علمی۔ ادبی و تنقیدی ماہوار مرقع

ادب لطیف

ایڈیٹر

بی۔ اے

دارالاشاعت

پنجاب بلڈپو۔ نوشرمال ۵ لاہور

اُردُو زبان کی پانچصد سالہ (۵۰۰) تاریخ میں

”اُردُو مرکز لاہور“

شاندار علمی کارنامہ

پچاس ہزار روپے کے صرف سے کئی سو سال کے اُردو ادب کا نچوڑ

۳۰ مجلدات میں

ملک کے ۱۷ نامور اہل قلم

علامہ تاجور کی زیر سیادت

اور

آنریبل سر عبدالقادر۔ خان بہادر شیخ نور الٰہی آئی ای ایس اسسٹنٹ ڈائرکٹر محکمہ تعلیم پنجاب و پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی دہلوی کی

زیر نگرانی

اُردو لٹریچر کے بیکراں انبار کی چھان بین اور لاکھوں صفحات کے مطالعہ کے بعد رُوسے جاندار اور کارآمد حصوں کا تاریخی ترتیب کے پیش نظر

شعبہ وار انتخاب حسب ذیل ۳۰ مجلدات میں مرتب کیا ہے

(۱) عہد بعہد اُردو نثر کا انتخاب عہد بعہد قدیم و جدید نامور نثر نگاروں کے ماہ و سال مع ان کی تصاویر کے خصوصیات نثر کی تفصیل مع دیباچہ از مشیر تنقید ۱۴ جلدوں میں

(۲) ملک کے مشہور افسانہ نگاروں کے سبق آموز دلکش افسانوں کا انتخاب مع تصاویر و تبصرہ و دیباچہ تاریخی ۱۱ جلدوں میں

(۳) عہد بعہد اُردو کے منتخب نامور شعرا کی بلند نظمیں مع تصاویر و خصوصیات نگارش و دیباچہ ۵ جلدوں میں۔

(۳۰) مجلدات کا یہ سٹ محکمہ تعلیم کا منظور شدہ ہے پنجاب ٹکسٹ بک کمیٹی نے حسب سرکلر نمبر ۲۲۵۹ منظور کیا ہے

کوئی لائبریری ترکِ نہ کرے۔ اس تاریخی سیٹ کے بعد مکمل ہیں بلا فی جلد ہر کتاب کی نہایت عمدہ بصورت جلد اور ہر کتاب کی محکمہ تعلیم کی مقررہ قیمت کل ایک روپیہ ہے

یہ مجلدات اُردو ادب کے مورخین اُردو ادب کے اساتذہ امتحانات کے امیدوار طلبہ و طالبات۔ ہر صاحب ذوق کے علاوہ اُردو خواں حضرات کے مطالعہ کیلئے از بس ضروری ہیں

دفتر اُردُو مرکز بُک ڈپو۔ لاہور

پنجاب بک ڈپو کی منظور شدہ درسی مطبوعات

جدید جیومیٹری

حصہ اوّل - دوم - سوم

مصنفہ چوہدری محمد اکبر صاحب ہیڈ ماسٹر مسلم ہائی سکول لائلپور - ان سہ کتب کو محکمہ تعلیم پنجاب نے چھٹی - ساتویں اور آٹھویں جماعت کیلئے بموجب سرکلر نمبر ۵۵ مورخہ ۱۴ مارچ ۱۹۳۴ء منظور فرمایا ہے - یہ کتاب طرز جدید پر لکھی گئی ہے - اور ہر قاعدے کی وضاحت عام فہم تجربوں پر کی گئی ہے - سوالات حتی الوسع ایسے دئے گئے ہیں جو طلباء کی لیاقت کے مطابق ہوں - اور ان کے جوابات مشکوک اور حیران کن نہ ہوں - مثالیں اور تجربے ایسے تجویز کئے گئے ہیں جو آسان ہیں اور روزمرہ کے مشاہدے میں آنے والے ہیں - قیمت حصہ اول ۳ آنے، حصہ دوم ۵ آنے، حصہ سوم ۱۰ آنے

زینہ حساب

منظور شدہ بموجب سرکلر نمبر ۱۵۱۸ مورخہ [illegible]

(جماعت دوم تا جماعت ہشتم)

مصنفہ چوہدری محمد اکبر صاحب ہیڈ ماسٹر مسلم ہائی سکول لائلپور - سلسلہ حساب پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی نے ۱۹۳۴ء میں منظور کر کے مصنف کی محنت کی داد دے کر بہت افزائی فرمائی ہے - یہ کتابیں جدید طریقہ تعلیم کو مدنظر رکھ کر بنائی گئی ہیں - مصنف کا دعویٰ ہے کہ یہ کتابیں باقی تمام مروجہ حساب کی کتابوں سے بہتر ہیں -

تمام ہیڈ ماسٹروں کو چاہیئے کہ اس نئی طرز کے سلسلہ حساب کو مسائل ضرور رائج فرما کر فائدہ اٹھائیں - قیمت حصہ دوم ۴ پائی، سوم ۸ پائی، چہارم ۱۰ پائی، پنجم ۱۰ پائی، ششم ۱ روپیہ، ہفتم ۱ روپیہ ۹ پائی، ہشتم ۱ روپیہ ۳ پائی

فارسی کی پہلی دوسری اور تیسری کتاب

مصنفہ مرحوم خلیفہ عماد الدین صاحب مرحوم سابق [illegible] پنجاب یونیورسٹی و انسپکٹر مدارس انبالہ ڈویژن منظور شدہ سررشتہ تعلیم پنجاب بموجب سرکلر نمبر ۲۵۱۶ مورخہ ۱۲ اپریل ۱۹۱۲ء وہ بالکل جدید سکیم کے مطابق تیار کرائی گئی ہیں - قیمت پہلی ۲ آنے، دوسری ۳ آنے، تیسری ۴ آنے!

صوبہ سرحد کی منظور شدہ کتب

سرحدی حساب

شمال مغربی سرحدی صوبہ کی جدید سکیم کے مطابق منظور کردہ ٹیکسٹ بک کمیٹی شمال مغربی سرحدی صوبہ بموجب سرکلر نمبر ۱۲۷۱/۱۲۵۶ ۱۹۳۵ء مصنفہ مولوی محمد عزیز الدین مدرس سنٹرل ماڈل سکول لاہور (ریٹائرڈ) نہایت بہترین کتابیں ہیں - قیمت حصہ سوم برائے جماعت سوم ۵ - حصہ چہارم برائے جماعت چہارم ۶ ر

برہان القواعد

منظور کردہ ٹیکسٹ بک کمیٹی شمال مغربی سرحدی صوبہ بموجب سرکلر نمبر ۱۸۱۰ ۱۹۳۴ء و درسی ٹیکسٹ بک ریاست کشمیر - اردو قواعد کی کتاب جدید سکیم کے مطابق لکھی گئی ہے - طرز بیان عام فہم اور آسان ہے

قیمت ۶ آنے

معین الترجمہ

حصہ اول - دوم و سوم مصنفہ چوہدری [illegible] محمد نذیر سیال ایم - اے و چوہدری محمد شفیع صاحب ایم - اے [illegible] پنجاب یونیورسٹی

ان کتب کے پڑھنے سے ترجمہ کرنے کے تمام گر طالب علم کے ذہن نشین ہو جاتے ہیں - ہر ایک مشق سے پہلے لڑکوں کی رہنمائی کے لئے چند فقرات کا ترجمہ کر دیا گیا ہے - [illegible] کتاب کے آخر میں دے دیا گیا ہے - ترجمہ کی تمام مشقیں انگریزی گریمر کے اصولوں پر تیار کی گئی ہیں - تاکہ ایک فقرہ کا [illegible] گریمر کا اصول سمجھ میں آ سکے - اور باقی مشق اسی کی امداد سے حل کی جاسکے - قیمت حصہ اول برائے جماعت ششم [illegible] دوم برائے جماعت ہفتم [illegible] سوم برائے جماعت ہشتم

ملنے کا پتہ: پنجاب بکڈپو - [illegible] سے ۹ [illegible] لاہور

منظور کردہ ڈائرکٹر صاحب بہادر سررشتہ تعلیم پنجاب لاہور بموجب لیٹر نمبر ۱۱۳۳ سی مورخہ ۱۰ فروری ۱۹۳۶ء
منظور کردہ محکمہ تعلیم حیدرآباد دکن ۳۴۰ سنہ ۱۳۴۴ف مثل نمبر (۱۸۱۱۳) ۴۴ ف

سالانہ چندہ
تین روپے
چار آنے

قیمت
فی پرچہ
۴؍

فہرست مضامین

ادارۂ تحریر - چودھری برکت علی بی اے - میرزا ادیب بی - اے

جلد ۴ | ماہ جنوری ۱۹۳۷ء | نمبر ۵

چودھری برکت علی ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے عالمگیر الیکٹرک پریس لاہور میں چھپوا کر دفتر رسالہ ادب لطیف لوئر مال روڈ لاہور سے شائع ہوا -

نذرِ اولیں

سالنامہ ادب لطیف ملک کے ادبی حلقوں میں ہماری توقعات سے بڑھکر مقبول ہوا۔ اہلِ نظر حضرات نے پرچے کے ظاہری و باطنی محاسن کا جس پیرائے میں ذکر کیا ہے۔ وہ جہاں، ایکطرف ہماری حقیر کوششوں پر دادِ تحسین ہے۔ وہیں ہمارے لئے ہمت افزا بھی۔ حقیقتاً ہماری کامیابی، ہمارے محترم و معزز مضمون نگاروں کی مخلصانہ قلمی معاونت کا خوشگوار نتیجہ ہے۔ اس لئے ہم جتنا بھی ہم ان محسنوں کا شکریہ ادا کریں کم ہے۔

شمارہ ساخرہ میں ہم چند ایسے قابلِ قدر گرانمایہ مضمونوں کو شائع کر رہے ہیں جنہیں ہم سالنامے میں شائع کرنا چاہتے تھے مگر جو عدم گنجائش و تنگیٔ وقت کی وجہ سے نہ چھپ سکے۔ اور ہمیں اس کا بہت افسوس ہے۔ لسان الوقت جناب راز رامپوری کا محققانہ و بلند پایہ مضمون "کیا مذہب مانعِ ترقی ہے؟" سالنامے کی اشاعت سے صرف دو روز قبل، بادلِ نخواستہ کاتب صاحب سے لیا گیا۔ آپ دیکھیں گے، کہ فاضل مضمون نگار نے اس مضمون میں کتنی جانفشانی اور سعی و تفحص کا ثبوت دیا ہے۔ غالباً قارئین ادب لطیف ہم سے متفق ہوں گے، کہ ایسے گرانمایہ مضامین بہت کم اردو رسائل میں شائع ہوتے ہیں۔ بہر حال ہم راز صاحب کے ازحد ممنون احسان ہیں——!!

محترم پروفیسر رگھوپتی سہائے صاحب کی غزل سحر حلال بھی سالنامے کے لئے موصول ہوئی تھی۔ مگر یہ بھی عدم گنجایش کے باعث نہ جا سکی۔ پروفیسر صاحب قبلہ اردو کے ان شاعروں میں سے ہیں جن پر اردو کو بجا طور پر فخر ہے۔ ہم ان سے معذرت خواہ ہیں کہ ان کی غزل سالنامے میں نہ جا سکی——!

دوشیزۂ صحرا۔ اردو داں حضرات کی نگاہوں سے، فرانس کے ممتاز افسانہ نگار ماپاساں کے اکثر افسانے گزرتے رہتے ہوں گے۔ ماپاساں کے افسانے، سوسائٹی کی ان کمزوریوں کو منظرِ عام پر لاتے ہیں، جو اس کی بنیادوں کو برابر تباہ کرتی جا رہی ہیں۔ دوشیزۂ صحرا میں اس نے عورت کے ایک خاص پہلو پر روشنی ڈالی ہے۔ یعنی عورت جس کی بے اعتنائی جابر سے جابر بادشاہ کے سرِ غرور کو خاکِ مذلت میں ملا دیتی ہے بعض اوقات کس درجہ کمزور ہوتی ہے——معمولی سے معمولی واقعے کا ایک ہلکا سا جھونکا بھی اس کی زندگی کے رخ کو بدل دیتا ہے۔

ساغرِ حبزی کا ترجمہ بھی نہایت کامیاب ترجمہ ہے۔

اندھا مصور۔ جناب سیاح سامی کے طبعزاد افسانے دنیائے ادب میں بہت وقعت کی نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں۔ آپ کا یہ افسانہ، آپ کے پچھلے افسانوں سے بہر لحاظ ممتاز ہے۔ سیاح صاحب نے محبت کے نازک و لطیف جذبات کو بہت دلآویز پیرائے میں بیان کیا ہے۔

قارئین کرام یہ سنکر بہت خوش ہوں گے۔ کہ جناب عبدالرشید

صاحب بی اے آئندہ ادب لطیف کے صفحات پر ادب لطیف کے نقاد خصوصی کی حیثیت سے ظاہر ہوا کریں گے۔ آپ کا ایک مضمون جو تنقید کے بنیادی اصولوں پر مشتمل ہے۔ فروری نمبر میں شائع ہوگا اور آئندہ قریباً ہر ماہ میں آپ کا کوئی نہ کوئی تنقیدی مقالہ درج رسالہ ہوا کرے گا۔

قارئین کرام سے یہ امر پوشیدہ نہیں، کہ ادب لطیف کی صوری و معنوی خوبیوں پر ہزار ہا روپیہ صرف کیا جا رہا ہے۔ کسی راجہ یا نواب کی سرپرستی بھی اسے حاصل نہیں جس سے اخراجات میں ہماری اعانت ہو سکے۔ صرف پنجاب بکڈپو کی درسی اور عام کتب کی فروخت کا منافع اس پر صرف کیا جاتا ہے۔ اس لئے محکمہ تعلیم کے افسر ہیڈ ماسٹر اور مدرس صاحبان کی خدمت میں درخواست ہے کہ وہ ادب لطیف کی سرپرستی فرمائیں۔ اور اس کا واحد طریقہ یہ ہے۔ کہ پنجاب بکڈپو کی درسی کتب اپنے سکولوں میں رائج کریں۔ کتابیں ملک کے بلند پایہ اہل قلم حضرات کی لکھی ہوئی، اور اکثر پنجاب، صوبہ سرحد اور کشمیر کے محکمہ ہائے تعلیم کی منظور کردہ ہیں۔ مکمل فہرست کتب طلب فرمائیں۔

ایڈوائزری بورڈ:۔ محکمہ تعلیم نے پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی کو توڑ کر اس کے کھنڈر پر ایڈوائزری بورڈ کی بنا رکھی ہے، اور اعلان کیا ہے۔ کہ مندرجہ ذیل فوائد کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ قدم اٹھایا گیا ہے:۔

(۱) بہترین درسی کتب کا انتخاب (۲) رشوت ستانی کا انسداد۔ (۳) مصنفین کو خود کتابیں پیش کرنے کا موقع دینا۔ (۴) منتخب کتابوں کو پانچ سال کے لئے مقرر کر کے طلباء کو ہر روز کی تبدیلی کتب کے نقصانات سے بچانا۔

اس سکیم کے نقصانات واضح کرنے کیلئے ملک کے ہر ایک جریدہ کے صفحات سیاہ کئے گئے۔ لیکن خداوندان تعلیم کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی۔ بارہا کہا گیا۔ کہ اس سکیم سے نہ تو مصنفین کو فائدہ پہنچے گا۔ نہ عام پبلشر کچھ حاصل کر سکیں گے اور نہ ہی بہترین کتابوں کا انتخاب ہو سکے گا۔ اور ہمیں یقین ہے۔ کہ رشوت ستانی کا انسداد بھی ناممکنات سے ہے۔

اس جگہ ہم اس سکیم کے حسن و قبح پر بحث کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ مگر ایڈوائزری بورڈ کی سب سے پہلی لغزش کی طرف پبلک کی توجہ دلانا چاہتے ہیں۔ پبلشر اور مصنفین کا عام خیال تھا۔ کہ نئی کتابیں پیش کرنے کے لئے کم از کم ایک سال کی مہلت دیجائے گی۔ تاکہ وہ بہترین کتابیں چھپوا کر پیش کرنے کے قابل ہو سکیں۔ لیکن محکمہ تعلیم کا یہ حکم کہ تمام کتابیں ۳۱ جنوری ۱۹۳۶ء تک سیکرٹری ایڈوائزری بورڈ کو پہنچ جانی چاہئیں۔ سخت تعجب خیز ہے۔ ہم دعوے سے کہہ سکتے ہیں، کہ کوئی مصنف اور کوئی پبلشر اچھی کتابیں نئی جلد تیار کر کے پیش نہیں کر سکتا۔ اور اس حکم کا مقصد بھی یہی ہے۔ کہ چند اجارہ دار پبلشروں کو تمام محکمہ تعلیم پر قابض کر دیا جائے ہم آنریبل چودھری سر شہاب الدین وزیر تعلیم۔ ڈائرکٹر صاحب بہادر و اسسٹنٹ ڈائرکٹر صاحب بہادر کی توجہ اس طرف منعطف کراتے ہیں۔ کہ کتابیں پیش کرنے کے لئے کم از کم ایکسال کی مہلت ضرور دیجائے۔ تاکہ مصنفین اور پبلشر بہترین کتابیں پیش کرنیکے قابل ہو سکیں۔

ڈسٹرکٹ بورڈ جالندھر کی انگلش ٹیچروں سے ناانصافی

دنیا کی اقتصادی حالت آج کل پستی کے جس انتہائی درجہ تک پہنچ چکی ہے۔ وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ جدھر دیکھو تخفیف کی تیغ جوہر دار چمکتی نظر آتی ہے۔ یہی حادثہ ضلع جالندھر کے انگلش ٹیچروں سے پیش آیا۔ اور ڈسٹرکٹ بورڈ نے ان کی تنخواہوں میں تقریباً [illegible] فیصدی تخفیف کر دی۔ جس کا نتیجہ حسب ذیل نقشہ سے واضح ہے:-

اصل تنخواہ	تخفیف شدہ
۲۰۰ روپے ماہانہ	۱۴۰ روپے ماہانہ
۱۴۰ " "	۱۰۰ " "
۱۲۵ " "	۷۵ " "
۷۵ " "	۴۰.۵۰ " "

اس بدحالی کے زمانے میں جبکہ ہر چیز گراں ہو۔ اور ملازمت پیشہ لوگوں نے اپنی ماہانہ آمدنی کے مطابق طرز رہائش و اخراجات کا میزانیہ بنا رکھا ہو تنخواہوں میں اس قدر کمی کرنا ظلم کے مترادف نہیں تو کیا ہے؟ اس پر مستزاد یہ کہ ذاتی استعداد و مدت ملازمت کے سوال کو مدنظر رکھا ہی نہیں جاتا۔

اس سے پیشتر ڈویژنل سروس کا طریق رائج تھا۔ یعنی جن سینئر اساتذہ کی تنخواہ دو سو روپیہ ماہانہ یا ایسے درجے تک پہنچ جاتی تھی، جسے ڈسٹرکٹ بورڈ ادا کرنے سے قاصر ہوتا تھا۔ تو انہیں دوسرے اضلاع میں بھیجکر وہاں سے جونیئر اساتذہ کو بلا لیا جاتا تھا۔ اب یہ طریق بھی اڑا دیا گیا ہے۔ اور مظلوم انگلش ٹیچر "نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن" کا مصداق بنکر رہ گئے ہیں۔ ہم آنریبل وزیر تعلیم پنجاب، اسسٹنٹ ڈائرکٹر صاحب ڈویژنل و ڈائرکٹر صاحب بہادر تعلیمات کی توجہ گرامی اس طرف مبذول کراتے ہوئے مستدعی ہیں، کہ وہ ان کس مپرس ٹیچروں کی دادرسی کے لئے مناسب اقدام فرمائیں۔ اور اگر ان کی تنخواہوں میں تخفیف ناگزیر ہو تو کلاسیکل ٹیچروں کی طرح ۱/۲ فیصدی کمی جائے۔ اور بیچارے انگلش ٹیچروں کو اس نقصان عظیم سے بچایا جائے۔ امید ہے کہ ہماری یہ اپیل صدا بصحرا ثابت نہیں ہوگی۔

(ادارہ)

قارئین کرام توجہ فرمائیں

جن حضرات کا سالانہ چندہ ماہ جنوری ۱۹۳۶ء میں ختم ہو رہا ہے وہ منیجر رسالہ کو مطلع کر دیں کہ آیا وہ آئندہ سال اس کی سرپرستی قبول فرمائیں گے یا نہیں آئندہ سال کے لئے خریدار بننے کی صورت میں فروری کے پہلے ہفتہ میں چندہ سالانہ مبلغ تین بذریعہ منی آرڈر ارسال کر دیں۔ یا پرچہ بذریعہ وی۔ پی بھیجنے کی اطلاع دیں۔ جواب نہ آنے کی صورت میں پرچہ فروری بذریعہ وی پی بھیجا جائیگا جسکو وصول کرنا ان کا اخلاقی فرض ہوگا۔

(منیجر)

"نغمۂ روح" پر ایک نظر

حضرت اختر انصاری بی۔ اے (آنرز) کو نغمہ و شباب کا شاعر کہنا بے جا ہوگا۔ نئے دور میں اور نوجوان شاعر بھی پائے جاتے ہیں۔ مگر اختر صاحب کو جو شے دوسروں سے الگ اور ممتاز کرتی ہے وہ ان کے مطالعے کی گہرائی ہے۔ جو موضوعات کی سطحی رعنائیوں سے گزر کر ان کے اثرات و کیفیات کو نمایاں کرتی ہے۔ اچھی شاعری کی یہی شناخت ہے وہ محض لفاظی و نقالی تک محدود نہیں رہتی۔ بلکہ شاعر کی ترجمانی محسوسات کو اپنے دامن میں لئے ہوتی ہے۔

اختر صاحب کے مجموعہ کلام کا نام نغمۂ روح ہے۔ جس کی جان چھوٹے چھوٹے مگر پر مغز قطعے ہیں۔ غزلیں بھی کچھ کم دل آویز نہیں ہیں۔ نظمیں بھی خوب ہیں گو ان میں عام منظومات سے تمیز کرنے والی کوئی بات نظر نہیں آتی۔

اختر صاحب نے اپنا معیار شاعری ایک مختصر مگر جامع مقدمے میں خود ہی بیان کر دیا ہے۔ اور اس پر کاربند ہوئے ہیں۔ اس کے ضروری مقامات نقل کرنا شاید غیر مفید نہ ہو۔ خصوصاً اس وجہ سے کہ گو یہ اصول مغرب سے مستعار ہیں تاہم ایک ایشیائی شاعر نے ان کی رہنمائی میں کامیابی ہی حاصل نہیں کی، بلکہ متعدد ایسے تخیلات کا اضافہ کیا۔ جو مشرق و مغرب کے خوشگوار و صناعانہ امتزاج کے باعث بالکل نئے اور اچھوتے معلوم ہوتے ہیں۔

فرماتے ہیں کہ:

"آرٹ تخلیق حسن ہے، اور آرٹسٹ خلاق حسن!

... ... کا ذریعہ بنانا اپنی کوششوں کو ضائع کرنا اور آرٹ کی ... کو قتل کرنا ہے۔

فنی و صناعی کارنامے ہماری اخلاقی زندگی پر اثر انداز نہیں ہوتے۔

آرٹسٹ کی نگاہ حیات انسانی کے خوبصورت مناظر تک محدود ہے۔

آرٹ کا مطالعہ آرٹسٹ کے نقطۂ نظر سے کرنا چاہئے۔

انسانی جذبات کی گہرائیوں سے دو چشمے ابلتے ہیں۔ شاعری اور موسیقی!

عصر حاضر کی شاعری انداز بیان کا دوسرا نام ہے۔

مغربی ادب کی تقلید نہ صرف غیر ضروری بلکہ مضر بھی ہے۔ اس سے استفادہ کرنا نہ صرف جائز بلکہ ضروری ہے۔"

کاش آخری اصول کو ہمارے ملک کے نوجوان بھی سمجھیں اور اس پر عمل پیرا ہوں کیونکہ زیادہ تر یہی دیکھنے میں آیا ہے کہ مغربی ادب کو بدسلیقگی سے اردو میں منتقل کرنے پر قناعت کی جاتی ہے۔ اس طرح ترقی درکنار، زبان بگڑتی، اور مسخ

ہوتی ہے یہ عیب دور نہ ہوگا جب تک کورانہ تقلید اور لفظی ترجمے کو صدقِ دل سے مردود قرار نہ دیا جائے۔ مغربی خیالات پر ایشیائی ذہن کے اجتہادانہ تصرف سے جو خوبیاں پیدا ہوسکتی ہیں، نغمۂ روح میں جابجا اس کی بہترین و دلکش مثالیں ملتی ہیں ملاحظہ فرمایئے

چاندنی

اس روپہلی شرابِ نوریں سے
کاش میں جامِ شعر بھر سکتا
اے شبِ مہ کے منتشر جلوو!
کاش میں تم کو نظم کر سکتا!

یہ دعویٰ سچا ہوگا کہ مغربی ادب سے جو شخص ناواقف ہو، یہ اندازِ بیان اختیار یا وضع نہیں کرسکتا۔ اور اسی کیساتھ شاید یہ دعویٰ مبالغہ آمیز نہ ثابت ہو کہ چاندنی کی تعریف اس سے بہتر کوئی مغربی نظم بھی پیش نہیں کی جاسکتی، چاند کی روشنی کو روپہلی شراب کہکر لفظِ نوریں سے درخشاں تموج پیدا کرنا، اس کیلئے شعر کا جام تجویز کرنا، ستاروں کو شب کے منتشر جلوے کہنا، لفظ منتشر ہی سے مزید فائدہ اٹھاکر اس تخصیص کو جس نے غیر متعین کردیا، اور اسطرح پڑھنے والے کے ذہن کو مزید دعوتِ غور دینا، تاکہ وہ دیگر مناظرِ فطرت کو بھی ستاروں میں شامل کرلے۔ بعد ازاں لفظِ نظم سے ایک نظام کا تخیل خلق کرنا، ایسے اختراعات ہیں جو خراجِ تحسین لئے بغیر نہیں رہ سکتے

حسین رات

نسیم پھولوں کی رونق کھلے ہوئے تارے
فضا میں چھوٹ رہے ہیں ضیا کے فوارے
رخِ حسینۂ فطرت سے اٹھ گئی ہے نقاب
نظر کو ڈھونڈ رہے ہیں حسین نظارے

تاروں کو چھٹکے ہوئے، یا نکھرے ہوے کی جگہ کھلے ہوئے کہنا، ایک اپچ ہے۔ مگر خوبصورت، جس کے جواز کو پھولوں کی رونق موجود ہے۔ اس طرح ستارے کھلے ہوئے پھول یا پھول کھلے ہوئے ستاروں میں منتقل ہوگئے۔ میں ایسے دلپذیر اختراعات کو جن میں شانِ اجتہاد پائی جاتی ہے، پسند اور ان کا خیر مقدم کرتا ہوں، ان سے زبان میں اضافہ اور اس کا دائرہ وسیع ہوتا ہے۔ پرانی لکیر کے فقیر چاہے جسقدر ناک بھوں چڑھائیں ستاروں کی کرنوں کو فضا میں ضیا کے فوارے چھوٹنا کہنا، نہایت حسین اسلوبِ بیان ہے۔ دوسرا شعر ایسا معنوی اضافہ ہے جو صرف ایک سچا رمز شناسِ فطرت ہی کرسکتا تھا۔ ہر ستارہ، اور ہر پھول ایک دیدۂ نگراں ہے جو ایک نگاہِ آشنا کا منتظر ہے۔ اسی طرح چشمِ بینا و دلِ آگاہ کی وقعت و منزلت کا جو پہلو نکلا، اس سے مغربی شاعری قطعاً محروم ہے۔

مغنیہ!

تیرے گیتوں کی لے ارے توبہ
یہ طرب، یہ نشاط، اور یہ لوچ
کیوں نہ دنیا پگھل کے بہ جائے
اک ذرا تو ہی اپنے دل میں سوچ

تیسرے مصرع کی تخئیل یک لخت مغربی ہے۔ مگر دوسرے مصرعے کے لفظِ لوچ نے خالص ایشیائی رنگ میں اسطرح منتقل کردیا کہ لطافت و ندرت کی حد نہ رہی۔

فطرت۔

یہاں سے دور جنگل میں رہا کرتی ہے اک دیوی
وہ غم دیدہ دلوں کو غم کے بدلے عیش دیتی ہے
میں جب روتا ہوا جاتا ہوں اس کی بزمِ عشرت میں
تو بڑھ کر ریشمی آنچل سے آنسو پونچھ لیتی ہے

ریشمی آنچل نے جو سبک و لذیذ مگر معصوم لمس اور جس نزاکت کے ساتھ سامانِ سکون مہیا کیا ہے۔ اس کے مزے صرف

ایک شاعر کا دل اٹھا سکتا ہے۔

نشاطِ بہار

پھوار ابر پرندوں کے گیت مست ہوا
ہرے کٹوروں کی صورت چھلک رہی ہے فضا
بہار کان میں کچھ کہہ رہی ہے مجھ سے مگر
وہ بے خودی ہے کہ میں کچھ سمجھ نہیں سکتا

ایک دلچسپ منظر کو ہم بہار بنا کر وجدان کے سپرد کر دیا اس طرح وہ اثر مرتب ہوا جو تمام حواسوں کی متفقہ شرح سے بھی ناممکن تھا۔

میں نے چند قطعے نقل کر دیئے۔ "نغمۂ روح" میں ایسے گلدستے کثرت سے ہیں۔ ایک قطعہ تاج کی تعریف میں، اور سن لیجئے۔

چاندنی رات کا سماں تاج کا منظر حسین
چھائی ہوئی ہیں مستیاں کیفیتوں کا دور ہے
قلزم نور چاندنی کشتیٔ نور تاج گنج!!
نور میں نور مل گیا، تاج نہیں کچھ اور ہے

اس قطعے کو انگریزی شاعر کے خواب مرمریں کی تعبیر کہنا چاہئے

اب کچھ شعر غزلوں کے ملاحظہ ہوں، اختر صاحب نے ذوق سلیم کی رہبری میں غزل کیلئے نہایت نرم و نازک زبان، اور لطیف جذبات اختیار کئے ہیں۔ پھر بھی علوئے تخیل سے بیگانگی نہیں برتی، اور انداز بیان میں تازگی و ندرت قائم رکھی ہے۔ ان کی غزلوں کے اشعار اسقدر صاف اور سلیس ہیں کہ ان کے متعلق کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ پڑھئے اور مزے لیجئے

کامیابی محال ہے اختر۔ ذوق اپنا بلند رکھتا ہوں
سرشار ہوں چھلکتے ہوئے جام کی قسم
مست شراب شوق ہوں خیام کی قسم

ہوتی تھی بنتِ عید مری صبح پر نثار
کھاتی تھی شامِ عیش مری شام کی قسم

مست ہوں میں مری نظر سے ابھی
بادۂ لالہ گوں ٹپکتا ہے!

ہاں کبھی خواب عشق دیکھا تھا،
اب تک آنکھوں سے خوں ٹپکتا ہے

یاس کی تیرگی نے گھیرا ہے
ہر طرف ہولناک اندھیرا ہے

سب سمجھتے ہیں لے رہا ہوں سانس
اصل میں آہیں بھر رہا ہوں میں!

نامرادی سے کہو منہ پھیر لے اپنا ذرا
میری دنیا میں عروس کامرانی آئیگی

ایکدن جان جائیگی اختر۔ مجھے ایسا دکھائی دیتا ہے

آفتوں میں گھر گیا ہوں زیست سے بیزار ہوں
میں کسی رومانِ غم کا مرکزی کردار ہوں

علاجِ اختر ناکام کیوں نہیں ممکن
اگر وہ جی نہیں سکتا تو مر تو سکتا ہے

کیا خبر کس نے کیا سوال کیا:
میں نے کیا جانے کیا جواب دیا،

اجڑے دل میں امید کا عالم۔ جیسے صحرا میں جل رہا ہو دیا

ابھی تو دل کی وحشت ہی جھلکتی ہے نگاہوں میں
کسی دن خون روئیں گی، یہ دل کی رازداں آنکھیں

شرابِ ناب میں ڈوبی ہوئی نگاہوں سے

مجھے خرید لیا التفات کے بدلے

فلک سے نور برستا رہا ہے چاند
میں صبح خلد نہ لوں ایسی رات کے بدلے
جو پوچھتا ہے کوئی دل کی حسرتوں کا حال
تو منہ سے آہ نکلتی ہے بات کے بدلے

روئے بغیر چارہ نہ رونے کی تاب ہے
کیا چیز اف یہ کیفیت اضطراب ہے

آرزو کو روح میں غم بن کے رہنا آگیا
سہتے سہتے ہم کو آخر رنج سہنا آگیا

پھول سونگھے جانے کیا یاد آگیا
دل عجب انداز سے لہرا گیا

اس سے پوچھے کوئی چاہت کے مزے
جس نے چاہا اور جو چاہا گیا

دل کے شکستہ ساز سے نغمے ابل پڑے
پوچھا کسی نے حال تو آنسو نکل پڑے
بلبل ترے نثار اس انداز سے چہک
فصل بہار کا بھی کلیجہ اچھل پڑے

زیادہ اس سے کوئی آج تک نہ بتا سکا
کہ ایک نکتۂ ناقابل بیاں ہوں میں

مسلسل نظموں پر تبصرے کے لئے زیادہ وقت اور گنجائش کی ضرورت ہے۔ لہذا ان کو نہیں چھیڑتا۔ نغمۂ روح میں بعض اغلاط بھی نظر آئے۔ اور ناقد کی حیثیت سے میرا یہ تلخ فرض ہے کہ ان کو بھی نمایاں کروں۔

بہار:—

یہ بوندیاں یہ ہوائیں، یہ کیف بار سماں
مرے حواس پہ اک بیخودی سی چھائی ہے
تجلیات مسرت سے قلب ہے معمور
مگر بہار کسی کا سلام لائی ہے

حواس بصیغۂ جمع چاہیے۔ بلکہ دوسرا مصرعہ یوں بہتر ہوتا۔
ع۔ حواس و ہوش پہ اک بیخودی سی چھائی ہے: سلام کی جگہ پیام اچھا تھا۔ ممکن ہے کہ سہو کاتب ہو۔

مہتاب:

آسماں کے ہاتھ میں ہے اک بہار
پڑ رہی ہے مست نغموں کی پھوار
آہ ان نغمات سے ہے مرتعش
ساز دل کا کوئی نامعلوم تار

مہتاب کی تشبیہ ستارے کچھ موزوں نہیں۔ عنوان ماہ نو ہوتا، تو غالباً ایک حد تک یہ عیب مٹ جاتا۔ تیسرے مصرعے میں لفظ آہ نے بے جا تصنع پیدا کر دیا۔ اس کی جگہ اور بہتر تھا ع
اور ان نغمات سے ہے مرتعش

یاس میں امید:—

میرے مایوس دل میں اے اختر
اس طرح سے امید آتی ہے:
جس طرح ایک اداس چہرے پر!!
مسکراہٹ سی کھیل جاتی ہے

کھیل کا یہ موقع نہ تھا۔ دوڑ مناسب ہوتا۔

دور سے گانے والی:—

تجھ کو کیا معلوم بھیگی رات میں!
باد نم آلود کی موج خنک! ✽

متمول طبقہ اور جماعت عاملہ کی آویزش

میں رفتار سے تہذیب و تمدن ترقی کر رہے ہیں وہ ہر شخص جانتا ہے۔ پرانی تعمیرات گر رہی ہیں۔ اور ان کی جگہ نئے محلات کھڑے کئے جا رہے ہیں۔ سائنس نے وہ باتیں ممکن کر دکھائی ہیں جو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ آ سکتی تھیں۔ لاسلکی، سینما، ٹیلیگراف، ٹیلی وژن اور دیگر ایجادات نے ہمارے اجتماعی نظام میں انقلاب عظیم برپا کر دیا ہے لیکن ان تمام عیش و عشرت کے سامانوں کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ بجائے ان کے خریدنے کے انسان خود ان کے آگے بک رہا ہے۔ بجائے سامان کو مالک بننے کے وہ خود اس کے ہاتھوں غلام بن رہا ہے۔ دوسرے الفاظ میں "دنیا مشین" میں وہ ایک پرزہ بنکر رہ گیا ہے۔ وہ روئی اور کھن کی طرح ایک جنس بن گیا ہے جو بازار میں خریدی اور فروخت کی جا سکتی ہے۔

یہ تمام نتائج کیوں ظہور میں آئے؟

اس لئے کہ دنیا کا معاشی نظام، انقلاب پذیر حالات کے دوش بدوش نہیں چل سکا۔

آجکل کے معاشی نظام نے اکثر لوگوں کے لئے ترقی کا میدان محدود کر دیا ہے۔ اور اس وجہ سے ایک ایسی حالت پیدا ہو گئی ہے۔ جو موجودہ نظام کے خلاف ہے۔ یا بالفاظ دیگر یہ کہ سوسائٹی، دو فریق میں بٹ چکی ہے۔

ایک سرمایہ داروں کی جماعت۔ اور دوسری مزدوروں کی جماعت۔

اول الذکر کے تو اتنے مواقع میسر ہیں کہ وہ اگر نہ بھی کام کرے۔ تو بھی اس کے لئے دولت و امارت کا کوئی ٹھکانہ نہیں لیکن دوسری طرف جماعت عاملہ نان شبینہ کے لئے محتاج ہے۔

غریبوں کے بچے باوجود اس کے کہ وہ ہماری آبادی کا اسی فیصدی ہیں ترقی نہیں کر سکتے کیونکہ ان کے پاس تعلیم حاصل کرنے کیلئے پیسہ نہیں ہے۔

کسی شخص نے امریکہ کے متعلق لکھا تھا۔ کہ ایک طرف تو وہاں سربفلک مکانوں سے صبح کے وقت دودھ کی کڑاہیاں گرائی جا رہی ہوتی ہیں کیونکہ وہ رات کے وقت بچ رہا تھا اور دوسری طرف اسی مکان کے نیچے ایک بدرو کے پاس برف باری کے زمانہ میں ایک معصوم بچہ بھوک کے مارے بلک رہا ہوتا ہے کیونکہ اس کا کوئی پرسان حال نہیں۔!

یہ منظر ہندوستان کے چپے چپے پر دکھائی دے رہا ہے۔ ٹھیک اسی وقت جبکہ تہذیب تو موٹروں اور گاڑیوں میں شہر کی خوشنما سڑکوں پر اور دلفریب بالوں میں عیش و عشرت کے ترانے گا رہی ہوتی ہے۔ ایک فاقوں کا مارا ہوا۔ اور برسوں سے بیکار نوجوان فراٹے بھرتی ہوئی گاڑی کے نیچے، یا دریا گیت

... سکاتی ہوئی ندی کے پل پر خودکشی کے لئے آمادہ نظر آتا ہے !

ایک طرف امارت کا یہ حال ہے۔ کہ بھاؤ بڑھانے کی خاطر امراء اپنی گیہوں کی بوریاں نذر آتش کر رہے ہوتے ہیں۔ یا آسٹریلیا کے سرمایہ دار رسد کو مطالبہ کے برابر کرنے کے لئے اُون کی گٹھڑیاں دریا برد کر رہے ہوتے ہیں، اور دوسری طرف غربت کا یہ حال ہے کہ اکثر فاقہ مست بھوکے اس انتظار میں رہتے ہیں کہ گیہوں کے آٹے کا ایک لقمہ کہیں ان کے نصیب میں آئے۔ اور ہندوستان کے برہنہ کے ننگے اسی تمنا میں فوت ہو جاتے ہیں۔ کہ کاش کون کیا روئی کا بنا ایک کپڑا ان کے سرد جسموں کو حرارت پہنچا سکتا !!

آجکل شخصی خصائص ترقی کے ضامن نہیں ہیں، اور نہ لیاقت بام رفعت تک پہنچنے کا زینہ ہے۔ آج کل تو دولت کام کرتی ہے۔ دولت ——! روپیہ، پیسہ اور نقدی !!

سرمایہ داروں اور مزدوروں کے درمیان یہی چیز بعد اور تفاوت کا باعث بنی ہوئی ہے، یہی جڑ ہے۔ ان کی باہمی آویزش کی اور یہی چیز ہے۔ جو آج کل مختلف ملکوں میں سرمایہ دار حکومتوں کا تختہ الٹ رہی ہے۔ یہی چیز ہے جس نے ہسپانیہ کی حکومت کو از سر نو استوار کیا۔

اور جو ہندوستان کو آمادۂ پیکار کر رہی ہے۔ کیا اس مرض کا کوئی علاج ہے ؟

ظاہر ہے۔ کہ جب تک امراء اور غرباء یعنی دونوں جماعتوں کو یکساں مواقع میسر نہ آئیں گے۔ دنیا میں امن کا قیام ایک پریشان کن خواب ہے۔ اور اس کے لئے سرمایہ داری کا نظام سرتا سر تبدیل کرنا ہوگا۔ ایک عامی کا معیار زندگی بڑھا دینا چاہئے۔ تاکہ وہ بھی عصر جدید کی لذتوں سے بہرہ ور ہو سکے۔ ایک قلیل ترین معیار مقرر ہونا چاہئے۔ جس میں ایک تہذیب یافتہ انسان کی جملہ ضروریات پوری کی جا سکیں۔ اور وہ سب کیلئے یکساں ہو .....!

جب لوگ دال روٹی کے بارے میں بےفکر ہو جائیں گے۔ تو وہ ملک و ملت کی بھی اچھی طرح سے خدمت سرانجام دے سکیں گے۔

اس جماعتی عصبیت کی اصل بنیاد معاشی حالت ہے۔ اور ظاہر ہے۔ کہ جب تک معاشی ذرائع استعمال نہ کئے جائیں گے۔ اس مسئلہ کو حل کرنا دشوار ہوگا۔ آرڈیننس جاری کرنے یا سیاسی طور پر مزدور جماعت کی تحریکات کو دبا دینے سے یہ مسئلہ حل نہیں ہوگا۔

عبدالرحیم شبلی۔ بی۔کام

اطلاع ۔ خریدار حضرات خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیا کریں۔ تاکہ تعمیل ارشاد میں ہمیں سہولت ہو جائے ۔ (مینجر)

سحرِ حلال

مٹ کے میں نے تجھکو عالم میں نمایاں کردیا
زندگی کی شمع گل کر کے چراغاں کردیا

نذرِ وحشت دل کے اجزائے پریشاں کردیا
میں نے ان ذروں کو گم کر کے بیاباں کردیا

قرب و دوری رکھ دیئے سر مارنے کے واسطے
عاشقی کو بے نیازِ وصل و ہجراں کردیا

لب پہ موجیں ہیں تبسم کی سکوتِ عشق پر
اس کلی کو میں نے بے چھیڑے گلستاں کردیا

وائے اے دستِ جنوں شائستگی چاک کو
صرفِ داماں کردیا وقفِ گریباں کردیا

زندگی تھی عشق کی بس اک نگاہِ آشنا
اس کو بھی نذرِ تغافلہائے پنہاں کردیا

اس حجابِ ناز نے رنگینیوں میں ڈوب کر
دیکھ حسنِ شرمگیں کو اور عریاں کردیا

رنگ و بو والو کچھ اس کا درد بھی تم پر کھلا
جس تبسم نے گلستاں کو گلستاں کردیا

حسنِ خود افزوں نگاہِ شوق کی حیرانیاں
یونہی کیا کم تھیں کہ تونے اور حیراں کردیا

شوخیوں نے اسطرح چھیڑا کہ حسنِ یار کو
سر بسر برقِ تبسم ہائے پنہاں کردیا

کچھ نہ جن کی نازکی حسن حیا پرور کو بھی
ان نگاہوں کو بھی پیوستِ رگِ جاں کر دیا

کون جانے عقدۂ ہستی نگاہِ مست نے
اور مشکل کر دیا یا اور آساں کر دیا

اس سکوتِ ناز کی ہنگامہ آرائی نہ پوچھ
دل سی خلوت گاہ جس نے محشرستاں کر دیا

ایک مشتِ خاک وہ افتادگی عشق نے
کچھ سہارا درد دل کا دے کے انساں کر دیا

ذوق افزا تھی نگاہِ ناز کی نشتر زنی
اس طرح چھیڑا کہ رگ رگ کو رگِ جاں کر دیا

عشق کی رسوائیوں نے غفلتوں نے حسن کی
مجھ کو پنہاں کر دیا تجھ کو نمایاں کر دیا

عقل نے صحرا میں کچھ دیکھا نہ ذروں کے سوا
اور جنوں نے ذرہ ذرہ کو بیاباں کر دیا

عشق پہ ہر طرح کا وہ زور وہ دعویٰ کیا ہوا
جس نے ہر اک جور کو جورِ پشیماں کر دیا

شوقِ پرسش کو بھی صرفِ تغافل کیوں کیا
جو نہ پنہاں کو بھی کیوں جو نمایاں کر دیا

عشق کو آیا ہے دینے حسن درسِ نیستی
بارہا شیرازۂ عالم پریشاں کر دیا

سوزِ پنہاں کا اشارہ پاتے ہی دل نے فراقؔ
دہر کو دودِ چراغِ شامِ ہجراں کر دیا

پروفیسر فراقؔ ایم اے۔ گورکھپوری

افسانہ:-

دوشیزۂ صحرا

(فرانسیسی افسانہ نگار سوپاسن کا ایک شاہکار)

مجھے ایک دوست نے بتایا تھا، کہ الجیریا میں سفر کرتے ہوئے، اگر مجھے "برج ابابا" کے قریب سے گزرنے کا موقع ملے۔ تو میں ایتل نامی ۔۔۔ اس کے ایک رشتہ دار سے جو کئی سالوں سے وہاں مقیم ہے، ضرور ملوں۔ ایتل اور اس کی جائے رہائش کا نام، دونوں میری یاد سے محو ہو چکے تھے۔ کہ اچانک مجھے اس اجنبی سے دوچار ہونا پڑا۔ قریباً ایک ماہ تک میں افریقہ کے اس عظیم الشان خطہ میں پا پیادہ سفر کرتا رہا۔ اس کوہستانی علاقہ میں آبادی بہت کم ہے۔ اور سینکڑوں میل تک جنگلات ہی جنگلات دکھائی دیتے ہیں۔ بعض مقامات پر سر بفلک پہاڑیوں کے درمیان صنوبر کے درختوں سے گھری ہوئی خوشنما وادیاں بھی پائی جاتی ہیں۔ جہاں سرد ہوا کے خوشگوار جھونکے قدرتی چشموں کے صاف و شفاف پانی کی آواز کے ساتھ مل کر نغمہ کی صورت اختیار کر لیتے ہیں چٹانوں کے درمیان، دہشتناک غاروں کے علاوہ پتھروں سے ٹکراتی ہوئی برفانی ندیاں جن کے کناروں پر پہاڑی خودرو پھولوں نے عجیب بہار پیدا کر دی ہے۔ پورے جوش و خروش سے بہ رہی ہیں۔ اور ان کے عبور کرنے کیلئے جا بجا مقامی باشندوں نے گرے ہوئے درخت ڈال کر گذرگاہیں بنا رکھی ہیں میرا سفر پیچھے پڑ رہا وہ فرحت بخش بہت تھی۔ یہ توجیہہ نا ہموار پگڈنڈیوں پر چلتے ہوئے ان راستوں پر سے گزرنا پڑتا تھا۔ جنکے دونوں جانب گنجان اور ... درخت بکثرت موجود ہوتے۔ اس کوہستانی بلندی سے ... زمین کا وہ تمام پتھریلا اور ناہموار حصہ صاف نظر آتا۔ جو دور سمندر کے ساحل سے جا ملتا ہے

جس دن کا میں ذکر کر رہا ہوں۔ میں اپنا راستہ کھو چکا تھا ایک بلند چوٹی پر پہنچکر مجھے چند پہاڑیوں کے عقب میں ایک وسیع میدان دکھائی دیا میں نے جنوب کی سمت نیچے اترنا شروع کیا میرے سامنے دور تک ٹوٹی پھوٹی چٹانوں کا ناہموار سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ جس کی ایک طرف بڑے بڑے پہاڑ آسمان سے باتیں کرتے ہوئے کھڑے تھے۔ جا بجا زرد رنگ کی چٹانیں کسی شتر کی کوہان کی مانند ابھری ہوئی نظر آتی تھیں۔ میں بہ سرعت و سرعت اس پہاڑی راستہ پر چلنے لگا۔ جو کئی ایک چکر کاٹتا ہوا نیچے کو جاتا تھا۔ اگر زندگی کا صحیح لطف حاصل کرنا ہو تو ایسے پہاڑی علاقہ میں سفر کرنا چاہئیے۔ کیونکہ کوہستانی فضا، آدمی کو تمام جسمانی و روحانی تکالیف سے بے پروا بنا دیتی ہے اس دن میرا دماغ ایسے تمام خیالات سے آزاد تھا جو ہماری زندگی کو بدمزہ بنا دیتے ہیں۔ میرے دل میں صرف ایک

ہی تنگ تھی۔ اور وہ پہاڑی راستہ سے نیچے اترنے لگی۔ . . . کچھ فاصلے پر مجھے مقامی عرب باشندوں کے بھورے نوکدار خیمے دکھائی دیئے۔ جو سطح زمین پر اس طرح ۔۔۔ ہوئے تھے جیسے سیپ دار مچھلیاں چٹانوں سے چمٹی ہوئی ہوں کہیں کہیں شاخوں اور پتوں سے بنی ہوئی جھونپڑیاں بھی نظر آ رہی تھیں۔ جن کی چھتوں سے دھوئیں کے سیاہ بادل اٹھ رہے تھے جا بجا سفید رنگ کے مرد اور عورتیں چر رہے تھے۔ اور مویشیوں کے گلوں میں بندھی ہوئی چھوٹی چھوٹی گھنٹیوں کی آواز شام کی پر مسرت فضا میں نہایت بھلی معلوم ہوتی تھی۔ میرے راستے پر سرخ پھلوں سے لدے ہوئے درختوں کی دو رویہ قطار بار ثمرت زمیں بوس ہو رہی تھی۔ اور پھلوں نے راستہ میں گر گر کر تمام سڑک کو ارغوانی لباس پہنا رکھا تھا۔ ہر ایک شاخ کے سرے پر سرخ رنگ کے پھل خون کے قطروں کی مانند آویزاں تھے۔ اردگرد کی تمام سطح زمین خونیں بنی ہوئی تھی۔ اور پھلوں کے روندے جانے کے باعث راستہ میں جا بجا سیاہی مائل خون کے سے نشانات قائم ہو چکے تھے۔ اکثر مرتبہ اچھل اچھل کر چلتے ہوئے میں چند پکے ہوئے پھل توڑ کر نہایت مزے سے کھانے لگتا۔ یکایک تمام وادی پر دھندلکا سا چھا گیا دور افق پر بلند پہاڑیوں کے اوپر آفتاب آہستہ آہستہ غروب ہو رہا تھا۔ سرخ اور سنہری رنگ کی بے شمار شعاعیں جن کے درمیان سے کبھی کبھی نیلگوں آسمان کا دھندلا سا عکس دکھائی دیتا۔ ہر طرف پھیلنے لگیں میں نہیں کہہ سکتا۔ کہ اس وقت میں کہاں اور کدھر

جا رہا تھا۔ ایک دائمی مسافر کی طرح بغیر کسی سوچ بچار کے میں اردگرد کی اشیا پر غائر نظر ڈالتے ہوئے چل رہا تھا۔ میں نے جس راستے کو اختیار کرنے کی تجویز کی تھی۔ خبر نہیں اب وہ کس طرف رہ گیا تھا۔ کیونکہ رات کے قریب تر ہونے کے باعث میں نے محسوس کیا۔ کہ میں راستہ بھول چکا ہوں۔ شب کی سیاہی نے سطح زمین پر سیاہ لبادہ بچھا دیا۔ مجھے اپنے سامنے پہاڑیوں کے سلسلے کے سوا کچھ دکھائی نہ دیتا تھا ایک وادی میں چند خیمے لگے دیکھ کر میں ان کے قریب گیا۔ اور سب سے پہلے جو مقامی باشندہ عرب مجھے ملا میں نے اس سے اپنی منزل کا پتہ دریافت کرنے کی کوشش کی۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اس نے میرا مطلب سمجھا ہو۔ تاہم اس نے ایسی زبان میں جس کا میں ایک لفظ بھی نہ سمجھ سکا میری بات کا خوب لمبا چوڑا جواب دیا۔ میں دل میں کہہ رہا تھا کہ اب رات بسر کرنے کے لئے اس جگہ کسی خیمے کے نزدیک پڑے رہنا چاہئے۔ یکایک اس کی باتوں میں "برج ابابا" کو ذکر سنکر میں چونک پڑا۔

"برج ابابا" میں نے دہرا کر پوچھا۔ اور اس نے جواب دیا "ہاں، ہاں"

میں نے اسے دو فرانک پیش کئے۔ جو کہ اس کیلئے ایک معقول رقم تھی۔ اور اس نے مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ رات کی تاریکی میں میں نے اس زرد رو عربی کے پیچھے چلنا شروع کیا۔ میں پتھریلی چٹانوں پر سے گرتے پڑتے گزر رہا تھا۔ مگر وہ ننگے پاؤں نہایت تیزی سے قدم اٹھائے چلا رہا تھا۔ کافی دور چلنے کے بعد اچانک ہمیں

کچھ روشنی دکھائی دی، اور چند گھنٹوں کے بعد ہم ایک چھوٹی سی قلعہ نما عمارت کے نزدیک پہنچ کر ٹھیر گئے۔ میں نے آگے بڑھ کر دروازے پر دستک دی تو اندر سے کسی کتے کے بھونکنے کی آواز آئی۔ ایک منٹ کے بعد کسی نے انگریزی آواز میں پکارا: "کون ہے؟"

"کیا مسٹر ایپل یہیں تشریف رکھتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں"

دروازہ کھلا۔ اور مسٹر ایپل منہ میں پائپ لئے ہوئے میرے سامنے آکھڑا ہوا۔ وہ ادھیڑ عمر کا ایک دراز قد اور خوش وضع آدمی تھا۔ میں نے اپنا تعارف کرانے ہوئے اندر آنے کی اجازت مانگی۔ تو اس نے خوشی سے دونوں ہاتھ پھیلاتے ہوئے میرا خیر مقدم کیا۔ اور نہایت مؤدبانہ لہجہ میں کہا:۔

"آپ شوق سے تشریف رکھئے۔ اور غریب خانہ کو اپنا ہی گھر تصور فرمائیے"

پندرہ منٹ بعد میں اپنے میزبان کے ہاں دسترخوان پر بیٹھا کھانا کھا رہا تھا۔ وہ نہایت اطمینان سے میرے سامنے بیٹھا ہوا پائپ کے لمبے لمبے کش لگانے لگا۔ مجھے اس کی زندگی کے گزشتہ حالات خوب اچھی طرح یاد تھے اپنی دولت کا کافی سے زیادہ حصہ عیاشی پر صرف کرنے کے بعد اب وہ الجیریا کے اس کوہستانی علاقہ میں سکونت اختیار کر چکا تھا۔ اس نے تھوڑی سی زمین خرید کر اس میں انگوروں کا باغ لگایا ہوا تھا۔ جس کی تجارت سے اسے معقول منافع ہو جاتا۔ اور وہ نہایت سکون و اطمینان کیساتھ ایام حیات بسر کر رہا تھا۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ پیرس کا یہ باشندہ کیونکر اس تنہا زندگی کا عادی ہو چکا تھا۔ کھانا کھا چکنے کے بعد میں نے اس سے استفسار کیا: "آپ کتنے عرصہ سے یہاں مقیم ہیں؟"

"دس سال سے" اس نے جواب دیا۔

"اور آپ نے یہاں رہ کر کبھی اداسی محسوس نہیں کی؟"

"مطلق نہیں" یہاں کی بود و باش کا عادی ہونے کے بعد آدمی اس جگہ کو پسند کرنے لگ جاتا ہے۔ یہاں رہ کر خود بخود ایک ایسا غیر فانی جذبہ محبت ہمارے دلوں میں پیدا ہو جاتا ہے۔ جس کا شروع میں ہمیں مطلق احساس نہیں ہوتا۔ شروع شروع میں اس جگہ کے قدرتی مناظر ہمارے احساسات پر قابو پا لیتے ہیں۔ پھر یہاں کی پرکیف ہوا، قدرتی چشموں کا صاف و شیریں پانی، طلوع و غروب آفتاب کے دلکش منظر ہمیں اپنا گرویدہ بنا لیتے ہیں۔ اور جب یہاں کی آب و ہوا تندرستی ہمیں موافق آجاتی ہے۔ تو یہاں کی سکونت سے ہماری روحوں کو حقیقی مسرت حاصل ہوتی ہے"

"اور یہاں کی عورتیں؟" میں نے پوچھا۔

"او ہو! وہ تنہائی کو بہت کم پسند کرتی ہیں۔ کیونکہ یہاں مقامی صحرا نورد و دیگر عربی قبائل میں ایسے لوگ بکثرت موجود ہیں۔ جو مغربی تہذیب کی تقلید کے از حد شیدائی ہیں"

اتنا کہکر ایم۔ ایپل ایک دراز قد و سیاہ رنگ عربی

خادم سے جس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں اس کی دستار کے نیچے چمک رہی تھیں اور جو قریب ہی خدمت کے لئے کھڑا تھا، مخاطب ہوا۔ "محمود تم اب جاؤ بوقت ضرورت میں تمہیں خود آواز دونگا۔"

محمود کے چلے جانے پر اس نے کہنا شروع کیا "یہ فرانسیسی زبان خوب سمجھتا ہے۔ اور میں تمہیں ایک ایسا دلچسپ قصہ سنانا چاہتا ہوں۔ جس میں اس کی شخصیت کو بہت حد تک دخل ہے۔ مجھے یہاں آئے ہوئے چھ سال گزر چکے تھے۔ ور یہاں کی قدر۔ یہاں کی زبان بھی سمجھ چکا تھا مگر ابھی تک میں اس ملک سے پورے طور پر مانوس نہیں ہوا تھا کئی کئی دنوں تک میں دل بہلانے کے لئے دارالسلطنت میں چلا جاتا۔ شکستہ سا قلعہ نما مکان جو برج ابابا کہلاتا ہے۔ میں نے اپنی رہائش کے لئے لے لیا۔ ور کاشت وغیرہ کے لئے تھوڑی سی زمین بھی خرید لی۔ مقامی قبائل سے اکثر جنہیں میں بطور مزدور کام پر لگاتا ہوں قریب ہی اپنے خیمے میں رہتے ہیں میرا نوکر محمود تو دراز قد اور مضبوط ہونے کے علاوہ ایک اچھے قبیلے کا نوجوان ہے۔ اور جو ابھی یہاں سے اس کھڑا تھا۔ بہت جلد مجھ سے مانوس ہو گیا۔ میں نے اسے اپنی ذاتی خدمات پر مامور کیا اور وہ نہایت فرمانبرداری سے میری خدمت کرنے لگا۔ چونکہ وہ مکان میں رہنے کا عادی نہیں اس لئے قریب ہی میدان میں اس نے اپنا خیمہ نصب کیا ہوا ہے۔ تاکہ بوقت ضرورت میں اسے بآسانی بلا سکوں میری زندگی نہایت سادہ و بے تکلف تھی۔ تمام دن میں پودوں کی کاشت وغیرہ کی نگرانی کرتا اکثر دفعہ شکار بھی کھیلتا، اور عموماً قریب ترین مقامات پر مختلف افسروں کے ہاں دعوتوں پر چلا جاتا۔ اور کبھی کبھی میں بھی ان کو مدعو کر لیتا تفریحات کی نسبت کچھ کہنا لاحاصل ہے۔ کیونکہ آپ جانتے ہی ہوں گے کہ الجیریا میں تعیش پرستی کے بہترین مشاغل مہیا ہو سکتے ہیں۔

ایک شام موسم گرما کے آغاز میں میں کھیتوں کو دیکھ کر واپس آ رہا تھا کہ مجھے کسی کام کے لئے محمود کی ضرورت پڑی اور جیسا کہ میں اکثر کیا کرتا تھا بغیر آواز دیئے اس کے خیمے میں داخل ہو گیا۔ سرخ رنگ کے ایک بڑے نرم، اونی قالین پر ایک خوبصورت دوشیزہ دونوں بازوؤں کو سینے پر رکھے ہوئے نیم عریاں حالت میں محو خواب تھی۔ سورج کی دھندلی سی روشنی میں جو دروازے کے راستے اندر داخل ہو رہی تھی اس کا سفید جسم نہایت حسین معلوم ہوتا تھا۔ ایسی خوبصورت عورت میں نے پیشتر ازیں ہرگز نہ دیکھی تھی آپ کو پتہ ہوگا کہ اس علاقہ کی عورتیں غیر معمولی طور پر خوبصورت اور دراز قد ہوتی ہیں۔ اور ان کے چہرے کے خد و خال نہایت دلآویز ہوتے ہیں میں قدرے متعجب ہو کر خیمے سے باہر نکلا۔ اور دروازے پر پردہ گرا کر اپنے مکان پر چلا آیا۔ آپ جانتے ہیں کہ میرے لئے صنف نازک کتنی جاذبیت رکھتی ہے۔ اس مجسمہ شعر و شباب نے اپنی برق جمال سے میرے خرمن دل میں آگ لگا دی اور میرے خون میں پھر وہی سابقہ حرارت پیدا کر دی جس کی بدولت میں فرانس کو خیر باد کہنے پر مجبور ہوا تھا۔ آہ! وہ شام کتنی دلکش و خوشگوار تھی۔ تمام رات میں انتہائی بے چینی سے کھڑکی میں کھڑا رہا۔ اور محمود کے خیمے کو جو ایک سیاہ سایہ کی مانند زمین پر نصب تھا

متمول طبقہ اور جماعت عاملہ کی آویزش

جس رفتار سے تہذیب و تمدن ترقی کر رہے ہیں وہ ہر شخص جانتا ہے۔ پرانی تعمیرات گر رہی ہیں۔ اور اس کی جگہ نئے محلات کھڑے کئے جا رہے ہیں۔ سائنس نے وہ باتیں ممکن کر دکھائی ہیں۔ جو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتی تھیں۔ لاسلکی، سینما، ٹیلیگراف، ٹیلی وژن اور دیگر ایجادات نے ہمارے اجتماعی نظام میں انقلاب عظیم برپا کر دیا ہے لیکن ان تمام عیش و عشرت کے سامانوں کے باوجود ہم دیکھتے ہیں۔ کہ بجائے ان کے خریدنے کے انسان خود ان کے آگے بک رہا ہے۔ بجائے سامان کو مالک بننے کے وہ خود اس کے ہاتھوں غلام بن رہا ہے۔ دوسرے الفاظ میں "دنیا مشین" میں ایک پرزہ بنکر رہ گیا ہے۔ وہ روئی اور کھلی کی طرح ایک جنس بن گیا ہے جو بازار میں خریدی اور فروخت کی جاسکتی ہے

یہ تمام نتائج کیوں ظہور میں آئے؟

اس لئے کہ دنیا کا معاشی نظام، انقلاب پذیر حالات کے دوش بدوش نہیں چل سکا۔

آجکل کے معاشی نظام نے اکثر لوگوں کے لئے ترقی کا میدان محدود کر دیا ہے۔ اور اس وجہ سے ایک ایسی حالت پیدا ہو گئی ہے۔ جو موجودہ نظام کے خلاف ہے۔ یا بالفاظ دیگر یہ کہ سوسائٹی، دو فریق میں بٹ چکی ہے۔ ایک سرمایہ داروں کی جماعت۔ اور دوسری مزدوروں کی جماعت۔

اول الذکر کے لئے تو اتنے مواقع میسر ہیں کہ وہ اگر نہ بھی کام کرے۔ تو بھی اس کے لئے دولت و امارت کا کوئی ٹھکانہ نہیں۔ لیکن دوسری طرف جماعت عاملہ نان شبینہ کے لئے محتاج ہے

غریبوں کے بچے باوجود اس کے کہ وہ ہماری آبادی کا اسی فیصدی ہیں ترقی نہیں کر سکتے۔ کیونکہ ان کے پاس تعلیم حاصل کرنے کیلئے پیسہ نہیں ہے۔

کسی شخص نے امریکہ کے متعلق لکھا تھا۔ کہ ایک طرف تو وہاں سرمایہ داروں کے مکانوں سے صبح کے وقت دودھ کی کڑاہیاں گرائی جا رہی ہوتی ہیں، کیونکہ وہ رات کے وقت بچ رہا تھا اور دوسری طرف اسی مکان کے نیچے ایک بدرو کے پاس برف باری کے زمانہ میں ایک معصوم بچہ بھوک کے مارے بلک رہا ہوتا ہے کیونکہ اس کا کوئی پرسان حال نہیں۔!

یہ منظر ہندوستان کے چپے چپے پر دکھائی دے رہا ہے۔ ٹھیک اسی وقت جب کہ تہذیب موٹروں اور گاڑیوں میں، شہر کی خوشنما سڑکوں پر اور تھیٹر ہالوں میں عیش و عشرت کے ترانے گا رہی ہوتی ہے، ایک فاقوں کا مارا ہوا، اور برسوں سے بیکار، نوجوان فراٹے بھرتی ہوئی گاڑی کے نیچے، یا دشتی گیت

... گاتی ہوئی ندی کے پل پر خودکشی کے لئے آمادہ نظر آتا ہے!

ایک طرف امارت کا یہ حال ہے۔ کہ بھاؤ بڑھانے کی خاطر امراء اپنی گیہوں کی بوریاں نذرِ آتش کر رہے ہوتے ہیں۔ یا آسٹریلیا کے سرمایہ دار رسد کو مطالبہ کے برابر کرنے کے لئے اُون کی گٹھڑیاں دریا برد کر رہے ہوتے ہیں۔ اور دوسری طرف غربت کا یہ حال ہے۔ کہ اکثر فاقہ مست ہندوستانی اس انتظار میں رہتے ہیں۔ کہ گیہوں کے آٹے کا ایک لقمہ کبھی ان کے نصیب میں آئے۔ اور ہندوستان کے بہت سے ننگے اسی تمنا میں فوت ہو جاتے ہیں۔ کہ کاش اون کیا روئی کا ہی ایک کپڑا ان کے سرد جسموں کو حرارت پہنچا سکتا!

آجکل شخصی خصائص ترقی کے ضامن نہیں ہیں، اور نہ لیاقت بامِ رفعت تک پہنچنے کا زینہ ہے آج کل تو دولت کام کرتی ہے۔ دولت ——— روپیہ پیسہ اور نقدی!!

سرمایہ داروں اور مزدوروں کے درمیان یہی چیز بُعد اور تفاوت کا باعث بنی ہے اور یہی چیز سبب ان کی باہمی آویزش کی اور یہی چیز ہے۔ جو آج کل مختلف ملکوں میں سرمایہ دار حکومتوں کا تختہ الٹ رہی ہے۔ یہی چیز ہے جس نے ہسپانیہ کی حکومت کو ازسرِ نو استوار کیا۔

اور جو ہندوستان کو آمادہ پیکار کر رہی ہے۔ کیا اس مرض کا کوئی علاج ہے؟

ظاہر ہے۔ کہ جب تک امراء اور غرباء یعنی دونوں جماعتوں کو یکساں مواقع میسر نہ آئیں گے۔ دنیا میں امن کا قیام ایک پریشان کن خواب ہے۔ اور اس کے لئے سرمایہ داری کا نظام سرتاسر تبدیل کرنا ہوگا۔ ایک عامی کا معیارِ زندگی بڑھا دینا چاہئے۔ تاکہ وہ بھی عصرِ جدید کی لذتوں سے بہرہ ور ہو سکے۔ ایک قلیل ترین معیار مقرر ہونا چاہئے۔ جس میں ایک تہذیب یافتہ انسان کی جملہ ضروریات پوری کی جا سکیں۔ اور وہ سب کیلئے یکساں ہو .....؟

جب لوگ دال روٹی کے بارے میں بےفکر ہو جائیں گے۔ تو وہ ملک و ملت کی بھی اچھی طرح سے خدمت سرانجام دے سکیں گے۔

اس جماعتی عصبیت کی اصل بنیاد معاشی حالت ہے۔ اور ظاہر ہے۔ کہ جب تک معاشی ذرائع استعمال نہ کئے جائیں گے۔ اس مسئلہ کو حل کرنا دشوار ہوگا۔ آرڈیننس جاری کرنے یا سیاسی طور پر مزدور جماعت کی تحریکات کو دبا دینے سے یہ مسئلہ حل نہیں ہوگا۔

عبدالرحیم شبلی۔ بی۔ کام

اطلاع:۔ خریدار حضرات خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیا کریں تاکہ تعمیل ارشاد میں ہمیں سہولت ہو جائے۔ (مینجر)

سحر حلال

مٹ کے میں نے تجھکو عالم میں نمایاں کر دیا
زندگی کی شمع گل کر کے چراغاں کر دیا

نذرِ وحشت دل کے اجزا نے پریشاں کر دیا
میں نے ان ذروں کو گم کر کے بیاباں کر دیا

قرب و دوری رکھ دیئے سر مارنے کے واسطے
عاشقی کو بے نیازِ وصل و ہجراں کر دیا

لب پہ موجیں ہیں تبسم کی سکوتِ عشق پر
اس کلی کو میں نے بے چھیڑے گلستاں کر دیا

وائے اے دستِ جنوں شائستگیٔ چاک کو
صرفِ داماں کر دیا وقفِ گریباں کر دیا

زندگی تھی عشق کی بس اک نگاہِ آشنا
اس کو بھی نذرِ تغافلہائے پنہاں کر دیا

اس حجابِ ناز نے رنگینیوں میں ڈوب کر
دیکھ حسنِ شرمگیں کو اور عریاں کر دیا

رنگ و بو والو کچھ اس کا درد بھی تم پر کھلا
جس تبسم نے گلستاں کو گلستاں کر دیا

حسنِ خود افزوں نگاہِ شوق کی حیرانیاں
یونہی کیا کم تھیں کہ تو نے اور حیراں کر دیا

شوخیوں نے اسطرح چھیڑا کہ حسنِ یار کو
سر بسر برقِ تبسم ہائے پنہاں کر دیا

چھیڑ تھی جن کی نہ تھی حسنِ حیا پرور کو بھی
ان نگاہوں کو بھی پیوستِ رگِ جاں کر دیا

کون جانے عقدۂ ہستی نگاہِ دوست نے
اور مشکل کر دیا یا اور آساں کر دیا

اس سکوتِ ناز کی ہنگامہ آرائی نہ پوچھ
دل سی عزلت گاہ جس نے محشرستاں کر دیا

ایک مشتِ خاک کو افتادگیٔ عشق نے
کچھ سہارا اور دردِ دل کا دے کے انساں کر دیا

روح افزا تھی نگاہِ ناز کی نشتر زنی
اس طرح چھیڑا کہ رگ رگ کو رگِ جاں کر دیا

عشق کی رسوائیوں نے غفلتوں نے حسن کی
مجھ کو پنہاں کر دیا تجھ کو نمایاں کر دیا

عقل نے صحرا میں کچھ دیکھا نہ ذروں کے سوا
اور جنوں نے ذرہ ذرہ کو بیاباں کر دیا

عشق پر ہر طرح کا وہ زور وہ دعویٰ کیا ہوا
جس نے ہر اک جور کو جورِ پشیماں کر دیا

شوخیٔ پرسش کو بھی صرفِ تغافل کیوں کیا
جورِ پنہاں کو بھی کیوں جورِ نمایاں کر دیا

عشق کو آیا ہے دینے حسن درسِ نیستی
بارہا شیرازۂ عالم پریشاں کر دیا

سوزِ پنہاں کا اشارہ پاتے ہی دل نے فراق
دہر کو دودِ چراغِ شامِ ہجراں کر دیا

پروفیسر فراق ایم اے۔ گورکھپوری

افسانہ:۔

دوشیزۂ صحرا

(فرانسیسی فسانہ نگار موپساں کا ایک شاہکار)

(۱)

مجھے ایک دوست نے بتایا تھا، کہ الجیریا میں سفر کرتے ہوئے، اگر مجھے "برج ابابا" کے قریب سے گزرنے کا موقع ملے۔ تو میں ایبل نامی ۔۔۔ اس کے ایک رشتہ دار سے، جو کئی سالوں سے وہاں مقیم ہے، ضرور ملوں۔ ایبل اور اس کی جائے رہائش کا نام، دونوں میری یادسے محو ہوچکے تھے۔ کہ اچانک مجھے اس اجنبی سے دوچار ہونا پڑا۔ قریباً ایک ماہ تک میں افریقہ کے اس عظیم الشان خطہ میں پاپیادہ سفر کرتا رہا۔ اس کوہستانی علاقہ میں آبادی بہت کم ہے۔ اور سینکڑوں میل تک جنگلات ہی جنگلات دکھائی دیتے ہیں۔ بعض مقامات پر سربفلک پہاڑیوں کے درمیان صنوبر کے درختوں سے گھری ہوئی خوشنما وادیاں بھی پائی جاتی ہیں۔ جہاں سرد ہوا کے خوشگوار جھونکے قدرتی چشموں کے صاف وشفاف پانی کی آواز کے ساتھ ملکر نغمہ کی صورت اختیار کرلیتے ہیں چٹانوں کے درمیان، دہشتناک غاروں کے علاوہ پتھروں سے ٹکراتی ہوئی بر بانی ندیاں جن کے کناروں پر پہاڑی خود رو پھولوں نے عجیب بہار پیدا کردی ہے۔ پورے جوش وخروش سے بہ رہی ہیں۔ اور ان کے عبور کرنے کیلئے جابجا مقامی باشندوں نے گرے ہوئے درخت ڈال کر گذرگاہیں بنا رکھی ہیں میرا غرضیکہ پیدل سفر زیادہ فرحت بخش ہوتا تھا۔ کیونکہ مجھے ناہموار چٹانوں پر سے ہوتے ان راستوں پر سے گزرنا پڑتا تھا۔ جنکے دونوں جانب گنجان اور سایہ دار درخت بکثرت موجود ہوتے۔ اس کوہستانی بلندی سے زمین کا وہ تمام پتھریلا اور ناہموار حصہ صاف نظر آتا۔ جو دور سمندر کے ساحل سے جاملتا ہے

جس دن کا میں ذکر کر رہا ہوں۔ میں اپنا راستہ کھو چکا تھا۔ ایک بلند چوٹی پر پہنچکر مجھے چند پہاڑیوں کے عقب میں ایک وسیع میدان دکھائی دیا۔ میں نے جنوب کی سمت نیچے اترنا شروع کیا میرے سامنے دور تک ٹوٹی پھوٹی چٹانوں کا ناہموار سلسلہ پھیلا ہوا تھا جس کی ایک طرف بڑے بڑے پہاڑ آسمان سے باتیں کرتے ہوئے کھڑے تھے۔ جابجا زرد رنگ کی چٹانیں کسی شتر کی کوہان کی مانند ابھری ہوئی نظر آتی تھیں۔ میں بہ مسرت وسرعت اس پہاڑی راستہ پر چلنے لگا۔ جو کئی ایک چکر کاٹتا ہوا نیچے کو جاتا تھا۔ اگر زندگی کا صحیح لطف حاصل کرنا ہوتو، ایسے پہاڑی علاقہ میں سفر کرنا چاہیئے۔ کیونکہ کوہستانی فضا، آدمی کو تمام جسمانی وروحانی تکالیف سے بے پروا بنا دیتی ہے اس دن میرا دماغ ایسے تمام خیالات سے آزاد تھا۔ جو ہماری زندگی کو بدمزہ بنا دیتے ہیں۔ میرے دل میں صرف ایک

آس امنگ تھی۔ اور وہ پہاڑی راستہ سے نیچے اترنے کی۔

کچھ فاصلے پر مجھے مقامی عرب باشندوں کے جھونپڑے دکھائی دیئے جو سطح زمین پر اس طرح ایستادہ تھے جیسے سیپ و مچھلیاں چٹانوں سے چمٹی ہوئی ہوں کہیں کہیں شاخوں اور پتوں سے بنی ہوئی جھونپڑیاں بھی نظر آ رہی تھیں۔ جن کی چھتوں سے دھوئیں کے سیاہ بادل اٹھ رہے تھے۔ جا بجا سفید رنگ کے مرد اور عورتیں پھر رہے تھے۔ اور مویشیوں کے گلوں میں بندھی ہوئی چھوٹی چھوٹی گھنٹیوں کی آواز شام کی پرمسرت فضا میں نہایت بھلی معلوم ہوتی تھی۔ میرے راستے پر سرخ پھلوں سے لدے ہوئے درختوں کی وجہ سے یہ قطعہ بار ثمرت زمین بوس ہو رہی تھی۔ اور پھلوں نے راستہ میں گر گر کر تمام سڑک کو ارغوانی لباس پہنا رکھا تھا۔ ہر ایک شاخ کے سرے پر سرخ رنگ کے پھل خون کے قطروں کی مانند آویزاں تھے۔ اردگرد کی تمام سطح زمین خونیں بنی ہوئی تھی۔ اور پھلوں کے روندے جانے کے باعث راستہ میں جا بجا سیاہی مائل خون کے سے نشانات قائم ہو چکے تھے۔ اکثر مرتبہ اچھل اچھل کر چلتے ہوئے میں چند پکے ہوئے پھل توڑ کر نہایت مزے سے کھانے لگتا۔ یکایک تمام وادی پر دھندلکا سا چھا گیا دور افق پر بلند پہاڑیوں کے اوپر آفتاب آہستہ آہستہ غروب ہو رہا تھا۔ سرخ اور سنہری رنگ کی بے شمار شعاعیں جن کے درمیان سے کبھی کبھی نیلگوں آسمان کا دھندلا سا عکس دکھائی دیتا۔ ہر طرف پھیلنے لگیں میں نہیں کہہ سکتا۔ کہ اس وقت میں کہاں اور کدھر جا رہا تھا۔ ایک دائمی مسافر کی طرح بغیر کسی سوچ بچار کے میں اردگرد کی اشیا پر غائر نظر ڈالتے ہوئے چل رہا تھا میں نے جس راستہ کو اختیار کرنے کی تجویز کی تھی۔ خبر نہیں اب وہ کس طرف رہ گیا تھا۔ کیونکہ رات کے قریب تر ہونے کے باعث میں نے محسوس کیا۔ کہ میں راستہ بھول چکا ہوں۔ شب کی سیاہی نے سطح زمین پر سیاہ لبادہ بچھا دیا۔ مجھے اپنے سامنے پہاڑیوں کے سلسلہ کے سوا کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ ایک وادی میں چند خیمے لگے دیکھ کر میں ان کے قریب گیا۔ اور سب سے پہلے جو مقامی باشندہ عرب مجھے ملا میں نے اس سے اپنی منزل کا پتہ دریافت کرنے کی کوشش کی میں نہیں کہہ سکتا کہ اس نے میرا مطلب سمجھا ہو تاہم اس نے ایسی زبان میں جس کا میں ایک لفظ بھی نہ سمجھ سکا میری بات کا خوب لمبا چوڑا جواب دیا۔ میں دل میں کہہ رہا تھا کہ اب رات بسر کرنے کے لئے اس جگہ کسی خیمے کے نزدیک پڑے رہنا چاہئے۔ یکایک اس کی باتوں میں "برج ابابا" کا لفظ سنکر میں چونک پڑا۔

"برج ابابا" میں نے دہرا کر پوچھا۔ اور اس نے جواب دیا "ہاں ہاں"

میں نے اسے دو فرانک پیش کئے۔ جو کہ اس کیلئے ایک معقول رقم تھی۔ اور اس نے مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ رات کی تاریکی میں میں نے اس زرد رو عربی کے پیچھے چلنا شروع کیا۔ میں پتھریلی چٹانوں پر سے گرتے پڑتے گزر رہا تھا۔ مگر وہ ننگے پاؤں نہایت تیزی سے قدم اٹھائے چل رہا تھا۔ کافی دور چلنے کے بعد اچانک ہمیں

کچھ روشنی دکھائی دی۔ اور چند گھنٹوں کے بعد ہم ایک چھوٹی سی قلعہ نما عمارت کے نزدیک پہنچ کر ٹھیر گئے۔ میں نے آگے بڑھ کر دروازے پر دستک دی۔ تو اندر سے کسی کتے کے بھونکنے کی آواز آئی۔ ایک منٹ کے بعد کسی نے فرانسیسی آواز میں پکارا "کون ہے"؟

"کیا مسٹر ایبل یہیں تشریف رکھتے ہیں" میں نے پوچھا۔

"ہاں"

دروازہ کھلا۔ اور مسٹر ایبل منہ میں پائپ لئے ہوئے میرے سامنے آکھڑا ہوا۔ وہ ادھیڑ عمر کا ایک دراز قد اور خوش وضع آدمی تھا۔ میں نے اپنا تعارف کراتے ہوئے اندر آنے کی اجازت مانگی۔ تو اس نے خوشی سے دونوں ہاتھ پھیلاتے ہوئے میرا خیر مقدم کیا۔ اور نہایت مودبانہ لہجہ میں کہا۔

"آپ شوق سے تشریف رکھئے۔ اور غریب خانہ کو اپنا ہی گھر تصور فرمائیے"

پندرہ منٹ بعد میں اپنے میزبان کے ہاں دسترخوان پر بیٹھا کھانا کھا رہا تھا۔ وہ نہایت اطمینان سے میرے سامنے بیٹھا ہوا پائپ کے لمبے لمبے کش لگانے لگا۔ مجھے اس کی زندگی کے گزشتہ حالات خوب اچھی طرح یاد تھے اپنی دولت کا کافی سے زیادہ حصہ عیاشی پر صرف کرنے کے بعد اب وہ الجیریا کے اس کوہستانی علاقہ میں سکونت اختیار کر چکا تھا۔ اس نے تھوڑی سی زمین خرید کر اس میں انگوروں کا باغ لگایا ہوا تھا۔ جس کی تجارت سے اسے معقول منافع ہو جاتا۔ اور وہ نہایت سکون و اطمینان کیساتھ ایام حیات بسر کر رہا تھا۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ پیرس کا یہ باشندہ کیونکر اس تنہا زندگی کا عادی ہو چکا تھا۔ کھانا کھا چکنے کے بعد میں نے اس سے استفسار کیا: "آپ کتنے عرصہ سے یہاں مقیم ہیں؟"

"۲۵ سال سے" اس نے جواب دیا۔

"اور آپ نے یہاں رہ کر کبھی بھی اداسی محسوس نہیں کی؟"

"مطلق نہیں" یہاں کی بود و باش کا عادی ہونے کے بعد آدمی اس جگہ کو پسند کرنے لگ جاتا ہے۔ یہاں رہ کر خود بخود ایک ایسا عرفانی جذبہ محبت ہمارے دلوں میں پیدا ہو جاتا ہے۔ جس کا شروع میں ہمیں مطلق احساس نہیں ہوتا۔ شروع شروع میں اس جگہ کے قدرتی مناظر ہمارے احساسات پر قابو پا لیتے ہیں۔ پھر یہاں کی پرکیف ہوا، قدرتی چشموں کا صاف و شیریں پانی، طلوع و غروب آفتاب کے دلکش منظر ہمیں اپنا گرویدہ بنا لیتے ہیں۔ اور جب یہاں کی آب و ہوا بتدریج ہمیں موافق آجاتی ہے۔ تو یہاں کی سکونت سے ہماری روحوں کو حقیقی مسرت حاصل ہوتی ہے"

"اور یہیں کی عورتیں؟" میں نے پوچھا۔

"اوہو! وہ تنہائی کو بہت کم پسند کرتی ہیں۔ کیونکہ یہاں مقامی صحرا نورد و دیگر عربی قبائل میں ایسے لوگ بکثرت موجود ہیں۔ جو مغربی تہذیب کی تقلید کے از حد شیدائی ہیں"

اتنا کہکر ایم۔ ایبل ایک دراز قد و سیاہ رنگ عربی

خادم سے جس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں اس کی دستار کے نیچے چمک رہی تھیں اور جو قریب ہی خدمت کے لئے کھڑا تھا، مخاطب ہوا "محمود! تم اب جاؤ۔ بوقت ضرورت میں تمہیں خود آواز دونگا۔"

محمود کے چلے جانے پر اس نے کہنا شروع کیا "یہ فرانسیسی زبان خوب سمجھتا ہے۔ اور میں تمہیں ایک ایسا دلچسپ قصہ سنانا چاہتا ہوں۔ جس میں اس کی شخصیت کو بہت حد تک دخل ہے۔ مجھے یہاں آئے ہوئے چار سال گزر چکے تھے اور میں کسی قدر یہاں کی زبان بھی سمجھ چکا تھا۔ مگر ابھی تک میں اس ملک سے پورے طور پر مانوس نہیں ہوا تھا۔ کئی کئی دنوں تک میں دل بہلانے کے لئے دارالسلطنت میں چلا جاتا۔ یہ ٹیکسٹ سا قلعہ نما مکان جو یہاں آپ دیکھ رہے ہیں میں نے اپنی رہائش کے لئے لے لیا۔ اور کاشت وغیرہ کے لئے تھوڑی سی زمین بھی خرید لی مقامی قبائل کے اکثر دہقان بطور مزدور کام پر لگاتا ہوں قریب ہی اپنے خیمے میں رہتے ہیں۔ یہ نوکر محمود جو دراز قد اور مضبوط ہونے کے علاوہ ایک اچھے قبیلے کا نوجوان ہے۔ اور جو ابھی ہمارے پاس کھڑا تھا۔ بہت جلد مجھ سے مانوس ہو گیا۔ میں نے اسے اپنی ذاتی خدمات پر مامور کیا اور وہ نہایت فرمانبرداری سے میری خدمت کرنے لگا۔ چونکہ وہ مکان میں رہنے کا عادی نہیں اس لئے قریب ہی میدان میں اس نے اپنا خیمہ نصب کیا ہوا ہے تاکہ بوقت ضرورت میں اسے آسانی سے بلا سکوں میری زندگی نہایت سادہ و بے تکلف تھی۔ تمام دن پودوں کی کاشت وغیرہ کی نگرانی کرتا اکثر دفعہ شکار بھی کھیلتا۔ اور عموماً قریب ترین مقامات پر مختلف افسروں کے ہاں دعوتوں پر چلا جاتا۔ اور کبھی کبھی میں بھی ان کو مدعو کر لیتا۔ عورتوں کی نسبت کچھ کہنا لاحاصل ہے۔ کیونکہ آپ جانتے ہی ہوں گے کہ الجیریا میں تعیش پرستی کے بہترین مشاغل مہیا ہو سکتے ہیں۔

ایک شام موسم گرما کے آغاز میں میں کھیتوں کو دیکھ کر واپس آ رہا تھا کہ مجھے کسی کام کے لئے محمود کی ضرورت پڑی اور جیسا کہ میں اکثر کیا کرتا تھا بغیر آواز دیے اس کے خیمے میں داخل ہو لیا۔ سرخ رنگ کے ایک بڑے نرم اونی قالین پر ایک خوبصورت دوشیزہ دونوں بازوؤں کو سینے پر رکھے ہوئے نیم عریاں حالت میں محو خواب تھی۔ سورج کی دھندلی سی روشنی میں جو دروازے کے راستے اندر داخل ہو رہی تھی اس کا سفید جسم نہایت حسین معلوم ہوتا تھا۔ ایسی خوبصورت عورت میں نے پیشتر نہیں ہرگز نہ دیکھی تھی۔ آپ کو پتہ ہوگا کہ اس علاقہ کی عورتیں غیر معمولی طور پر خوبصورت اور دراز قد ہوتی ہیں اور ان کے چہرے کے خدوخال نہایت دلآویز ہوتے ہیں۔ میں قدرے متعجب ہو کر خیمے سے باہر نکلا۔ اور دروازے پر پردہ گرا کر اپنے مکان پر چلا آیا۔ آپ جانتے ہیں کہ میرے لئے صنف نازک کتنی جاذبیت رکھتی ہے۔ اس مجسمہ شعر و شباب نے اپنی برق جمال سے میرے خرمن دل میں آگ لگا دی اور میرے خون میں پھر وہی سابقہ حرارت پیدا کر دی جس کی بدولت میں فرانس کو خیرباد کہنے پر مجبور ہوا تھا۔ آہ! وہ شام کتنی دلکش و خوشگوار تھی۔ تمام رات میں انتہائی بے چینی سے کھڑکی میں کھڑا رہا۔ اور محمود کے خیمے کو جو ایک سیاہ سایہ کی مانند زمین پر نصب تھا

دیکھتا رہا۔

"دوسری صبح جب محمود میرے کمرے میں داخل ہوا تو میں نے اس کے چہرے پر خوب نظر جما کر دیکھا۔ اس نے ندامت سے کسی مجرم کی طرح سر جھکا لیا۔ شاید اسے اس بات کا احساس ہو گیا تھا، کہ میں اس کے راز سے واقف ہو گیا ہوں۔ میں نے قدرے تندی سے پوچھا "محمود! شاید تم نے شادی کر لی ہے"

اس کے چہرے کا رنگ سرخ ہو گیا۔ اور وہ جھجکتے ہوئے بولا، "نہیں جناب! میں نے اسے فرانسیسی زبان سکھائی تھی اور اس کے عوض وہ مجھے عربی زبان سکھا چکا تھا"

"تو پھر تمہارے خیمے میں کسی خوبصورت دوشیزہ کا موجود ہونا کیا معنی رکھتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"حضور وہ ایک نووارد ہے۔ جو جنوبی حصے سے آئی ہے" اس نے کہا۔

"خوب! لیکن تمہارے خیمے میں اس کا کیا کام؟"

"میرے سوالوں کا جواب دیئے بغیر اس نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "وہ نہایت خوبصورت ہے۔"

"بے شک! وہ نہایت خوبصورت ہے۔ مگر یاد رکھو کہ دوسری مرتبہ جب کوئی خوبصورت عورت جنوبی حصہ سے آ کر تمہارے ہاں ٹھہرے، تو بجائے اپنے خیمے میں رکھنے کے اسے میرے کمرے میں بھیج دینا۔ سمجھے محمود!"

"ہاں جناب!" اس نے نہایت سرگرمی سے جواب دیا۔

"سارا دن اس عربی دوشیزہ کی یاد میرے خیالات پر حاوی رہی۔ آہ! وہ حسین و جمیل عورت کتنے دلکش انداز سے، نیم عریاں حالت میں سرخ قالین پر محوِ خواب تھی! تمام دن وہ دلفریب منظر میرے پیشِ نظر رہا۔ اور کئی مرتبہ میں نے دوبارہ محمود کے خیمے میں جانے کا ارادہ کیا۔ تاکہ اس پیکرِ شباب کو جی بھر کر دیکھ سکوں۔ شام کے وقت محمود حسبِ معمول میری خدمت میں حاضر رہا۔ وہ نہایت خاموش و بے حس معلوم ہوتا تھا، میں نے اس سے پوچھنا چاہا، کہ وہ اس نازک اندام دوشیزہ کو کتنا عرصہ اپنے ہاں ٹھہرانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ مگر جرأت نہ کر سکا۔ رات کے نو بجے کے قریب، جبکہ میری روح ابھی تک اس سحرِ نسوانی سے متاثر تھی میں ہواخوری کے لئے مکان سے باہر نکلا۔ محمود کے خیمے سے شمع کی روشنی چھن چھن کر باہر نکل رہی تھی۔ چند قدم میں اس کے خیمے کی طرف گیا۔ مگر پھر اس خیال سے کہ کہیں محمود اس وقت مجھے اپنے خیمے کے نزدیک پھرتا ہوا نہ دیکھ لے۔ میں دور نکل گیا۔

قریباً ایک گھنٹہ بعد میں سیر سے واپس لوٹا۔ مکان میں میرے علاوہ ایک خانساماں دو فرانسیسی مزدور اور ایک بوڑھا باورچی، جسے میں الجیریا سے لایا تھا، سویا کرتے تھے۔ مکان پر آتے ہی میں سیدھا بالاخانے پر چڑھ گیا۔ جو کمرہ میری خوابگاہ کے لئے مخصوص تھا۔ اگرچہ اس کا دروازہ بند تھا۔ تاہم روشنی کی ایک شعاع دروازے کے نیچے سے باہر نکل رہی تھی۔ مجھے یہ دیکھ کر سخت تعجب ہوا۔ میں نے دروازہ کھولا۔ وہی کافرادا حسینہ ایک مجسمہ کی مانند کرسی پر بیٹھی ہوئی میرا انتظار کر رہی تھی۔ قریب ہی میز پر شمع جل رہی تھی۔ اس کی کلائی اور گلے میں چاندی کے چند خوبصورت زیورات جو جنوبی ملک کی عورتیں پہنا کرتی ہیں نہایت بھلے معلوم ہوتے تھے۔ اس کی پیشانی پر سیاہ رنگ کا ایک بڑا سا تل تھا۔ جو اس کی خوبصورتی کو

دو بالا کر رہا تھا۔ وہ اپنی شرمگیں آنکھوں سے مجھے گھور گھور کر دیکھ رہی تھی۔ اور سرخ رنگ کا ایک ریشمی جبّہ اس کے شانوں پر ستے ہوتا ہوا، تمام جسم کو ڈھانپے ہوئے تھا۔

"میرے اندر داخل ہوتے ہی وہ عجیب منکسرانہ انداز میں کرسی سے اٹھکر میرے مقابل کھڑی ہو گئی"

"تم یہاں کیا کر رہی ہو؟" میں نے عربی زبان میں پوچھا

"مجھے محمود نے یہاں آنے کو کہا تھا" اس نے جواب دیا۔

"بہت خوب۔ بیٹھ جاؤ!"

وہ نظریں نیچی کئے ہوئے بڑے آرام سے کرسی پر بیٹھ گئی اور میں اس کے سامنے کھڑا ہو کر بڑے غور سے دیکھتا رہا۔ اس کا چہرہ انتہائی طور پر دلکش تھا کتنے متناسب، معصوم، اور دلآویز خدوخال تھے۔ اگرچہ اس کے دست و بازو بالکل سفید تھے۔ تاہم اس کے موٹے ہونٹ جن پر خون کی سی سرخی تھی یہ ثابت کرتے تھے۔ کہ اس کی رگوں میں قدرے حبشی خون ملا ہوا ہے۔ میرا اضطراب لحظہ بہ لحظہ بڑھ رہا تھا۔ اور میں نہیں سمجھ سکتا تھا۔ کہ پریشانی کی حالت میں کیا جائے ....وقت کی نزاکت کو ذہن نشین کرنے، اور حالات پر قابو پانے کے لئے میں نے اس سے چند اور سوال کئے۔ اس کا حسب و نسب کیا تھا وہ یہاں کیسے آئی، اور میرے ملازم کے ساتھ اس کے کیا تعلقات تھے۔ وغیرہ

میں نے یہ سب کچھ بالترتیب پوچھنا شروع کیا۔ مگر میرے ہر سوال کا جواب وہ اس انداز سے دیتی تھی، کہ میں اسکی باتوں سے کوئی نتیجہ اخذ نہ کر سکتا۔ میں اسے واپس محمود کے پاس بھیجنے کا خیال کر رہا تھا۔ کہ وہ میرے ارادے کو سمجھتے ہوئے میرے عین مقابل کھڑی ہو گئی۔ اکدم اس نے بازو پھیلاتے ہوئے اپنی دونوں باہیں میری گردن میں حمائل کر دیں۔ اور اپنی ملتجی نگاہوں سے مجھے اپنی جانب کھینچنا شروع کیا۔ اس کی سحر آمیز آنکھوں نے میرے دل و دماغ پر جادو کی کیفیت طاری کر دی۔ ہماری نظریں ایک دوسرے سے ملی ہوئی تھیں۔ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اور میں عجب کشمکش میں مبتلا تھا۔ وہ اپنی سحر کن آنکھوں سے کچھ اس قسم کا پیغام محبت دے رہی تھی۔ کہ میں مفتوح ہوئے بغیر نہ رہ سکا دوسرے الفاظ میں یہ کہوں گا۔ کہ ہماری نگاہوں کی باہمی کشمکش، مرد و عورت کے فطرتی جذبات کے مابین ایک ایسی جنگ کی حیثیت رکھتی تھی۔ جس میں مرد کو ہمیشہ شکست ہوتی ہے۔ وہ اپنے دونوں ہاتھوں سے میرے سر کو آہستہ مگر زور کے ساتھ اپنے متبسم لبوں کی طرف کھینچ رہی تھی۔ یہاں تک کہ میں نے بھی بیتاب ہو کر اپنے ہونٹ اس کے سرخ اور شاداب لبوں سے پیوست کر کے اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔ اس غزال رعنا کا بدن نہایت نرم و نازک تھا۔ اور اس کے خمار آگیں بوسوں میں ایسی عجیب و لاثانی چاشنی تھی، جو شاید جنت کے پھلوں میں بھی نہ ہو سکے؛

"چند لمحات کے بعد ـــــ میں چند لمحات ہی کہونگا۔ اگرچہ صبح کاذب کا وقت ہو رہا تھا ـــــ میں نے یہ سوچتے ہوئے کہ جس طرح وہ آئی تھی، اسی طرح خود بخود چلی بھی جائے گی، اسے واپس بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ ابھی میں نے اس بات پر غور نہیں کیا تھا۔ کہ مجھے اس کے ساتھ کیا برتاؤ

کرنا چاہیئے۔ یا وہ میرے ساتھ کیا سلوک کرے گی۔ کہ اس نے فوراً میری نیت سے آگاہ ہو کر کہا۔

" اگر آپ مجھے یہاں سے نکالنا چاہتے ہیں۔ تو اس وقت میں کہاں جاؤں گی؟ مجھے رات کی تاریکی میں باہر زمین پر سونا پڑے گا۔ براہ نوازش آپ صرف مجھے اپنی چارپائی کے پاس قالین پر پڑا رہنے کی اجازت دیں "

میرے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ مجھے صرف یہی اندیشہ تھا۔ کہ محمود ضرور میرے کمرے کی کھلی ہوئی کھڑکی کو جس میں سے روشنی باہر نکل رہی تھی، دیکھتا ہوگا، اور اتنی رات تک میرے بیدار رہنے پر متعجب ہوگا۔ ایسے کئی خیالات میرے دماغ میں پیدا ہو کر مجھے پریشان کرنے لگے۔ یکلخت میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوا، کہ اس مجسمۂ حسن و جمال کو جو زبردستی میری آغوش تمنا میں گرا دیا گیا ہے میں اپنے حرم میں داخل کر کے مکان میں رکھ سکتا ہوں جب میرا دل سیر ہو جائے گا تو کسی نہ کسی طریقہ سے اسے علیحدہ کر دوں گا۔ کیونکہ اس جگہ ہر مرد اپنی عورت کے جسم و روح کا مالک تصور کیا جاتا ہے۔ اس خیال کے آتے ہی میں نے اس سے کہا۔

" تم بخوشی یہاں رہ سکتی ہو۔ میں ہر ممکن طریقے سے تمہیں خوش رکھنے کی کوشش کروں گا۔ مگر اس وقت میں تمہارے اصلی حالات سے پوری طرح واقف ہونا چاہتا ہوں "

" یہ سمجھتے ہوئے کہ اب اسے ضرور کچھ نہ کچھ کہنا ہی پڑیگا اس نے اپنے حالات بیان کرنے شروع کئے۔ اس نے مجھے بتایا۔ کہ وہ ایک شیخ النسل قاضی کی لڑکی ہے، اس کی ماں جو عربی و حبشی خون کی آمیزش سے پیدا ہوئی تھی، کسی لڑائی میں اس کے والد کے ہاتھ آئی تھی، اس کے مدور و نرم سینے کا ابھار، اور ہونٹوں کی سرخ رنگت بظاہر یہ ثابت کر رہے تھے۔ کہ اس کی رگوں میں بھی حبشی خون موجود ہے۔ اس کے جسم کا سفید رنگ، اور اس کا دراز قد کسی خوبصورت مغربی باشندے کی مانند تھا۔ اس کی کشادہ اور سیاہ آنکھوں نے اس کے چہرے کے تناسب اور سادہ خد و خال کو جو کسی ہندوستانی مجسمہ کی مانند تھے۔ زیادہ دلآویز بنا رکھا تھا۔ میں اس کی زندگی کے صحیح حالات کا کچھ اندازہ نہ کر سکا۔ اس نے اپنے مخصوص معصومانہ انداز میں اپنی داستان زندگی کو چند بے ربط واقعات کی صورت میں پیش کیا۔ اس نے بتایا۔ کہ وہ ایک خانہ بدوش لڑکی تھی، اور افریقہ کے ایسے عربی قبائل سے تعلق رکھتی تھی۔ جن کی تمام عمر صحرا نوردی میں بسر ہو جاتی ہے۔

یکایک مجھے فطرت کی اس ستم ظریفی کا خیال ہوا جس کی بدولت بنی نوع انسان کی مختلف نسلیں ایک دوسرے سے بالکل الگ تھلگ رہنا پسند کرتی ہیں، اپنے اور اس عربی دوشیزہ کے درمیان بھی مجھے اختلاف نسل کی یہی ناعبور خلیج دکھائی دی، اور اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ اس بات کا خیال کرتے ہوئے میں نے اس کافر ادا حسینہ سے اس کا نام پوچھا۔

اس نے انگڑائی لیتے ہوئے نہایت سست

آواز میں جواب دیا" اینہ :

" وہ چند منٹوں سے خاموش بیٹھی تھی۔ میں نے دیکھا، کہ اس کی آنکھوں میں نشہ سا طاری ہے۔ اور وہ سونے کے لئے بیتاب ہو رہی ہے۔ میں نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا" تمہیں نیند آرہی ہے؟ اینہ "

" ہاں" اس نے جواب دیا۔

" بہت خوب! تم خوشی سے سو سکتی ہو" میں نے کہا اور وہ خاموشی سے میرے پاس ہی چارپائی پر لیٹ گئی۔ اس کا منہ زمین کی طرف تھا۔ اور وہ دونوں بازوؤں پر سر رکھے ہوئے تھی۔ چند لمحوں کے بعد اس کے خراٹوں کی آواز آنے لگی۔ میں بھی اس کے پہلو میں لیٹ گیا۔ اور یہ سوچنے لگا، کہ محمود نے اسے کیوں میرے حوالے کر دیا ہے۔ کیا اس نے سچ مچ ایک وفادار اور جاں نثار خدمتگار کی طرح اس عورت کو، جسے شاید اس نے اپنے لئے منتخب کیا تھا اپنے مالک کے سپرد کر دیا ہے۔ یا اس نے یہ خیال کر کے، کہ میں اس پیکرِ شباب کی سحر آفرینی سے ضرور بے بس ہو جاؤں گا اسے میرے ہاں بھیجدیا ہے۔ کبھی میں یہ سوچتا، کہ شاید پیشتر ہی سے محمود نے حسن کی اس نوخیز کلی کو، جس پر اتفاقاً میری نگاہ جا پڑی، میری خدمت میں بطور تحفہ پیش کرنے کے لئے منتخب کیا ہو۔ ان تشویشناک خیالات سے تنگ آکر میرا دماغ چکرانے لگا۔ اور میں بھی آہستہ آہستہ خوابِ خرگوش میں محو ہو گیا۔

" دروازے کی چرچراہٹ سے میری آنکھ کھلی محمود حسب معمول مجھے بیدار کرنے کے لئے علی الصبح آپہنچا۔ اس نے آتے ہی کھڑکی کھولی اینہ ابھی تک محو خواب تھی۔ دن کی روشنی اندر داخل ہو کر اس کے سیمیں بدن پر پڑنے لگی۔ محمود نے میرے کپڑے صاف کرنے کیلئے کھونٹی سے اتارے اس نے اینہ کی طرف، جو میرے قریب ہی سو رہی تھی مطلق خیال نہیں کیا۔ اور نہ ہی اسے اس بات کا احساس ہوا۔ کہ میرے علاوہ کوئی اور بھی کمرے میں موجود ہے۔ صبح کی تازہ ہوا، دن کی روشنی، اور قدموں کی چاپ محسوس کرتے ہوئے اینہ نیند سے بیدار ہوئی۔ اس نے انگڑائی لیکر آنکھیں کھولیں۔ اور ایک نظر سے مجھے اور محمود کو دیکھ کر اٹھ بیٹھی۔ پھر وہ بولی۔

" مجھے بھوک لگ رہی ہے "

" کیا تم قہوہ کے ہمراہ توس اور پنیر پسند کرو گی" میں نے پوچھا۔

" ہاں" اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ محمود ہماری چارپائی کے نزدیک کھڑا حکم کا منتظر تھا۔ میرے کپڑے اس کے بازو پر پڑے ہوئے تھے۔

" میرے اور اینہ کے لئے ناشتہ حاضر کرو" میں نے اسے کہا۔ اور بغیر کسی تردد و فکر کے وہ حکم کی تعمیل میں باہر نکل گیا۔ جب وہ چلا گیا تو میں نے اینہ سے پوچھا

" کیا تم میرے ساتھ رہنا پسند کرتی ہو؟"

" ہاں" وہ بولی۔

" میں تمہارے لئے ایک علیحدہ کمرہ خالی کرا دونگا اور ایک خادمہ خاص تمہاری خدمتگزاری کے لئے مقرر کر دونگا"

" آپ یقیناً نیک دل انسان ہیں۔ میں آپ کے احسانات کی زحد ممنون ہوں " اس نے جواب دیا۔

" لیکن اگر تم نے ذرا بھی اپنا طرز سلوک بگاڑا، تو میں تمہیں فوراً یہاں سے نکال دونگا "

" میں آپ کی ہر خدمت بجا لانے کیلئے تیار رہوں "

اس نے حلف وفاداری کے طور پر میرا ہاتھ پکڑ کر اس پر بوسہ دیا۔ اتنے میں محمود ناشتہ کی طشتری ہاتھ میں لئے ہوئے اندر داخل ہوا، میں نے اسے بتایا، کہ امینہ اب میرے مکان پر رہیگی، اس لئے دوسرے کمرے میں اسکی رہائش کا مناسب انتظام کیا جائے۔ ور ایک خادمہ اس کی خدمت کے لئے مقرر کر دیجائے۔

" بہت خوب۔ حضور " اس نے کہا۔ اور خاموش ہو گیا۔

" ایک گھنٹہ بعد ایک وسیع کمرہ میری نئی محبوبہ کی رہائش کے لئے جملہ سامان سے آراستہ کر دیا گیا۔ اور جب میں یہ دیکھنے کے لئے کہ آیا تمام انتظام درست ہو چکا ہے یا نہیں، اس کمرے میں داخل ہوا، تو امینہ نے بھی ایک قد آدم آئینہ اور کپڑوں کے لئے لکڑی کے ایک بڑے صندوق کی فرمائش کی، میں نے فوراً ہر دو اشیا مہیا کرنے کا وعدہ کیا۔ جب میں کمرے سے باہر نکلنے لگا تو وہ نہایت دلربایانہ انداز سے منہ میں سگرٹ دبائے ہوئے قالین پر بیٹھی تھی، اور اپنی نئی خادمہ سے یوں باتیں کرتی تھی، جیسے وہ اسے عرصہ سے جانتی ہو

(۲)

" ایک مہینہ امینہ کی صحبت میں نہایت خوشی و خرمی سے بسر ہوا۔ ان دنوں میں ہر فکر و غم سے آزاد تھا۔ امینہ کی موجودگی میرے لئے پیام حیات تھی۔ میرا مسکن ایوان عشرت بنا ہوا تھا۔ میں اس والہانہ شیفتگی کا صحیح طور پر اندازہ نہیں کر سکتا۔ جو امینہ کے قیامت خیز شباب۔ اور اس کے ساحرانہ حسن نے میرے دل کی گہرائیوں میں حاصل کی تھی۔ میں پہلے بھی آپ کو بتا چکا ہوں۔ کہ افریقہ کا یہ ویران اور سادہ خطہ آہستہ آہستہ اپنی خوبیوں سے ہمارے دلوں پر اثر کر لیتا ہے۔ اس ملک کی پر سکون فضا صبح و شام کے دلکش نظارے اور بہار کے دیگر تمام مسرت آفریں مشاغل ہمیں فوراً اپنا گرویدہ بنا لیتے ہیں۔ اس طرح امینہ نے بھی اپنے یاسمیں جلوہ کی ضیا پاشیوں، اور اپنی لاتعداد اداؤں سے مجھے اپنا شیدائی بنا لیا۔

" میری طرف سے اسے کامل آزادی تھی، کہ وہ جہاں چاہے بخوشی آجا سکتی ہے۔ مکان کے باہر پاس ہی ان مزدوروں کے خیمے لگے ہوئے تھے۔ جو تمام دن میرے کھیتوں میں کام کرتے۔ امینہ قریباً دوسرے تیسرے روز ان کے خیموں میں جاتی، اور دل بہلانے کے لئے دیر تک۔ ان کی عورتوں کے پاس بیٹھی رہتی۔ بسا اوقات وہ سارا دن اپنی زیبائش میں صرف کر دیتی، قد آدم آئینہ کے سامنے کھڑی ہو کر وہ اپنے ہر انداز کو غور سے دیکھتی، اور اپنے حسین و نازک بدن کی دل ہی دل میں تعریف کر کے خوش ہوتی۔ کبھی وہ اپنی نازک کمر لچکا کر مٹک مٹک کر چلتی، کبھی آئینہ کے سامنے تھک کر کرسی پر بیٹھ جاتی۔ اور دیر تک اپنے حسین افکار میں محو رہتی۔ کچھ دنوں

بعد میں نے معلوم کیا کہ وہ ہر روز ناشتہ کرنے کے بعد باہر چلی جاتی ہے۔ اور تمام دن غیر حاضر رہ کر شام کے وقت مکان پر واپس آتی ہے۔ مگر اس کی آزاد زندگی کا خیال کرتے ہوئے میں نے اس بات کی مطلق پروا نہ کی۔ مکان میں امینہ کی موجودگی سے محمود بھی نہایت مسرور نظر آتا تھا۔ مگر مجھے ان دونوں کی نسبت کبھی کسی قسم کا شبہ نہیں ہوا تھا۔ کیونکہ میں نے انہیں کبھی تنہائی میں یکجا نہ دیکھا۔ اور نہ ہی وہ مجھ سے کسی امر کو پوشیدہ رکھنے کی کوشش کرتی۔

"گرمی کا موسم انتہائی مسرت میں گزرا۔ خزاں کے شروع ہوتے ہی امینہ کی مسرتوں میں کمی ہونے لگی۔ وہ ہر وقت اپنے خیالات میں محو رہتی۔ اور ہرگز کسی شغل میں دلچسپی نہ لیتی۔ ایک شام کو جب میں نے اسے بلا بھیجا تو وہ اپنے کمرے میں نہیں تھی۔ میرا خیال تھا۔ کہ وہ قریب ہی کہیں سیر کرنے گئی ہوگی لہذا میں نے ایک ملازم کو اس کی تلاش میں روانہ کیا۔ چند لمحات انتظار کرنے کے بعد میں نے اپنے کمرے کی کھڑکی کھولی۔ اور محمود کو آواز دی۔

"حکم حضور!" اس نے اپنے خیمے کے اندر سے جواب دیا۔

"تمہیں امینہ کا کچھ پتہ ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں جناب! کیا وہ گم ہو گئی؟"

ایک لمحہ بعد وہ انتہائی پریشانی کی حالت میں میرے کمرے میں داخل ہوا۔ "امینہ کھو گئی؟" اس نے حیران ہو کر پوچھا۔

"ہاں وہ کہیں چلی گئی ہے۔ جاؤ اس کی تلاش کرو!" میں نے اسے بتایا۔

چند لمحوں تک وہ ایک مجسمہ کی مانند ساکت کھڑا رہا شاید وہ حالات کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پھر وہ امینہ کے کمرے میں گیا۔ جہاں اس کے کپڑے بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے تھے۔ اس نے ہر ایک چیز کا بہ نظر غور جائزہ لیا۔ اور باہر نکلتے ہوئے تسلی آمیز لہجہ میں بڑبڑانے لگا: "یقیناً وہ چلی گئی ہے"

"مجھے خیال ہوا کہ شاید اسے کوئی ناخوشگوار حادثہ پیش آیا ہو۔ اور سیر کرتے ہوئے کسی چٹان سے گر کر اس کے نازک بدن پر ضرب آئی ہو۔ لہذا میں نے تمام ملازموں کو جو قریب ہی اپنے خیموں میں رہتے تھے۔ امینہ کی جستجو میں روانہ کیا۔ تاکہ جس طرح بھی ہو۔ اس کا پتہ لگائیں۔

متواتر ایک ہفتہ امینہ کی تلاش کی گئی۔ مگر اس کا کوئی نشان نہ ملا۔ اس کے کھو جانے پر میں عجیب کشمکش میں مبتلا تھا میرا دل بیقرار اور میری روح بے چین ہو رہی تھی۔ امینہ کے بغیر مکان سنسان اور زندگی بے مزہ معلوم ہونے لگی۔ میں نے سمجھ لیا۔ کہ وہ ضرور اغوا کی گئی ہے۔ یا قتل کر دی گئی ہے۔ مگر محمود کو اس بات کا پورا یقین تھا۔ کہ وہ خود بخود کہیں چلی گئی ہے تین ہفتے اسی اضطراب میں گزر گئے۔ میں اپنی عربی محبوبہ کو دوبارہ دیکھنے کی تمام امیدیں کھو چکا تھا۔ کہ ایک صبح محمود خوشی خوشی میرے کمرے میں داخل ہوا۔ اور کہنے لگا۔

"جناب! امینہ واپس آ گئی ہے"

میں ایکدم بستر سے اٹھا۔ اور جلدی جلدی محمود سے اس کا پتہ پوچھنے لگا۔

"وہ آپ کے پاس آنے کی جرأت نہیں کرتی دیکھئے وہ سامنے اس درخت کے نیچے بیٹھی ہے۔" اس نے اپنا بازو

پھیلاتے ہوئے کھڑکی میں سے ایک انسانی سایہ کی طرف اشارہ کیا۔ جو انگور کے ایک بڑے درخت کے نیچے نظر آرہا تھا

میں جلدی سے اٹھکر باہر نکلا۔ امینہ درخت کے تنے سے کمر لگائے بیٹھی تھی۔ میں نے دور ہی سے اس کی سیاہ آنکھوں اور پیشانی کے تل سے، اسے پہچان لیا۔ میں انتہائی غصہ کی حالت میں اس کی طرف بڑھا۔ میرے دل میں اسے سزا دینے کا خیال پیدا ہو رہا تھا۔ چند قدم کے فاصلے پر سے میں نے اسے تحکمانہ لہجہ میں آواز دی "امینہ تو کہاں تھی؟"

وہ بت بنی ہوئی خاموش و ساکن کھڑی تھی۔ شاید وہ جانتی تھی۔ کہ میں اسے ضرور سزا دوں گا۔ میں اب بالکل اس کے سر پر کھڑا تھا۔ اور اس کے پھٹے پرانے لباس کو، جو گرد و غبار سے اٹا ہوا تھا، حیرانی سے دیکھنے لگا۔

"تم کہاں تھیں؟" میں نے ہاتھ بلند کرتے ہوئے دہرایا۔

"میں اپنے قبیلے کے لوگوں سے ملنے گئی تھی" اس نے ڈرتے ہوئے کہا۔

"تم کیوں گئی تھیں" میں نے ذرا نرم ہو کر پوچھا۔

یہ دیکھکر کہ اب میں اسے کچھ نہیں کہونگا۔ اس کی قدرے ہمت بندھی، اور وہ جرأت کر کے دبی آواز میں بولی:۔

"میں جانا۔ ۔ ۔ چاہتی تھی، میں اس مکان میں زیادہ عرصہ رہنے سے اکتا گئی تھی"

اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر مجھے اس کی حالت پر رحم آگیا۔ اور میں بھی اس کے پاس ہی زمین پر بیٹھ گیا محمود دور سے اس منظر کو دیکھ رہا تھا۔ میں نے محبت بھرے انداز میں امینہ سے اس کے چپ چاپ چلے جانے کی وجہ دریافت کی۔ اس پر اس نے مجھے بتایا۔ کہ کئی دنوں سے اس کے دل میں دوبارہ خانہ بدوشوں کی سادہ و پرکیف صحرائی زندگی سے لطف اندوز ہونے کی خواہش پیدا ہو رہی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ ایکبار پھر اسے اپنے خیمے کے نیچے سونے کا موقع ملے، جہاں رات کے وقت چاند کی روشنی کپڑے کی چھت سے چھن چھن کر اندر داخل ہوتی ہے۔ صبح سے شام تک ہر طرف پھیلے ہوئے صحرا میں رہ کر خودرو پھولوں سے سرگوشیاں کرنا، ریت میں ادھر ادھر کھیلتے رہنا۔ خوش الحان طائروں کی ہمنوائی، اپنے قبیلے کے ساتھ گانا، رقص کرنا۔ یہ تھے۔ وہ تمام حیات آفریں مشاغل جن کی یاد نے اسے مضطرب بنا دیا تھا۔

اس کا بیان اس قدر دلکش اور مدلل تھا۔ کہ مجھے اس کے دلی جذبات کی صداقت کا یقین ہو گیا۔ اور اس کی بے بسی پر افسوس کرتے ہوئے میں نے پوچھا۔

"تم نے مجھ سے کیوں نہ کہا کہ تم چند دنوں کے لئے اپنے قبیلے میں جانا چاہتی ہو؟"

"کیونکہ میں سمجھتی تھی کہ آپ کو میری جدائی گوارا نہ ہو گی" اس نے جواب دیا۔

"اگر تم واپس آنے کا وعدہ کرتیں، تو میں یقیناً تمہیں اجازت دے دیتا"

مجھے یوں ہمدردانہ باتیں کرتے ہوئے دیکھ کر اس نے مسکراتے ہوئے کہا "خیر اب آپ اس قصے کو جانے دیں۔ میں صحرائی زندگی سے خوب اچھی طرح سیر ہو کر آئی ہوں۔ اور نہایت مسرور ہوں۔ اب کہیں نہیں جاؤں گی۔ اور آپ کے پاس ہی رہوں گی۔ مجھے خوشی ہے کہ آپ مجھ سے ناراض نہیں ہیں"

"اچھا چلو، اب مکان پر چلیں" میں نے اسے کہا۔

وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں نے اس کا نرم و نازک ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اور وہ نہایت سنجیدگی سے میرے ہمراہ مکان کی طرف روانہ ہوئی۔ راستہ میں میں نے اسے کہا۔

"امینہ اگر کسی وقت تم اپنے قبیلے میں جانا چاہو تو مجھے فوراً اطلاع دینا۔ میں اسی وقت تمہیں اجازت دے دوں گا"

"آپ وعدہ کرتے ہیں؟" اس نے احتیاطاً پوچھا۔

"ہاں۔ میں وعدہ کرتا ہوں"

"تو میں بھی آپ کو یقین دلاتی ہوں" اس نے اپنی پیشانی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ کہ جب کبھی مجھے صحرا کی یاد ستائیگی تو آپ سے اجازت لئے بغیر ہرگز نہیں جاؤں گی"

میں اس کے کمرے تک اسے چھوڑنے آیا۔ اندر داخل ہوتے ہی اس نے آئینہ میں اپنا عکس دیکھا۔ اور اپنی بوسیدہ حالت پر حسرت بھری نگاہ ڈالی۔ پھر اس نے صندوق سے ایک ریشمیں پوشاک نکالی تاکہ اسے زیب تن کر کے اپنی خوبصورتی کو بدستور قائم کر سکے۔ میں اسے اسی حالت میں مصروف زیبائش چھوڑ کر مکان سے باہر نکل آیا۔

ہماری زندگی دوبارہ پرکیف ہوگئی۔ اور میں پھر اس دوشیزہ صحرا کے لاثانی حسن سے مسحور ہونے لگا۔ چھ مہینے خوب عیش و عشرت میں گزرے۔ اور اس عرصہ میں کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہ آیا۔ چند دنوں بعد میں نے محسوس کیا کہ امینہ پھر مضطرب و غمگین نظر آ رہی ہے۔ بالآخر ایک دن میں نے اس سے پوچھا۔

"امینہ! کیا تم اپنے قبیلے میں جانا چاہتی ہو؟"

"ہاں! میں ضرور جانا پسند کروں گی" اس نے جواب دیا۔

"غالباً تم مجھ سے کہنے کی جرأت نہیں کرتی تھیں؟"

"بیشک مجھ میں اتنی ہمت نہیں کہ آپ سے اجازت طلب کروں"

"بہت خوب! تم خوشی سے جا سکتی ہو"

اس نے اظہار تشکر کے طور پر میرے ہاتھوں کو بوسہ دیا۔ اور دوسرے دن وہ پھر اپنے قبیلے میں چلی گئی۔ تقریباً تین ہفتے بعد وہ واپس آئی۔ اس کے کپڑے پھر اسی طرح بوسیدہ و گرد آلود تھے۔ اور وہ خانہ بدوشوں کی آزاد صحرائی زندگی سے خوب سیر ہو کر آئی تھی۔ دو سال کے عرصہ میں وہ اسی طرح چار مرتبہ اپنے قبیلے کے لوگوں سے ملنے کیلئے گئی۔ جب وہ اپنے ہمجنسوں سے ملا کرتی۔ تو میں نہایت خندہ پیشانی سے اس کا استقبال کرتا۔ میرے دل میں کسی قسم کا حسد نہیں تھا۔ کیونکہ مجھے اس پر پورا اعتماد تھا۔ تاہم اگر اس کا ذرہ بھر فریب بھی ظاہر ہو جاتا۔ تو اس کا قتل ہو جانا لازمی امر تھا۔

ایک دن صبح کے وقت محمود سراسیمگی کی حالت میں میرے کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے چہرے پر پژمردگی و پریشانی کے آثار نمایاں تھے۔

"محمود! کیا بات ہے؟" میں نے اس سے استفسار کیا۔

"امینہ بھاگ گئی ہے۔ حضور!" اس نے جواب دیا۔

مجھے بے اختیار ہنسی آگئی "بھاگ گئی ہے۔ کہاں؟" میں نے دریافت کیا۔

"جناب! وہ ہمیشہ کے لئے چلی گئی ہے۔"

"تم کیسی احمقانہ باتیں کرتے ہو محمود!" میں نے کہا۔ "اچھا مفصل بتاؤ، کہ وہ کیوں، اور کیسے چلی گئی ہے؟"

چند منٹ وہ خاموش رہا۔ پھر یکلخت انتہائی حقارت آمیز لہجہ میں بڑبڑانے لگا۔ میں نے اس کی وحشیانہ گفتگو سے معلوم کیا، کہ امینہ میرے چرواہے کے ساتھ مفرور ہو گئی ہے۔ میں نے اس کے غصہ کو فرو کرتے ہوئے، ایک ایک کر کے تمام واقعات معلوم کرنے شروع کئے۔ محمود نے ایک لمبی چوڑی داستانِ حمق سناتے ہوئے بتایا۔ کہ اس بدمعاش نے، جسے میرے داروغہ نے قریباً ایک ماہ قبل بطور چرواہا کے ملازم رکھا تھا۔ ایک ہفتہ سے امینہ پر نظر رکھی ہوئی تھی۔ روزانہ رات کے وقت امینہ مکان سے باہر سیر کو نکل جاتی۔ اور قریب ہی انگور کے درختوں تلے یا چٹانوں کے عقب میں اپنے نئے آشنا سے ملاقات کرتی۔ گذشتہ رات محمود نے اسے مکان سے باہر نکلتے دیکھا تھا۔ مگر ابھی تک وہ واپس نہیں آئی تھی۔

"چلی گئی جناب! اب وہ نابکار ہمیشہ کے لئے چلی گئی۔" اس نے دوبارہ کہا۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ محمود کی باتوں کا مجھے کیسے اعتبار آ گیا۔ کیونکہ میرے دل میں یکلخت یہ بات پختہ طور پر بیٹھ گئی۔ کہ امینہ ضرور اس بدمعاش چرواہے کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔ اگرچہ بادی النظر میں یہ امر ناممکن تھا۔ تاہم عورتوں کی کمزور فطرت اور ناقص عقل کے پیش نظر ایسے واقعے کا ظاہر ہو جانا بہت حد تک ممکن تھا۔ میرے دل پر مایوسی و غصہ کے بادل چھا گئے۔ اور اس رذیل چرواہے کا چہرہ میری آنکھوں کے سامنے پھرنے لگا۔ ایک یا دو ہفتہ پیشتر میں نے اسے مویشیوں کے درمیان ایک چٹان پر کھڑے دیکھا تھا۔ اور وہ مجھے دیر تک گھور گھور کر دیکھتا رہا تھا۔ وہ ایک دراز قد بدو تھا جس کے برہنہ بازو اس کے بوسیدہ کپڑوں کی مانند سیاہ تھے۔ وہ ایک مخصوص صحرائی بدمعاش تھا۔ جس کے رخسار پچکے ہوئے تھے۔ وہ، پنی گیدڑ کی سی مکار آنکھوں، مڑی ہوئی ناک اور پتلی پتلی ٹانگوں سے ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے ہڈیوں کے کسی ڈھانچے کو لباس پہنا دیا گیا ہو۔ مجھے پورا یقین ہو گیا کہ امینہ اس خبیث کے ساتھ فرار ہو گئی ہے۔ مگر کیوں؟:

اس لئے کہ وہ دوشیزۂ صحرا تھی۔ اگر یہی واقعات مجھے پیرس میں پیش آتے۔ اور امینہ کی طرح مجھے کسی بازاری لڑکی سے الفت ہو جاتی، تو یقیناً ایک دن وہ بھی میرے ڈرائیور یا کسی دیگر ملازم کے ساتھ بھاگ جاتی!

"اچھا ہوا!" میں نے محمود کی بات کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ "اگر وہ نابکار چلی گئی ہے، تو اس پر خدا کی پھٹکار ہو۔ فی الحال تم مجھے تنہا چھوڑ دو۔ کیونکہ میں نے چند ضروری خطوط تحریر کرنے ہیں۔"

وہ میرے سکون و اطمینان پر تعجب کرتے ہوئے باہر نکل گیا۔ میں نے اٹھکر کھڑکی کھولی۔ اور تازہ ہوا کے لمبے لمبے سانس بھرنے لگا۔ پھر میں نے سوچنا شروع کیا۔ آخر کار وہ بھی دوسری عورتوں کی طرح ایک عورت تھی۔ کیا کوئی سمجھ سکتا ہے۔ کہ ان سے ایسی حرکات کیوں سرزد ہوتی ہیں وہ کونسا جذبہ ہے۔ جس کی بدولت ایک عورت کسی مرد سے محبت کرنے لگتی ہے۔ اور پھر اسے چھوڑ جاتی ہے۔ کبھی کبھی

ہم اس بات کو سمجھ جاتے ہیں۔ مگر عموماً نہیں۔ اور اکثر مرتبہ تو ہم شبہ میں رہتے ہیں۔ آخر وہ کیا بات تھی۔ جس نے ابیہ کو اس منحوس صورت بدو کے ساتھ بھاگنے پر مجبور کیا۔ آہ! عورت فطرتاً کتنی کمزور واقع ہوتی ہے۔ جس طرح ہوا کا ایک ہلکا سا جھونکا بھی بادنما کو گھما دینے کے لئے کافی ہوتا ہے۔ بعینہٖ کوئی نامعلوم جذبہ یا کوئی عارضی احساس عورت کے ناپائیدار خیالات پر قابو پا لیتا ہے۔ قطع نظر اس کے کہ وہ کسی شہر کی مہذب عورت ہو۔ یا گاؤں کی معمولی گنوار۔ بیشک عورت احساسات کا کھلونا ہے۔ وہ گرد و پیش کے حالات سے بکلیت متاثر ہو جاتی ہے۔ اور معمولی سے معمولی جذبہ بھی اسے خلاف توقع مسحور کر لیتا ہے۔"

ایم ایبل اپنی کہانی ختم کر کے اٹھ کھڑا ہوا، چند قدم ادھر ادھر ٹہل کر اس نے میری طرف دیکھا۔ اور مسکرا کر کہنے لگا۔

"یہ ہے۔ اس دوشیزۂ صحرا کی داستانِ محبت۔"

"فرض کیا، کہ وہ ایک مرتبہ پھر آپ کے پاس آ گئی تو؟" میں نے استفسار کیا۔

"کون! وہ مکار لڑکی۔" اس نے جواب دیا۔ "خیر مجھے پھر بھی خوشی ہو گی۔"

"اور آپ اس چرواہے کو بھی معاف کر دیں گے؟"

"ہاں یقیناً عورتوں کے بارے میں ہمیں ان کی گذشتہ خطاؤں کو معاف یا فراموش کر دینا چاہئے۔"

(ساغر جعفری۔ بی۔ اے۔ ایل۔ بی۔)

"التجا"

آ کے مہتاب درخشاں کی ضیا میں چھپ کر
قلبِ تاریک کو پر نور بنائے جاؤ!

شب دیجور ہے۔ خاموش فضا ہے ساری
مجھ کو آغوشِ مسرت میں سلائے جاؤ!

دلِ بیتاب کو تسکین دلانے کیلئے
پھر مجھے نغمۂ جاں بخش سنائے جاؤ!

چشم پرنم ہے مرے لب پہ فغاں ہے پیہم
صبر کا کام تمنا کو دلائے جاؤ!

آنسہ نسیمہ سوز

شاعر!

وہ نظم پڑھوں بلبل سدرہ بھی پھڑک جائے　　　یہ بزم نئے رنگ کے پھولوں سے مہک جائے
فقرہ ہو جو غنچۂ دل، وہ بھی چٹک جائے　　　تیروں کا نشانہ، جو کہیں نوک پلک جائے

چبھتی ہوئی ہر مصرعۂ موزوں کی ادا ہو!
جو لفظ ہو موتی کی طرح صاف بندھا ہو

وہ پھول چنوں رنگِ چمن جس پہ فدا ہو　　　کانٹے کے کھٹکنے میں بھی بلبل کی صدا ہو
سیدھی سے بھی ہو بات، تو شوخی سے ادا ہو　　　گلچیں کی رکھائی میں لگاوٹ کا مزا ہو

اس حسن سے کچھ شاہدِ مضموں نظر آئیں
منہ چومنے کو چرخ سے حوریں اتر آئیں

سادہ سا ورق دامنِ گلچیں سے زیادہ　　　میدانِ قلم تختۂ رنگیں سے زیادہ
پُرپیچ روش کاکلِ مشکیں سے زیادہ　　　بندش، وہ پری ساعدِ سیمیں سے زیادہ

مقبول خلائق میرے اندازِ بیاں ہوں
سکّے کی طرح لفظ زبانوں پہ رواں ہوں

تو چاہے تو مٹی کو طلا کر کے دکھا دوں　　　زنگِ دلِ منکر پہ جلا کر کے دکھا دوں
بلبل کو گلِ تر سے خفا کر کے دکھا دوں　　　اس باغ میں کچھ اور ہوا کر کے دکھا دوں

غل ہو کہ عجب واصفِ فطرت یہ ہوا ہے
سو رنگ سے اک پھول کے مضموں کو رنگا ہے

آغا شاعر قزلباش دہلوی

مرزا غالب اور دیگر شعراء[1]

مرزا غالب کے کلام پر بیشمار مضامین لکھے گئے ہیں۔ ان کے دیوان کی بیسیوں شرحیں ملک میں موجود ہیں۔ انکی شاعری کے محاسن و معائب پر طویل تحریریں شائع ہوئی ہیں اہل نظر حضرات نے ایک ایک شعر کی شرح کرتے ہوئے بال کی کھال بکمال فراغی۔ حتیٰ کہ بعض علم دوست اور باریک بیں احباب نے مرزا کے اصلی خیالات و جذبات ... اور معانی اشعار کو بہت بڑھا دیا۔ اور بخلاف اس کے ان کے کمال فن سے انکار کرنے والوں نے ان کی معمولی لغزش کو مبالغہ آمیز اور رنگین پیرائے میں نمایاں کیا۔ مگر باوجود ان تمام باتوں کے طالبانِ ذوق، نقادانِ شعر و سخن اور ہر قسم کے مطالب پیدا کرنے والے تشنہ لب ہیں۔ اور مرزا کے کلام کی باریکیوں کو پورے طور پر سمجھنے اور سمجھانے کے لئے یا دل کھول کر اس پر نکتہ چینی کرنے کی غرض سے مزید سامان بہم پہنچانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ مرزا کا کلام بحیثیت مجموعی قابل قدر ہے بعض صورتوں میں بے نظیر ہے۔ ان کی جدتِ موضوع، تنوع مضامین۔ زورِ تخیل، فلسفہ، تصوف، اور دیگر محاسنِ کلام ہر شاعر کے لئے باعثِ رشک خصوصیات ہیں۔ لیکن جہانتک ہمارا خیال ہے۔ ابھی تک مرزا کی شاعری کے متعلق بعض امور کی طرف اہلِ قلم کا ذہن پورے طور پر منتقل نہیں ہوا ہے مثلاً اس امر کے متعلق کہ مرزا نے دیگر شعراء کے کلام سے کس حد تک استفادہ کیا ہے۔ یا یہ کہ دیگر شعرا نے ان سے اکتسابِ فیض میں کس قدر حصہ لیا ہے۔ بہت کم لکھا گیا ہے ان امور کے علاوہ مرزا کے کلام میں تکرارِ مضمون کا عیب بھی موجود ہے۔ آج ہم ان کے عام محاسن و معائب سے قطع نظر کر کے متذکرہ صدر امور پر ایک غیر جانبدارانہ سرسری نظر ڈالتے ہیں اس سے ہماری مراد نہ بے جا نکتہ چینی ہے۔ نہ بلا وجہ مدح سرائی یا طرفداری اور نہ خواہ مخواہ مرزا پر سرقہ کا الزام عاید کرنا مقصود ہے۔ غالباً سخن فہم حضرات کو ہماری اس رائے سے اتفاق ہوگا۔ کہ ایک شاعر کسی دوسرے شاعر کے کلام میں کوئی ردّ و بدل یا تصرف اس غرض سے کرے۔ کہ اس میں کسی عیب کی اصلاح ہو جائے۔ یا مضمونِ شعر کو بلند سے

[1] یہ مضمون ابتدائی صورت میں رسالہ "زمانہ" کانپور بابت ماہ جون ۱۹۳۱ء میں شائع ہوا تھا لیکن اس وقت چونکہ اس میں کئی باتیں درج کرنے سے رہ گئی تھیں لہٰذا اس کو موجودہ صورت میں از سرنو تحریر کر کے حتی الوسع ایک جامع مضمون بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور مضمون قریب قریب پہلے سے دوگنا ہو گیا ہے۔ (طالب)

بلند تر کیا جائے تو اس صورت میں کسی قسم کا اعتراض یا نکتہ چینی کرنا جائز نہیں۔ لیکن ساتھ ہی اس کے اگر کوئی شاعر اپنے کسی ہمعصر یا پیشرو کا مضمون بلا وجہ اڑا لے، یا دوسری زبان میں محض ترجمہ کر کے، اس غرض سے پیش کرے کہ عوام اس کو مترجم ہی کی کاوش دماغ یا زور تخیل کا نتیجہ سمجھیں۔ تو اس صورت میں غالباً کوئی صاحب عقل بغیر کسی تامل کے یہ کہنے کے لئے تیار نہ ہوگا۔ کہ ایسے شاعر کی بازپرس نہ کی جائے۔ اور اس کے فعل کو مذموم سمجھا جائے۔ بقول الانسان مرکب من الخطاء والنسیان۔ یہ نہیں کہا جا سکتا۔ کہ مرزا سہو و خطا سے بالکل مبرا تھے۔ نہ ہی یہ کہنا حق اور انصاف پر مبنی ہوگا کہ ان کے کلام میں بمقابلہ دیگر مستند و ہر دلعزیز شعرا کے زیادہ عیوب پائے جاتے ہیں۔ متقدمین و متاخرین میں سے کوئی شاعر ایسا نہیں۔ جس نے اپنے پیشرو اور ہمعصر اساتذہ کے دواوین اور تصانیف سے فیض نہ حاصل کیا ہو۔ جس طرح بعد میں آنیوالے شعرائے خود مرزا کے کلام سے فائدہ اٹھایا۔ یا جن کے یہاں مضمون کسی نہ کسی صورت میں مکرر نہ بندھا ہو۔ اس تحریر سے فقط یہ دکھانا مقصود ہے۔ کہ مرزا جیسے مسلم الثبوت، اور نازک خیال شاعر بھی ان امور سے مستثنےٰ نہیں۔

مرزا نے متقدمین اور ہمعصر شعرا کے بعض خیالات و مضامین اپنے کلام میں اس طرح جذب کئے ہیں۔ کہ عام لوگ جن کا مطالعہ وسیع نہیں، ان کو مرزا کے زور تخیل ہی کا نتیجہ سمجھتے ہیں اور عش عش کر کے رہ جاتے ہیں۔ حالانکہ بعض موقعوں پر وہ سرقہ کے الزام سے بھی نہیں بچ سکتے بعض اشعار میں توارد واقع ہوا ہے۔ بعض ترجمے کے تحت میں آجاتے ہیں۔ اور بعض ایسے بھی ہیں۔ جن کا مضمون تو انہوں نے کسی اور شاعر سے لیا ہے۔ مگر اپنے اسلوب بیان اور مخصوص طرز میں ادا کر کے اس کو بلند تر کر دیا ہے۔ یا بیان میں شوخی، جدت اور وسعت اس قدر پیدا کر دی ہے۔ کہ ان کا اپنا شعر معلوم ہوتا ہے۔ ذیل میں ہم اس قسم کے اشعار درج کرتے ہیں جن میں ان امور کی جھلک پائی جاتی ہے۔ ناظرین ملاحظہ فرمائیں

مرزا سوداؔ کے ایک ہمعصر تو بون کا شعر ہے ؎

دل کے پھپھولے جل اٹھے سینے کے داغ سے
اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

مرزا غالبؔ کے ذہن میں اس شعر کی کیفیت سمائی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ چنانچہ یہی رنگ ان کے اس شعر میں جھلکتا ہے ؎

دل میں ذوق وصل و یاد یار تک باقی نہیں
آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا[1]

مرزا کا شعر مذکورہ بالا شعر کے مقابلے میں پھیکا نظر آتا ہے

خواجہ میر دردؔ کا ایک فارسی شعر ہے ؎

بہ ہیچ کار کتب خوانیت نمی آید
زجمع خاطر خود نسخہ فراہم کن[2]

---

[1] مرزا غالب کے اشعار مطبوعہ دیوان غالب اردو، کے پیش نظر ردیف وار درج کئے گئے ہیں تمام مضمون میں یہی التزام رکھا گیا ہے

[2] اس مضمون میں بعض اشعار بطور حوالہ پیش کرنے کی غرض سے حضرت ناطق لکھنوی کے ایک مضمون بعنوان "سرقہ و توارد" مطبوعہ "زمانہ" کانپور بابت ماہ مارچ سنہ ۱۹۱۳ء سے نقل کئے گئے ہیں۔

(طالب)

ملاحظہ فرمایئے کہ مرزا کے مندرجہ ذیل شعر میں اس شعر میں
کس قدر مطابقت پائی جاتی ہے ؎

تالیفِ نسخہ ہائے وفا کر رہا تھا میں
مجموعۂ خیال ابھی فرد فرد تھا

میر تقی میر کا شعر ہے ؎

غم رہا جب تک کہ دم میں دم رہا
دم کے جانے کا نہایت غم رہا

مرزا کا مندرجہ ذیل شعر یہی مضمون بالفاظ دیگر ادا کرتا ہے ؎

جاتی ہے کوئی کشمکش اندوہِ عشق کی
دل بھی اگر گیا تو وہی دل کا درد تھا

ان دونوں شعر کے مطلب میں کوئی نمایاں فرق نہیں۔ مرزا کا انداز اگرچہ دلچسپی سے خالی نہیں لیکن میر کا شعر زیادہ سلیس اور سلجھا ہوا ہے۔

ذوق فرماتے ہیں ؎

کہتے ہیں آج ذوق جہاں سے گزر گیا
کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے

مرزا نے یہی مضمون ذرا سی تبدیلی کے ساتھ اپنے شعر میں یوں ادا کیا ہے ؎

یہ لاش بے کفن اسدِ خستہ جاں کی ہے
حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

عرفی شیرازی کا ایک شعر ہے ؎

ہر کس نہ شناسندۂ راز است وگرنہ
ایں ہا ہمہ راز است کہ معلوم عوام است

مرزا کا مندرجہ ذیل شعر اسی سے ماخوذ معلوم ہوتا ہے ؎

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

فارسی کے ایک شاعر میر عبداللہ پیامی کا شعر ہے

بیم از وفا ندارید وعدۂ کرس
از ذوق وعدۂ تو بہ فردائے رسم

مرزا کہتے ہیں ؎

ترے وعدے پر جئے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

یہ شعر قریب قریب مندرجۂ بالا فارسی شعر کا ترجمہ ہے لیکن مرزا نے اپنے شعر میں مقابلتاً زور پیدا کیا ہے۔

آذری طوسی کا یہ شعر ملاحظہ ہو ؎

جانے کہ داشت کرد فدائے تو آذری
شرمندہ از تو گشت کہ جانِ دگر نداشت

مرزا نے یہی مضمون اپنی زبان میں یوں ادا کیا ہے ؎

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

انشا کی مشہور غزل کا شعر ہے ؎

نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

مرزا کا مندرجہ ذیل شعر اسی خیال کو ظاہر کرتا ہے ؎

غمِ فراق میں تکلیفِ سیرِ باغ نہ دو
مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بیجا کا

دونوں شعر اپنی اپنی جگہ خوب ہیں۔ اگرچہ مضمون

واحد ہے۔ اس کو توارد سے منسوب کرسکتے ہیں لیکن گمان غالب ہے کہ مرزا اس مضمون کو بھی ابوتراب تراب کے مندرجہ ذیل شعر سے اخذ کرنے میں بے نیاز نہیں ؎

نکہتِ گل رساند پیغامے ٭ بید ماغی نہ داد ہیچ جواب

ذوق کا شعر ہے ؎

چرخ کوکب یہ سلیقہ ہے ستمگاری میں
کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں

مرزا کہتے ہیں ؎

فلک کو دیکھ کے کرتا ہوں یاد اسکو اسد
جفا میں اس کی ہے انداز کارفرما کا

ان دونوں اشعار کے مضمون میں زیادہ باریک فرق نہیں۔ بلکہ ذوق کا شعر مقابلتاً بہتر ہے۔

مصطفٰے علی خان خوشدل کا شعر ہے ؎

بوم من بے برگ و نوا برگ حنا را
تا بوسہ بہ پیغام دہم آں کف پا را

مرزا کے مندرجہ ذیل شعر کا مضمون اس کے ساتھ لڑ گیا ہے ؎

شہید عاشق سے انگلی ہے جو کوسوں تک حنا
کس قدر یارب ہلاکِ حسرتِ پابوس تھا

آصفی شیرازی کا ایک شعر ہے ؎

تو ہم ز آئینہ حیراں ز حسن خویشتنی
زمانہ ایست کہ ہر کس بہ خود گرفتار است

مرزا نے اس مضمون سے مضمون پیدا کیا ہے ؎

شکوہ سنج رشک ہمدیگر نہ رہنا چاہئے
میرا زانو مونس اور آئینہ تیرا آشنا

طالب آملی کا یہ شعر پیش نظر کیجئے ؎

اے کاش گوشِ زعتم احول شدے چو چشم
تا ہر چہ گفتی از تو مکرر شنیدمے

مرزا نے برنگِ دیگر یہی مضمون اپنے ایک شعر میں ادا کیا ہے۔ لیکن باوجود اتحاد خیال کے اختلاف مذاق اس بات کی گواہی دیتا ہے۔ کہ توارد واقع ہوا ہے ؎

بہرا ہوں میں تو چاہیئے دونا ہو التفات
سنتا نہیں ہوں بات مکرر کہے بغیر!

نظیری فرماتے ہیں ؎

نشاط رفتہ زدوراں بہ صد بہ پیستانم
کہ بد معاملہ آزردہ از تقاضا نیست

مرزا اسی مضمون کو خفیف سے فرق کے ساتھ یوں باندھتے ہیں ؎

فلک سے ہم کو عیش رفتہ کا کیا کیا تقاضا ہے
متاع بردہ کو سمجھے ہوئے ہیں قرض رہزن پر

راقم مشہدی کا ایک شعر سنیئے ؎

سیکند وعدۂ دیدار بہ فردا امروز
یار دانستہ کہ امروز مرا فردا نیست

مرزا اپنے ایک عزیز یعنی زین العابدین خان عارف کے مرثیہ میں کہتے ہیں ؎

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے
کیا خوب قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

ان دو شعروں میں مضمون و تخیل متحد ہیں۔ صرف لفظی

فرق ہے۔

شیدائی دیوانہ کا یہ مصرعہ دیکھئے۔

"با خضر کس نگفت کہ عمرت دراز باد"

اس کے ساتھ مرزا کے ایک مطلع کا مصرعہ ثانی بھی

زیرِ نظر لایئے۔

"دعا قبول ہو یارب کہ عمرِ خضر دراز"

یہاں مرزا نے صاف طور پر دیوانہ کا مصرعہ ترجمہ کر کے

مضمون اڑا لیا ہے۔

میر تقی میر کہہ گئے ہیں ؎

نہ تسلی ہوا دلِ بیتاب - نہ تھمی چشم تر سے خونِ ناب

مرزا کا شعر اسی خیال کو یوں پیش کرتا ہے ؎

جس جگر تشنۂ آزار تسلی نہ ہوا - جوئے خوں ہم نے بہائی بن ہر خار کے پاس

غنی کشمیری کا شعر ہے ؎

شد روشنم از شمع کہ در بزمِ حریفاں

خاموش شدن مرگ بود اہلِ زباں را

مرزا تقریباً لفظ بہ لفظ ترجمہ کر کے اس شعر کو اردو کا جامہ

اسطرح پہنا دیتے ہیں ؎

زبانِ اہلِ زباں میں ہے مرگ خاموشی

یہ بات بزم میں روشن ہوئی زبانیِ شمع

کون کہہ سکتا ہے۔ کہ یہاں توارد واقع ہوا ہے۔

یا یہ کہ مرزا کا شعر صرف ماخوذ ہے؟

ذوق کا ایک شعر ہے ؎

کیا اعتبارِ ہستیِ ناپائدار کا - چشمک ہے برق کی کہ تبسم شرر کا

مرزا نے اسی مضمون کو اس طرح ادا کیا ہے[۲] ؎

یک نظر بیش نہیں فرصتِ ہستی غافل

گرمیِ بزم ہے اک رقصِ شرر ہونے تک

ایک فارسی شاعر کہتا ہے ؎

ز ضعفِ تن عجب حال است بیمارِ محبت را

کہ نتواند کشید از ناتوانی بارِ صحت را

مرزا تھوڑے سے فرق کے ساتھ اردو میں اسی

خیال کو یوں ادا کرتے ہیں ؎

ہو فشارِ ضعف میں کیا ناتوانی کی نمود

قد کے جھکنے کی بھی گنجائش مرے تن میں نہیں

ممنون کہتے ہیں ؎

تفاوتِ قامتِ یار او رقیامت میں ہے کیا ممنوں

وہی فتنہ ہے لیکن یاں ذرا سانچے میں ڈھلتا ہے

مرزا نے یہی مضمون اپنے کلام میں اس طرح داخل

کیا ہے ؎

---

[۱] ہمیں یہ دیکھکر تعجب ہوا کہ مدیر "زمانہ" نے اس شعر کی نسبت حاشیے پر یہ نوٹ لکھدیا کہ "یہ شعر غالب کے کلام مطبوعہ میں نہیں ہے" حالانکہ یہ شعر تمام مطبوعہ دیوانوں میں موجود ہے۔ [۲] اس شعر کے متعلق بھی مدیر زمانہ نے یہ نوٹ لکھا ہے کہ "ذوق و غالب ہمعصر تھے۔ لہذا ان پر سرقہ کا الزام نہیں لگایا جاسکتا"۔ اول تو ہم نے یہاں مرزا پر سرقہ کا الزام نہیں لگایا ہے۔ بلکہ یہ کہا ہے کہ مرزا نے یہی مضمون اسطرح ادا کیا ہے؛ اور دوسرے ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ کیوں ایک شاعر اپنے ہمعصر شاعر سے مضمون نہیں لے سکتا؟ ہم نے خود رسالہ زمانہ میں اس قسم کے کئی مضمون دیکھے ہیں جنمیں ہمعصر شعراء سے مضامین

ترے سرو قامت سے اک قدِ آدم
قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں!

کم گو کشمیری کا ایک شعر ہے ؎

ز خضر عمر فردوس است عشق بازاں را
اگر ز عمر شمارند روز ہجراں را!

مرزا کسی قدر پہلو بدل کر یہی مضمون اردو میں یوں پیش کرتے ہیں ؎

کب سے ہوں کیا بتاؤں جہانِ خراب میں
شبہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں

شمس تبریزی فرماتے ہیں ؎

در شراب ہم چیز دیگر ریختی۔ بادہ تنہا نیست آں آمیختی

مرزا نے اسی مضمون کو مندرجہ ذیل شعر میں ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن حق تو یہ ہے کہ شمس تبریزی کے شعر کے مقابلہ میں پست ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دورِ جام
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

ایک شاعر متخلص بہ ثبات کا شعر ہے ؎

با آنکہ ہمہ عمر نہ رفتم ز در او!!
پرسد ز من از ناز ترا خانہ کدام است

مرزا اپنے انداز میں ایک ایسے ہی خیال کو ظاہر کرتے ہیں۔ اگرچہ یہاں ان کا شعر ثبات کے شعر سے ماخوذ ہونے کا احتمال نہیں رکھتا ؎

لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے
یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

خضر لاری کا ایک مصرعہ ہے۔

در بزم او کسے بہ بدی ہم نبرد نام

مرزا نے اس طرح اس مصرعہ کا ترجمہ کرتے ہوئے مضمون کو کسی قدر بلند کر دیا ہے۔

ذکر میرا بہ بدی بھی اسے منظور نہیں

فیاض لاہجی کا ایک شعر ہے ؎

ہر کس کہ زخم کاری ما را نظارہ کرد
تا حشر دست و بازوئے او را دعا کند

مرزا ذیل کے ایک شعر میں یہی مضمون اس طرح پیش کرتے ہیں ؎

نظر لگے نہ کہیں ان کے دست و بازو کو
یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں

مرزا کا یہ شعر بہت مشہور اور قابل تعریف ہے لیکن فیاض کے شعر سے ماخوذ ہے۔

ایک فارسی شاعر کہتا ہے ؎

تا نیفتد ہر کہ تن پرور بود۔ خوش بود گر دانہ نبود دام را

مرزا کا یہ شعر اسی فارسی شعر سے ماخوذ معلوم ہوتا ہے ؎

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لیکر بہشت کو

حیدر تبریزی کا شعر ہے ؎

چو ریزم اشک از دل آہ درد آلود می خیزد
بلے چوں آب بر آتش بریزد دود می خیزد

مرزا نے اپنے ایک شعر میں اسی مفہوم کو ادا کرنے کی کوشش کی ہے لیکن صاحب مذاق اصحاب سے یہ امر پوشیدہ نہیں کہ ان کا یہ شعر حیدری کے مقابلے میں ناقص ہے ؎

آگ سے پانی میں بجھتے وقت اٹھتی ہے صدا
ہر کوئی درماندگی میں نالہ سے ناچار ہے

بیدل کا ایک شعر ہے ؎

می روم از خویش و در اندیشۂ باز آمدن
ہمچو عمر رفتہ یارب بر نگردانی مرا

مرزا اس مفہوم کو یوں ادا کرتے ہیں ؎

مستانہ طے کروں ہوں رہ وادیِ خیال
تا بازگشت سے نہ رہے مدعا مجھے

ذوقی سمرقندی کہتے ہیں ؎

مکن تغافل ازیں بیشتر کہ می ترسم
گماں برند کہ ایں بندہ بے خداوند است

مرزا کے اس شعر کا مضمون ذوقی کے شعر سے ماخوذ ہے ؎

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

شرف قزوینی کا ایک شعر دیکھیے ؎

ہست صد منت بجاں از غیبتِ بدگو مرا
چوں بایں تقریبِ من آرد بیاد او مرا

مرزا کے مندرجہ ذیل شعر کا ماخذ یہی فارسی شعر ہے جو مقابلتاً زیادہ واضح ہے ؎

گرچہ ہے کس کس برائی سے ولے با ایں ہمہ
ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے

ایک فارسی شاعر کا شعر ہے ؎

تو ملولی ز ما و ما مشتاق - دل بدل میرود چہ عالم است

مرزا کہتے ہیں ؎

ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار - یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے.

یہ شعر فارسی شعر کا ترجمہ ہے، جو خفیف سا فرق مصرعہ ثانی میں باعتبار معنی پایا جاتا ہے بحر کی پابندی اور ترجمہ کی قید سے لازمی تھا.

نزالی خوارمی کا ایک شعر ہے ؎

تنہا نصیب من غم و دردِ حبیب نیست
از ہیچ درد و غم دلِ ما بے نصیب نیست

مرزا نے مندرجہ ذیل شعر میں اسی مفہوم کو الفاظ و تخیل میں تصرف کر کے ادا کیا ہے ؎

تیری وفا سے کیا ہو تلافی کہ دہر میں
تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے

رضی سمرقندی کا ایک شعر سنیے ؎

ستارہ نیست در گوش آں ہلال ابرو
ز روئے حسن بہ خورشید می زند پہلو!

مرزا کے مندرجہ ذیل شعر کا اس شعر سے مقابلہ کیجیے ؎

گوہر کو عقدِ گردنِ خوباں میں دیکھنا
کیا اوج پر ستارۂ گوہر فروش ہے

اس میں کلام نہیں کہ دونوں شعر اپنی اپنی جگہ خوب

ہیں۔ لیکن باوجود اس امر کے کہ دونوں کے مفہوم میں کسیقدر خلاف ہے۔ مرزا کا مفہوم رضی کے شعر سے ماخوذ معلوم ہوتا ہے۔

فیضی کہتے ہیں ؎

نوشدارو بے محبت راپہ پرسی جزاکہ چیست
سودۂ الماس در زہر ہلاہل می کنند

مرزا ہو بہو اسی شعر کا ترجمہ یوں پیش کرتے ہیں ؎

نہ پوچھ نسخہ مرہم جراحت دل کا
کہ اس میں ریزۂ الماس جزو اعظم ہے

عرفی شیرازی فرماتے ہیں ؎

کے لازم است بادہ کشیدن زجام زر
مقصود تو گر انیست قصور سفال چیست

مرزا کا شعر ہے ؎

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا
ساغر جم سے مرا جام سفال اچھا ہے

مرزا کا یہ شعر مشہور ہے۔ اور عرفی کے شعر کے مقابلے میں پر زور بھی۔ لیکن مضمون اس میں بھی ان کا نہیں۔

فسونی تبریزی کا شعر ہے ؎

بادوچو میرسم آسودہ می شوم از دور
ندیدہ حال مرا وقت بے قراری حیف

مرزا کا شعر ملاحظہ ہو ؎

اُن کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

یہ شعر مرزا کے بلکہ اردو زبان کے بہترین اشعار میں سے سمجھا جاتا ہے۔ اور فی الواقع ہے بھی خوب۔ لیکن اس میں بھی سوائے زبان اور بندش کے مرزا کا کوئی حصہ نہیں۔

حسن بیگ رفیع کا بھی ایک شعر سنئے ؎

خوش دلم زیں کہ باد نامہ نویسم شب و روز
مقصدم نیست کہ مکتوب رسد یا نرسد

مرزا قریب یہی بات اردو میں کہتے ہیں ؎

خط لکھیں گے گرچہ کچھ مطلب نہ ہو
ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے

مضمون یکساں ہے۔ اور طرز بیان میں بھی کوئی خاص فرق نہیں۔

ذوق کا ایک نہایت مشہور شعر جس کی مرزا بھی بڑی تعریف کرتے تھے۔ یہ ہے ؎

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

مرزا نے اپنے الفاظ میں اسی خیال کو جامہ پہنانے کی یوں کوشش کی ہے ؎

ہائے واں بھی شورِ محشر نے نہ دم لینے دیا
لےگیا تھا گور میں ذوقِ تن آسانی مجھے

ذوق کے شعر کا مضمون بلند تر ہے۔ اور اسی وجہ سے زیادہ شگفتہ نظر آتا ہے۔

عرفی شیرازی کا ایک اور شعر ہے ؎

بیار بادہ کہ جانم دمے زنالہ برآید
ہزار زمزمہ از دل بیک پیالہ برآید

مرزا کے مندرجہ ذیل شعر کا ماخذ عرفی کا یہی شعر ہے

پھر دیکھئے اندازِ گل افشانیٔ گفتار
رکھ دے کوئی پیمانۂ صہبا مرے آگے

امیر خسرو فرماتے ہیں ؎

گفتم چگونہ می کشی و زندہ میکنی،
از یک نگاہ کشت و نگاہِ دگر نہ کرد

مرزا یہی مضمون یوں باندھتے ہیں ؎

کرنے گئے تھے اس سے تغافل کا ہم گلہ
کی ایک ہی نگاہ کہ بس خاک ہو گئے،

عاقل خاں رازی کہتے ہیں ؎

نہ مرا کرد رقیب از سر کوئے تو جدا
اول ایں حادثہ بہ آدم و حوا گزشت

مرزا کا مشہور شعر ہے ؎

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں لیکن
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

یہ شعر بھی قریب قریب فارسی شعر کا ترجمہ ہے۔ لیکن اتنا ضرور ہے۔ کہ مرزا کے شعر میں انداز بیان نے جان ڈال دی ہے۔

فریدوں خراسانی کا ایک شعر ہے ؎

از ضعف دل مثال فریدوں بیکسی
بیدار دل قوی کہ کسِ بیکساں خداست

مرزا اپنے شعر میں اس مضمون کو مذاق کے لحاظ سے زیادہ موثر پیرائے میں یوں بیان کرتے ہیں ؎

بیدل نہ ہو بیگانگیٔ خلق سے غالب
کوئی نہیں تیرا تو مری جان خدا ہے

متاخرین ایران میں سے کسی کا شعر ہے ؎

مشاطہ را بگو کہ بر اسباب حسن دوست
چیزے فزوں کند کہ تماشا بہ ما رسید

مرزا کا مندرجہ ذیل شعر اسی مطلب کو برنگ دیگر ادا کرتا ہے ؎

زمانہ عہد میں اس کے ہے محوِ آرائش
بنیں گے اور ستارے اب آسماں کیلئے

مثنوی پدماوت میں عبرت کا ایک شعر ہے ؎

نزاکت سے شکم میں بچہ اس کا
نظر آوے تھا جوں مینا میں صہبا

مرزا نے اسی مضمون کو لیکر فارسی میں اس طرح باندھا ہے ؎

چوں صورت آئینہ ز افراطِ لطافت
آید بہ نظر بچہ او از شکم او!

اسی طرح مرزا کے فارسی کلام میں بھی اسی قسم کے بہت سے اشعار پائے جاتے ہیں۔ جن کا تذکرہ بطور خود ایک علیحدہ مضمون چاہتا ہے۔ ہم اس سلسلے کو بیاں بخوفِ طوالت قلم انداز کرتے ہیں۔ صرف نمونے کے طور پر ایک دو شعر نذر ناظرین کئے جاتے ہیں:۔

حافظ شیرازی کا شعر ہے ؎

شب تاریک و بیم موج و گردابے چنیں حائل
کجا دانند حالِ ما سبکساران ساحل را

مرزا کا شعر ملاحظہ فرمایئے ؎

ہوا مخالف و شب تار و بحر طوفاں خیز

گسستہ لنگر کشتی و ناخدا خفتہ است

مرزا کے مصرعۂ ثانی میں بجائے اس کے کہ سبکسارانِ ساحل کو حال معلوم نہیں انہیں مشکلات اور سختیوں کا حال پایا جاتا ہے۔ جن کا ذکر دونوں شاعروں کے مصرعۂ اول میں موجود ہے۔

خواجہ حافظ کے اور دو شعر مختلف بحروں میں ملاحظہ فرمائیے ؎

علاج بر سرِ دار ایں نکتہ خوش سرایند
از شافعی مپرسید امثال ایں مسائل

رازِ درونِ پردہ ز رندانِ مست پرس
کیں حال نیست صوفی عالی مقام را

مرزا نے انہیں دو شعروں کے مضمون کو ایک کے دوسرے لباس میں اس طرح جلوہ گر کیا ہے ؎

آں راز کہ در سینہ نہاں است نہ وعظ است
بر دار تواں گفت و بہ منبر نتواں گفت

اس میں شک نہیں کہ مرزا نے یہ شعر اختصار اور خوبی کے ساتھ بہتر الفاظ میں لکھا ہے۔ ناظرین خود اس فرق کو محسوس کر سکتے ہیں۔

رہا یہ کہ مرزا کے کلام سے کن شاعروں نے خیالات اور مضامین اخذ کئے ہیں، اس کے متعلق اتنا ہی لکھدینا کافی ہے۔ کہ ان کی تعداد بے انتہا ہے۔ بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ ملک کے وہ تمام شاعر جو شاعری میں نام پیدا کر گئے۔ اور خاص کر غزل گوئی میں شہرۂ آفاق ہوئے کم و بیش مرزا سے استفادہ کرنے میں بے نیاز نہیں رہے اور بلاواسطہ و بالواسطہ مستفیض ہوئے۔ اگر ان تمام شعار کا ذکر کیا جائے۔ تو یقیناً ہمارا مضمون ایک ضخیم کتاب کی صورت اختیار کر لے گا۔ لہذا ہم نمونے کے طور پر فقط انہی چند شعراء کا حوالہ دیں گے۔ جن کے ایسے اشعار ہماری یادداشت میں محفوظ ہیں۔

مرزا کا ایک شعر ہے ؎

حضرتِ ناصح گر آئیں دیدۂ و دل فرشِ رہ
کوئی مجھکو یہ تو سمجھا دو کہ سمجھائیں گے کیا!

مولانا حالی نے بالکل یہی مضمون دو شعروں میں باندھا ہے ؎

واعظ آتا ہے تو آنے دو اسے،
پر مزا آنے کا یاں کیا پائے گا:
آئے گا اور ہمکو شرمائے گا مفت
اور خود شرمندہ ہو کر جائے گا

مرزا ؎

غم اگرچہ جاں گسل ہے یہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غم عشق گر نہ ہوتا غمِ روزگار ہوتا،

یہ مضمون بھی مولانا حالی نے مرزا سے لیا ہے۔ اور کسی قدر پہلو بدل کر اس کو یوں بیان کیا ہے ؎

دل نہ طاعت میں لگا تب تو لگایا غمِ عشق
کسی دھندے میں تو آخر یہ لگایا جاتا

مرزا ؎ قاصد کو اپنے ہاتھ سے گردن نہ ماریئے
اس کی خطا نہیں تھی یہ میرا قصور تھا

عالیجاہ نظام آصف نے یہی مضمون اپنے شعر میں جلوہ گر کیا ہے ؎

ایلچی کو بھی کوئی قتل کیا کرتا ہے؟
میں خطاوار تھا قاصد تو خطادار نہ تھا

مرزا — وا کر دیئے ہیں شوق نے بندِ نقابِ حسن
غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا

اپنے ایک سخن فہم دوست نے ہمیں مرزا کے مندرجہ صدر شعر کی طرف توجہ دلائی، اور کہا، کہ ہمارے ذیل کے شعر کا مضمون دراصل مرزا کا ہے، ہمارا نہیں۔ ناظرین ملاحظہ فرمائیں —

ہے اضطرابِ شوق نقابِ رخِ امید
تارِ نگاہ پردۂ مژگاں سے کم نہیں

مرزا — شوق بے ساماں طرازِ نازشِ اربابِ عجز
ذرہ صحرا دستگاہ و قطرہ دریا آشنا

مولانا حسرت موہانی کا یہ شعر مرزا کے شعر سے کتنا مشابہ ہے —

شوق سے تیرے بڑھے کیا کیا دلوں کے مرتبے
مہر ذروں کو کیا قطروں کو دریا کر دیا!

مرزا — تا کرے نہ غمازی کر لیا ہے دشمن کو
دوست کی شکایت میں ہم نے ہمزباں اپنا

بارہ تیرہ سال کا عرصہ ہوا کہ لالہ سری رام صاحب ایم اے دہلوی مرحوم مولف "خمخانہ جاوید" بغرض سیر و تفریح کشمیر تشریف لائے تھے۔ اس تقریب میں ایک شاندار مشاعرہ ایس، پی، کالج سری نگر کے ہال میں منعقد کیا گیا۔ اور لالہ صاحب مرحوم کی خدمت میں راقم نے شعرائے کشمیر کی طرف سے ایک ایڈریس بھی پیش کیا۔ منجملہ دیگر شعرا کے خان صاحب میر منشی سراج الدین احمد خان صاحب نے ایک غیر طرحی غزل پڑھ کر سنائی، اس کا ایک شعر جس کی حاضرین جلسہ نے داد دی تھی، مرزا کے اسی شعر کا چربہ ہے —

دکھائی ایسی ہمدردی کہ بے کھٹکے رقیبوں نے
سنا دی داستاں اپنی سمجھ کر رازداں مجھکو

مرزا — غم سے مرتا ہوں کہ اتنا نہیں دنیا میں کوئی
کہ کرے تعزیتِ مہر و وفا میرے بعد

منور خان غافل نے یہی خیال اسی زمین میں یوں ظاہر کیا ہے —

گرم بازاریِ الفت ہے مجھی سے ورنہ
کوئی لینے کا نہیں نامِ وفا میرے بعد

مرزا — ہوں فشارِ ضعف میں کیا ناتوانی کا نمود
قد کے جھکنے کی بھی گنجائش مرے تن میں نہیں

حکیم مومن خان مومن نے مندرجہ ذیل شعر کا ماخذ مرزا کا یہی شعر ہے البتہ مومن نے مضمون بلند تر کر دیا ہے —

اب تو مرجانا بھی مشکل ہے ترے بیمار کو
ضعف کے باعث کہاں دنیا سے اٹھا جائے ہے

ارشد دہلوی نے بھی یہی مضمون اس طرح ادا کیا ہے —
ضعف میں مرنا بھی مشکل ہو گیا۔ جان اٹکی ہے نفس کے تار سے

ارشد کا مضمون یقیناً پست تر ہے۔

مرزا — مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دورِ جام
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

رسالہ "شاعر" آگرہ بابت ماہ جنوری ۱۹۳۱ء میں لالہ
گوردھن لال صاحب نامی کی ایک طرحی غزل نظر سے
گزری۔ جس کا یہ شعر مرزا کے شعر سے ماخوذ ہے ؎

کچھ بے طرح سے آج تو لطفِ خمار ہے!
ساقی نے جانے کیا ہے ملایا شراب میں

مرزا ؎ شرم اک ادائے ناز ہے اپنے ہی سے سہی
ہیں کتنے بے حجاب کہ ہیں یوں حجاب میں

مولانا حسرت موہانی نے اس سے ایک باریک
اور عمدہ مضمون پیدا کیا ہے ؎

چھپے جو مجھ سے تو کیا یہ بھی اک ادا نہ ہوئی
وہ چاہتے تھے نہ دیکھے کوئی ادا میری!

ارشد دہلوی کا مندرجہ ذیل شعر بھی مرزا کے اسی شعر
سے ماخوذ ہے ؎

حسن ان کا تاب سوزِ نگہ اپنی ناتواں
وہ بے حجابیوں پہ بھی ہیں سو حجاب میں

مرزا ؎

وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگدل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو

راقم مضمونِ ہذا کا شعر ہے ؎

خواہشِ سجدہ ہے سنگِ آستانِ یار پر
پھوڑنا سر کا ہے گویا نقشِ پیشانی مجھے

اپنے استادِ نامدار قبلہ علامہ کیفی دہلوی کے سمجھانے
سے ہمیں ماننا پڑا، کہ اس شعر کا مضمون مرزا کے مندرجہ بالا
شعر سے لڑ گیا ہے۔ بلکہ یہ شعر کہتے وقت غالباً یہی مضمون
ہمارے ذہن میں جاگزیں تھا۔

مرزا ؎

گرچہ ہے طرزِ تغافل پردہ دارِ رازِ عشق
پر ہم ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ وہ پا جائے ہے

مومن کے مندرجہ ذیل شعر کا ماخذ مرزا کا یہی
شعر ہے ؎

کل تم جو بزمِ غیر میں آنکھیں چرا گئے:
کھوئے گئے ہم ایسے کہ اغیار پا گئے

مرزا ؎

ہے دلِ شوریدۂ غالب طلسمِ پیچ و تاب
رحم کر اپنی تمنا پر کہ کس مشکل میں ہے

امیر مینائی نے مرزا کے اس مضمون کو اپنے رنگ
میں اس طرح رنگا ہے۔ کہ سطحی نظر سے کام لینے والے
احباب اس کو امیر ہی کا مضمون سمجھیں گے ؎

دل آپ کا کہ دل میں جو کچھ ہے سب آپ کا
دل لیجیے مگر مرے ارماں نکال کے!

مرزا نے اگرچہ اپنے شعر میں تمنا بر آنے کے مضمون
کو نئی طرح سے ادا کیا ہے۔ لیکن امیر کا شعر زیادہ سلیس
ہونے کی وجہ سے واقعی بدرجہا بہتر ہے۔

مرزا ؎

ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں۔ ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

اکبر الہ آبادی کے مندرجہ ذیل شعر میں اسی شعر کی
جھلک پائی جاتی ہے۔ اگرچہ دونوں کے مفہوم میں فرق ہے
؎ میرے سکوت سے مجھے ناداں نہ جانیے۔

الفاظ کی کمی ہے خیالات کی نہیں۔
مرزا: پر ہوں میں شکوے سے یوں راگ سے جیسے باجا
اک ذرا چھیڑیئے پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے
سرڈاکٹر اقبال کی قابل قدر نظم "نوائے غم" کا پہلا شعر اسی شعر کا مولود ہے۔ بلکہ اس ساری نظم کا محرک یہی شعر کہا جا سکتا ہے ؎

زندگانی ہے مری مثل رباب خاموش!!
جس کے ہر رنگ کے نغموں سے ہے لبریز آغوش

مرزا کا مشہور شعر ہے ؎

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے
تمہیں کہو کہ یہ انداز گفتگو کیا ہے؟

نثار علی خان نثار مرزا کا یہ شعر تقریباً لفظ بہ لفظ یوں چرا لیتے ہیں ؎

مجھ سے کہتے ہیں وہ کہ تو کیا ہے
کوئی پوچھے یہ گفتگو کیا ہے

سرقہ ظاہر کی اس سے بڑھ کر اور کونسی دلیل ہو سکتی ہے؟ مرزا ؎

وعدہ آنے کا وفا کیجے یہ کیا انداز ہے
تم نے کیوں سونپی ہے میرے گھر کی دربانی مجھے

مولانا حالی یہی خیال دوسری صورت میں یوں ظاہر کرتے ہیں ؎

شب وعدہ ہے بارعام ان کے در پر
مرے حق میں اک پاسبانی کی صورت

مرزا ؎

وہ آیا بزم میں دیکھو نہ کہیو پھر کہ غافل تھے
شکیب و صبر اہل انجمن کی آزمائش ہے

سالک نے اسی مضمون کو یوں ادا کیا ہے ؎

وہ زیب شبستاں ہوا چاہتا ہے
یہ مجمع پریشاں ہوا چاہتا ہے

مولانا حالی نے بھی استاد کا یہ مضمون اپنے ایک شعر میں داخل کیا ہے ؎

دل چاہتا ہے بزم طرب میں انہیں مگر
وہ انجمن میں آئیں تو پھر انجمن کہاں

مرزا ؎

زندگی میں تو وہ محفل سے اٹھا دیتے تھے
دیکھوں اب مر گئے پر کون اٹھاتا ہے مجھے

سرڈاکٹر اقبال نے مرزا سے یہ مضمون لیکر ذرا سی تبدیلی کر کے اس میں جدت پیدا کی ہے ؎

ایسی ذلت ہے میرے واسطے عزت سے سوا
خود وہ اٹھکر مجھے محفل سے اٹھا دیتے ہیں

پروفیسر نندلال طالب ایم اے

اندھا مصوّر

(۱)

ایک فلک بوس شاہی محل تھا اور ایک مختصر سی خس وخاشاک کی جھونپڑی۔ ان دونوں میں اس قدر بعد تھا جتنا "بھاگیرتی گنگا" کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک ہے۔ جہاں وہ سورگ کی بلندیوں سے اونچی نیچی پہاڑیوں کے زینے طے کرتی ہوئی "مکشما" کی دیوی کی طرح اترتی ہے، اور جہاں ایک مقدس اور دیوتائی ترنم کے درمیان میدانی پستیاں، اور کوہستانی بلندیاں آپس میں بغلگیر ہوتی ہیں۔

صبح جب سورج مشرقی آسمان پہ بلند ہونے لگتا، اس محل کی سب سے اونچی اٹاری کی پرچھاؤں، جہاں مہارانا کی عیش منزل تھی، گھاس پھوس کی جھونپڑی کے پاؤں چھوتی، اور پھر دھیرے دھیرے پیچھے ہٹتی ہوئی محل کی دیوار کے تلے مل جاتی۔ جس طرح کوئی گنہگار اپنے روٹھے ہوئے دیوتا کو منانے کے لئے آئے۔ مگر معبود کے عتاب اور غصے سے ڈر کر باہر ہی سے نمسکار کر کے پلٹ جائے...... اور جس وقت شام کو سورج نظروں سے اوجھل ہونے لگتا، اور سائے پورب کی سمت بہت طویل ہو جاتے۔ تو اس جھونپڑی کا سایہ راج محل کے مغربی حصہ پر پڑ کر اوپر اٹھتا ہوا اٹاری کے کنگرے اور کلس سے بھی بلند ہو جاتا۔ دور سے دیکھنے پر یہ منظر ایسا معلوم ہوتا۔ جیسے کسی غیبی طاقت نے اس خوبصورت محل کے قریب تاریکی کا ایک بہت اونچا مینار یکایک تعمیر کر دیا ہے۔ اور پھر یہ سب کچھ رات کی تاریکیوں میں گم ہو جاتا۔ اور محل کے اندر سے فانوسوں اور قندیلوں کی شفاف روشنی کی ہلکی ہلکی شعاعیں کھڑکیوں کے شگافوں اور روشندانوں میں سے چھن چھن کر اس جھونپڑی میں جلنے والے دھوئیں دھار چراغ کی سرخ سرخ، مدھم سی روشنی کیساتھ کھیلنے لگتیں۔

اس جھونپڑی میں سترہ اٹھارہ سال کا ایک سانولے رنگ کا گوالا رہتا تھا۔ اور اس کی برف جیسے سفید بالوں کی اندھی، دبلی اور دائم المریض ماں...... یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ محل کی عیش منزل میں ہیرے جواہرات سے پٹے ہوئے شاہانہ لباس اور شاہی تلوار پہننے والا ایک بارعب اور منصف مزاج مہارانا، اور اس کی پروقار حسین مہارانی رونق افروز رہا کرتے تھے۔ مگر شیشوں جڑی بند کھڑکیوں میں سے انہیں جھونپڑی کے مکینوں نے آج تک دیکھا نہیں تھا۔

ایک دن بسنت کا تیوہار تھا۔ گوالا لوگوں کے ڈھور ڈنگر چرانے نہیں گیا تھا۔ وہ جھونپڑی کے دروازے میں ایک پھٹے پرانے بوریے کے ٹکڑے پر بیٹھا، اپنی لاٹھی پر موم کے پھولوں کے سفید سفید بند لگا رہا تھا۔ قریب ہی اس

کی جان ست پیاری بانسری پڑی تھی۔ اس پر بھی تپلے تپلے پروں کے دو ننھے ننھے بند لگے ہوئے تھے۔ دونوں سروں پر پرے پیسے اسرخ نقلی موتیوں کی چھوٹی چھوٹی لڑیاں بھی لٹکا رکھی تھیں۔ اندر۔۔۔۔۔۔۔ ایک بوسیدہ سی کھاٹ پر دائم المریض ماں بحران کی حالت میں پڑی کراہ رہی تھی۔ ایک نحیف اور افسردہ آواز میں ماں نے پانی مانگا۔ اور گوالا اپنی لاٹھی کے بند کو ادھورا ہی چھوڑ کر اندر گیا جیب سے دوا کی ایک گولی جسے وہ آج صبح راج اوشدھالیہ سے لایا تھا۔ نکالی اور ماں کو کھلا دی۔ آبخورے میں سے پانی کے دو گھونٹ پلائے۔ اور باہر آ کر پھر اپنے شغل میں مصروف ہو گیا۔

جھونپڑی کے اندر سے ایک چیخ کی آواز سنائی دی۔ یہ دوا کھانے کیلئے کہنیوں کے سہارے اٹھ بیٹھی ہوئی ماں پھر چارپائی پر لیٹ گئی تھی۔ گوالا بولا۔ "ہے ایشور! میں ماتا جی کے دکھ کو زیادہ عرصے تک نہیں دیکھ سکتا۔ یا تو اب انہیں صحت بخش دو۔ یا اپنے چرنوں میں۔۔۔۔۔۔"

جملہ ابھی پورا نہیں ہوا تھا۔ کہ راج محل کی اٹاری میں سے دو مترنم قہقہے فضا میں گونجتے ہوئے سنائی دیئے۔ گوالے کی نظریں بے اختیار اوپر کو اٹھ گئیں۔ عیش منزل کی کھڑکی کھلی تھی۔ اور اندر ایک مرد بسنتی رنگ کا کامدار ریشمی جبہ پہنے کھڑا تھا۔ اور ایک عورت پیلے رنگ کی ریشمی ساڑھی جس پر سونے کی تاروں کی بیلیں بنی ہوئی تھیں۔ پہنے کھڑی تھی۔ یہ دونوں ادھر کو پشت کئے ہوئے تھے چہرے کھڑکی کی اونچائی سے اوپر ہونے کے باعث دکھائی نہ دیتے تھے۔

پھر ایک مردانہ قہقہہ سنائی دیا۔ ساتھ ہی مہاراجا نے کہا۔ "اگر پسند نہیں تو پھینک دوں"؟ پھر مہارانی کی شیریں آواز۔ "پھینک دو۔ میری بلا سے!" اور ساتھ ہی کوئی چمکدار چیز کھڑکی میں سے باہر ہوا میں اچھلی، اور ایک لمحہ کے اندر زمین پر آ رہی۔ جیسے کوئی جڑاؤ زیور ہو۔ "ہے! ہے!! آپ نے تو سچ مچ ہی!" ایک اور آواز آئی، پھر مہارانی نے کھڑکی میں سے نیچے کی طرف جہاں زیور گرا تھا۔ دیکھنے کے لئے منہ باہر نکالا۔ گوالے کی نظریں مہارانی کے جمال کو دیکھکر خیرہ ہو گئیں۔ وہ بھونچکا سا رہ گیا۔ اسے پتہ نہیں رہا کہ کب عیش منزل کی کھڑکی بند ہوئی۔ اور کب ایک باندی نیچے آ کر مہارانی کا نو لکھا ہار واپس اٹھا کر لے گئی۔

(۲)

جسوقت گوالے کا سلسلۂ تخیل ٹوٹا۔ اس وقت رات کا پہلا حصہ قریب الاختتام تھا۔ اور آبادی کا شور رات کے بھیانک سکوت میں آہستہ آہستہ ڈوبتا جا رہا تھا۔ اس نے آنکھیں مل کر ادھر ادھر دیکھا۔ "مجھے کیا ہوا؟" وہ بڑبڑایا۔ پھر محل کی تاریک اور خاموش دیواروں کی طرف دیکھا۔ بیمار ماں کا خیال آتے ہی وہ اندھیرے میں بانسری اور لاٹھی کو ٹٹول کر پور ریئے کا ٹکڑا سنبھالتا ہوا تیزی سے اٹھا، اور جھونپڑی میں داخل ہو گیا۔

اندر گھپ اندھیرا تھا۔ گوالے نے آج شام کو چراغ نہیں جلایا تھا۔ اور بڈھی ماں کا تو چراغِ حیات ہی بجھ رہا تھا۔ وہ اپنے اوپر ملامت کرتا ہوا آگے بڑھا۔ تاریکی میں اسے کسی چیز سے ٹھوکر لگی، یہ کوئی جانور تھا۔ وہ وہاں سے

کود کر انگیٹھی کی طرف بڑھا۔ چمٹے سے راکھ کے نیچے دبی ہوئی آگ نکالی۔ اور قریب پڑے ہوئے گھاس پھوس اس پر رکھنے کے بعد دو تین پھونکیں مار کر آگ جلائی تاکہ چراغ روشن کر کے جانور کو دیکھے۔ مگر چراغ میں تیل نہیں تھا۔ بتی زمین پر گری پڑی تھی۔ اور دروازے کے نزدیک کھڑا ہوا کتا۔ جو جھونپڑی کے اندر گھس کر ڈیوٹ پر رکھے ہوئے چراغ کا تمام تیل پی گیا تھا۔

آگ پر ڈالا ہوا پھوس جل کر ختم ہو گیا تھا۔ روشنی سے ڈر کر بھاگی ہوئی تاریکی پھر اُمڈ کر ہر چیز پر مسلط ہو گئی۔ گوالے نے ایک سرد آہ بھری۔ گھر میں اور تیل نہیں تھا اور جیب خالی تھی۔ اس نے آگ پر اور پھوس ڈال کر پھونکیں مارنی شروع کیں۔ اور تھوڑی دیر کے لئے یہ تاریک فضا پھر روشن ہو گئی۔ متحرک شعلوں کی روشنی میں وہ ماں کی چارپائی کی طرف بڑھا۔

پایوں کے سروں پر چار مستطیل ڈنڈوں سے گھرے ہوئے رسیوں کے گڑھے میں ایک بے حس و حرکت جسم پڑا تھا۔ نہ آنکھوں میں چمک تھی۔ نہ سینے میں سانس جس وقت گوالا مہارانی کے بے جہانتاب کی جھلک دیکھ کر استعجاب و تحیر کے سکر آمیز انہماک میں گم تھا........ اس وقت ماں وہ شفقت و احسان کی دیوی کے منہ سے بیٹا! بیٹا!! کی دو نحیف اور کانپتی ہوئی آوازیں نکلی تھیں۔ اور پھر وہ سرد ہو گئی تھی۔ اس وقت اس کی آنکھوں میں اپنے نورِ چشم کو صرف ایکبار دیکھنے کی آرزو۔ پھیلے ہوئے بازوؤں میں اپنے لختِ جگر کو سینے سے لپٹا لینے کی تمنا۔ خشک لبوں پر اپنے پتر کو آخری "شیر داد دینے" کے الفاظ سب مردہ ہو کر رہ گئے تھے۔ گوالے نے ماتا جی! ماتا جی!! کہکر کئی بار پکارا دل پر ہاتھ رکھا۔ پھر اس کی چیخیں جھونپڑی کی تاریکی میں گونجنے لگیں۔ آگ پر ڈالا ہوا پھوس جل چکا تھا۔

گوالے کی اس جھونپڑی کے قریب دور تک کوئی آباد مکان نہیں تھا۔ اردگرد... کچے مکانوں کے کھنڈر ضرور تھے۔ جن میں کبھی کبھی ایک معتوب شاہی غلام دکھائی دیتا تھا گوالا تاریکی میں بیٹھا دیر تک پھوٹ پھوٹ کر روتا رہا جب تھک گیا۔ تو دبی ہوئی چنگاریوں پر پھوس ڈال کر پھر آگ روشن کی۔ پھونک مارتے وقت اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے چند قطرے آگ پر گر پڑے بیقرار شعلوں کی روشنی میں متحرک سائے اس طرح معلوم ہوتے تھے۔ جس طرح ایک گمنام جنگل میں کسی گم کردہ راہ مسافر کی لاش کے اردگرد گرسنہ گیدڑوں کا ایک گروہ اچھل کود رہا ہو۔ ماں کی شفقت میں پلا ہوا گوالا خوف سے تھرا اٹھا۔ اسے خواب میں بھی یہ خیال نہ آیا تھا۔ کہ اسے کبھی ایک مردے کے پاس رات بسر کرنا ہوگی۔ ماں کے مردے کے پاس۔ اس کی عمر بیفکری سے بانسری بجانے، گنے چوسنے۔ کھیرے اور تربوز کھانے، گلی ڈنڈا کھیلنے، اور گھنگرو اور کوڑیاں جمع کرنے میں بسر ہوئی تھی۔

رات ختم ہو چکی تھی۔ گوالا رو رو کر تھک چکا تھا، اس کی پلکیں نیند اور تھکاوٹ سے دبی جا رہی تھیں مگر غم اور ماتم میں نیند بری معلوم ہوتی ہے۔ صبح کاذب کا نور جھونپڑی کے اندر داخل ہو رہا تھا۔ یکایک گوالا بڑبڑایا

ارے! ماتا جی تو چارپائی پر ہی مرگئی ہیں؟ اُف! مجھ بدبخت نے انہیں مرتے دم زمین پر بھی نہ لٹایا! فرطِ غم نے اسے اس وقت تک یہ محسوس ہونے نہ دیا تھا۔ وہ تندی سے اُٹھا۔ زمین پر بوریا بچھایا پھر کانپتے ہوئے ہاتھوں کے ساتھ ماں کے سرد اور اکڑے ہوئے جسم کو اس پر لٹا دیا اور ساتھ ہی دھاڑیں مار مار کر رونے لگ پڑا۔ دھیرے دھیرے دن نکل آیا۔ اور شہر کے دیگر گوالے جو اس کو ساتھ لیکر ہر روز مویشی چرانے جایا کرتے تھے۔ جمع ہو گئے پھر ان کی عورتیں ...... سے "شمشان بھومی" میں لے جا کر جلا دیا گیا۔ غریب انسانوں کو نہ کسی پنچایت کی ضرورت ہے۔ نہ کسی رسم و رواج کی ...... کی فاقہ کشی اور تن عریانی ہی سوگواروں اور ستم رسیدوں سے بڑھ کر ہے

(۴)

گوالا ایسا ناخلف تو نہیں تھا کہ اپنی ماں کا سوگ نہ مناتا دنوں وہ روتا رہا۔ آخر جیون آیا۔ مگر وہ اس نظارے کو نہ بھلا سکا۔ جو اس نے ایک شام راج محل کی عیش منزل کی کھڑکی میں دیکھا تھا۔ وہ ایک بجلی تھی، جو اس کے خرمن دل کو جلا کر سیاہ بادلوں میں چھپ گئی تھی۔ وہ کئی دنوں تک جھونپڑی کے دروازے میں بیٹھا کھڑکی کی طرف دیکھتا رہا۔ اس امید پر کہ یہ پھر کھلے گی۔ اور وہ مہارانی کے درشن کر سکے گا اس نے مویشی چرانے چھوڑ دیئے۔ وہ تمام وقت پاگلوں کی طرح محل کی طرف ٹکٹکی لگائے دیکھتا رہتا۔ رات کو جھونپڑی کے اندر بیٹھکر اپنے تصوراتِ جمیل کی ایک دنیا بسا لیتا۔ اور اسی میں اسے کھیلتے کھیلتے صبح ہو جاتی۔ کبھی کبھی ایک آدھ گھنٹے کیلئے اس پر نیند بھی مسلط ہو جاتی۔ مگر بے سود۔ تصور کی مضبوطی اسے بھی حسین خوابوں کا ایک مجموعہ بنا دیتی جب کبھی اسے بھوک لگتی، تو ایک برتن میں سے کچے اناج کی دو ایک مٹھیاں نکال کر جو گوالوں نے اور ان زمینداروں نے جن کے وہ مویشی چرایا کرتا تھا۔ اس کی ماں کی موت پر امداد کے طور پر اکٹھا کر کے دیا تھا۔ چبا لیتا۔ اور پانی پی لیتا۔ پھر دروازے میں آ بیٹھتا۔ اسے امید تھی، کہ مہارانی اسے یکبار پھر دکھائی دے گی۔ مگر یہ امید موہوم سی ہوتی چلی گئی کامل ایک ماہ بیت گیا۔ مگر عیش منزل کی کھڑکی نہ کھلی۔

ابتدا میں گوالے کو اس کے ضمیر کی کچھ عجیب و غریب سی آوازیں سنائی دی تھیں۔ عقل و نصیحت اب مرتی ہوئی سی طاقتوں نے اس کے جنوں کو سمجھانے کی کوشش کی تھی، وہ ایک سالم رات جب اس کی ماں کی موت کا غم کسی قدر کم ہو چکا تھا۔ اور جھونپڑی کے تاریک گوشوں میں مہارانی کے خورشید جمال چہرے کے نقش و نگار اپنی بڑی بڑی مست آنکھوں اور یاقوتی تبسم ہونٹوں کے ساتھ مرتسم ہونے لگے تھے۔ یہ سوچتا رہا تھا کہ مجھے یہ بیقراری کیوں ہے؟ میں دنیا کو کیوں بھول گیا ہوں؟ مجھ پر پاگل پن کے اثرات کیوں چھا رہے ہیں؟ میں راج محل کی کھڑکی کیطرف کیوں دیکھتا رہتا ہوں؟ کیا مجھ کو مہارانی سے محبت ہے؟ اس خیال کے آتے ہی وہ چونک پڑا۔ اس نے کہا مہارانی، ...... مہارانی تو رعایا کے تمام لوگوں کی ماں ہوتی ہے۔ وہ میری بھی ماں ہے۔ ہاں، راج رانی ماں۔ مگر دل کی دھڑکن، دماغ کے چکر، جگر کی ٹیسیں، آنکھوں کے

سامنے رات دن ناچتا ہوا تصور ان سب نے اسے جھنجھوڑ دیا تھا۔ اور یہ آواز اس کے کانوں میں گونجتی سنائی دی تھی محبت ایسے فرضی رشتوں کی پروا نہیں کرتی۔ جو شاید اس کے دل کی گہرائیوں سے اٹھی تھی۔ یا جنت کی وادیوں میں پریم کے دیوتا کے ساز محبت پر گاتے ہوئے کسی حسین اور دلکش راگ کا کوئی بند تھا جو ہوا کی لہروں پر تیرتا ہوا یہاں تک پہنچا تھا۔

ایک رات گوالا بڑبڑانے لگا۔ "مہارانی مجھ سے کیوں محبت کرنے لگی۔ ایک نادار۔ ناتواں اور بدصورت گوالے کے ساتھ۔ مہاراجہ۔ اوہ! جنگجو بہادر۔ خوبصورت اور خزانوں کا مالک مہاراجہ۔ جس کی بہادروں اور تیغ زنیوں کے گیت بھک منگے فقیروں تک کی زبانوں پر ہیں۔ جس کی حسین اور پرشکوہ تصویروں نے، جب اس کی شادی نہیں ہوئی تھی دور دراز کی بیشمار ریاستوں اور بادشاہتوں کی راجکماریوں اور شاہزادیوں کے دلوں کو بے قابو کر دیا تھا۔ اور جو اب مہارانی کے سر پر سے منوں ہیرے جواہر نچھاور کر سکتا ہے اسے خوش کرنے کے لئے ریاست کے کاروبار کو بھلا سکتا ہے اس کی طرف غیر نظر سے دیکھنے والے کو آدھا زمین میں گڑوا کر تیروں سے ہلاک کروا سکتا ہے۔"

اس کے بعد وہ پھر کبھی جھونپڑی کے دروازے میں نہیں بیٹھا۔ اسے مہارانی کی محبت کا خیال لئے ہوئے شاہی محل کے مقابلے میں ایک خستہ حال جھونپڑی کے سامنے بیٹھے نظر آتا اچھا نہ لگا۔ شاید یہ احساس غیرت تھا۔ یا جذبہ [illegible]

اب اس کے پاس یہی دو شغل رہ گئے تھے [illegible]

سیلاب زدہ فرش پر مور کے پر کے ٹکڑے سے مہارانی کے چہرے کی تصویریں بناتا۔ وہ روتا، اور تصویر بناتا۔ مٹاتا، اور پھر بناتا۔ اور روتا۔ کھاٹ کے نیچے، اور چکی کے قریب چولہے کی بکھری ہوئی راکھ پر تصویریں ہی تصویریں نظر دکھائی دیتی تھیں۔ ان کے نقش و نگار ایسے واضح، اتنے پختہ، اور اس قدر آرٹ و جذبات سے لبریز ہوتے تھے۔ کہ کم کسی باکمال مصور کے شاہکار ہوں گے۔ اگرچہ دیکھنے میں یہ لکیروں کے خاکے سے معلوم ہوتے تھے۔ مگر ان میں زندگی تھی، حقیقت تھی، محبت تھی، اور سب سے زیادہ بیچارے گوالے کا دل تھا۔

ایک دن سورج مغربی افق پر پھیلے ہوئے سرخ سرخ بادلوں کی اوٹ میں دھیرے دھیرے ڈوب رہا تھا ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں۔ راج محل کی شیشوں جڑی دیواریں شفق کی روشنی میں اس طرح معلوم ہوتی تھیں جیسے سونے کے پربت ہوں۔ اس وقت ایک چھابڑی والا جو دیہات میں استریوں کے سنگار اور دیہاتی مدرسوں میں پڑھنے لکھنے کا سامان رکھ دیتے جایا کرتا تھا۔ گاؤں، گاؤں پھرتا ہوا اپنی شام کی پھیری کو ختم کر کے گھر پہنچنے کے لئے باہر سے آ رہا تھا۔ وہ جھونپڑی کے قریب آ کر رک گیا۔ ایک بار عرصہ ہوا، گوالے نے اس سے ایک ملمع کئے ہوئے سنہری پیتل کے بندوں والی بانسری خریدی تھی۔ آج پھیری والے کا مال کافی نہیں بکا تھا۔ اس لئے اس نے چاہا کہ یہاں بھی آواز دیتا چلوں۔ شاید دو چار پیسوں کی بکری ہو جائے۔ اس نے آواز دی [illegible]

[illegible]

گوالے نے چھابڑی والے کی آواز نہیں سنی، وہ اپنے خیالات کی گہرائیوں میں ڈوبا، ایک غریب نوجوان کی محبت کے انجام اور حسن اور عشق کے تعلقات پر غور کر رہا تھا۔ کبھی کبھی اس کی سرخ سرخ آنکھوں کے متورم کونوں سے ایک آدھ گرم گرم آنسو بھی گر پڑتا تھا اور "بہت اچھی بانسری" آج اس کے لئے کچھ بھی نہیں تھی۔ چھابڑی والے کو یہاں چند لمحے ٹھہرنے کے باعث کچھ تکان سی محسوس ہونے لگی۔ اس نے اپنی بھاری بھرکم چھابڑی سر پر سے اتار کر زمین پر رکھدی۔ کوئی جواب نہ پاکر اس نے اندر کی طرف جھانکا۔ وہ گوالے کو گرد آلود بالوں کے ساتھ اس حالت میں بیٹھے دیکھکر بولا "آج کسے رستے بیٹھے ہو۔ کیا کسی زمیندار نے مویشیوں کی چرائی نہیں دی ؟" گوالا چونک پڑا۔ چھابڑی والے نے قریب آکر حیرت سے پوچھا "ارے تم تو بیمار رہتے ہو"

گوالا بولا "جی! میری ماتا سورگباش ہوگئی ہیں!"

چھابڑی والے نے ہمدردی کی ایک آہ بھری۔ پھر پیشہ ورانہ انداز میں کہنے لگا "میں تو یہ سمجھکر یہاں آیا تھا، کہ تم کوئی بانسری یا گھونگھروؤں کی جوڑی خریدوگے۔ مگر تم پر تو مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے۔ آہ! بیچاری کیسی نیک اور سمجھدار بڑھیا تھی" گوالا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا، چھابڑی والا دو منٹ تک اسے تسلی دیتا رہا۔ جب وہ جانے لگا۔ تو گوالے نے پوچھا "لالہ جی! آپ کے پاس تصویر بنانے کا سامان بھی ہے۔ وہ رنگ، برش، اور کاغذ"

چھابڑی والا حیران ہوکر اس کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ بولا "ہے تو سہی! مگر تم کیا کروگے" اس کی نگاہ ان بیشمار تصویروں پر نہیں پڑی تھی، جو گوالے نے لکڑی یا پر کے ٹکڑے سے فرش پر بنائی تھیں۔ گوالا اٹھا۔ اناج سے بھرے ہوئے دو مٹکے۔ جو اس کے گھر کا اثاثہ رہ گیا تھا اٹھا لایا، اور بولا "یہ لو! اور مجھے وہ چیزیں دیدو۔ ان کی قیمت کے لئے میرے پاس یہی کچھ ہے"

بدستور حیران چھابڑی والے نے کہا "مگر تم کیا کھاؤگے" اور ساتھ ہی چھابڑی میں سے تصویرکشی کا سامان نکالنے لگا۔ رنگوں کا ڈبہ دو برش، اور موٹے موٹے سفید کاغذ کے چار تختے۔ اس کو دیدیئے۔ اور پھر ایک چھوٹی سی گٹھڑی کھول کر جس میں پہلے بھی گیہوں چنے اور جو ملا ہوا، چار پانچ سیر اناج تھا۔ زمین پر بچھا دی۔ گوالے نے کاغذ اور ڈبہ وغیرہ کھاٹ پر رکھ لئے۔ اور اناج کے دونوں مٹکے چھابڑی والے کے کپڑے میں خالی کردیئے۔ مضبوط الاعضا چھابڑی والے نے کس کر گٹھڑی باندھی۔ پھر چھابڑی اور گٹھڑی دونوں کو اٹھا کر یہ کہتا ہوا "میرے بچے دیر سے میری راہ دیکھ رہے ہوں گے" جھونپڑی سے باہر نکل گیا۔ اور گوالا برش، رنگ اور کاغذ کو جو اس کے لئے بالکل اجنبی چیزیں تھیں، دیکھنے لگا۔

(۴)

یہ حضرت عشق کی کارسازیاں ہیں۔ کہ ایک ان پڑھ اور جاہل گوالا اپنی محبوبہ کی تصویر بنانے کے لئے مصور بن رہا ہے۔ گوالے نے صبح کے انتظار میں رات بڑی بےچینی سے کاٹی۔ صبح اٹھتے ہی جب سورج کی پہلی کرن جھونپڑی میں داخل ہوئی، تو وہ رنگ وغیرہ تیار کرکے تصویر بنانے

میں مصروف ہوچکا تھا۔ اپنے تصور کی تصویر، مہارانی کی تصویر وہ انتہائی احتیاط سے ایک باکمال مصور کی طرح تصویر بنا رہا تھا۔ ایک کاغذ پر رنگوں کی . . . . شوخی یا ان کی آمیزش کو آزما کر دیکھ لیتا۔ اور دوسرے پر تصویر بناتا۔ تصویر بنانے کے اصول اسے نہ جانے کس نے سمجھا دیئے تھے۔ تمام جہان کا فنِ نقاشی سمٹ کر گوالے کے دماغ آنکھوں اور انگلیوں میں جمع ہو رہا تھا۔ آرٹ اور کمال نے شاید تمام دنیا کے شہرۂ آفاق مصوروں کا غرور توڑ دینے کے لئے اس کی تصویر میں جمع ہونا شروع کر دیا تھا۔ تاکہ وہ اپنی شبانہ روز محنتوں، کاوشوں، اصولوں اور سامان مصوری پر نازاں نہ ہوں اور ان پر ظاہر کر دیا جائے۔ کہ ایک علم و اصول سے نابلد گوالا بھی ان سے بہتر تصویر بنا سکتا ہے۔

گوالا تمام دن تصویر بناتا رہا۔ نہ کچھ کھایا، نہ پیا، اور شام کے وقت اس کی تصویر مکمل ہوچکی تھی۔ یہ مہارانی کے نصف جسم کی تصویر تھی۔ جو اس کے تصور میں آسکی تھی، اور جو وہ پہلی جھلک میں دیکھ سکا تھا۔ مگر یہ تصویر۔ اگر مہارانی کی عکسی تصویر بھی ہوتی۔ تو بھی اس سے بڑھکر نہ ہوتی، یہ مہارانی سے بھی خوبصورت تھی۔ یہ مہارانی ہی تھی، مگر مہارانی کا حسن اس کے سامنے ٹھہر نہیں سکتا تھا۔ تصویر بنا کر گوالے نے اطمینان کا سانس لیا۔ اس نے اسے نزدیک سے دیکھا، دور سے دیکھا۔ دائیں بائیں کھڑے ہو ہو کر دیکھا۔ وہ مسرور ہو کر اٹھا۔ مگر پھر کسی خیال سے اس کے چہرے پر غم کے بادل چھا گئے۔ باہر رات کی تاریکی پھیل رہی تھی۔ رات کے اندھیرے میں مہارانی کا تخیل، جو ایک عرصے سے گوالے کی جھونپڑی کے ایک کونے میں مجسم ہو کر تمام رات اس کی آنکھوں کے سامنے موجود رہا کرتا تھا۔ اور جسے مخاطب کر کے وہ کہا کرتا تھا: "مخفل و دلی مہارانی، تو مہارانا کی ہے۔ میری مہارانی تو تم ہی ہو۔ اور جس کے روبرو بیٹھا وہ تمام رات روتا بھی رہا کرتا تھا۔ آج پھر اسے دکھائی دے رہا تھا گوالے نے کہا: "میری مہارانی! میں نے آج تمہاری تصویر بنائی ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا۔ کہ وہ ٹھیک تم سے ملتی ہے، یا نہیں" لیکن پھر اس نے وہ تصویر سینے سے لگالی۔ اور رونے لگا۔ آج رات وہ اسقدر رویا۔ جتنا کبھی بھی نہ رویا تھا۔ آنسو تھم جانے پر بھی، آنکھیں سوج جانے پر بھی۔ ان کے آنسو آنے پر بھی۔ مہارانی کی تصویر اور مہارانی کے تصور سے اس کے دل کو تسکین نہیں ہوئی تھی۔ وہ مہارانی سے ملنے کا . . . . . آرزومند تھا۔

وہ ہر رات رو رو کر ہی بسر کیا کرتا تھا۔ اسے وقت کا اندازہ تھا۔ مگر آج معمول سے بھی زیادہ عرصہ تک رونے کے باوجود دن نہ نکلا۔ بادِ نسیم کے جھونکے دیر تک چلتے رہے، رات کی خاموشی کے صبح کے شور سے معمور ہو جانے پر بھی صبح کا نور نہ دکھائی دیا۔ تاریکی طویل ہی طویل ہوتی چلی گئی۔ تقریباً دو گھنٹے اور گزر جانے کے بعد اسے اپنی جھونپڑی کے دروازے کے پاس، جس کے بالمقابل وہ بیٹھا تھا۔ کسی کے پاؤں کی آہٹ سنائی دی۔ پھر کسی شخص نے اندر آکر پوچھا "تم کون ہو؟" گوالے نے جواب دیا "جی میں ایک غریب گوالا ہوں، مگر آپ رات کے وقت میری جھونپڑی میں کس لئے آئے ہیں؟" . . . . . رات ہے؟ آنیوالے نے حیران ہو کر کہا: "کیا تمہاری

نگاہ کام نہیں کرتی؟ ایک پہر دن چڑھ چکا ہے۔ اور تم ابھی رات ہی سمجھ رہے ہو" گوالے کے ہونٹ فرطِ تحیرت کھل گئے وہ بولا"... دن چڑھ آیا ہے۔ تو میری آنکھیں اندھی ہو گئی ہیں" پھر اس نے کہا" جناب کئی دن ہوئے میری ماں جی کا انتقال ہو گیا ہے۔ میں ان کی موت کے غم میں اس قدر روتا رہا ہوں۔ کہ آج رات میری نگاہ بھی جاتی رہی"

آنے والا شخص شاہی مصور تھا۔ جو آج مہارانا کے جنم دن کی تقریب پر دربار میں دور دراز کے ممالک سے آنیوالے دیگر مصوروں کی طرح شاہکار۔ دس ہزار اشرفی کا انعام حاصل کرنے کیلئے صبح کے سہانے وقت... قریب کے دریا کے کنارے بیٹھکر اپنی تصویر کا بقایا حصہ مکمل کر کے آرہا تھا، اس جھونپڑی کے قریب سے گزرتے وقت گوالے کے ہاتھ میں تصویر دیکھکر اور پہلی ہی نظر میں اس میں آرٹ کا کمال معلوم کر کے اسے بغور دیکھنے کیلئے اندر چلا آیا تھا۔ وہ اب تصویر کے محاسن کے خیال میں گوالے کی ماں کی افسوسناک موت پر افسوس کرنا بھی بھول گیا۔ اس نے پوچھا" کیا یہ تصویر تم نے بنائی ہے؟" گوالے نے کہا" جی ہاں! کل شام مکمل کی تھی۔ رات کو اندھا ہو گیا ہوں" شاہی مصور نے ایک سرد آہ بھری وہ بڑبڑایا۔ اچھے آرٹسٹوں کو حادثات ہی شکست دیتے ہیں" وہ چپ رہے تھے، پھر مڑکر تصویر کی طرف دیکھتا ہوا چلا گیا۔

(۵)

دن کے دس بجے۔ شاہی دربار میں جب تخت پر رونق فروز ہو کر مہارانا نے بہت سے مصوروں کی تصاویر ملاحظہ کرنے کے بعد یہ فرمایا۔ کہ ہمارے مصور کی تصویر سب سے اعلیٰ ہے۔ مقررہ انعام اسے دیدیا جائے۔ تو فراخ دل شاہی مصور نے عرض کی" حضور! عیش منزل کے پچھواڑے ایک چھوٹی سی جھونپڑی میں ایک اندھا مصور رہتا ہے پہلے اس کی تصویر جو اس نے نابینا ہونے سے قبل بنائی تھی۔ ملاحظہ فرما لیں۔ .... وہ خود تو دربار میں حاضر نہیں ہوا۔ مگر اسے بلوا لیجئے۔

مہارانا کے حکم پر چوبداروں نے فوراً دبلے پتلے، میلے کچیلے کپڑوں والے اندھے گوالے کو تصویر کے ساتھ حاضر دربار کر دیا۔ شاہی مصور نے گوالے سے مخاطب ہو کر کہا۔ "مہارانا صاحب تمہاری تصویر دیکھنا چاہتے ہیں" گوالے نے بغیر کچھ کہے کانپتے ہوئے ہاتھوں کے ساتھ تصویر آگے کو بڑھا دی۔ اور شاہی مصور نے اسے گوالے کے ہاتھ سے لیکر مہارانا کے پیش کر دیا۔

مہارانا تصویروں کے بڑے قدر دان تھے۔ انہوں نے تصویر کی طرف دیکھا" واقعی! واقعی!!" ان کے منہ سے نکلا۔ پھر ان پر ایک محویت سی طاری ہو گئی۔ ایک لمحہ کے بعد وہ گوالے کی طرف دیکھ کر بولے" اندھے مصور! تمہاری تصویر واقعی بہترین ہے" گوالا خاموش رہا۔ نہ جانے اس کے دماغ میں کیا کیا خیالات گھوم رہے تھے۔ شاہی مصور اس سے مخاطب ہو کر بولا" بھائی! تم بڑے خوش قسمت ہو مہارانا صاحب نے تمہاری تصویر کو تمام تصویروں سے بڑا درجہ دیا ہے۔ اس پر تم کو دس ہزار اشرفی انعام ملے گا۔ اور یہ تصویر راج محل میں جہاں اور بھی بہت سے م

شاعر ہندوستان

رباعی

نغمے میں حیات کا خزینہ آجائے / طوفاں میں سکوت کا سفینہ آجائے
ہے ساز میں میرے وہ دہکتی ہوئی لے / فطرت کو بھی جس لے سے پسینہ آجائے

میں وہ شاعر ہوں مرے نغموں میں پنہاں ہے کسک / میرے آتش زا ترانوں میں ہے شعلوں کی لپک
میں وہ شاعر ہوں چمن زاروں میں جگاتا ہوں میں / آرزوں کا لہو خوشوں سے ٹپکاتا ہوں میں!
شعر میرے جب فضا میں تولتے ہیں بال و پر / پاؤں پر میرے جھکا دیتی ہے فطرت اپنا سر
شاعری میری ہیولیٰ ہے شرار طور کا / میری لے سے دل دھڑکتا ہے شب دیجور کا
راگ سے میرے ابلتی ہے جوانی کی شراب / ساز انجم دے نہیں سکتا مری لے کا جواب
کانپ جاتا ہے سکوں میرے نوائے راز سے / زندگی کا رس ٹپکتا ہے مری آواز سے!
دامنِ گل میں بھڑکتی ہے مرے نالوں کی آگ / لوٹتا ہوں میں عروس لالہ و گل کا سہاگ!
رازِ عرفانِ حقیقت میری سرمستی میں ہے / ایک سیلِ نور مستتر پیکرِ ہستی میں ہے
میری جولانی پہ وا ہوتے جو مغرب کے دیار / کانپتا میری غزل خوانی سے شیلے کا وقار
باغ یورپ میں اگر کرتا میں دعوائے غزل / بائرن کو بھول کر ہوتا نہ سودائے غزل
میں جو اس دنیائے آزادی سے رشتہ جوڑتا / ٹینی سن کا جوش میرے سامنے جاں توڑتا
لوٹ لیتی میری لے عالی پناہوں کا غرور / ٹوٹتا میری رجز خوانی سے شاہوں کا غرور
بجلیاں بھرتا دلوں میں میرا اندازِ بیاں! / زمزمے میرے اٹھاتے خاک سے بے دھواں
میرا سوز و ساز کرتا سینۂ گیتی کو چاک / میری لے کرتی جراثیم جہالت کو ہلاک
کارزاروں سے اٹھاتا میں نوائے ہاؤ ہو، / کھولتی جذبے سے میرے سلطنت شاہی لہو
کس قدر افسوس ہے اے خطۂ پاک وطن / میرے ہوتے اس طرح روندی گئی خاکِ وطن

وہ مرا نالہ جو اک میخانۂ الہام ہے:
خطۂ ہندوستان میں ہر طرح ناکام ہے:

سراج الدین ظفر بی اے

کیا مذہب مانع ترقی ہے؟

"کیا مذہب مانع ترقی ہے؟" اس سوال کا جواب دینے کے لئے ہمکو سب سے پہلے مذہب اور ترقی کا مفہوم ذہن نشین کر لینا چاہیئے۔ چونکہ یہ مضمون مذہب کی حمایت میں اس فرقہ کو مخاطب کر کے لکھا جا رہا ہے۔ جو بہت حد تک دانایان فرنگ کے اقوال سے واقف ہے۔ اور ایشیائی علوم و فنون سے اس کی بےخبری روزانہ بڑھتی جاتی ہے۔ اس لئے ہم مذہب اور ترقی کے مفہوم کو بھی انہیں دانایان فرنگ کے مقررکردہ الفاظ کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ویرائیٹیز آف دی ریلجس ایکسپیرئنس کے مصنف ولیم جیمس کا قول ہے:۔

"اگر مذہب کے ایسے خواص پوچھے جائیں
جو سب میں پائے جاتے ہوں تو جواب یہ ہے کہ
مذہب ایک نادیدہ نظام کا یقین دلاتا ہے۔ اور
انسان کی سب سے بڑی بھلائی خود کو اس کے
ساتھ ہم آہنگ کرنے کو بتاتا ہے بس یہی یقین
اور یہی ہم آہنگی ہے۔ جو روح کے اندر مذہبی عنصر
ہے"

افلاطون کے نزدیک مذہب کی تعریف حسب ذیل ہے:۔

"مذہب اپنی استطاعت کے مطابق خدا کے
ساتھ مناسبت پیدا کرنے کا نام ہے"

اے ڈسکورس آف میٹرز پرٹیننگ ٹو ریلیجن میں مسٹر تھیوڈور پارکر لکھتے ہیں:۔

"مذہب خدا کے ان اندرونی اور بیرونی قوانین
کی اطاعت کا نام ہے جو اس نے ہماری فطرت
میں رکھے ہیں۔ اور جو مختلف طریقوں سے عقل حیوانی
عقل انسانی ضمیر اور مذہبی جذبہ کی وساطت
سے ظاہر ہوتے ہیں"

مسٹر فچ کہتے ہیں:۔

"مذہب دنیا کی اخلاقی سلطنت پر اعتقاد رکھتا ہے"

غرضکہ ہوشمندان مغرب کے نزدیک مذہب ایک ایسے اثر یا اعتقاد کا نام ہے۔ جو انسان کو اخلاقی بھلائی کی طرف لے جائے۔ اور ترقی کی مختصر تعریف یہ ہے۔ فطرت کے جملہ وسائل پر غالب آ جانا۔ اس کو زیادہ واضح الفاظ میں یوں سمجھئے کہ اول اول انسان اپنی جملہ خواہشات فطری کو پورا کرنے کے لئے محض فطری وسائل کا محتاج تھا۔ اس کے بعد ایک ایسا زمانہ آیا، کہ اسے اپنی اس احتیاج کا احساس ہوا، پھر اس نے آہستہ آہستہ یہ کوشش کی۔ کہ وہ ان وسائل کو اپنی موجودگی کا رہین منت کرلے۔ اور اس کی موجودگی ان وسائل کی رہین منت نہ رہے۔ مثلاً اپنے عہد ابتدا میں انسان مجبور تھا، کہ زرخیز زمینوں اور پانی کے بڑے بڑے ذخیروں یعنی دریاؤں اور جھیلوں سے

قریب اپنی بستیاں بنائے چنانچہ تمام قدیم شہر اور آبادیاں اسی اصول پر نظر آتی ہیں۔ اس کے بعد اس نے بہم رسانی آب و نان کے دوسرے وسائل پہ غور کیا۔ کنوئیں اور تالاب بنانے سیکھے۔ اور اب بورنگ کی بدولت پانی پیدا کرنے کے وسائل اس قدر وسیع ہو گئے ہیں کہ تپتے ہوئے میدانوں میں وہ خود اپنے فیض کی گنگا بہا سکتا ہے۔

بالکل اسی طرح لباس و طعام کے مسائل پر غور کر کے وہ صرف پھل کھانے، اور کھال لپیٹنے کے عہد سے ترقی کر کے یہاں تک پہنچ گیا ہے کہ اصول غذا، طریقہ حفظانِ صحت اور لباس اب اس کے باقاعدہ علوم ہو گئے ہیں، زراعت اور آبپاشی کی باقاعدہ تعلیم اس کے اندر موجود ہے۔ اور اب وہ اپنی بستیاں بنانے کے لئے، دریا اور زرخیز میدانوں کی فطری موجودگی کا محتاج نہیں ہے۔

اب ہمیں یہ ثابت کرنا ہے کہ مذہب نے انسان کو ان وسائل فطری پر اختیار حاصل کرنے سے کبھی نہیں روکا اور یہ ثابت کرنے کے لئے ہمیں مذہب کی تاریخ پر نظر ڈالنا چاہئے۔ یعنی یہ دیکھنا چاہیئے کہ مذہب کی ابتدا کیونکر ہوئی، لیکن اس سے پہلے ہم انسان کا تجزیہ اس کی جذباتی حیثیت سے کرنا چاہتے ہیں۔

انسان میں بعض جذبات اس کی ابتدا سے مکمل ہیں اور بعض جذبات کی اصلاح اور تربیت ہوئی ہے جو جذبات ابتدا سے مکمل ہیں، انہیں جذبات حیوانی کہا جاتا ہے۔ مثلاً بھوک، پیاس وغیرہ۔ اور جن جذبات کی اصلاح و تربیت ہوئی ہے، انہیں جذبات انسانی کہا جاتا ہے۔ مثلاً رحم ہمدردی، شجاعت، انتقام وغیرہ۔ اور ترقی کا واسطہ ان دونوں قسم کے جذبات سے صرف اتنا ہے کہ جس قدر انسان وسائل فطری پر قدرت پاتا جاتا ہے۔ اس کے جذبات میں تقاضے پورے ہونے کی صورت میں نفاست آتی جاتی ہے مثلاً ابتداً انسان نے جنگل کے خودرو پھل کھائے، قدرت کے جاری کئے ہوئے چشموں کا پانی پیا۔ اور درختوں کے پتوں اور جانوروں کی کھالوں سے ستر پوشی کی۔ اس کے بعد اپنے گرد و پیش کے حالات سے اس کی واقفیت بڑھتی گئی۔ آگ دریافت ہوئی۔ زراعت کے طریقے معلوم ہوئے کپڑا تیار کرنا آیا۔ اور رفتہ رفتہ ان تمام امور میں اس کی دسترس اور اس کی طاقتیں، اسے موجودہ عہد کے انسان تک لے آئیں۔ مگر کھانے پینے اور پہننے کا وہ بالکل اسی طرح خواہشمند ہے جس طرح عہد اول کا انسان تھا، اور بھوک اور پیاس وغیرہ کی کیفیت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے، یعنی جذبات حیوانی تبدیل نہیں ہوئے۔ اور ترقی صرف ان کو پورا کرنے کے طریقوں میں ہوئی۔

اب جذبات انسانی پر نظر ڈالئے، تو معلوم ہوگا، کہ ان میں بہت زیادہ اصلاح اور ترتیب ہوئی ہے مثلاً ایک جذبہ شجاعت کا امتحان کیجئے۔ اپنے عہد ابتدا میں، انسان جس چیز کو شجاعت سمجھتا تھا، وہ اب وحشت اور بربریت کہلاتی ہے۔ ایک زمانے میں اپنے مقابل کو بے دریغ قتل کر دینا، اور اس کے املاک و اموال اور اہل و عیال کو تباہ کر دینا داخل شجاعت تھا مفتوح گروہ کے بوڑھے بچے عورتیں، تلوار کے گھاٹ اتار دیئے جاتے تھے۔ مفتوح قوم

کے اسیروں اور مجروحوں کو جان سے مار دیا جاتا تھا لیکن اب یہ سب باتیں اصولِ جنگ کے خلاف قرار دیدی گئی ہیں یہاں تک کہ متخاصمین کے مجروحوں کی نگہداشت کے لئے مختلف سوسائٹیاں بنگئی ہیں۔ اور عین میدانِ جنگ میں ان سوسائٹیوں کی مجوضات پر گولہ باری یا حملہ ناجائز سمجھا جاتا ہے۔ بلکہ اس سے بھی ایک قدم اور آگے بڑھایا گیا ہے حریف مقابل کے مجروحین کو ہر ممکن طبی امداد دیجاتی ہے۔ اور تصفیہ جنگ تک نہیں بطور امانت کے حفاظت سے رکھا جاتا ہے۔ وہ قتل عام گذشتہ عہد کی شجاعت کا مرقع تھا۔ اور یہ موجودہ عہد کی شجاعت کا اقتضاء۔ اس تمام تغیر کے باوجود ہم یہ نہیں کہہ سکتے۔ کہ شجاعت کے جذبات فنا ہوگئے ہیں۔ بلکہ یہ کہا جاسکتا ہے۔ کہ ان جذبات میں اصلاح اور تربیت ہوگئی ہے اس قسم کے تمام جذبات جن میں اصلاح اور تربیت ہوئی ہے جذباتِ انسانی کہلاتے ہیں۔

مذہب کی تاریخ پر نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے۔ کہ وہ جذباتِ انسانی کی اصلاح کے لئے عالمِ وجود میں آیا۔ مغرب میں مذہب کے اولین دشمن جان سٹوارٹ مل مسٹر بریڈلا ورنیوٹن وغیرہ ہیں۔ یہ لوگ مذہب کو داخل فطرت انسانی نہیں سمجھتے بلکہ اس کو بہت بری قسم کا جنون کہتے ہیں جس میں ان کو چھوڑ کر تمام دنیا مبتلا ہے۔ لیکن ان ہی جان سٹوارٹ کا قول ہے

"جب تک انسانی زندگی انسانی تمناؤں
کو برلانے کے ناقابل ہے تب تک یہاں کی
کامیابیوں سے بالاتر لذائذ کا اشتیاق قائم رہیگا
اور اس اشتیاق کو صحیح تسکین مذہب سے حاصل
ہوگی۔ جب تک دنیوی زیست تکالیف سے معمور
ہے تسلی کی ضرورت رہیگی۔ خودغرضوں کو بہشت
کی امید سے، اور پارسا لوگوں کو خدا کی محبت سے
حاصل ہوگی"

مذہب کو خلافِ فطرتِ انسانی سمجھتے بھی جان سٹوارٹ مل جس نتیجے پر پہنچے ہیں۔ اور جن اسباب کو مذہب کی بقا کا ضامن بتاتے ہیں وہ عین فطری ہیں۔ انسانی زندگی کا انسانی تمناؤں کے برلانے کے ناقابل ہونا۔ یہاں کی کامیابیوں سے لذائذ کا اشتیاق، اور دنیوی زیست کا تکالیف سے معمور ہونا ایسے اسباب ہیں۔ جو انسان کے اپنے پیدا کردہ نہیں۔ انسان صدق دل سے چاہتا ہے۔ کہ اس کی زیست اس کی تمناؤں کو برلانے کے قابل ہو۔ جس قدر کامیابیاں اسے دنیا میں میسر ہوتی ہیں۔ ان سے بالاتر کامیابیاں چاہنا اس کی فطرت ہے۔ اور اگر یہ اس کی فطرت میں داخل نہ ہوتا۔ تو انسان اب تک غاروں کی رہائش پر قانع ہوتا۔ جھونپڑے اور جھونپڑوں سے محل، اور محلوں سے قصرالحمرا۔ مدینۃ الزہرا۔ اور بکنگھم پیلس جیسی عمارتیں وجود میں نہ آتیں۔ وہ پیدل چلنے پر توکل کرتا۔ گھوڑے پھر گاڑیاں، اور گاڑیوں سے ریل، موٹر اور ہوائی جہاز ایجاد نہ ہوتے۔ لیکن یہ تمام کام انسان کی سعیٔ ترقی نے کیا۔ اور وہ سعیٔ ترقی داخل فطرت انسانی ہے تو مذہب جو مل کے قول کے بموجب انہیں اسباب کا نتیجہ ہے۔ ضرور داخل فطرت انسانی ہونا چاہیئے۔ کیونکہ جب بھوک داخل فطرت ...

درحقیقت مذہب کو داخل فطرتِ انسانی تسلیم کرلینا یہ کہدینا ہے۔ کہ مذہب مانع ترقی نہیں ہے۔ بلکہ معاون ترقی ہے۔ اسی لئے مذہب کا داخل فطرتِ انسانی نہ ہونا، ثابت

کرنے کے لئے مغرب کے ان مشہور شعرائے دہریت نے بہت طویل قصیدے کہے ہیں۔ لیکن یہ گروہ جن نتائج پر پہنچا ہے، ان کا مطالعہ خالی از دلچسپی نہیں۔

فری تھنکرز ٹسٹ بک (کتاب امتحان آزاد خیالی) میں مسٹر بریڈلا فرماتے ہیں

"منکر خدا یہ نہیں کہتا کہ خدا نہیں ہے۔ بلکہ یوں کہتا ہے کہ لفظ خدا سے جو مطلب تم لیتے ہو۔ وہ مجھے معلوم نہیں۔ میرے دماغ میں خدا کا خیال موجود نہیں۔ اور یہ لفظ میرے نزدیک ایک ایسی آواز ہے، جس کا مطلب صاف اور ممتاز نہیں۔ میں خدا کا انکار نہیں کرتا۔ کیونکہ جو چیز میرے تصوّر میں نہیں، اور جس کا تصوّر اس کے ماننے والوں کے دماغوں میں بھی اتنا نامکمل ہے۔ کہ وہ اس کی تعریف اور تحدید نہیں کر سکتے۔ میں اس کا انکار کیونکر کر سکتا ہوں؟ صفحہ ۱۱۸"

مسٹر ولیم آر گریک لکھتے ہیں:۔

"ایک دائمی۔ قدیم اور مشخص خدا کا تصوّر، مجھے دشوار معلوم ہوتا ہے، اور ایسے مشخص خالق کے بغیر پیدائش اور ترقی کا تصوّر بھی ایسا ہی دشوار ہے کہ اس پر غالب نہیں آ سکتے۔"

تھری ایسیز آن ریلیجن میں جان سٹوارٹ مل تحریر فرماتے ہیں:۔

"ایمان کے ثبوت اور ایمان کو تسلیم کر کے اس کے متعلق وحی و الہام کے ثبوت کا امتحان کرنے کے بعد یہ نتیجہ نکلتا ہے، کہ مذہب خواہ الہامی ہو یا فطری دونوں میں جس قدر مافوق العادت کاروبار کا تعلق ہے، اس کی نسبت ذی شعور قلب کا عقلی میلان انکار کی جانب ہے۔ لیکن یہ انکار جیسے ایک طرف خدا کے اقرار سے جدا ہونا چاہیئے۔ ویسا ہی دوسری جانب انکار خدا سے بھی علیحدہ ہونا چاہیے اور یہ انکار ہمارا جس سے ہم اپنے انکار کو جدا رکھنا چاہتے ہیں یعنی سلبی اور ایجابی قسم کا ہے یعنی ہم کو اس خیال سے بھی علیحدہ رہنا چاہیئے کہ خدا نہیں ہے۔ اور اس خیال سے بھی الگ رہنا چاہیئے کہ خدا کے ثبوت کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ کیونکہ عملاً اس آخری انکار کا بھی وہی نتیجہ ہے۔ جو وجود خدا کو ناممکن ماننے کا ہوگا پس اپنی گذشتہ تحقیق میں ہم جن نتائج تک پہنچے ہیں۔ اگر وہ صحیح ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ وجود خدا کی شہادت موجود ہے، مگر اس کو ثابت کرنے کے لئے ناکافی ہے۔ البتہ ایک کم درجے کا گمان پیدا کرتی ہے۔"

ان اقتباسات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ خدا کے وجود اور مذہب کے متعلق تذبذب ہی نہیں۔ بلکہ ایک کم درجے کا گمان اس گروہ کے دلوں میں پایا جاتا ہے۔ اور یہ گروہ خدا کے بغیر کاروبار کائنات کو دشوار جانتا ہے۔ انکار خدا سے اس کا مطلب انکار ذات مطلق نہیں، بلکہ اس کے صفات لامتناہی کو نہیں سمجھ سکتا۔ اس لئے ان صفات کے خدا کا اقرار کرنے میں ہچکچاتا ہے چنانچہ فرسٹ پرنسپل کے مصنف

ڈاکٹر ہربرٹ سپنسر لکھتے ہیں:۔

"اگر کچھ ایسے لوگ ہیں جنہوں نے چند قابل نفرت خیالات، مذہب میں ملاکر اس کی اصلی خوبی کو جو سب مذاہب میں مشترک ہے۔ نابود کردیا ہے تو ایسی جماعت بھی موجود ہے۔ جو سائنسدان کہلاکر مذہبی عقائد پر ایسی نکتہ چینی کی مرتکب ہوئی ہے جس سے اس کو نفس علم کی نسبت سخت تعصب پیدا ہوجاتا ہے۔ حالانکہ اس کی اس نفرت کے لئے کوئی دلیل بھی اس کے پاس نہیں ہے، وہ صرف ان ناشائستہ اعتراضوں سے واقف ہے۔ جو سائنس نے مذہب کے بعض عقائد پر کئے ہیں۔ اور اس سے گمان کر لیا ہے کہ سائنس شاید مذہب کے تمام خیالات کا استیصال کردے گی"

مطلب یہ کہ اگر مذہب میں بعض "قابل نفرت خیالات" کی آمیزش نہو، اور اس کی "اصلی خوبی" اپنے صحیح رنگ میں موجود ہو تو، سائنس کے پاس اس سے نفرت کرنے کے لئے کوئی دلیل نہیں۔ لیکن یہاں تک پہنچ کر یہ بات پھر بھی تشریح طلب رہ جاتی ہے۔ کہ مذہب کی اصلی خوبی ان مغربی اصنام خیالی کے نزدیک کیا ہے۔ اور اس کو سمجھنے کیلئے ہمیں ایک مرتبہ پھر مذہب کی اس تعریف کی طرف متوجہ ہونا پڑتا ہے۔ جو ہم ابتدائے مضمون میں تحریر کرچکے ہیں۔ اور ان تعریفوں کے بغور مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ مذہب محض اخلاق انسانی سدھانے کا ذریعہ ہے۔ چنانچہ جان سٹوارٹ مل اخلاق کو پاکیزہ رکھنے، اور انسانیت کو اخلاق کی اعلیٰ منزل تک پہنچانے کے لئے خدا کی بجائے، خود انسانی زندگی کے احترام کا مشورہ دیتے ہیں۔ اور ان کی تمنا ہے۔ کہ دنیا جس شدومد سے خدا پر اعتقاد رکھتی ہے۔ اسی شدت کے ساتھ انسانی زندگی کا احترام کرے۔ اور انسانی زندگی پر اپنے اخلاق کی بنا رکھے۔

"یہ اعلیٰ اخلاق اپنے عروج کے لئے کسی معاوضہ کی امید پر منحصر نہ ہوگا۔ بلکہ اس کا ایسا معاوضہ ہوگا، جو دیکھا جاسکے۔ اور جو تکلیف کے وقت تسلی، اور کمزوری کے وقت سہارے کا کام دے، اور وہ معاوضہ اگلے جہاں کی مشتبہ زندگی نہیں، بلکہ اسی زندگی میں ان لوگوں کی خوشنودی ہے۔ جن کی ہم عزت کرتے ہیں۔ اور خیالی طور پر ان تمام مردہ اور زندہ لوگوں کی پسندیدگی ہے۔ جن کی تعریف و تعظیم کے ہم معترف ہیں۔ کیونکہ یہ خیال کہ ہمارے مردہ آباؤ اجداد ہمارے اطوار کو پسند کرتے ہوں گے ایسا ہی طاقتور ہے۔ جیسا یہ خیال کہ زندہ لوگ پسند کرتے ہیں۔ اور یہ تصور کہ سقراط یا ورڈ واشنگٹن انٹانی نس یا مسیح ہمارے ساتھ ہمدردی رکھتے ہوں گے۔ یا یہ کہ ہم بھی اسی نیت سے کام کرتے ہیں، جس نیت سے وہ کرتے تھے۔ بہت سے نیک دلوں کے لئے اعلیٰ خیالات کے واسطے قوی محرک ہوا ہے"

خدا اور مذہب کے وجود یا اہمیت سے انکار کردینے کے بعد مسٹر مل انسانی اخلاق کے لئے کسی قوی محرک کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ اور اس محرک کو موجودہ انسانی زندگی تک

محدود کرنا ایک ناکافی فعل خیال کرتے ہوئے، مردہ آباؤ اجداد کی خوشنودی کے خیال تک کی اجازت دیدیتے ہیں لیکن ان مردہ آباؤ اجداد کی یہ حالت ہے۔ کہ ان کے متعلق ان کا فلسفہ ہی یہ تسلیم کرچکا ہے۔ کہ روح کوئی چیز نہیں، موت کے بعد جسمانی اعضا فنا ہوکر۔ اپنے اپنے عنصر میں ملجاتے ہیں اور وہ عنصر ناپید ہوجاتا ہے۔ گویا جناب کے نزدیک اخلاق کی درستی کے لئے، جن آباؤ اجداد، یا جن قابل تعریف و تعظیم بزرگوں کی پسندیدگی کا خیال قوی محرک ہوسکتا ہے وہ خود آپ کے نزدیک اپنی موت کے بعد کوئی حیثیت نہیں رکھتے، پھر معلوم نہیں، کہ ان کی خوشنودی کیا ہوگی، اور اس کو درست مان کر عہد جہالت کے ان فرقوں کے خیالات کی تکذیب کیونکر ہوسکے گی۔ جو اپنے آباؤ اجداد کی روحوں کو پوجتے تھے۔ انہیں اپنا محافظ اور خیر خواہ سمجھتے تھے، اور ان موجودہ مذاہب کے خلاف کیا کہا جاسکے گا، جو اپنے اوتاروں، اور رسولوں کو اپنے افعال کا ناظر جانتے ہیں۔ اور ان کی پیروی اور خوشنودی کے لئے نیک افعال کرتے ہیں۔ کیونکہ قابل تعریف و تعظیم ہستیوں میں، مسیح۔ سقراط اور حضرت محمد علیہ الصلوٰة والسلام موجود ہیں۔ پھر ان کے ارشادات گرامی پر چلنے والوں کو، کیونکر ایک خطرناک قسم کے جنون میں مبتلا کہا جاسکتا ہے جبکہ خود مسٹر ل کے نزدیک ان کی خوشنودی کا خیال اصلاح اخلاق انسانی کے لئے قوی محرک ہوسکتا ہے، اور جب یہ حالت ہے۔ تو ان متبرک ہستیوں کے بتائے ہوئے خدا کا اعتقاد، کیونکر مشتبہ اور کم درجے کا گمان پیدا کرنے والا ہوسکتا ہے — کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ جب تک اخلاق کی درستی کے لئے محض ان متبرک ہستیوں کی خوشنودی کا سوال رہے۔ مغرب کو کوئی اعتراض نہیں۔ لیکن جہاں ان سے بھی زیادہ بلند مقصد پیش نظر ہو، اور ان متبرک ہستیوں کے حاکم اعلیٰ، یعنی خدا کی طرف خیال رجوع ہو۔ وہاں سے مغرب محض اسلئے کترانا چاہتا ہے۔ کہ خدا کو مشخص ماننا انسانی زندگی کا وہ احترام، جو ۔ مفتوح اقوام کے ساتھ روا رکھ رہا ہے۔ بہت زیادہ قابل اعتراض ہوجاتا ہے۔ اور ایشیا کی وہ قیمت جو وہ ادا کر رہا ہے۔ بڑی ارزاں نظر آتی ہے۔؟

کسی مردہ بزرگ کو قابل تعظیم و توصیف سمجھکر اس کے افعال کا تتبع ہی وہ چیز ہے۔ جو مذہب سکھاتا ہے۔ کیونکہ دنیا میں کسی الہامی مذہب کا بانی ایسا نظر نہیں آتا جسکے افعال اس کے اقوال سے جدا ہوں۔ چنانچہ کسی الہامی مذہب کے بانی نے کسی ایسے فعل کی تلقین نہیں کی، جس پر وہ خود شدت سے عمل نہ کرتا ہو پھر اسی نیت سے ان افعال کا کرنا جس نیت سے وہ کرتے تھے۔ ان کا کامل تتبع ہے۔

مذہب کی اس سے بڑی خوبی اور کیا ہوگی کہ جو لوگ انسانی زندگی کا ماحصل محض اخلاق سمجھتے ہیں۔ وہ بھی بانیان مذہب کی پاکیزہ زندگی کا تتبع اور ان کی خوشنودی کے خیال کو جسے دوسرے لفظوں میں ہم پیروی اور تقلید کہہ سکتے ہیں درستی اخلاق کے لئے قوی محرک سمجھیں۔؟

درحقیقت مادہ پرست دنیا میں انسانی زندگی کا ماحصل اخلاق اور سعی حصول کی برتری کے علاوہ کچھ ہو بھی نہیں سکتا اور یہ بھی صحیح ہے۔ کہ یہ دونوں انسانی جذبے نظری ہیں، پھر یہ بھی صحیح ہے، کہ درستی اخلاق کے لئے کسی زبردست محرک

کی ضرورت ہے۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود مغرب کو ایسے "دقیانوسی تخیل" اور شخصی خدا کا تصور دشوار نظر آتا ہے جو ازل سے ابد تک اپنے بندوں کی ہدایت کے لئے قانون نازل کرتا رہے۔ اور مخصوص لوگوں کو، ایسے مخصوص لوگوں کو جنکی نیکی تمام افراد کے مقابلہ میں ان کے لئے وجہ برتری بھی ہو دوسرے بندوں کی ہدایت کے لئے مامور کرے۔ اگرچہ ان بندوں کی نیکی اور ان کی خوشنودی کا خیال خود مغرب کے لئے درستی اخلاق کے واسطے قوی محرک ہے۔ بلکہ ہمیں یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ الہام، نزول کتب، وحی وغیرہ یہی وہ "قابل نفرت" خیالات ہیں۔ جن کی آمیزش سے مغرب کو مذہب قابل اعتراض نظر آتا ہے۔ اور ان ہی کے ہوتے ہوئے وہ مذہب کو فطری شے سمجھنے، اور انسانی ترقی کا معاون خیال کرنے سے قاصر ہے۔ حالانکہ بانیان مذہب کے افعال کو لائق پیروی، اور ان کی خوشنودی کے خیال کو اچھا سمجھنے کے بعد کوئی جھگڑا ہی باقی نہیں رہتا، کیونکہ نیکی اور رذیل جو برائیوں کی جڑ ہے، کا ایک ہی شخص میں جمع ہو جانا عملاً ناممکن ہے۔

مسٹر ڈارون کتاب ڈلسینٹ آف مین میں مذہب کے خلاف فطرت ہونے کی سب سے بڑی دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ ہم فطری شے اسے کہتے ہیں، جو ہر انسان میں کسی نہ کسی صورت میں پائی جائے۔ اسی دلیل سے وہ شجاعت وغیرہ کو فطری مانتے ہیں، اور اسی دلیل کو مذہب کے خلاف اس طرح پیش کرتے ہیں۔ کہ دنیا میں چند وحشی اقوام ایسی پائی جاتی ہیں۔ جن میں مذہب کا وجود نہیں ہے۔ پس اگر مذہب داخل فطرت انسانی ہوتا۔ تو ان اقوام میں بھی کسی نہ کسی طرح موجود ہوتا۔

اس اعتراض کا سب سے بڑا الزامی جواب یہ ہے کہ دنیا میں اب تک بعض قومیں ایسی پائی جاتی ہیں، جن میں ترقی کے کوئی آثار نہیں۔ وہی غاروں اور جھاڑیوں کی رہائش، وہی جنگل کی خود رو گھاس پات، اور جانوروں کے شکار پر گزارا، چنانچہ مغرب میں ایسی قوموں کو بش مین کہتے ہیں۔ لیکن ان کی موجودگی میں ڈارون صاحب عقل اور ترقی کو انسانی فطرت سے خارج نہیں کرتے، حالانکہ بڑی آسانی سے کہا جا سکتا ہے۔ کہ چونکہ عقل اور ترقی دنیا کی بعض قوموں میں نہیں پائی جاتی، اس لئے یہ فطری شے نہیں ہے مگر مسٹر ڈارون اور مسٹر بریڈ لا جانتے ہیں۔ کہ ایسا کہنا ان کی اور ان کی تمام قوم کی ایجادات، و ترقیات پر پانی پھیر دینا ہے اس لئے بڑی بے تکلفی سے ترقی کے حیوانات تک قائل ہو جاتے ہیں۔ اور مذہب کے خلاف انتہائی عداوت میں وہی دلیل استعمال کرتے ہیں جس کے بعد ان کے الفاظ کی کوئی وقعت باقی نہیں رہتی۔

دوسرا اعتراض مذہب پر یہ کیا جاتا ہے۔ کہ مذہبی احساس رکھنے والی قوموں کا مطمح نظر یکساں نہیں۔ مثلاً کبھی لوگ شجر، پتھر، دریا، آگ اور چاند اور سورج وغیرہ کو پوجتے تھے۔ پھر دیوتاؤں کی پرستش کرنے لگے۔ اس کے بعد خدا کی وحدانیت کا آوازہ بلند ہوا۔ لیکن بھوک، پیاس وغیرہ فطری جذبوں کی یہ کیفیت نہیں ہے۔ انسان کو جب بھوک ستاتی ہے وہ کھانا کھاتا ہے۔ جب پیاس معلوم ہوتی ہے وہ پانی پیتا ہے

اور کبھی ایسا نہیں ہوا کہ اسے بھوک معلوم ہو، کھانے کی ضرورت ہو، اور پیئے پانی۔ یا پیاس سے بیتاب ہو، اور کھائے کھانا لیکن یہ اعتراض، ایک بڑی افسوسناک غلط فہمی ہے۔ جو فلسفی، اور عالم و فاضل گروہ کی طرف سے کم سے کم نہ ہونی چاہیئے۔ اور یہ مثال مطابق حال نہیں ہے۔ کیونکہ جب انسان کو بھوک معلوم ہوتی ہے۔ تو وہ واقعی صرف پانی نہیں پیتا۔ بلکہ کھانا کھاتا ہے لیکن پہلے ایسے موقعوں پر انسان درختوں کے پھل اور گھاس پات کھایا کرتا تھا پھر شکاری جانوروں کا گوشت کھانے لگا، اور اب ہزاروں قسم کی اعلیٰ اعلیٰ طبی اور سائنٹیفک اصول پر تیار کی ہوئی غذائیں استعمال کرتا ہے۔ اور نہیں کہا جا سکتا، کہ آئندہ اور کیا کیا سہولتیں رونما ہونے والی ہیں۔ ان تمام تبدیلیوں کے باوجود بھوک اپنی جگہ پر اسی طرح فطری جذبہ ہے۔ جس طرح پہلے تھا۔ پھر اگر یہ مان لیا جائے۔ کہ پہلے انسان اشیاء مثلاً پتھر وغیرہ کو پوجتا تھا۔ پھر اجرام مثلاً چاند ستارے سورج کی پرستش کرنے لگا۔ پھر طاقتیں مثلاً اندر۔ مہادیو وغیرہ کو سجدہ کیا اور اب خدا کو پوجتا ہے۔ تو اس سے مذہب کے فطری ہونے پر کیا زد پڑتی ہے۔ بلکہ بالکل برعکس اس کے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ دیگر صلاحیت پذیر فطری جذبات کیطرح مذہب انسان میں فطری تھا۔ اور سائنس کی ترقی کے ساتھ ساتھ، اسکو ترقی ہوئی اس مسئلہ کو ڈاکٹر سپنسر نے اپنی کتاب فرسٹ پرنسپل میں مان لیا ہے۔ مثلاً

"مذہب کا اصلی مدعا ایک ایسی ہستی کا اعتقاد
جس کو ہم نہیں سمجھ سکتے اس کو مذہب کی مختلف شاخیں
چھپاتی آئی ہیں۔ اور ہر ایک مذہب نے اپنے دائرے

اس کو کسی نہ کسی قدر سمجھ میں آنے کے لائق مانا گیا ہے مگر یہ مذہب پر سائنس کا احسان ہے۔ کہ وہ اس مسئلہ کو صاف کرتی گئی ہے۔ اور ہر ایک محدود علت کے اوپر اس سے عام تر علت ثابت کرتے کرتے وہ آخر اس آخری علت العلل تک پہنچنے کا رستہ صاف کرتی آئی ہے۔

آفتاب کو پرانے زمانے میں دیوتا کی گاڑی سمجھا جاتا تھا۔ اور یوں اس کی حرکت کا، ایک ایسا ہی سبب مقرر کرکے جیسا عام طور پر دنیا میں پایا جاتا ہے اس کی علت کو سمجھنے کے قابل بنایا ہوا تھا۔ کئی صدیوں کے بعد کیپلر نے ثابت کیا، کہ تمام سیارے آفتاب کے گرد پھرتے ہیں، اور ہر ایک کے لئے ایک خاص دائرہ ہے اس کے بعد اس نے مانا کہ ہر ایک سیارے میں روح ہے۔ جو اس کو حرکت دیتی ہے۔ گویا اس وقت کی سائنس نے بھی ذریعہ حرکت ویسا ہی مانا، جو بت پرستوں کے نقطہ خیال سے ملتا جلتا تھا۔ بعد کے زمانے میں تمام حرکات کو کشش ثقل کا اثر مانا گیا۔ اور کیپلر کے خیالی ارواح کو غلط ٹھہرایا گیا تو اب خیال میں آنیوالی علت کی بجائے، ایک خیال میں نہ آسکنے والی علت قائم ہوئی کیونکہ کشش ثقل اگرچہ ہمارے ذہن کی گرفت کے اندر ہے۔ مگر پھر بھی اس کو خیال میں بالکل مشخص اور معین کر لینا ناممکن ہے۔ خود نیوٹن نے مانا ہے۔ کہ کشش ثقل قابل فہم ہوتی اگر درمیان میں ایتھر کا واسطہ نہ ہوتا مگر ہم دکھا چکے ہیں کہ ایتھر کو مانکر بھی یہ عقدہ حل نہیں

ہوتا اور کشش ثقل کا اثر سمجھ میں نہیں آتا۔ غرضکہ سائنس کی ترقی سے عام در عام ذرائع اور علل دریافت ہوتے جاتے ہیں۔ اور یہ علل جو زیادہ سے زیادہ غیر شخصی اور غیر متعین ہوتے جاتے ہیں۔ اور ان کو سمجھنے کی قابلیت بھی درجہ بدرجہ کم ہوتی جاتی ہے

سائنس نے بھی اپنا فرض پورے طور پر ادا نہیں کیا ہے۔ پہلے قدم پر جب سائنس نے مظاہر کا باہمی مسلسل تعلق معلوم کیا اور یوں مختلف ارواح کو ذریعہ کاروبار ٹھہرانے سے انکار کیا تو خود بھی ایسے ہی اسباب تسلیم کئے جو شخص نہیں تھے۔ تاہم بدلستہ ضرور تھے اور اس طرح واقعات کی تشریح کرنے کا ایک طریق اختیار کیا۔ جو اگرچہ موجودہ مذاہب کے طریق سے مختلف تھا مگر پھر بھی اس میں مختلف علل کو مانا گیا تھا اور اس طرح نامعلوم کو معلوم سمجھ لیا گیا یعنی ملکوتی علل کو چھوڑ کر سائنس نے برق حرارت کشش ثقل و انفصال وغیرہ مختلف علتیں تسلیم کیں۔

آزاد طور پر دیکھا جائے تو سائنس کا یہ طریق غیر فلسفیانہ ہے۔ جس طرح مذہب کا مافوق مروجہ دیوتا وغیرہ غیر فلسفیانہ ہے۔ کیونکہ دونوں ایک ناقابل فہم چیز کو قابل فہم بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر حال میں بعض سائنس کے اعلیٰ درجے کے ماہر حرارت، روشنی اور مقناطیس کو چھوڑ کر۔ جن کو جدا جدا علتیں مانا جاتا ہے۔ اب یہ کہنے لگے ہیں۔ کہ سب طاقتیں کسی اور محیط کل طاقت کے مظاہر ہیں۔ اور اس طرح یہ لوگ اس طاقت کو ناقابل فہم سمجھنے سے باز آنے لگے ہیں۔"

اس اقتباس کو پڑھکر خدا کے متعلق دنیا کے آخری بانی مذہب کا آخری فیصلہ لیس کمثلہ شئی (اس کی طرح کوئی چیز نہیں) پڑھیئے تو صاف ظاہر ہوتا ہے۔ کہ ہماری جملہ علمی اور مذہبی ترقی کا مقصد متحد ہو گیا۔ یعنی ہم ترقی کرتے کرتے ایک ایسی محیط کل طاقت تک پہنچ گئے جس کو ہم نے ناقابل فہم تسلیم کر لیا سائنس نے اس طاقت کو علۃ العلل اور محیط کل مانا۔ اور ناظر خاموش ہو گئی۔ مذہب نے اس طاقت کو محیط کل ماننے کے بعد ایک قدم اور بڑھایا۔ اپنے جملہ افعال کی جوابدہی اس سے متعلق کر دی تاکہ قلوب میں اس طاقت کی کارفرمائی کا خوف باقی رہے۔ اور انسان اپنے افعال کو درست رکھے۔

ان تمام امور سے یہ ثابت ہو گیا کہ مذہب مانع ترقی نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ وہ خود ترقی کر کے انسان کی صحیح رہبری کرنے کے قابل ہوا ہے۔

آخر میں مذہب کی اثر اندازی کے متعلق ہم ایسے شخص کا قول پیش کرتے ہیں جس کو مذہب سے کوئی واسطہ ہی نہ تھا۔ دہریت کی فضا کا تربیت یافتہ تھا۔ اور زندگی بھر مذہب سے ناآشنا رہا۔ یہ شخص فرانس کا باشندہ زمانۂ انقلاب فرانس کا تھا۔ کہ وہ جرنیل مرات تھا جس کی شادی بعد کو نپولین اعظم کی بہن غالباً کیرو لائن سے ہوئی۔ اس کے متعلق جوزف۔ ایس۔ سی ایبٹ کی کتاب لائف آف نپولین میں، جبکہ نپولین مصر پر حملہ آور ہوا تھا جنگ کوہ طبیر کے موقع پر لکھا ہے:

"مجھے اس ہولناک معرکہ میں حضرت مسیح کا خیال آیا کہ اسی مقام پر ان کی تبدیل ہیئت کی گئی تھی۔ جسکو

دو ہزار برس کا عرصہ ہوا۔ اور اس خیال سے مجھ میں چند ہمت اور دلیری بڑھ گئی۔"

خود نپولین کا مذہب کے متعلق حسب ذیل خیال تھا۔ لائف آف نپولین مصنفہ جوزف ایس سی ایبٹ:

"اصل تو یہ ہے کہ علم اور فلسفہ نجات کے لئے بیکار ہیں۔ مسیح دنیا میں اس لئے آئے تھے کہ روح القدس اور سماوات کے قوانین کے راز ظاہر کریں۔ سکندر، قیصر، شارلیمان اور خود میں نے سلطنتوں کی بنیاد ڈالی لیکن اپنی ذہن کی آفریدہ سلطنت کو ہم نے کس بنیاد پر قائم کیا صرف افواج پر۔ لیکن مسیح نے اپنی سلطنت کو صرف محبت پر قائم کیا۔ اگر میں مر جاؤں تو مجھے خاک میں سونپ دیں گے۔ اور میرا جسم غذائے مور ہو جائے گا۔ لیکن مسیح کے نام پر اس وقت لاکھوں آدمی اپنی جانیں دے دیں گے یہ اس آدمی کا انجام ہونے والا ہے جس کو نپولین اعظم کہتے ہیں۔ پس میری اور مسیح کی سلطنت میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ کیا اس کو مرنا کہو گے یہ تو زندہ ہونا ہے۔ مسیح کے نام کا مرنا خدا کے نام کا مرنا ہے۔

میں عالم کو دیکھتا ہوں جو دسیع پیچیدہ اور عالیشان ہے۔ میں اپنے جی سے کہتا ہوں کہ یہ سب اتفاق کا نتیجہ نہیں ہو سکتا۔ بلکہ یہ ایک نامعلوم قادر مطلق کا کام ہے۔ اس کے بنانے سے خواہ اس کا کچھ ہی مقصد ہو۔ لیکن یہ قادر مطلق ایسا خالق ہے کہ انسان سے فائق ہے۔ اور اسی طرح اس خالق کی تمام صنعتیں بشری صنعتوں سے فائق ہیں۔ فلاسفہ کے اقوال میں اس کی جستجو کے لئے آپ کو اس سے بھی زیادہ واضح براہین نظر آئیں گی۔ اور آپ ان براہین کو ہلا نہ سکیں گے۔ لیکن یہ صداقت آدمی کے لئے بہت نہیں ہے۔ کیونکہ وہ خود اپنی بابت اور اپنی آئندہ قسمت کے متعلق حالات جاننا چاہتا ہے۔ اور یہ بھیدوں کا ایسا معمہ ہے جو اس عالم کی مثالوں سے حل نہیں ہوتا۔ پس کیا وجہ ہے کہ مذہب کو اجازت نہ دی جائے کہ وہ ہمیں ان باتوں سے باخبر بنا دے۔"

جزیرہ سینٹ ہلینا میں اپنے آخری اسیری کے دوران میں نپولین اعظم نے کہا:-

"مذہبی خیالات اس قدر تسلی بخش ہیں کہ ان کو آسمانی برکات کہنا چاہئے۔ اگر ہم مذہب کے پابند ہوں تو وہ ایسی کونسی شے ہے جو اس سے حاصل نہ ہو گی۔"

ایک اور مشہور فاضل کا بیان بھی پڑھیئے۔ ڈرائی فینڈل لکھتا ہے:-

"مجھے اچھی طرح یقین ہے کہ انسان خود کچھ نہیں کرتا وہ موج کے جھاگ کی مثل ہے جو پیدا ہوتا ہے اور بلبلے پیدا کرتا ہے۔ اور پھر بیٹھ جاتا ہے۔ اور اس کچھ میں اس کی سعی سے کچھ نہیں ہوتا۔ بلکہ تقدیر کی قوی تحریک سے ہوا کرتا ہے۔ جو اس کو مجبور کرتی ہے اسی کو پرسیلے فلسفیانہ ضرورت سے موسوم کرتا ہے اور کالون نے قضا و قدر نام کہا ہے۔"

مذہب کے متعلق ہم نے علمی گروہ کی دماغ سوزی بھی دیکھی اور نپولین اعظم اور مرات جیسے عملی لوگوں کے بیانات بھی دیکھے اور اس نتیجے پر پہنچے کہ دنیا کی اخلاقی سلطنت کے لئے مذہب کا وجود ضروری ہے اور مذہب فطری ہے۔ اس لئے مغرب کا یہ کہنا کہ مذہب ترقی کے لئے مانع ہے قطعی غلط ہے۔

(لسان الوقت) راز یزدانی

اندھا مصور

بقیہ صفحہ نمبر ۱۴

باکمال مصوروں کی تصویریں لگی ہوئی ہیں۔ زینت پانے کی:

اندھا مصور چونک کر بولا: "نا با با! میں اس تصویر کو بیچوں گا تو نہیں۔ خواہ اس کے بدلے مجھے انعام دیا جائے۔ یا قیمت۔ یہ تو میری جان ہے"۔

تمام درباری اس کی اس گستاخانہ جرات پر کانپ گئے لیکن شاہی مصور جس کے کہنے پر اسے یہاں بلوایا گیا تھا۔ گوالے سے بولا: "یہ سچ ہے۔ کہ یہ تمہارا واحد اور آخری شاہکار ہے کیونکہ اب تم اندھے ہو گئے ہو۔ اس لئے آئندہ کوئی بھی تصویر نہیں بنا سکو گے۔ مگر تمہیں انعام بھی تو خاطر خواہ ملتا ہے۔ تمام زندگی اس سے بآرام گزار سکو گے۔ ورنہ کسی نے مانگی بھیک بھی تو نہیں ڈالنی"۔ گوالا بولا۔

"نہیں بھائی! مجھے تو میری تصویر ہی واپس دیدو، مجھے کسی انعام وغیرہ کی ضرورت نہیں۔ میں اسے فروخت نہیں کرونگا"

مہارانا کی آنکھیں غصے سے سرخ ہو گئیں۔ وہ کڑک کر بولے: "اس تصویر کو راج محل میں پہنچا دو اور اس پاگل اندھے کو دھکے دیکر باہر نکال دو"۔

چوبداروں نے حکم سنتے ہی گوالے کو دھکے دیکر دربار سے باہر نکال دیا۔ اور تصویر مہارانی کے سنگار دان کی چوکی کے بالمقابل ایک بیش قیمت چوکھٹے میں لگا کر آویزاں کر دی گئی، راجہ کا غصہ رحم اور انصاف سے بھی زبردست ہوتا ہے۔

(۲)

رات کے وقت جب مہارانا عیش منزل میں پہنچے۔ تو مہارانی نے۔ جسے اندھے مصور کے دربار سے نکال دیئے جانے کا حال معلوم ہو چکا تھا۔ مہارانا سے کہا: "پتی دیو! آپ نے اس اندھے مصور پر بڑا ظلم کیا۔ جو اسے اسطرح بے عزت کر کے دربار سے نکلوا دیا۔ ایسی اعلےٰ تصویر بنانے والے کے تو ہاتھ چومنے چاہئیں"۔ لیکن مہارانا نے اسے ہنسی مذاق میں ہی ٹال دیا۔ پھر وہ اس واقعہ کو بھول گئے۔ مگر کئی دنوں بعد مہارانا کھانا کھا رہے تھے۔ اور مہارانی مور کے پروں سے بنے ہوئے پنکھے سے انہیں ہوا کر رہی تھی، اور ساتھ ہی تصویر کی طرف بھی دیکھ رہی تھی۔ معاً مہارانی کو ایسا معلوم ہوا جیسے تصویر کی آنکھوں سے دو آنسو ٹپک کر زمین پر گر رہے ہوں، وہ حیران ہو کر بولی:

"مہاراج میں نے اس تصویر کی آنکھوں سے آنسو گرتے دیکھے ہیں"۔ مہارانا اس کے چہرے کی طرف دیکھکر مسکراتے ہوئے بولے: "دیوانی ہو گئی ہو کیا؟"

مہارانی نے کہا۔ نہیں مہاراج! میری آنکھیں دھوکہ نہیں کھا سکتیں۔ شاید یہ کوئی جادو کی تصویر ہے۔ آپ اس

کے بنانے والے کو بلوائیں۔ ایسا نہ ہو۔ اس سے ہمارے لئے کوئی خطرہ پیدا ہو جائے۔

مہارانی کے اصرار سے مجبور ہو کر مہارانا نے اندھے مصوّر کو حاضر کرنے کے لئے چوبداروں کو حکم دیا۔ مگر انہوں نے واپس آکر عرض کی۔ کہ غریب مصوّر ان کے جانے سے تقریباً آدھ گھنٹہ پہلے اس دارِ فانی سے کوچ کر گیا ہے۔

مہارانی نے کہا؛ مہاراج یقیناً اس تصویر نے اپنے بنانے والے کی موت پر ہی زندہ انسانوں کی طرح آنسو بہائے تھے۔ شاید یہ اس کی بیوی یا محبوبہ کی تصویر ہو۔ اس کو اس کے ساتھ ہی چتا میں جلا دینا چاہیئے۔ یہ واقعی اس نیکدل انسان کی جان تھی۔ آپ نے اس کو اس سے زبردستی چھین کر بہت برا کیا!

شام ہونے سے پہلے، اندھے مصوّر کی نعش اور اس کی بنائی ہوئی تصویر دونوں چتا کے شعلوں میں جل کر خاک ہو گئے۔

سیاح سنامی

بادۂ شیراز

اگر با رقیباں وفا کردہ باشی — ندانی بر عاشق جفا کردہ باشی

کسے کز رخت چشم پوشیدہ باشد — بدل اندرش نیز جا کردہ باشی

اگر کردۂ زاہدا کارِ رندی — بہ آئین ریو و ریا کردہ باشی

مجو منزلِ تشنہ کامانِ الفت — ز سر تا بہ اے خضر پا کردہ باشی

بہ زلفِ خود آنگونہ جنبش بدادی — کہ مرغِ دلِ من رہا کردہ باشی!

برآید ز گردوں مرادِ تو کامل

چو تکیہ بہ لطفِ خدا کردہ باشی

ملک عبدالحق کامل بی اے

غزل

زمانہ اس کی یکتائی کا قائل کیوں نہ ہو دل سے
بدیہیات کا انکار ہو سکتا ہے مشکل سے

نہ اب امید راحت اضطرابِ شوق کے ہاتھوں
نہ اب مشکل فراغت کاروبارِ حسرتِ دل سے

ضروری تھا مرا دنیا سے اٹھ جانا ضروری تھا!
خبر بھی ہے کہ اٹھوایا گیا تھا کس کی محفل سے

بہت چاہا کہ ہم کچھ دین کی خدمت بھی کر جائیں
مگر فرصت نہ پائی شاہد و مے کے مشاغل سے

وہ اک مہرِ تجلّی بارِ عالم کا خیال آنا،
وہ اک عالم کا بت جانا تجلّی ہائے نازل سے؛

یہ کہنا تھا کہ اسکو جلوہ فرما کس طرح دیکھوں
صدا آئی کہ "آنکھیں بند کر کے دیدۂ دل سے"!

خوشا حالِ قدح نوشانِ خوش قسمت کہ پی پی کر
مہکتے ہیں گلِ تر سے چہکتے ہیں عنادِل سے

خلافِ راہِ منزل گامزن ہونے سے کیا حاصل
بجائے قربِ منزل بعد ہو جائیگا منزل سے!

کہیں آزاد تاثیرِ نظر مٹتی نہیں پھرتی!
یقیناً تم کو نسبت ہے کسی درویشِ کامل سے

حکیم آزاد انصاری

(افسانہ)

ماں

"بیٹی اچھی!"

یہ آواز، ایک عالیشان عمارت، اسمٰعیل بلڈنگ، کے دروازے کے پاس بجلی کے کھمبے کے نیچے کھڑی ہوئی ایک برقعہ پوش عورت کے لبوں سے نکلی، اور اس کے قریب کھڑی ہوئی سردی سے ٹھٹھرتی ہوئی ایک کمسن لڑکی، اس کی ٹانگوں سے لپٹ گئی۔

"کیوں، ماں؟"

"جاؤ بیٹی! اندر چلی جاؤ، یہاں بہت سردی ہے۔"

لڑکی نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ اور اس کی ٹانگوں سے لپٹی رہی۔ یہ بدنصیب عورت، شہر کے مشہور و معروف دولتمند تاجر شیخ اسمٰعیل کی بیوی آمنہ تھی، اور یہ اس کی بیٹی اصغری۔

آج سے آٹھ سال پیشتر آمنہ اپنے غریب والدین کے گھر میں، نہایت خوش و خرم تھی، زندگی کے تلخ و صبر فرسا حقائق سے بالکل ناواقف، اور زمانے کے دل شکن و روح گداز حادثات سے محض ناآشنا، اس کی نگاہ میں زندگی عبارت تھی ایک غیر مختتم مسرت سے۔ اور دنیا نام تھا ایسی جگہ کا جہاں مسلسل خوشی کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔ دیہات کا وہ گوشہ جہاں اس کی مسرور زندگی گزر رہی تھی، اس کے لئے جنت الفردوس سے کسی حالت میں بھی کم نہ تھا۔ صبح کے وقت، رات کے جھوٹے برتن مانجھنے کے بعد، جب وہ اپنی سادہ طبیعت سہیلیوں کے ساتھ گا گا کر قہقہے لگا لگا کر چکی پیستی تو اپنے دل میں ایک ایسی مسرت محسوس کرتی جسے دولتمندوں کی فراوانی دولت بھی حاصل کرنے سے قاصر تھی، دیہات کی سادہ دستوں میں اسے ہر وقت مسرت ہی کے قہقہے گونجتے ہوئے سنائی دیتے تھے۔ اس کی زندگی بذات خود ایک قہقہہ تھی جس نے دیہات کی ایک سادہ مزاج لڑکی کی شکل اختیار کر لی تھی، جیسے جیسے وقت گزرتا جاتا تھا۔ اس کی خوشیاں بھی بڑھتی جاتی تھیں۔ یہ ایک حقیقت ہے۔ کہ جب جوانی کا آفتاب افق حیات کی پیشانی پر طلوع ہوتا ہے، تو سادہ سے سادہ زندگی بھی، ایک دلآویز خواب بن جاتی ہے — ایک دلآویز خواب رنگین —!! آمنہ نے بھی منزل شباب میں قدم رکھتے ہوئے خود کو نئی مسرتوں کے آغوش میں پایا۔ اور جب اس کی منگنی شہر کے بہت بڑے رئیس اور اپنے چچا کے بیٹے اسمٰعیل سے قرار پائی، تو خاندان کا ہر ایک فرد فرط مسرت سے دیوانہ ہو رہا تھا۔ کسی کے خواب و خیال میں بھی یہ بات نہ آ سکتی تھی، کہ آمنہ اس قدر خوش نصیب ہوگی۔ اسمٰعیل کا باپ ایک نہایت کامیاب تاجر تھا جفاکشی، ایمانداری، اور لگاتار تگ و دو نے اس کے کاروبار کو بہت فروغ دیا تھا۔ اور انہی خصوصیات کی بنا پر اس کا ہر اقدام کامیاب رہتا۔ آدمی نیک مزاج و خلوص کیش تھا، اس لئے آمنہ کے والد کی درخواست کو رد نہ کر سکا۔ اور دیہات

کی اس سادہ مزاج لڑکی کو اس نے اپنی بہو بنانا منظور کر لیا آمنہ کے ارد گرد متعدد شادی شدہ عورتیں تھیں۔ جنہیں وہ اپنے سے زیادہ مسرور پاتی تھی۔ اب جبکہ خود وہ اس منزل پر قدم رکھنے والی تھی، اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا شہر کی زندگی کو دیہات کے لوگ جنت کی زندگی سمجھتے ہیں، آمنہ کو جب اس زندگی کا خیال آتا۔ تو اس کے دل میں ایک اضطراب انگیز مسرت یا ایک مسرت انگیز اضطراب دوڑنے لگتا۔ اور جب سہیلیوں کے ساتھ گاگر اٹھائے، وہ پانی بھرنے کے لئے کنوئیں پر جاتی۔ اور پہلے گاگر بھرنے کیلئے لڑائی کرتی، تو وہ اس کی گاگر چھڑا لیتیں، اور مسکرا کر کہتیں۔ اری تو تو یہاں چار دن کی مہمان ہے۔ پھر بھی ہم سے لڑتی ہے: وہ مسکرا کر منہ دوسری طرف پھیر لیتی۔ حیا کی سرخی اس کے چہرے پر جھلک جاتی۔ وہ سب سے آخر میں گاگر بھرتی۔ اور چلنے لگتی۔ تمام راہ رنگین امیدوں کے پرتو سے جگمگاتے ہوئے مستقبل کا تصور، نشے کی ایک لہر بنکر اسکے دل و دماغ پر طاری رہتا۔ بظاہر وہ سہیلیوں کی گفتگو کو برا مناتی۔ مگر اس کے دل میں یہی خواہش ہوتی، کہ ان کی گفتگو ختم نہ ہو، منگنی کے دو سال بعد یہ دیہاتی لڑکی، دیہات کی جھونپڑی سے نکل کر شہر کی ایک محل نما عمارت میں پہنچ گئی، حجلۂ عروسی کی فضا خوشبو سے مہک رہی تھی، وہ اس وقت شاندار پلنگ پر گٹھری کی صورت میں بیٹھی ہوئی عجیب لذت محسوس کر رہی تھی۔ ہر طرف رنگ برنگ کے برقی قمقموں کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ پلنگ پر پھولوں کے ہار پڑے ہے۔ اس نے پھولوں کے رنگین ہاروں کو دیکھا۔ اور خود بخود شرما گئی اس کی نگاہوں کے آگے دولہا کا پھولوں میں بکھرا ہوا مسکراتا چہرہ پھرنے لگا۔ اس نے اپنے عین سامنے دولہا کے چہرے کو دیکھا۔ پھر وہاں سے اس کی نظریں ہٹ کر . . . . پھولوں پر پڑیں۔ ایسا معلوم ہوتا، کہ اس کا رنگین خواب، روشنی سے ٹکرا کر، پھولوں کی صورت میں بکھر گیا ہے، ہر قدم کی آہٹ پر اس کا دل دھڑک جاتا تھا۔ اور وہ شرما کر، لجا کر رہ جاتی تھی۔ اس کا دولہا آیا، محبت کے فوری جذبے میں، مرد عورت سے وفاداری کا کیا کیا وعدہ نہیں کرتا؟ اسمٰعیل نے بھی اس کے ساتھ محبت کے عہد و پیمان کئے۔ حیات ازدواجی شروع ہوئی، اور نہایت مسرور کن و نشہ آور کیفیت میں، شادی کے آغاز میں عورت خود کو بہت خوش نصیب سمجھتی ہے۔ کیونکہ مسرت اس کا ساتھ دیتی ہے۔ مگر حیات ازدواجی کی یہ مقدس مسرت بہت جلد غائب ہو جاتی ہے۔ آمنہ کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ اس کی تمام امیدیں خاک میں مل گئیں۔ رنگین تصورات خاک نامرادی میں منہ چھپانے لگے۔ اور خوشی درخت کی ٹہنی سے ٹوٹے ہوئے ایک حقیر پتے کی مانند، جو ظالم جھونکوں کا مقابلہ کرتا ہوا، شاخوں سے سہارا لیتا ہوا، چند لمحوں میں زمین پر گر پڑتا ہے مفقود ہو گئی —— !! اس کے خاوند کی حالت بالکل بدل گئی۔ شہری زندگی کے تصنعات میں پرورش پائے ہوئے، امیرانہ تربیت حاصل کئے ہوئے، مرد کی تمناؤں خواہشوں کو، دیہات کی ایک سادہ مزاج عورت کیونکر پورا کر سکتی تھی۔ اور نہ پورا کر سکنے کی حالت میں کیونکر اپنی زندگی کی لڑکھڑاتی ہوئی مسرتوں کو سنبھال سکتی تھی؟ نتیجہ وہی ہوا۔ جو ہمیشہ ہوتا رہا ہے۔ اور جو ہمیشہ ہوتا رہے گا۔ اسمٰعیل اس سے متنفر ہو گیا۔ اور اس سے گریزاں رہنے لگا۔ ایک وفا شعار

عورت کے لئے اس سے زیادہ اور کیا مصیبت ہوسکتی ہے کہ اس کا خاوند اس سے نفرت کرے۔ اس سے بھاگے؟ وہ ہروقت غمگین رہنے لگی۔ دل ہی دل میں کڑھتی اس کے سوا وہ کر بھی کیا سکتی تھی؟ اس حالت میں اس کی معصوم بچی اصغری اس کے واسطے بہت بڑی رحمت ثابت ہوئی۔ اس کی تمام توجہات اس ننھے سے جسم میں مرکوز ہوگئیں۔ جب ننھی بچی کے لبوں پر معصوم تبسم کھیلتا۔ تو فرط محبت کے زیر اثر وہ بے اختیارانہ اسے سینے سے لگالیتی۔ خوشی سے اس کا سینہ بھر جاتا۔ غم کا تاریک وکثیف بادل، جو اس کی روح پر منڈلاتا رہتا تھا۔ اس معصوم کی چمکتی ہوئی پیاری پیاری آنکھوں کی روشنی کے سامنے دور ہوجاتا۔ خاوند کے ناقابل برداشت مظالم کے باوجود وہ خوش تھی۔ قدرت نے اس کے خاوند کے دل سے محبت چھین لی۔ لیکن اس کے عوض محبت کی یہ جیتی جاگتی تصویر بھیج دی۔

اسمٰعیل کی عشرت پسند اور عیش جو طبیعت کیونکر خاموش رہ سکتی تھی؟ وہ کیونکر برداشت کرسکتا تھا کہ کوئی جدید معاشرت کا ساتھ دینے والی اس کی زندگی کا ساتھ نہ دے۔؟ ترکشِ ستم سے آخری تیر نکلا۔ شہر کے ایک دولتمند آدمی کی لڑکی اس کی سوکن کی صورت میں اس کے پاس آموجود ہوئی۔ صورت حال دیکھکر آمنہ کا دل لرز گیا۔ اس نے سنا تھا، کہ سوکن بہت ظلم کیا کرتی ہے۔ ایسا ہی ہوا۔ دنیا کے ملعون ترین ظلم نے اپنا نشانہ اس دیہاتی عورت ہی کے سینے کو بنایا۔ اب اس کے خاوند کے پاس اس کے لئے صرف ایک چیز رہ گئی تھی، اور وہ تھی، بالکل لاپروائی۔ اس کی سوکن کے پاس اس کے واسطے صرف ایک شے تھی، اور وہ تھی طعنہ زنی!! بیچاری عورت اپنی فریاد کسے سناتی؟ شادی کے دو سال بعد ہی اس کا سسر فوت ہوگیا تھا۔ اب رہ گئے والدین۔ تو ان کے لئے یہ فخر کی بات نہیں تھی۔ کہ ان کی لڑکی بہت بڑے رئیس کے گھر ہے؟ وہ اسی فخر میں مست تھے۔ کاش انہیں اپنی بیٹی کے اس زخم کی خبر ہوتی جو اس کے سینے میں ہروقت رستا رہتا ہے۔

بار بار نفرت انگیز قہقہے، ہروقت دلخراش طعنے، رات دن جھڑکیاں، گالیاں، وہ کیا کیا ظلم برداشت کرتی۔ ظلم بالائے ظلم یہ کہ سوکن اس کی معصوم بچی کو بھی ظالمانہ طور پر مارتی تھی۔ وہ بیچاری اتنا بھی نہ کرسکتی تھی۔ کہ اصغری کو اس ظالمہ کے پنجے سے چھڑائے۔ اس نیت سے جب ذرا آگے بڑھتی تو خاوند، اور سوکن دونوں پنجہ جھاڑ کر اس کے پیچھے پڑ جاتے: "تم لڑکی کو خود بھی ہدایت نہیں دیتی ہو، اور ہمیں بھی منع کرتی ہو" یہ تھے سوکن کے الفاظ، جو وہ اسے روکنے کے واسطے کہتی۔ بے چاری آمنہ خونِ جگر پی کر منہ دوسری طرف پھیر کر خاموش کھڑی رہتی جب مار پڑنی ختم ہوجاتی، تو وہ بچی کو سینے سے لگائے، اپنے کمرے میں چلی جاتی۔ اسے بھینچ بھینچ کر خوب روتی، بچی معصومانہ انداز میں کہتی۔

"انہوں نے تمہیں بھی مارا ہے اماں؟"

"نہیں۔۔۔۔ بب۔۔۔۔۔ بیٹی!"

"تو پھر تم کیوں روتی ہو؟"

اس کا جواب وہ کیا دیتی ۔۔۔ کیا دے سکتی تھی؟

آج کی شام سے دو دن پیشتر اصغری کا ہاتھ آگ میں جل گیا تھا۔ اس لئے وہ اسے کوئی کام کرنے نہیں دیتی تھی۔ اب

سے ایک گھنٹہ پیشتر وہ اپنے کمرے میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اور اپنی حالت پر رو رہی تھی۔ جب غم و غصہ انتہا پر پہنچ جاتا۔ تو والدین کو کوسنے لگتی جنہوں نے اسے اس اندھیرے کنوئیں میں دھکیل دیا تھا یکایک اسے بچی کے رونے کی آواز سنائی دی۔ وہ بے اختیارانہ باہر نکل آئی سوکن اصغری کو بیرحمانہ مار رہی تھی۔ اور بچی درد سے تلملا رہی تھی۔ اس سے نہ رہا گیا۔ اس نے آگے بڑھکر سوکن کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"ایک تو اس کا ہاتھ جلا ہوا ہے اور دوسرے تم مار رہی ہو۔ رحم نہیں آتا تمہیں؟"

"دیکھا! بڑی ہمدرد آگئی" سوکن نے اسمٰعیل کی طرف مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

"کیا بات ہوئی؟" اسمٰعیل نے پوچھا۔

"میں نے اس کمبخت کی بچی کو کہا تھا کہ ذرا گلاس مانجھ دے۔ کہنے لگی میرا ہاتھ جلا ہوا ہے۔ حالانکہ اس کے ہاتھ کو کچھ بھی نہیں ہوا۔"

"اندھی تو نہیں ہو۔ اس کا ہاتھ تو دیکھو" آمنہ نے جل کر کہا۔

ایسا سخت فقرہ اس نے تمام عمر میں پہلی بار کہا تھا، اس کے سینے میں آگ لگی ہوئی تھی۔ اس وقت اس کا دل چاہتا تھا۔ کہ سامنے کھڑی ہوئی ظالم عورت کے چہرے کو نوچ دے وہ کچھ اور کہنا چاہتی تھی۔ کہ سوکن آگ بھبوکا ہو کر بولی۔

"اندھی ہو تو، تیری ماں —— بے شرم کہیں کی....

... دیہات کی چھوکری ہو کر ہمارے سروں پر چڑھتی جاتی ہے "تو تو کب بادشاہ کی بیٹی ہے" وہ نہیں جانتی تھی، کہ کیا جواب دے۔ فرط غصہ و غم سے اس کی زبان بند ہو گئی تھی۔

"خاموش رہو بدبخت! میں پوچھتا ہوں، تو اپنی شرارتوں سے کب باز آئے گی؟" خاوند نے اپنی چہیتی بیوی کے اشارے پر کہا۔

"میرا تو اب یہ فیصلہ ہے۔ کہ یا میں رہوں گی، یا تمہاری یہ چہیتی بیوی" اس کی سوکن نے خاوند کی طرف دیکھتے ہوئے کہا

"یہ دیہاتی ڈائن واقعی بہت تنگ کرتی ہے" اسمٰعیل نے کہا۔

ان الفاظ سے آمنہ پر بجلی گر پڑی۔

"اگر تو نے اپنی حالت نہ بدلی، تو میں تجھے گھر سے نکال دونگا" یہ اس کا دوسرا فقرہ تھا۔

"اس کا ابھی فیصلہ ہونا چاہیئے۔ میں اس ڈائن کے ساتھ نہیں رہ سکتی" سوکن نے لال پیلا ہو کر کہا۔

"میں ڈائن ہوں؟" آمنہ کے لبوں سے نکلا۔

"اور کیا، بلکہ ڈائن سے بھی زیادہ"

"تو میں چلی جاتی ہوں"

"ہماری جوتی سے۔"

آمنہ اپنے کمرے میں چلی گئی، برقعہ پہنا، اور باہر نکلنے لگی۔ اسے کامل یقین تھا، کہ اس کا خاوند اسے ایسا کرنے سے روکے گا۔ مگر وہ ظالم بیٹھا رہا۔ ایک لفظ تک اس کے منہ سے نہ نکلا۔ وہ اضطراری کیفیت میں گھر سے باہر نکل گئی، اور انتظار کرنے لگی۔ کہ اس کا خاوند یا کوئی اور آئے۔ اور اسے لے جائے۔ اسی اثناء میں اصغری بھی وہاں آگئی۔

رات کے نو بجے تھے۔ سردی بلا کی تھی۔ ہوا کے سرد جسم خراش جھونکے، نہایت تیزی سے چل رہے تھے۔ اور ان کے ہلاکت خیز حملوں کے سامنے دو بیکس ہستیاں کھڑی تھیں۔ دو بیکس مظلوم، ستم رسیدہ ہستیاں! ان کے سامنے، ان کے عالیشان مکان کا دروازہ کھلا تھا۔ مگر وہ نہیں جا سکتی تھیں ماں نے چہرے سے نقاب ہٹا دیا تھا۔ اس کی آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی آنکھیں آسمان کی طرف دیکھ رہی تھیں اس کا دایاں ہاتھ دروازے پر رکھا ہوا تھا۔ گویا وہ خلاقِ عالم سے پوچھ رہی تھی، کہ اس دروازے کو چھوڑ کر اب وہ کہاں جائے؟ بچی متفکرانہ، بیکس ماں کو دیکھ رہی تھی۔ امینہ نے سرد آہ بھری۔ اور دروازے پر نظریں گاڑ دیں۔ وہ انتظار کر رہی تھی، کہ کوئی اندر سے آئے۔ اسے آہنی دروازے پر برقی قمقمے کا ہلکا سا حلقہ نور، اس کی کبھی پوری نہ ہونے والی امید پر، ایک خاموش قہقہہ استہزا بنکر محسوس ہو رہا تھا۔ دائیں بائیں ایک مسلسل قطار میں شاندار کوٹھیاں کھڑی تھیں۔ جن کے خوش قسمت مکیں مخملیں لحافوں میں خوابِ استراحت کا لطف اٹھا رہے تھے۔ انہیں کیا خبر تھی، کہ ان کے قریب دو مظلوم ہستیاں، قدرت کے انتہائی ظلم کا نشانہ بنی ہوئی ہیں، وہاں کوئی بھی نہیں تھا جو ان کی مصیبت کا اندازہ لگاتا۔ ان کی گریہ آور و قابلِ رحم حالت دیکھتا۔ کسے پڑی تھی کہ اس سردی میں گھر سے باہر نکلتا۔؟ اچانک اندر سے اسمٰعیل کی گرجتی ہوئی آواز سنائی دی، اصغری خوف زدہ ہو کر، اور یہ سمجھ کر کہ اس کا باپ جھڑکتا ہوا اسے مارنے کے لئے آ رہا ہے۔ ماں کا ہاتھ چھوڑ کر ایک طرف تیزی سے بھاگ گئی حیران و پریشان ماں بھی اس کے پیچھے چلی گئی۔ اصغری کچھ دور ایک درخت کے عقب میں کھڑی کانپ رہی تھی۔ آمنہ نے آواز دی، خوفزدہ بچی خاموش رہی۔ کئی بار ایسا ہوا تھا، وہ سوتیلی ماں یا باپ سے ڈر کر ایک جگہ چھپ گئی ماں نے آواز دی اور جب وہ آئی تو سوتیلی ماں نے اسے مارنا شروع کر دیا ظلم کا یہ نقشہ اس کی آنکھوں کے آگے پھر رہا تھا۔ چند منٹ کے بعد آمنہ نے معصوم بچی کو کانپتے ہوئے دیکھ لیا۔

"اچھی تجھے کیا ہوا؟" ماں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"ابا جان ـــ ۔۔۔۔۔ مارنے آ رہے تھے!"

مظلوم عورت کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔ آنسوؤں کی نقاب میں سے اس نے خوف اور سردی سے کانپتی ہوئی بیکس بچی کے زرد چہرے کو دیکھا۔ اس کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہونے لگا۔ وہ اس وقت جی کھول کر رونا چاہتی تھی، سیلاب اشک بہنے کے لئے آنکھوں میں موجزن تھا۔ اس نے انتہائی ضبط سے کام لیا۔ معاً اس کے دل میں خیال گزرا، کہ یہ معصوم بچی کیوں اس کے ساتھ سردی کا ظلم برداشت کرے؟ وہ خود کو لعنت ملامت کرنے لگی، کہ کیوں وہ گھر سے باہر نکل آئی؟ "آخر میں نے پہلے یہ ظلم برداشت نہیں کئے تھے؟" اس نے دل میں کہا۔ یہ ذلت و ستم میرے واسطے نیا نہیں ... مگر انہوں نے تو مجھے گھر سے نکال دیا ہے ـــ وہ تو مجھے ـــ" اس نے مایوس ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔ تاہم وہ رو کر بھی کیا کر سکتی تھی۔ اس نے بچی کو گود میں اٹھا لیا۔ اور گھر کی طرف چلنے لگی۔ بار بار اس کے دل میں

یہ خیال پیدا ہوتا تھا۔ کہ اگر نوکروں نے دروازہ بند کر لیا ہو تو پھر، دروازے کو دور ہی سے دیکھ کر اس کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ اس کی آخری امید بھی خاک میں مل چکی تھی، دروازہ بند ہو چکا تھا۔ اس کی نگاہوں میں دنیا خون آلود تاریکی میں ڈوبنے لگی۔ قریب پہنچ کر اس نے دروازے پر دستک دی، مگر اس سے کیا ہو سکتا تھا، ماں کو دیکھ کر بچی بھی اپنے ننھے ننھے ہاتھ لوہے پر مارنے لگی۔ مگر پھر درد محسوس کر کے، اپنے ہاتھ کھینچ لئے۔ آہ! یہ منظر کتنا دردناک، کتنا درد انگیز تھا۔ آمنہ نے آواز دینی چاہی، مگر کوشش کے باوجود بھی آواز اس کی زبان سے نہ نکل سکی۔ آخر کار ہلکی سی آواز "نبیا" کہتی ہوئی، اس کے تھرتھراتے ہوئے لبوں سے نکلی۔ نبیا گھر کا بوڑھا خادم، وہاں کہاں تھا؟ اس نے ایک اور آواز دی۔ مگر یہ بھی فضا میں ایک ہلکا سا ارتعاش پیدا کر کے غائب ہو گئی۔ اندر سے کوئی ہاتھ دروازے کی طرف نہ بڑھا۔ آدھ گھنٹہ تک وہ وہاں کھڑی رہی۔ بچی بار بار کہتی "اماں سردی، سردی" وہ اس کے جواب میں اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرنے لگتی۔ اس کی باہیں تھک گئیں۔ ہاتھ درد محسوس کرنے لگے۔ اس کی قسمت کی طرح دروازہ بدستور بند تھا۔ اسے ایسا محسوس ہوتا تھا۔ کہ ہوا کا ہر ایک سرد جھونکا، اس کے دماغ کا کوئی نہ کوئی جزو، اس کے دل کا کوئی نہ کوئی حصہ اڑا کر لئے جا رہا ہے اور وہ قبرستان کے زنگ آلود آہنیں دروازے پر زخمی ہاتھ مار مار کر چیخ رہی ہے۔ اس کے عریاں سینے سے لہو کا ایک قطرہ نکلتا ہے۔ اور وہ وہیں جم جاتا ہے۔ یکا یک اصغری مدھم سی آواز نکالتی ہے۔ اور نظر اس کی آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے، خون کا یہ قطرہ منجمد اس کی ننھی اصغری ہے۔ جسے اس نے سینے سے لگا رکھی ہے۔ اسی اثنا میں امید کی ایک کرن اس کی آنکھوں میں چمکی۔ جس کمرے میں بوڑھا نبیا سوتا تھا، وہاں سے بھی اندر راستہ جاتا تھا۔ وہ تیزی سے وہاں پہنچی۔ دروازے پر دستک دی، بوڑھے نے یہ سمجھ کر کہ شاید کوئی کتا دروازے پر پنجے مار رہا ہے "شی شی" کہا، اور ساتھ ہی چھڑی کو زور سے زمین پر مارنے کی آواز آئی۔ آمنہ کو محسوس ہوا، کہ وہ زمین کی آخری گہرائی میں جا گری ہے۔ وہ اس گھر کی مالکہ تھی ― وہ اس گھر کی مالکہ بنکر آئی تھی، اور آج اسے ایک ذلیل کتا سمجھا جا رہا تھا، اس کی آنکھوں میں آنسو خشک ہو چکے تھے، کوشش کے باوجود آنسو کا ایک قطرہ بھی اس کی آنکھوں سے نہ نکلا، یہ نا امیدی کی، ذلت کی انتہا تھی۔ ذلت اور حقارت، دنیا میں اس کے لئے صرف یہی دو چیزیں رہ گئی تھیں۔ اگر وہ اکیلی ہوتی تو یقیناً کنوئیں میں چھلانگ لگا لیتی۔ مگر اس وقت وہ ایسا نہیں کر سکتی تھی۔ اس کے سینے سے چمٹی ہوئی ایک ننھی سی ہستی، اپنے ننھے ننھے ہونٹوں سے بار بار اماں، اماں کہنے والی معصوم بچی، اس کے اس خطرناک ارادے میں حائل تھی، اس لئے دل کڑا کر کے پھر دروازے پر دستک دی۔ آواز بھی دی، اب کے "شی" کی آواز زور سے آئی، وہ دروازے سے ہٹ گئی، چند منٹ ایک جگہ کھڑی رہنے کے بعد، وہ پھر آہنیں دروازے کے سامنے کھڑی تھی۔ کچھ دیر وہاں کھڑا رہنے کے بعد، وہ اپنے مکان کے پہلو میں باغیچہ کی طرف قدم اٹھانے لگی، دو تین منٹ میں وہ باغیچے میں تھی۔ چاروں طرف تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ آسمان پر بادل منڈلا رہے تھے۔ وہ ایک گوشے میں کھڑی ہو گئی، اسے ایسا محسوس

ہوتا تھا کہ وہ بحرِ بے پایاں میں ڈوب رہی ہے۔ ہر طرف تاریکی ہے۔ ایک طرف سے۔ مگر کچھ تیزی سے اس کی طرف بڑھ رہا ہے۔ دور بجلی کا قمقمہ سے مگرمچھ کی چمکتی ہوئی آنکھ بنکر نظر آرہا تھا۔ قدرت کے ستم کا کون سا تیر تھا جس سے وہ محفوظ تھی۔ وہاں جہاں وہ کھڑی تھی، اس کے مکان کی ایک کھڑکی کھلتی تھی، وہ اس وقت بند تھی۔ اور بچی بھی اس سے بہت اونچی۔ بچی لرزتی ہوئی آواز میں کہتی، "اماں سردی۔۔۔ سردی"! بیکس ماں اسے سینے سے بھینچ لیتی وہ ایک پودے کے پاس بیٹھ گئی ..

... اچانک اس کے دماغ میں خیال پیدا ہوا، کہ وہ کسی ہمسائے کے دروازے کو کیوں نہ کھٹکھٹائے۔ لیکن پھر مایوس ہو گئی، ممکن ہے۔ دروازہ نہ کھلے۔ اور پھر وہ کہہ کیا سکتی تھی؟ شرم و حیا، اور بے عزتی کا احساس، اسے ایسا کرنے پر کبھی رضامند نہیں کر سکتا تھا۔ مجبور ہو کر بیکس عورت باغیچے کے آخری گوشے میں چلی گئی۔ جسم پر شلوار اور ایک قمیص کے سوا باقی سب کچھ اتار دیا۔ پھر برقعے اور دوسرے کپڑوں میں بچی کو لپیٹا، اور اسے سینے سے لگا لیا۔ اس کے جسم کے گرد ہاتھ حمائل کر دیئے پشت دیوار سے لگا دی، اور بیٹھ کر سردی کے ہلاکت آور جھونکوں کے درمیان ماں کی ممتا کا آخری ثبوت دینے لگی ۔۔ !!

صبح کے سات بج چکے تھے۔ باغیچے میں آکر مالیوں نے جونہی زور، ایک عجیب و غریب منظر دیکھا۔ وہ وہاں تیزی سے پہنچے۔ ایک عورت مردہ پڑی تھی سینے پر کپڑوں کی ایک گٹھری کے گرد ہاتھ حمائل تھے۔ ایک مالی نے یہ دیکھنے کے لئے کہ آیا وہ زندہ ہے یا نہیں، اسے جنبش دی، سینے سے ہلکی سی آواز آئی جسے سن کر انہوں نے سینے سے کپڑے اتار ے ننھی بچی اس وقت آنکھ ملتی ہوئی، مردہ ماں کے سینے سے علیحدہ ہو کر ایک طرف کھڑی ہو گئی، اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اماں اماں، کہنے لگی آہ! اس کی اماں ہمیشہ کے لئے دنیا سے رخصت ہو چکی تھی ———— بیوفا خاوند، ابھی ... تک آرام سے سو رہا تھا اور وفا شعار بیوی کی نگاہیں مر کر بھی مکان کی کھڑکی کی طرف لگی ہوئی تھیں۔

میرزا ادیب

تیری شعلہ آفریں آواز سے!
بن کے بن جاتی ہے تونوسے کی ایک

خنک جس میں نون بالضم ہے۔ اور لپک جس میں پ بالفتح ہے ہم قافیہ نہیں ہو سکتے۔

مطرب کا راگ :-

یہ شیریں راگ میرے حافظے کو جگمگاتا ہے
جو دیکھے تھے کبھی آنکھوں نے وہ نقشے دکھاتا ہے
میں اک لمحہ نظارہ کرلوں اپنے عہد ماضی کا:
ٹھہر او خوش نوا مطرب مجھے کچھ یاد آتا ہے

آخری مصرعے میں لفظ ٹھہر کے برتے ہوئے" یاد آتا ہے" کی جگہ" یاد آیا ہے" چاہئے۔

جفائے آرزو :-

وہ کاشانہ کہ تھی جس سے الفت مراد
مرے دل میں پانی جگہ۔ رہ گیا
کیا دل کو ویراں لہو چوس کر
مگر خود چھپا کا چھپا رہ گیا

"چھپے کا چھپا" چاہئے۔

حضرت اختر بہت اچھے شاعر ہیں۔ طبیعت میں جوش، جدت اور رنگینی ہے۔ زبان و بیان کے اغلاط معمولی توجہ اور احتیاط سے رفع ہو سکتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ وہ ان لوگوں میں نہیں ہیں جو زبان کی نزاکتوں کے سمجھنے، اور برتنے کی مشکلوں سے بچنے کیلئے خود فریبی پر مائل ہوتے ہیں۔ اور اس گمراہ کن قول کو اپنی جہالت کا پردہ بناتے ہیں۔ کہ خیال سب کچھ ہے زبان درخور اعتنا نہیں میں ایسے لوگوں کا ہمیشہ مخالف رہا ہوں، اور رہونگا۔ خیال کے اظہار کا وسیلہ زبان ہے۔ اور خیال نے جہاں الفاظ کا جامہ پہنا، اس کی خوبی و رعنائی کا دار و مدار بہت کچھ الفاظ کے انتخاب میں سلیقے، اور صحت زبان و محاورہ پر ہوتا ہے۔ اسالیب بیان اور طرز اظہار خیال میں جسقدر چاہئے تنوع پیدا کیجئے۔ مگر بد مذاقی اور بے راہ

جعفر علیخاں اثر لکھنوی۔ ڈپٹی کلکٹر

دنیائے اسلام کا مفید ترین عکسی قرآن مجید

انجمن حمایت اسلام لاہور کی عظیم الشان قرآنی خدمات

مسلمانوں کیلئے نادر تحفہ

مسلسل چھ برس کی محنتِ شاقہ اور ساٹھ ہزار روپے کے صرف کثیر سے انجمن حمایت اسلام لاہور نے قرآنِ پاک کا ایک نہایت دلکش اور مفید نسخہ تیار کیا ہے

مولٰنا سید سلیمان صاحب ندوی فرماتے ہیں۔ "انجمن حمایت الاسلام لاہور تمام مسلمانوں کے شکریے کی مستحق ہے۔ کہ اس غریب انجمن نے بادشاہوں کے کرنے کے کام تھے۔ اُن کا بوجھ اٹھالیا"

امام الہند مولٰنا ابوالکلام آزاد کا فرمان ہے۔ "کہ کتابت کی خوبی، اعراب کی وضاحت، اوقاف و علایم کی نگرانی صحت کا اہتمام، نقش و نگار کی موزونیت، نمبروں کا اندراج، فہرستوں کا اضافہ، طباعت کی درخشندگی، کاغذ کی عمدگی اور پھر اس پر ہدیے کی یہ ارزانی کہ بے اختیار سے

نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز!

زبان سے نکل جاتا ہے۔ میں ہر مسلمان سے درخواست کروں گا کہ "کم از کم ایک نسخہ اس ایڈیشن کا ضرور لے۔ خواہ اُس کے پاس کتنے ہی نسخے موجود ہوں پھر بھی اس سے بے نیاز نہیں ہو سکتا"

دیگر علمائے اعظام نے بھی اس مفید ترین نسخہ کا پرجوش خیر مقدم کیا ہے۔

نمونہ کے سولہ صفحات اور آرا کے رسالے مفت طلب فرمائیے۔

برادرانِ اسلام سے التماس ہے کہ وہ اپنے گھروں کو اس بے نظیر تحفہ سے رونق دیں۔ اور دین و دنیا کی سعادت حاصل کریں۔

ہدیہ قسم خاص ۲۵ روپے۔ قسم اول ۵ روپے۔ قسم دویم ۲ روپے۔

ہر جگہ سے دستیاب ہو سکتا ہے

کتب خانہ انجمن حمایت اسلام برانڈرتھ روڈ لاہور

اُمیدوارانِ ورنیکلر و اینگلوورنیکلر فائنل

کامیابی - آپ کا انتظار کر رہی ہے!

بشرطیکہ

آپ مندرجہ ذیل کتب کا جو گذشتہ سالوں میں طلباء ورنیکلر فائنل کے لئے بہترین ثابت ہو چکی ہیں اور جن کو ہیڈ ماسٹر و استاد صاحبان نے از حد پسند فرمایا ہے۔ ایک دفعہ ضرور مطالعہ کریں۔ صرف اتنا ہی نہیں۔ اگر آپ ان کتب کی رہنمائی میں دل لگا کر صرف یہ آخری دو چار ماہ کام کریں گے تو بلاشبہ آپ کامیابی کی بلند ترین چوٹی پر پہنچنے کے قابل ہو جائیں گے۔ یہ کتب کامیابی کے بکھرے راستوں میں مشعل کا کام دیں گی۔ جلدی کریں۔ ورنہ بعد میں پچھتانا پڑے گا۔ ہمارا تو نصیحت کرنا فرض ہے۔ اور اس پر عمل کرنا آپ کا۔

ورنیکلر فائنل ٹیسٹ پیپرز (حساب۔ الجبرا۔ جیومیٹری اردو۔ فارسی۔ سائنس۔ شہریت۔ حفظانِ صحت) یہ ٹیسٹ پیپرز مطابق جدید سکیم منظور کردہ جناب ڈائرکٹر صاحب بہادر سررشتہ تعلیم پنجاب لاہور لائق اور تجربہ کار ہیڈ ماسٹر اور استاد صاحبان سے تیار کروائے گئے ہیں قیمت ۱۰ جلد ۱۲ر

20 ٹیسٹ پیپر انگریزی جدید سلیبس کے مطابق طلباء اینگلو ورنیکلر مڈل سکول کے لئے انگریزی کے لئے انگریزی کے پرچے علیحدہ تیار کروائے گئے ہیں۔ ان کی قیمت ۶ آنے ہے۔

رفیق مضمون نگاری (تیسرا ایڈیشن) مضمون نویسی پر اس سے بہتر کتاب آپ کی نظروں سے آج تک گذری ہو گی قیمت ۱۲ر

ورنیکلر فائنل جاگرفی	۱۰ر
ورنیکلر فائنل ہسٹری	۱۲ر
ورنیکلر فائنل ارتھمیٹک	۶ر
ورنیکلر فائنل جیومیٹری	۵ر
ورنیکلر فائنل الجبرا	۸ر

یہ سلسلۂ کتب خاص کر امیدواران ورنیکلر فائنل کے لئے تیار کروایا گیا ہے اس کی ایک ایک جلد ہر امیدوار کے پاس ہونی ضروری ہے۔

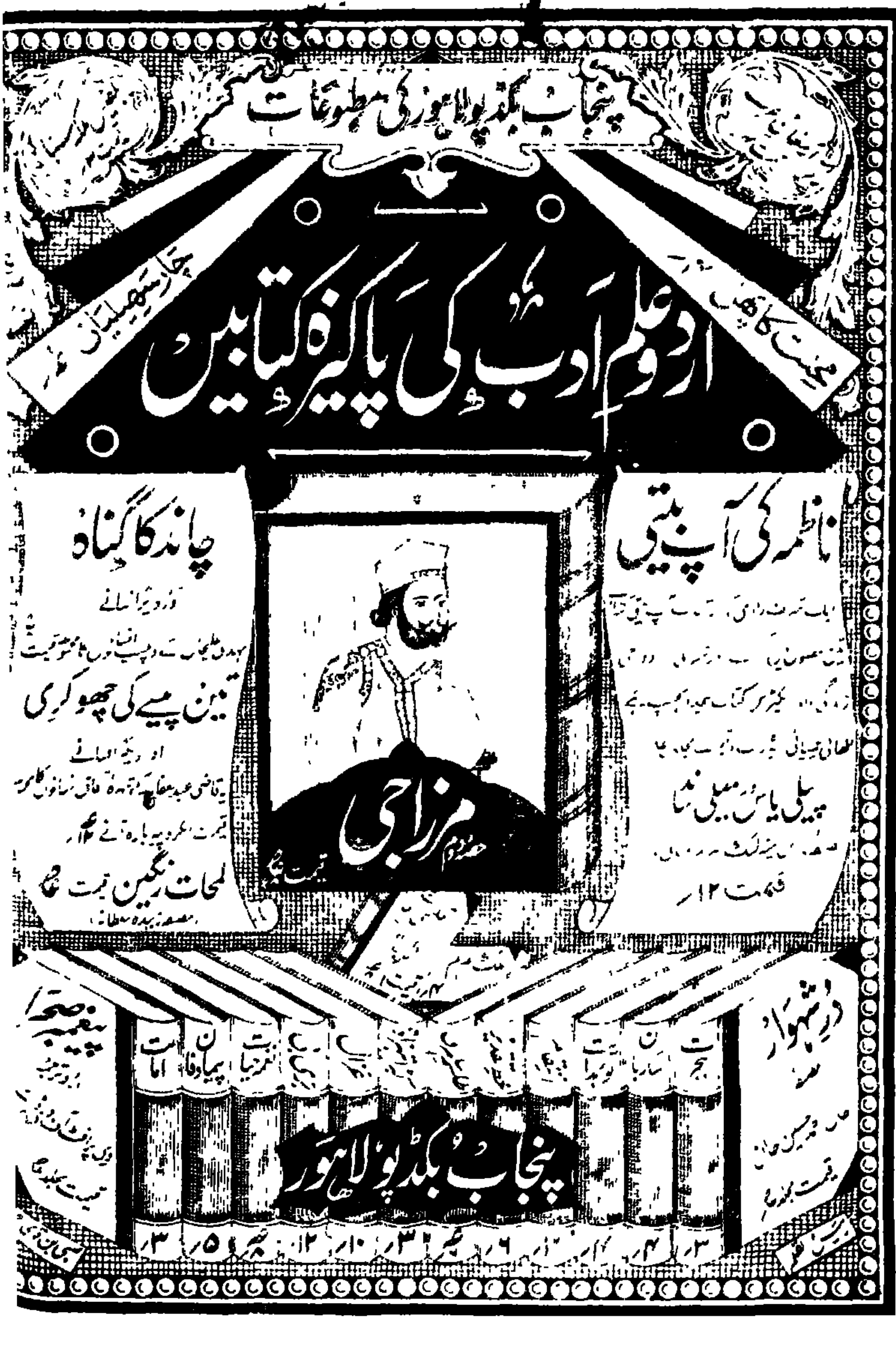
زبدۃ الحساب حل شدہ مثالوں اور مشقی سوالات کا بے بہا خزانہ قیمت ۸ر

گلشن ریاضی - یہ کتاب بھی طلباء کے لئے ایک نادر تحفہ ہے قیمت ۵ر

جدید خط و کتابت - - - قیمت ۱۲ر

نیز ہمارے ہاں ہر قسم کی کتب اور سامان سٹیشنری متعلقہ سکول بارعایت ملتا ہے۔ اپنی فرمایش اور مفصل فہرست کتب ذیل کے پتہ سے طلب کریں۔

پنجاب کتاب گھر (رجسٹرڈ) موہن لال روڈ ۹ لاہور



پنجاب بکڈپو لاہور کی مطبوعات
اردو علم ادب کی پاکیزہ کتابیں
چار سہیلیاں
چاند کا گناہ
اور دیگر افسانے
تین پیسے کی چھوکری
اور دیگر افسانے
لمحات رنگین
ناظمہ کی آپ بیتی
قیمت ۱۲ ؍
مرزا جی
حصہ دوم
پیغمبر صحرا
دُرِ شہوار
پنجاب بکڈپو لاہور



علمی ادبی و تنقیدی
ماہنامہ
آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب صریر خامہ نوائے سروش ہے

جوہر وسمہ مہندی کی مقبولیت

دنیا کی مستند ترین [illegible]

سفید بالوں کو سیاہ کرنیوالا نایاب جوہر

اس ایجاد کی صداقت کو دنیا مان گئی

DELHI

معززین کی رائے

[illegible]

اخبار سعید لاہور

جوہر وسمہ مہندی جس کی ایک شیشی ہمارے دفتر میں بغرض ریویو موصول ہوئی۔ [illegible]

[illegible]

ناچیز گذارشات

[illegible]

[illegible] رات کا اعلان

[illegible]

ماہوار رسالہ

خضر راہ لاہور

سالانہ چندہ
دو روپے
اگر پسند نہ آئے
تو قیمت واپس
فی پرچہ ۳ر آنے

[illegible]

ہندوستان بھر میں اپنی وضع کا نرالا میگزین

آرٹ اور جمالیاتی حسن کو اس کے اصلی خط و خال میں نمایاں کرنے والا

انسانی زندگی اور اسکی کمزوریوں کو اس طرح سے بے نقاب کرنے والا جس سے انسان سبق حاصل کر سکیں

جدید علوم و فنون پر پُر از معلومات مضامین کی نشر و اشاعت کا حامی

(۱) تحریک عُریانی (۲) سیکشول سائنس (۳) فلسفہ گناہ

سچی آپ بیتیاں

حسن و جمال کی حفاظت اور جسم کی نشو و نما پر قیمتی مضامین

دلچسپ افسانے۔ سبق آموز ڈرامے۔ گنہگار انسانوں کے اقرار نامے

۱۰۰ صفحات

اچھے اپنے بک اسٹالوں سے خریدیئے یا براہ راست دفتر سے طلب فرمائیے

ملنے کا پتہ: منیجر رسالہ خضر راہ [illegible]

ساقی بکڈپو دہلی

کی کتابیں

سرگذشت ... [illegible] ... پیدا ہوتی ہیں۔ دلچسپ اور عبرت انگیز آپ بیتی

نرگس ... [illegible] ... خیالات ... [illegible] ... کی ترجمانی

... [illegible] ... کا پاکیزہ ترجمہ حسن و عشق کا ایک جدید تصور۔ بہت عمدہ کتاب ہے

... [illegible] ... محبت کا منصب نہیں کیا سکتا ہے۔ سچے عشق کی المناک کہانی مؤثر اور مفید

... [illegible] ... کی زندہ تصویر

... [illegible] ... کام لیا کہ جان تک گنوا دی۔

... [illegible] ... اردو میں شائع نہیں ہوئے۔ پہلا افسانہ بہت مشہور ہے

... [illegible] ... کس طرح پہنچتا ہے حق کی فتح اور باطل کی شکست۔ خدا کا ... [illegible] ... کی طرف سے کس طرح انتقام لیتا ہے

... [illegible] ... مبتلا ہوتی ہے اور دلچسپ ... [illegible] ...

... [illegible] ... اگر آپ ... چاہتے ہیں تو اس کتاب کو طلب کیجیے جو حضرت فراق مرحوم کی تصنیف ہے

... [illegible] ... بہترین افسانوں کا مجموعہ جو بہت پسند کیا گیا ہے۔ ... [illegible] ...

... [illegible] ... دلی ... [illegible] ... لال قلعہ ... [illegible] ...

ملنے کا پتہ

ساقی بکڈپو دہلی

اردو ادبی لٹریچر کی پاکیزہ کتابیں

[illegible] درا قیمت [illegible]	پیامِ مشرق قیمت [illegible]	بالِ جبریل قیمت [illegible]	شاہنامہ اسلام حصہ اول قیمت [illegible]
شاہنامہ اسلام حصہ دوم قیمت [illegible]	سوز و ساز قیمت [illegible]	نغمۂ زار قیمت [illegible]	ہفت پیکر قیمت [illegible]
معیاری افسانے قیمت [illegible]	مرقع چغتائی قیمت [illegible]	نقش چغتائی قیمت [illegible]	خمکدۂ خیام قیمت [illegible]
نگارستان قیمت [illegible]	دیوانِ حالی قیمت ۱۲ر	مطالب الغالب قیمت [illegible]	دیوانِ گرامی قیمت [illegible]
رباعیات قیمت [illegible]	لیلیٰ کے خطوط اور روزنامچہ قیمت [illegible]	عجیب قیمت [illegible]	ایوانِ تصور قیمت [illegible]
بکھرے دل قیمت [illegible]	ناٹک ساگر قیمت [illegible]	ناٹک کتھا قیمت [illegible]	ظفر کی موت قیمت ۱۴ر
[illegible] کہانیاں قیمت [illegible]	بروجِ سیاست قیمت [illegible]	بہارِ جاوداں قیمت [illegible]	کہکشاں قیمت [illegible]
تہذیبِ عمل قیمت [illegible]	سرگزشتِ اسیر قیمت [illegible]	تجدیدِ عمل ہر دو حصہ قیمت [illegible]	دو آتشہ قیمت [illegible]
[illegible] قیمت [illegible]	[illegible] بھائی قیمت [illegible]	انقلابِ فرانس قیمت ۱۲ر	[illegible] قیمت [illegible]

[illegible] ۱۰ سرکلر روڈ لاہور

ایک ہزار (۱۰۰۰) روپیہ نقد انعام

عمل محبت کے شائقین جو سب طرف سے مایوس ہو چکے ہوں۔ آخری تربہ ہمارا آروشی کرن جنتر منگا کر اپنے دل کی مراد حاصل کریں۔ اس کو اپنے پاس رکھ کر آپ اپنے دل میں جس کسی کا نام لیں گے۔ خواہ کیسا ہی پتھر دل مغرور اور سخت کلام کیوں نہ ہو جہاں کہیں بھی ہوگا آپ سے ملنے کیلئے تڑپنے لگیگا۔ اور پھر تمام عمر آپ کی جدائی ہرگز گوارا نہ کریگا نیز حاکم یا مالک کو اپنا بنانا اور دشمن کو زیر کرنا اس جنتر کے خاص اوصاف ہیں۔ اور اگر آپ کے دل میں کوئی ایسی خواہش ہے جو کہ باوجود کئی ہزار کوششوں کے بھی پوری نہیں ہوئی تو وہ بھی ہمارے جنتر کے پاس رکھنے سے گنتی کے دنوں میں پوری ہو جائیگی۔ معاوضہ صرف ایک روپیہ چار آنہ (۱۴) علاوہ خرچ ڈاک

نوٹ۔ ہزار ہا سرٹیفکیٹ موجود ہیں جن کو غلط ثابت کرنے والے کو ایک ہزار روپیہ نقد انعام دیا جائیگا۔

پتہ:۔

پروفیسر جی شنکر پوسٹ بکس ۲۷ لاہور

گاڈلی کمپنی کا کٹ پیس انڈیا بھر میں بہترین نفع بخش و بیحد مفید ثابت ہوگا

گاڈلی کمپنی

اگر آپ کٹ پیس کی تجارت کرنا چاہتے ہیں ... اور آپ غور کر کے ... گاڈلی فسٹ بنڈل ... تمام کٹ پیس ...

ولایتی امریکہ نیو یارک ... ساٹن ... جاپانی ... وائل ... جارجٹ ... کریپ ...

... قیمت 60 ... بنڈل 150/- روپیہ گاڈلی فسٹ وزن 25 پونڈ 75/- روپیہ

گاڈلی فسٹ ... قیمت 38/- روپیہ گاڈلی سیکنڈ بنڈل ... جاپانی ... چھینٹ ... وغیرہ

علاوہ ازیں ... گز قیمت 100 ... بنڈل 150/- روپیہ گاڈلی سیکنڈ بنڈل وزن 50 پونڈ 75/- روپیہ

گاڈلی سیکنڈ بنڈل ... 38/- روپیہ فہرست ... قیمت پیشگی ... ضروری ہے ...

خاص رعایت: کل قیمت پیشگی آجانے پر پیکنگ رجسٹری مزدوری خرچ معاف ہوگا۔ ...

GODLY CO
WHOLESALE CUT PIECE

منیجر گاڈلی کمپنی کراچی (سندھ)

منظور کردہ ڈائرکٹر صاحب بہادر سر رشتۂ تعلیم پنجاب لاہور بموجب لیٹر نمبر ۲۳۲۱ سی مورخہ ۱۰ فروری ۱۹۳۵ء
منظور کردہ محکمۂ تعلیم حیدرآباد دکن ۲۴۲۰ سنہ ۱۳۴۴ ف مثل نمبر (۱۳/۱۰) ۴۴ ف

علم و ادب کا ماہوار مرقع

ادبِ لطیف لاہور

ماہِ اگست ۱۹۳۷ء

ادارۂ تحریر

چوہدری برکت علی بی۔ اے

میرزا ادیب بی۔ اے

مقامِ اشاعت

سالانہ چندہ ۴/۱۲ مکتبۂ اردو لاہور فی پرچہ ۸/

ممالک غیر سے — ابوالاصغر محمد شریف عباسی کاتب ادارۂ ادب لطیف لاہور۔ ساڑھے چھ شلنگ

فہرست مضامین

جلد ۵ — بابت ماہ اگست ۱۹۳۷ء — نمبر ۶

نذرِ اولیں

ہمیں یہ دیکھ کر بہت مسرت ہوئی ہے کہ "افسانہ نمبر" گذشتہ افسانہ نمبر سے بہت زیادہ کامیاب رہا ہے۔ ملک کے ادبی حلقوں نے اسے اردو رسائل کے نہایت کامیاب افسانہ نمبروں میں جگہ دی ہے۔ اردو کے چند اخبارات و رسائل اور مقتدر اہلِ قلم حضرات کی گرانبہا رایوں کے اقتباسات ملاحظہ فرمایئے۔

اخبار احسان لاہور۔ ادب لطیف۔ افسانہ نمبر۔

ممتاز ادبی مجلہ "ادب لطیف" کا افسانہ نمبر اسی مہینے شائع ہوا ہے، جسکے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ادارہ نے اس کی ترتیب و تدوین میں بڑی احتیاط سے کام لیا ہے۔ اسکے مختصر افسانے طویل افسانے منظوم افسانے۔ انگریزی افسانوں کے تراجم نظمیں اور فن افسانہ نویسی کے متعلق مضامین جن کی مجموعی تعداد تیس کے قریب ہے رسالہ میں خاص شان تنوع پیدا کر رہے ہیں، اکثر افسانے کامیاب و دلچسپ ہیں، رنگین تصاویر کی ایک تعداد بھی شامل کر دی گئی ہے۔ اور رسالہ بحیثیت مجموعی بہت کامیاب رہا ہے۔ قیمت فی پرچہ بارہ آنے۔

اخبار پرتاپ لاہور۔ ادب لطیف کا افسانہ نمبر

رسالہ ادب لطیف کا افسانہ نمبر بغرض ریویو آیا ہے۔

... تمام افسانے ... منظومات افسانے

بھی کافی جاذب توجہ ہیں۔ ادب لطیف کے مدیر میرزا ادیب بی۔ اے کا افسانہ "صحرا نورد کا چوتھا خط" بہت ہی عجیب و غریب ہے۔ اور دیگر حضرات کے افسانے اور منظومات بھی ہیں — جو بہت اچھے ہیں۔ ہم اس کامیابی پر جناب چوہدری برکت علی بی۔ اے اور میرزا ادیب بی۔ اے کو ہدیہ تبریک پیش کرتے ہیں لکھائی چھپائی عمدہ۔ ٹائیٹل پیج خوبصورت قیمت بارہ آنے۔

سید اختر احمد اورینوی ایم۔ اے فرماتے ہیں

"ادب لطیف" کا افسانہ نمبر ملا شکریہ!

صحرا نورد کے چوتھے خط پر میں آپکو مبارکباد عرض کرتا ہوں۔ آپ نے تشبیہہ کی جزئیات میں بھی ہیت نما کی اور اعجوبگی کا پہلو اختیار کیا ہے۔ غالباً فطرت آپکو اردو کا ایڈگر ایلن پو بنانے والی ہے۔

آل انڈیا براڈ کاسٹنگ دہلی جب سے دہلی میں براڈ کاسٹنگ کا محکمہ قائم ہوا ہے۔ ہندوستانیوں نے ریڈیو میں نہایت دلچسپی لینی شروع کر دی ہے جسکا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ملک کے بڑے بڑے شہروں میں ریڈیو سٹیشن قائم کئے گئے ہیں اور قائم کئے جا رہے ہیں

... براڈ کاسٹنگ ... کے اسٹیشن ... ہندو ... کا ...

لاہور کے سابق پروفیسر سید احمد شاہ بخاری ہیں۔ جو تعلیمی حلقوں میں خاص شہرت کے مالک ہیں اور اردو کے مشہور مزاح نگاروں میں شمار ہوتے ہیں۔ ہمیں کامل امید تھی کہ آپ اس قدر ذمہ دارانہ حیثیت اختیار کرتے ہی اپنے فرائض کی ذمہ داری کیساتھ انجام دیں گے مگر افسوس کے ساتھ لکھنا پڑتا ہے کہ آپ نے اپنی شخصیت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے محدود حلقہ احباب کو نوازنا شروع کر دیا ہے ایک اتنی ذمہ دار شخصیت کا یہ وطیرہ حیرتناک ہونے کے علاوہ افسوسناک بھی ہے ملک کے متعدد اخبارات نے آپکے اس افسوسناک عمل کے خلاف متعدد بار صدائے احتجاج بلند کی ہے۔ اور کر رہے ہیں۔ مگر بخاری صاحب نے اپنے عمل میں ذرہ بھر تغیر پیدا نہیں کیا۔ آل انڈیا براڈ کاسٹنگ بخاری صاحب کی ذاتی جائداد نہیں۔ کہ آپکو اس پر پورا حق حاصل ہو اور اسکے تمام انتظامی امور آپ کی ذاتی رائے پر منحصر بلکہ یہ ایک تعمیری شعبہ ہے۔ تبادلہ خیالات کا ایک زریں موقعہ۔ نشر و اشاعت کا ایک قابل قدر ذریعہ۔ اسلئے ہر قابل شخص کو اس سے فائدہ اٹھانے کا حق حاصل ہے۔ بخاری صاحب اسے اغراض شخصیہ کے حصول کا ذریعہ کسی صورت بھی نہیں بنا سکتے۔ غور کیجئے دہلی براڈ کاسٹنگ کے انچارج کے عہدہ جلیلہ پر آپ نے اپنے برادر اصغر ذوالفقار علی صاحب کو فائز کر دیا ہے اس طرح شملہ کی شاخ کا انچارج آپ نے اپنے برادر نسبتی کو بنا دیا ہے۔ درآنحالیکہ دونوں حضرات اپنی ذمہ داریوں کو سنبھالنے کی صلاحیت و قابلیت سے محروم ہیں۔ کیا اس سے زیادہ غرض پرستی کا کوئی اور مظاہرہ ہو سکتا ہے ؟؟

[illegible]

سپرد کر رکھا ہے۔ اس طرح جہاں ملک کے جلیل القدر اہل قلم کے حقوق تلف کئے جا رہے ہیں وہاں عامۃ الناس کو بھی ان حضرات کے خیالات سے مستفید ہونے کا موقعہ نہیں دیا جا رہا۔ بخاری صاحب کی خدمت میں کئی بار اس رویے کے خلاف کہا گیا مگر آپ نے ستم ظریفی سے کام لیتے ہوئے صرف اتنا فرما دیا کہ ملک میں ریڈیو پر بولنے والے حضرات کی بہت زیادہ کمی ہے۔ ہم نہیں سمجھتے آل انڈیا براڈ کاسٹنگ کا اسسٹنٹ ڈائرکٹر اس سے بڑھکر کسی اور غیر ذمہ دارانہ روش کا مظاہرہ کر سکتا ہے۔

معلوم ہوتا ہے بخاری صاحب بحیثیت مصنف ایک ظرافت نگار ہیں اور بحیثیت عملی انسان ——— ایک ستم ظریف ——— !

مصیبت یہ ہے کہ آل انڈیا براڈ کاسٹنگ کا ڈائرکٹر ایک یورپین ہے جو اردو کے اہل قلم سے کوئی واقفیت نہیں رکھتا، اور اگر واقف ہو سکتا ہے تو بخاری صاحب کی وساطت سے۔ اس طرح بخاری صاحب کو موقعہ ملا ہے کہ جو چاہیں کریں۔!

بہرحال ہم بخاری صاحب کے اس رویے کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے ہوئے ڈائرکٹر صاحب کی توجہ اس امر کی طرف مبذول کراتے ہیں۔

کیا ہم امید رکھیں کہ بخاری صاحب ہماری گذارشات پر ٹھنڈے دل سے غور فرمائیں گے۔

اردو کو ترقی دینے کے چند ذرائع

ہمارے محترم مضمون نگار [illegible] [redacted]

پنے مکتوب میں اردو کو ترقی دینے کے لئے چند ذریعے بتاتے ہیں۔ یہ ذرائع ایسے ہیں جن پر فوراً عمل پیرا ہو جانا چاہئے۔

"فی زمانا ہندی کے پرچار اور پروپیگنڈہ سے یہ خوف محسوس ہو رہا ہے کہ دس پندرہ برس کے اندر ہی نہ کہیں اردو بالکل ہی ختم ہو جائے۔ اسلئے ہر اردو نواز انسان اور ہر ہم عصر اردو اخبار و رسالہ کا فرض ہے کہ وہ بھی زبان اردو کے حیات میں بیش و بیش حصہ لے۔ ہمارے خیال میں ذیل کے چند طریقے اردو کو زندہ ہی رہنے میں کامیاب ثابت نہ ہونگے بلکہ اردو کو وسیع سے وسیع تر بھی کر دینگے۔ کاش اردو داں حضرات ان پر عمل پیرا ہو کر اپنی زندگی کا ثبوت دیں۔

(۱) ہر اردو پرست کا فرض ہے کہ وہ خطوط کا پتہ صرف اردو میں لکھے، کسی دوسری زبان میں لکھنے کی ضرورت نہیں آپ اپنے احباب کو ہزار ہا خطوط لکھتے ہیں انگریزی معلوم کس خیال سے پتہ ہمیشہ انگریزی میں لکھتے ہیں۔ کیوں؟ کیا آپ کی کوئی زبان نہیں۔ اور اگر ہے تو کیا اسمیں پتہ لکھنے کا کوئی طریقہ نہیں غور کیجئے اور آنسو بہائیے۔

(۲) تجارت پیشہ اصحاب جب کسی دوسری جگہ لین دین یا کسی اور قسم کے خطوط لکھیں تو ہمیشہ اردو میں لکھیں۔ دوسری ذہن مجبور ہوں گی کہ وہ اپنے یہاں ایک اردو داں کلرک کا بھی اضافہ کریں۔ وہ کلرک چاہے ہندو ہو یا مسلمان ہمیں اس سے بحث نہیں مگر اردو داں ضرور ہوگا۔ اگر نہیں رکھیں گی تو آپ کا کیا جائیگا۔ انکے کاروبار میں نقصان ہوگا۔ دو چار سال اس پر عمل کر کے دیکھئے نتیجہ خود بخود معلوم ہو جائیگا۔

(۳) تاجر ... اپنے اشتہارات زیادہ سے زیادہ اردو میں شائع کرائیں۔ سائن بورڈ صرف اردو میں لکھوائیں، اپنے یہاں وہ ملازم رکھیں جو اردو داں بھی ہوں، اپنے یہاں کے حساب کتاب اردو میں لکھوائیں، اور ہر دوسری زبانوں سے بہت کم کام لیں۔

موقعہ ملنے پر میں ایک بسیط مضمون اس پر سپرد قلم کرونگا اس وقت ان ہی دو تین باتوں پر اکتفا کرتا ہوں۔ قلم برداشتہ لکھدیا ہے"

مکتبۂ اردو کی علمی سرگرمیاں

(مکتبۂ اردو) نہایت خلوص دیانتداری اور محنت شاقہ کے ساتھ علمی سرگرمیوں میں مصروف ہے۔ اس مہینے کے آواخر تک مندرجہ ذیل کتابیں شائع ہو جائیں گی

(۱) "چغمہ صبا" جو علامہ عبداللطیف کابا کی مشہور عالم کتاب دی پرنٹ آف دی ڈیزرٹ کا بہت کامیاب اردو ترجمہ ہے

(۲) "تین پیسے کی چھوکری اور دیگر افسانے"۔ یہ افسانے اردو کے جلیل القدر مصنف قاضی عبدالغفار خاں کے نہایت دلچسپ افسانوں کا مجموعہ ہے۔

(۳) "چاند کا گناہ اور دوسرے افسانے"۔ یہ افسانے دنیا کے مشہور مصنفوں کے قلم سے ہیں جنہیں نوجوان انشا پرداز راجہ مہدی علی خانصاحب نے اردو کا جامہ پہنایا ہے۔ کتاب پریس میں ہے۔ انکے علاوہ چند ایک کتابیں کتابت کی منزل طے کر رہی ہیں۔ امید واثق ہے اس سال کے اختتام تک مکتبۂ اردو کی متعدد کامیاب کتابیں اردو میں اضافہ کر دیں گی! اہل قلم سے درخواست ہے کہ وہ اپنی تصنیف و تالیف کی اشاعت

کے لئے مینجر مکتبۂ اردو سے خط و کتابت فرمائیں۔

دو روح فرسا واقعات :۔ نہایت افسوس کے ساتھ اطلاع دی جاتی ہے کہ اردو زبان کے ممتاز ترین قلمی رسالے کے ایڈیٹر جناب بشیر ہندی کی والدہ ماجدہ کا ۲۰ جون کو انتقال ہوگیا ہے۔ ہمیں اس غم انگیز حادثے میں بشیر صاحب سے ہمدردی ہے۔ خداوند تعالیٰ مرحومہ کو جوار رحمت میں جگہ دے۔

اسی مہینے ہمارے کرم فرما جناب محمد امین صاحب کے صاحبزادے کا بھی انتقال ہوگیا ہے۔ دعا ہے خدا امین صاحب کو صبر جمیل دے۔!

فن افسانہ نگاری۔ افسانہ نمبر میں جناب یزدانی کا ایک مقالہ فن افسانہ نگاری کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ جسکے بعض مقامات اردو کے مشہور نقاد حضرت اختر اورینوی ایم۔ اے کے مضمون افسانہ نگاری سے ماخوذ ہیں۔ یزدانی صاحب نے ہر منقول سطر کو واوین میں لکھا تھا مگر کاتب کی غلطی سے

آغا حشر کی یادگار اور انکے ڈرامے

کتنی بار لکھا جا چکا ہے کہ آغا حشر کی یادگار اور انکے ڈراموں کی طرف ملک والوں کو بہت جلد توجہ دینی چاہئے۔ مگر کوئی اثر نہیں ہوا اور اسی سلسلے میں ایسے ہمت شکن واقعات سے دوچار ہونا پڑا جن کی کبھی توقع بھی نہیں ہوسکتی تھی۔ مخالفت کوئی نئی چیز نہیں اہل ہمت کے راستے میں یہ ایک معمولی سا روڑا ہے، جسے پاؤں کی ایک ہلکی سی ٹھوکر دور پھینک سکتی ہے۔ ہر نیک کام کی مخالفت کرنا اہل زمانہ کا وطیرہ ہے ہمیں مخالفوں کی مخالفت کا شکوہ نہیں۔ مگر اپنے دوستوں کا ہمت شکن و حوصلہ فرسا بے حسی سے ضرور شکایت ہے۔ ہماری صحافت میں یہ کتنا ماتم طلب، رنجدہ اور قابل نفرت رویہ ہے، کہ اخبارات و رسائل کے مطالعہ کرنے والے حضرات مدیران رسائل و جرائد کی کسی رائے کسی اعلان، کسی پیغام، کسی تجویز سے ذرہ بھر دلچسپی نہیں لیتے۔ ایڈیٹر ایک سکیم اخبار و رسالہ کے اوراق میں پیش کرتا ہے، مطالعہ کرنے والوں کی نگاہیں اسپر پڑتی ہیں۔ مگر کوئی اثر کوئی تغیر ان میں پیدا نہیں ہوتا اور اس سکیم کو امتداد زمانہ اخبار و رسالہ کے اوراق کے آغوش میں موت کی نیند سلادیتی ہے۔۔۔ ! حیف صد حیف۔!! حیرت ہوتی ہے کہ کیوں پڑھنے والے صحافت کے ساتھ تعاون نہیں کرتے؟ کیا اپنی رائے کا وہ اظہار نہیں کرسکتے، کیا انہیں اس کے لئے وقت نہیں ملتا، اور کیا وہ اس روش کو قابل نفرت روش سمجھتے ہیں؟؟ حقیقت یہ ہے کہ وہ اسے قابل نفرت نہیں سمجھتے۔ انکے پاس وقت بھی کافی ہے۔ پھر وہ کیوں اپنی رائے کا اظہار نہیں کرتے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ کرنا نہیں چاہتے دلائل و براہین سے انہیں قائل کرنے کی کوشش نہ کیجئے۔ وہ ایسا نہیں کرینگے۔ کیونکہ وہ ایسا کرنا نہیں چاہتے۔!

آغا حشر کے متعلق لکھا جا رہا ہے مگر چند اصحاب کے سوا کسی نے اس پر اظہار خیال نہیں فرمایا۔ چند رسالوں نے ضرور اپنی رائے کا اظہار کردیا ہے۔ مگر چند رسالوں کے اظہار رائے سے کیا بنتا ہے۔ یہ تجویز تو عالمگیر تائید کی مستحق ہے! خط پر خط بھیجا مگر انجمن اردو پنجاب کے کان پر جوں تک نہیں رینگی!!

قارئین کرام کی خدمت میں التماس ہے کہ ہر تجویز ہر سکیم ہر پیغام جو ان اوراق میں ظاہر ہوتا ہے، آپکے غور کا مستحق ہے آپ اس پر غور فرمائیں، قابل تائید ہے۔ تو تائید فرمائیے

تقویت دیں، اگر وہ یہ حق نہیں رکھتا تو تردید کیجئے ——!

کہ بے حسی ——! آہ یہ ایک سخت دشکن رویہ ہے ——!!

کیا آغا حشر اردو کا ممتاز ترین ڈراما نویس نہیں؟ پھر یہ

نمود یہ بے حسی؟؟

مصورِ ہند کی سرگرمیاں - ہندوستان کے مشہور ترین مصور جناب خان بہادر عبدالرحمٰن چغتائی سے کون شخص ہے جو واقف نہیں، دیوان غالب کو مصور کر کے آپ نے شہرت جاوید حاصل کر لی ہے۔ آج کل آپ یورپ میں ہیں جہاں عمر خیام کی رباعیات کو مصور کرنے کے سلسلے میں مطالعہ کر رہے ہیں۔ امید ہے آپ کا یہ کارنامہ دنیائے مصوری کا عدیم النظیر کارنامہ ہو گا! ایک ہفتہ ہوا آپ لاہور تشریف لے آئے ہیں۔

شمارہ حاضرہ کے مضامین "جوان امنگ والوں سے" ہمارے محترم و مخلص دوست جناب سید راحت مولائی بی۔ اے علیگ نے یہ مضمون نہایت محنت و کاوش سے لکھا ہے اور ادبی نقطۂ نظر سے بہت کامیاب! اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض مقامات ہماری رائے میں قابل اعتراض ہیں۔ مگر . . . .

ایڈیٹر کا مضمون نگار کی ہر ایک رائے سے متفق ہونا ناگزیر نہیں۔

مضمون نصف سے کچھ کم باقی ہے۔ جو آئندہ شائع ہو گا۔

استفسارات یہ نظم ہے جناب راجہ مہدی علی خانصاحب کی۔ راجہ صاحب ایک کہنہ مشق صحافی ہیں۔ ہم آپکی عنایت کے ممنون ہیں۔

ہماری زبان کا نام - اس مقالے میں علامہ سید سلیمان ندوی نے ٹھوس دلائل و تجربہ ثابت کرنیکی کوشش کی ہے کہ ہندوستان

کی . . . .

فی الحال ہم اپنی رائے محفوظ رکھتے ہیں اور ادباء کرام اور ناظرین رسالہ کی خدمت میں گذارش ہے کہ وہ اس موضوع پر لکھیں، اور اپنی رائے سے ہمیں مطلع فرمائیں۔ یہ مسئلہ وقت کے نہایت اہم مسائل میں سے ہے۔ اس لئے اس پر توجہ دینا وقت کی ایک بہت بڑی ضرورت ہے۔ کیا ہم امید رکھیں کہ ہمارے محترم معاونین ہماری گذارش کو شرف قبولیت بخشیں گے۔ اس سلسلے میں "ادبِ لطیف" کے اوراق حاضر ہیں۔

بہار کے دن - اردو کے جوان فکر شاعر جناب عدم کی بہار پدامن نظم ہے۔ معلوم ہوتا ہے آجکل آپ بہت مصروف ہیں کہ خط کا جواب بھی نہیں دیتے۔

سالنامہ ۱۹۳۷ء - ہماری آرزو ہے کہ ادبِ لطیف کا سالنامہ ۳۷ء نہ صرف گذشتہ سالناموں سے ہر لحاظ و ہر صورت ممتاز ہو بلکہ ایک ایسا کامیاب سالنامہ ہو جسے ہم یورپ کے بہتر سے بہتر سالنامے کے مقابلے میں پیش کر سکیں۔

ادباء کرام سے درخواست - چونکہ یہ سالنامہ دسمبر سے پیشتر شائع ہو گا۔ اور اسکے ساتھ ہی بہت ضخیم بھی۔ اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ کتابت کا کام ابھی سے شروع کرا دیا جائے۔ اور یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب ہمارے محترم قلمی معاونین اس طرف توجہ فرمائیں۔ سالنامے میں بعض مضامین مصور کئے جائینگے اسلئے مضامین کا جلد موصول ہونا اور بھی ضروری ہے۔!

رسالہ ادبی دنیا کا نیا ادارہ تحریر - ہمیں یہ دیکھکر بڑی مسرت ہوئی کہ رسالہ ادبی دنیا کے ادارہ تحریر میں ملک کے مشہور و معروف افسانہ نگار حضرت عاشق بٹالوی بی۔ اے، ایل ایل۔ بی،

. . . .

جناب ؔ یزدانی صاحب

زندگی

پار جو سینۂ حق کوش سے ہو جاتا ہے
مرگ اس تیر کی نخچیر ہوا کرتی ہے
اس حقیقت کو حسینؓ ابن علیؑ سے پوچھو
زندگی موت سے تعمیر ہوا کرتی ہے

زندگی

بے بہا ہے انتظارِ سکونِ ہوا و بحر
طوفاں میں جو رواں ہوں وہ بیڑے ہیں زندگی
ساحل نہیں حقائقِ دریا کا راز دار
موجوں سے کھیل جاتے ہیں تھپیڑے ہیں زندگی

"موت"

جو ہو ضمیر کا مقصد وہ برملا کہیے
جو ہو ضمیر کا مطلب وہ برملا کہیے
یہ اختیار جہاں سے حیات میں نہ رہے
وہیں حیات نہ کہیے اُسے قضا کہیے

(ابوالخیال) سید راحت مولائی مرادآبادی بی۔ اے (علیگ)

جوان اُمنگ والوں سے

دُنیا میں ایسے محبت کرنے والوں کی جن پر کسی قسم اور کبھی شخص کی نصیحت کارگر نہیں ہو سکتی، دو اقسام کی جاتی ہیں۔ ایک وہ لوگ جو جذبات کے غلام ہوتے ہیں۔ اور وقتی جذبہ کے تاثرات اُن کے دل و دماغ کو فہم و شعور سے خالی کر دیتے ہیں۔ درحقیقت ایسے لوگوں پر ایسے وقت میں سوائے اس کے اور کیا کہا جا سکتا ہے، کہ یا تو کوئی بھوت سوار ہوتا ہے یا کسی مخصوص قسم کے پاگل پن کا ان پر دورہ پڑتا ہے۔ نہ تو مجھے اور نہ کسی ذی فہم انسان کو اُن حقائق سے انکار ہو سکتا ہے۔ جو محبت و شباب کے ادنے کرشمے ہیں۔ مرد اور عورت میں ان دونوں چیزوں کا اجتماع کیا کیا ظلم ڈھاتا ہے۔ اور محبت میں کن کن مصائب کا سامنا کرنا پڑتا ہے لیکن درحقیقت میں اپنی ہنسی بھی ضبط نہیں کر سکتا۔ جب یہ دیکھتا ہوں کہ م دوقتی تخیل نے زیر اثر کیا کیا گل کھلاتا ہے۔ عمر کے سولہویں اور بائیسویں یا پچیسویں حصے کے درمیان مرد کو کن کن حماقتوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ کتنی مرتبہ کسی کی ایک نظرِ کرم اور تبسم عاجز نواز "نے دلیل و برہان کے قلعوں کو ہوا میں اڑا دیا ہے۔ اور کتنی بار کسی کی ایک "نگاہ غلط انداز" نے غم و اندوہ کے اندھیرے کنویں میں دھکیل دیا ہے۔ کیا دنیا کی تاریخ ایسی مثالیں پیش کرنے سے اپنے اوراق کو چھپا سکے گی۔ جاتا ہو دیکھتے دیکھتے مرد نے محبت [illegible]

. . . . . . بہادرانہ بزدلی اور بزدلانہ جوانمردی . . . . . .

ایسے خیال و ارادہ والے شخص سے عقل و تمیز کی بات کرنا یا کسی دلیل کو سامنے رکھ کر قائل ہونے کا موقعہ دینا درحقیقت کج فہمی ہے۔ آپ موقعہ و محل کے مطابق بحث کر سکتے ہیں مگر یہ کوشش اگر اس شخص کی بجائے ہوا کی موجوں یا دریا کی لہروں کے ساتھ کی جائے تو شاید بہتر ہو۔ ایک تلاطم خیز پانی کے دھارے پر بند باندھ کر جس طرح اس کا زور بے پایاں کر دیا جاتا ہے اسی طرح ایسے بے وقوف انسان کو نصیحت کر کے اس کی حماقتوں میں اضافہ کرنے کے سوا اور کچھ نہیں۔ اسکے خیالات کی رو بہرحال بہے گی۔ چاہے نتیجہ کچھ ہی ہو۔ اس حال میں علاج صرف یہ ہو سکتا ہے کہ یا تو محبوب و محب دونوں میں دائمی جدائی کر دی جائے یا اسکو حسین عورتوں کی صحبت میں بٹھایا جائے یا ترنم ریز موسیقاروں کے گانے سنوائے جائیں۔ تاکہ وہ دوسرے کی نہیں تو اپنی ہی زندگی پر رحم کرنے کے قابل ہو سکے۔ مگر یہ علاج مقامی ہے۔ اس لئے کہ بہت ممکن ہے ع

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

اس جگہ ایک نئی مصیبت آتی ہے۔ غیر شادی شدہ عورتیں ہی نہیں بلکہ شادی شدہ بھی جہاں اس حقیقت سے بے انتہا مسرت محسوس [illegible]

ہے۔ وہاں یہ تنا بھی لکھتی ہیں کہ وہ مانگ [illegible] زکم مجنوں کا پھوڑا بھائی نہ ہو۔ اور یہ بھی نہیں بلکہ ہر وہ عمل اور ہر وہ تدبیر جس سے پاگل کو وحشت و جنوں سے حیث خیز ویرانے میں جانے سے روک سکے۔۔ گویا ایک پیام بیار نہ ہے۔ عورتوں کے حقوقِ شاہانہ سے ایک عورت کو اس وقت دیکھئے جبکہ اس کے محبت کرنیوالے سے طرح طرح کی احمقانہ حرکات کا ارتکاب ہو رہا ہے۔ اور محبوبہ اس یقین کو لئے ہوئے ہو کہ یہ سب کچھ صرف اسی کی وجہ سے ہے ——— کامل اطمینان، احساسِ مسرت اور ایک مسرورانہ درگذر ——— اس قسم کی ملی جلی بہت سی چیزیں ایک وقت میں ایک جگہ پر ملیں گی۔

یہ سب کچھ کیوں ہوتا ہے ؟ ؟ اس لئے کہ بالعموم خاندانوں کی پرورش و تربیت فکر و مصائب کے ہجوم ہی میں ہوتی ہے جس کے عمل یا ردِ عمل سے ایسے ہی جذبات و احساسات کی تخلیق ہو جاتی ہے اور انکے مقابلہ و مجادلہ کے لئے سوائے اس اہم ترین اور زنجیر جذبہ کے کوئی اور نہیں ہو سکتا جو شباب سے بھرپور ہو ——— اور مرد اور عورت ——— دو ہستیوں کو کہیں نہ کہیں سے لاکر ایک جگہ بٹھا دے، اور یہی ایک جذبہ اُنکے ارضی و سماوی تنکرات، مصائب، مشکلات اور رنج و آلام کا ہیچ [illegible] بناتا ہے۔ حقیقت یہ ہے۔ اگر شادیاں حسبِ خواہش اور کسی مخصوص اصول و مقصد کے ماتحت ہونے لگیں تو وہی دن میں دنیا تمام فیاضانہ و ایثارانہ جذبات و خیالات سے محروم ہو جائے۔

دُوسرا گروہ ان محبت کرنے والوں کا ہے جو محبت [illegible]

اور امیدوں کو بھی جریب اور گٹھے سے ناپنے کی کوشش میں مصروف رہتے ہیں۔ ان کی ان حرکتوں کو نہ تو محبت ہی کے عنوان کے تحت میں لایا جا سکتا ہے، اور نہ شادی ہی کے۔ بلکہ یہ ایک طرح کی خرید و فروخت ہے۔ فطرتاً اور ضرورتاً، ایک نوعمر انسان سماج میں سے اپنی ہم رتبہ عورت کو شادی کے لئے پسند کریگا اس لئے کہ وہ اسی سے بہ نسبت کسی دوسرے طبقہ کی عورت کے زیادہ واقف ہو سکتا ہے لیکن اگر اس انتخاب کے وقت مرد کی نظر کسی عورت کی دولت پر ہو، ——— یا کسی عورت کے خیال میں مرد کا موجودہ یا آنیوالا روپیہ ہو، اور دونوں شادی کی کوشش کریں تو یہ ایک قسم کا سودا ہوگا۔ بادشاہ و شہزادے اور شہزادیاں تو خیر شادی کے معاملہ میں قانون کی پابند ہوتی ہیں، مگر عمائدِ امرا اگر قانون نہیں تو اپنے مراتب اور اپنی برابری کا خیال ضرور رکھتے ہیں۔ اور یہ حقیقت جہاں تک شادی اور منزلی زندگی کے سچے لطف و انبساط کا تعلق ہے، انتہائی نقصان دہ اور خطرناک ہے (اور خطرناک کیا ہو سکتی ہے کہ ایک بادشاہ اپنے تخت تک کو چھوڑ دے اور عامیانہ زندگی کو شاہانہ زندگی پر ترجیح دے۔ آفریں!) اس لئے کہ اس لعنت کا شکار صرف ایک یا دو ہی ذاتیں نہیں ہوتیں بلکہ ساری قوم پر اسکا اثر پڑتا ہے۔ شادی کے بعد اکثر دولت و عظمت میں ایک قسم کا گھن لگنا شروع ہو جاتا ہے۔ اور میاں بیوی اُن کے بعد ان کی اولاد اور پھر اولاد کے بعد اولاد دولت کو بیدریغ لٹاتی اور مرتبہ کو جا و بیجا طور پر استعمال کرتی ہے۔ اور آہستہ آہستہ وہ اس جگہ پہنچ جاتی [illegible]

آتا ہے۔ آئے دن دیکھنے میں آتا ہے کہ دولت کے کتے اور جاہ و عظمت کے بھوکے اپنے مقاصد و مطالب کے لئے جانی و مالی قربانی کرتے ہیں۔ اور اپنے اس عجب و نخوت کی پرورش میں کچھ سکون و طمانیت قلب کا سامان جمع کرنا تو کجا ، اپنی زندگی کو اور اجیرن کر لیتے اور خود ہی برباد ہو جاتے ہیں۔ ان کا خیال ہوتا ہے کہ وہ محبت کی شادی پر دولت یا خاندان کی شادی کو ترجیح دیکر افلاس کے بھوت کے مقابلہ کے لئے ایک ناقابلِ شکست فوج تیار کر لیں گے لیکن ان اندھوں سے کوئی پوچھے کہ اگر افلاس ہی آجائے ۔ اور اسکا آجانا کوئی تعجب خیز امر نہیں کیونکہ ہر کمانے والے کے لئے ایک دن ایسا ضرور ہوتا ہے، تو اس وقت تمہارے پاس محبت و ہمدردی اور اعتماد کی وہ بے بہا دولت بھی ہوگی جو ایسی حالتوں میں جبکہ تفکرات اور مصائب و آلام ہر طرف اپنے ڈیرے ڈال دیں، روز بروز بڑھتی نہیں بلکہ روبہ انحطاط ہی ہوتی چلی جاتی ہے۔ اور باوجود بے انتہا مشکلات و مصائب کے اُنکے ضمیر سے یہی کہتی رہتی ہے کہ اب بھی تمہارے پاس ایک بے داغ دولت چھوڑ دی گئی ہے جسکو نہ چھوا گیا ہے، نہ چھیڑا گیا ہے اور جو بجنسہٖ محفوظ ہے —!

اگر دولت کی خاطر شادی کرنا کسی وجہ سے بے حیائی نہیں بلکہ صرف مذموم ہے تو اگرچہ قانوناً جائز طوائف بازی اور ان حرکات سے کچھ ہی کم حیا سوز ہے جن کی بہت سی حکومتیں صرف اسلئے اجازت دیدیتی ہیں کہ وہ اس ذریعہ سے کافی ٹیکس وصول کرسکیں گی تو اس نوجوان کو کیا کہوگے۔ جس نے شباب کے تمنا انگیز زمانہ میں ایک ایسی مالدار عورت سے شادی کر لی ہے۔ جو [illegible]

انتہائی بدشکل بھی ہے۔ یہ سب کچھ [illegible] کی دولت کی خاطر —— حقیقۃً ایسا شخص قوم و ملک کے نام کو بٹہ لگاتا ہے۔ اور ضروری ہے کہ ایسے شخص کے ساتھ ذلیل اور کمینہ کے الفاظ کا اضافہ کر دیا جائے۔ نتائج اخلاق ایسے نامعقول جوڑے کو ایک ٹھوکر سے ایک پرکاہ کی طرح اڑا دے گا۔ اور خدا کے انصاف کا چھپا ہوا ہاتھ کرۂ ارض سے اُنکے نام تک کو نیست و نابود کر دے گا۔

آؤ! اے میرے گمراہ ساتھیو! میرے بھٹکے ہوئے دوستو! دیکھو نپولین اعظم جیسے پرجلال و باجبروت شاہنشاہ کی زندگی چیخ چیخ کر تم کو کیا سبق دے رہی ہے۔ دل کی آنکھوں سے دیکھو اور نصیحت و عبرت کے کانوں سے سنو۔ دولت عظمت پالیسی اور ایسے ہی مقصد کے لئے کوئی غیر موزوں شادی کرنا دراصل شہرت، مسرت اور طمانیت کے شاہراہ پر چلنا نہیں بلکہ بربادی، گمنامی اور ذلت کے گڑھے میں گرنا ہے

مذکورہ بالا [illegible] میں اس گروہ کو مخاطب کرنا چاہتا [illegible] ہر نصیحت کو بغور سننا اور اگر قابلِ عمل ہو تو اس پر عمل کرنا، ورنہ ٹھکرا دیتا ہے۔ اور جو سچی محبت کا دلدادہ اور حقیقی مسرت کا جویاں ہے ہمیشہ یاد رکھو کہ شادی، دو ہستیوں میں ایک مقدس اور پاک معاہدہ کا نام ہے جس کو تمام زندگی میں ایسا ہی [illegible] و پاک رہنا چاہئے۔ جیسا کہ وہ اولین ساعتوں میں تھا ۔ اور اسی سبب سے اس پر زندگی کی ہر خوشی اور ہر تکلیف کا دارومدار ہے لاریب شادی انسانی تفکرات میں بے حد اضافہ کر دیتی ہے [illegible]

سامنے کونین کی ہر بخشیں بہا چیز ہیچ ہے نعم البدل بھی دیدتی ہے۔ اور واقعہ ہے کہ کسی صحیح، ورنیک بیوی کا ملجانا انسانی خوش بختی پر دال ہے۔ نسبت شادی کے معاملہ میں ایک ایسا جز و لاینفک ہے جس کے بغیر کسی مخصوص فیصلہ پر یقین نہیں ہم لئے دلیل و برہان کی روشنی چاہئے۔ پھر آپ اپنی زندگی کے ایک اہم ترین واقعہ کو اپنے لئے جتنا چاہیں اتنا ہی خوش آئند مفید اور مسرت انگیز کیوں نہ بنالیں میرے نوجوان دوستو! ذیل کی چند سطور کا گہرا مطالعہ آپ کی مسرتوں۔ آپ کے آرام آپ کی حمایت میں بے انتہا اضافہ کر دیگا۔ اسکو غور سے پڑھو اور پڑھنے کے بعد اس پر عمل کرنے کی بھی کوشش کرو۔

وہ چیزیں جو آپ کو ہر اس عورت میں تلاش کرنی چاہئیں جسے آپ رفیقۂ حیات بنانا چاہتے ہوں صرف آٹھ ہیں۔

(۱) وفاشعاری (۲) اعتماد و سنجیدگی (۳) مستعدی (۴) کفائت شعاری (۵) صفائی (۶) امور خانہ داری سے واقفیت (۷) خوش مزاجی اور (۸) حُسن

۱۔ وفاشعاری: موجودہ تہذیب کی بے راہ روی اور تملق نے اس چیز کو اگر فنا نہیں تو کم از کم مسخ ضرور کر دیا ہے وفاشعاری دراصل الفاظ کی معصومیت، خیالات کی عفت اور اعمال کی پاکیزگی کا نام ہے جس انسان میں عصمت و عفت اور حیا و معصومیت کا احساس نہیں وہ وفاشعاری کو قیامت تک نہیں سمجھ سکتا۔ اور چونکہ ایک رفیقِ حیات کا وفاشعار ہونا انتہائی ضروری ہے۔ اس لئے جب تک اس میں یہ صفت نہ ہو وہ ہرگز اس مرتبہ کے لائق نہیں۔ صرف اتنا ہی کافی نہیں

کام لیتی اور اُنکے سامنے اپنی نگاہیں جھکا لیتی یا حجاب نسوانی کے منافی کوئی لفظ سنکر ایک ہلکے سے تبسم کے ساتھ اپنا منہ پھیر لیتی ہے۔ بلکہ اسمیں یہ بات ہونی چاہئے۔ کہ گویا وہ ان باتوں کو سمجھتی ہی نہیں اور اگر سمجھتی ہو تو اسپر صرف اتنے نقوش قائم ہو سکتے ہیں جتنے ایک جامد جسم پر۔ ایک حیا باختہ عورت دنیا میں بدترین دوست ہے۔ پھر وہ بیوی بنکر انسانی زندگی میں کیا دلچسپی پیدا کر سکتی ہے محبت اندھی ہوتی ہے اسلئے محبت میں محبت کرنے والے کے اندر اتنی صلاحیت نہیں رہتی کہ وہ محبوبہ کے کردار کو غیر متعصبانہ طور پر سمجھ سکے یا روشن دماغی کے ساتھ اُس کا محاسبہ کر سکے۔ اور اگر ابتدا ہی میں یہ چیز قائم ہو گئی تو آپکو یقین رکھنا چاہئے کہ دنیا کی کوئی قوت آپ کے اس مرض کو دور نہیں کر سکتی۔ اگر بناوٹی سنجیدگی کسی جھوٹی عفت کی خاطر ہے تو واقعی یہ قابل نفریں چیز ہے لیکن اگر اس سے انتہائی بلند عصمت مراد ہے تو یہ دل سے لگا کر رکھنے کی شئے ہے۔ حقیقۃً میں ہی نہیں بلکہ شائد ہر دل والا انسان آزاد اور حسین عورتوں سے گفت و شنید اور اختلاط و ارتباط پسند کرتا ہے۔ لیکن ایسی عورتوں کو بیوی بنانا بھی میں مصلحت و عقلمندی کے خلاف سمجھتا ہوں۔ اس لئے کہ شادی ایک ایسا عمل ہے جس کا اثر چند روزہ نہیں بلکہ تمام زندگی میں جاری و ساری رہتا ہے۔ اور چونکہ مصائب و آلام کا توازن قائم رکھنے کی ذمہ داری بڑی حد تک شادی ہی پر ہوتی ہے۔ اس لئے جہانتک ہو سکے اسکو مکمل ہونا چاہئے ورنہ اس ہونے سے نہ ہونا بہتر ہے۔ رشک و حسد کو دل میں پرورش کرنا وہ حماقت ہے کہ اگر

[illegible] [redacted]

کوشش ایسے جذبات کی بیخ و بن نہ اکھیڑ سکے تو کم سے کم انکے شروع ہونے والے عناصر سے محفوظ رکھنے میں کامیاب ہو سکتی ہے۔ لاعلاج ہے وہ بدنصیب اور بدبخت ہے۔ وہ بھی جو کسی عورت کے کردار پر پورا پورا محاکمہ کرنے کے بعد اسکو خراب پاکر بھی پیام شادی دے اور شادی بھی کرلے۔ ان ہم معاملات میں مرد کا ایک فرض یہ بھی ہے کہ وہ کبھی ظاہری باتوں پر نہ جائے اور اسکے ساتھ ہی جب تک کوئی قابل اعتماد یا صحیح ثبوت نہ ہو اسوقت تک عورت کی عفت و پاکبازی میں کسی قسم کا بھی شک اپنے دل میں پیدا نہ کرے۔

تمام آنیوالے مصائب سے بچنے کے لئے بہتر ہے آنکھیں کھول کر کام کیا جائے۔ شادی کے معاملے میں آپ ہر انتخاب کے لئے خود کو آزاد سمجھئے اور کسی دوسرے پر مرومت کیجئے۔ اسلئے کہ شادی آپ کرتے ہیں، کوئی دوسرا نہیں۔ اگر ابتدا ہی میں عورت کی آزادی اور ذاتی رشک و حسد کو اہمیت نہ دی جائے۔ تو بہت کچھ علاج درد ممکن ہے لیکن اگر آپ کی ابتدا ہی کسی جذبہ حرص کے ماتحت ہوئی اور آپ نے شادی کسی ایسی عورت سے کرلی ہے جس سے ظاہر اور خفیہ ملاقاتوں کا موقعہ اکثر آپکو ملتا رہا ہو تو اسکے معنی یہ ہونگے کہ آپ خود ہی مصیبتوں کو بلا رہے ہیں۔ کیا آپکو یقین ہے کہ جس طرح وہ عورت آپ سے ملنے جلنے میں آزادی اور بے تکلفی سے کام لیتی تھی، یا جس طرح آپ اس سے بہت کشادہ ہوکر اور ہر تکلف و حجاب کو بالائے طاق رکھ کر ملتے تھے۔ اسی طرح وہ کسی اور مرد کو دعوت یا جرات اختلاط نہ دے سکتی

کے خلاف ہی نکلے تو پھر آپکو کوئی حق نہ ہوگا کہ آپ اپنی بیوی کے شاکی ہوں۔ یا اگر ثابت نہ کر سکتے ہوں تو بند ہی اندر رہا کیجیں۔ اسلئے کہ قصور آپ ہی کا ہے۔ اور آپ اسے خاموشی کے ساتھ برداشت کرنے پر بھی مجبور ہیں۔ اگر آپ واقعی اسکے چال چلن سے ناواقف بھی ہوتے تو آپ کی شکایت بجا تھی۔ خود ٹھوکر کھائی، خود چوٹ کھائے۔ بیوی یا بچوں پر کسی قسم کی تکلیف کا بوجھ ڈالنا خود کو اخلاقی مجرم بنانا ہے۔ میرا ذاتی تجربہ ہے کہ جہاں کہیں اس قسم کی ناخوشگواری اور تعلقات میں کشیدگی پائی جاتی ہے۔ وہاں اگر سو نہیں تو نوے فیصدی مرد کا قصور ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ اندھے کیوں بنتے ہیں؟ ہر چیز آپکے قبضے میں ہوتی ہے۔ جو چاہئے فیصلہ کیجئے۔

۲۔ اعتماد و سنجیدگی:۔ اعتماد و سنجیدگی بہت وسیع المعانی اصطلاحیں ہیں۔ جہاں ان سے مردانہ زندگی میں مختلف مرادیں ہوتی ہیں وہاں حیات نسوانی میں انکے مطالب کچھ اور ہی ہوجاتے ہیں۔ یہ صفات وقتی نہیں، بلکہ نسوانی کردار میں اس طرح پیوست ہونی چاہئیں جس طرح گوشت اور ہڈیاں۔ مستقل مزاجی۔ حزم و احتیاط۔ اور رکھ رکھاؤ یہ وہ چیزیں ہیں جو ایک عورت کو معمولی درجہ سے اٹھا کر نہایت بلند جگہ پر بٹھا دیتی ہیں۔ اور جس عورت میں یہ صفات پائی جاتی ہوں میں نہیں سمجھتا کہ اس سے زیادہ کوئی اور عورت بھی بیوی بننے کی اہل ہوسکتی ہے۔ پارہ کی طرح بے چین، قینچی کی طرح زبان چلانے والی، پیاری پیاری ہیجان انگیز باتیں کرنیوالی

ایک نوجوان دل لوٹ پوٹ ہوجاتا ہے۔ مگر یہ کشمکش حیات میں یہ چیزیں کچھ کام دے سکتی ہیں؟ ہاں جن کی زندگی تیری کی زندگی سے زیادہ اہم نہیں وہ شاید اس حالت کو پسند کریں اور انکے لئے موزوں بھی ہے۔ لیکن جو جانتے ہیں کہ زندگی کے بحر ذخار میں کشتی ڈالدینے کے بعد کن کن گردابوں سے واسطہ اور کون کون سی موجوں سے لڑنا پڑتا ہے۔ وہ اس چیز کی اہمیت کو بھی سمجھتے ہیں۔ ایسی سیماب وش زندگی اسی وقت تک مناسب معلوم ہوتی ہے جب تک لڑکپن اور بچپن کے زمانہ میں لوریاں ملتی ہوں لیکن جب وہ وقت آجائے۔ جب ایسی لڑکیوں کے تخیلات بھی اس دلفریب منظر کیطرف رجوع ہوتے ہوں۔ جس جگہ زندگی کا دائمی معاہدہ لکھا جاتا ہے اور جب ان کے دل میں بھی یہ گدگدی پیدا ہوتی ہے کہ وہ بھی کسی گھر میں جاکر بنکر بیٹھیں۔ تو پھر یہ بچپن کی حرکات زیب نہیں دیتیں۔ بلکہ ان کو خیر باد کہدینا ہی بہترین عقلمندی ہے۔ میرا ایمان ہے کہ اگر کسی کو ایسی بیوی نہ ملے جو بیک وقت مستقل مزاج بھی ہو سنجیدہ بھی محتاط بھی ہو معتمد بھی۔ اور اپنے رکھ رکھاؤ میں حزم و شعور سے بھی کام لیتی ہو۔ اس مرد کو تمام زندگی مجرد رہنا چاہیئے کیونکہ زندگی کو ناخوشگوار بنا دینے والی شادی سے احتراز و گریز ہی لازمی ہے۔

اعتماد:۔ اگر آپکو اپنی بیوی کا سچا اعتماد حاصل ہوجائے تو سمجھ لیجئے کہ آپ کو دنیا میں بہت کچھ مل گیا۔ اس سے زیادہ بے بہا چیز دنیا میں کوئی نہیں۔ اس شخص سے اس کے روحانی آلام کا تذکرہ سنئے جو مکان کی چوکھٹ چھوڑتے وقت ہزار ہا

پر شکوک سے نہیں، بلکہ ان شکوک سے ہے جو ایک بدنصیب مرد کو بیوی کی بداحتیاطی، بے توجہی، فضول خرچی اور بچوں کی طرف سے لاپروائی وغیرہ پر ہونگے۔ پھر اس بدبخت سے ملئے جو اپنی کوئی چیز بغیر تالے کے میز پر، الماری میں تکئے کے نیچے کہیں نہیں چھوڑ سکتا۔ اور پھر بھی جس کو یہ یقین نہیں ہوتا کہ اس کی ہر چیز قفل میں بھی صحیح وسلامت موجود ہوگی اس سے ہر روز کے تفکرات کا شمار کرائیے۔ واللہ آپکو اس پر رحم آنے لگیگا۔ بڑا خوش نصیب ہے وہ شوہر جو صرف ایک ثانیہ کی اطلاع پر گھر کو، جیسا بھی ہے، چھوڑکر چلا جائے اور اسکو ذرہ بھر فکر نہ ہو۔ اور پھر جب وہ واپس آئے تو کتابوں کو نہایت تہذیب سے لگا ہوا، قلم دوات، کاغذ نہایت تمیز سے میز پر پڑا ہوا، جوتا، موزا اپنی جگہ پر رکھا ہوا، چھڑی، ٹوپی، ہیٹ، کھونٹی میں لٹکے ہوئے، اور کمرہ نہایت صاف ستھرا پائے۔ ایسے انسان کو نہ دنیا کی کوئی فکر اور نہ زندگی میں کوئی مصیبت، ــــ جو شخص بیوی بچوں کی ہر مسرت سے ہمکنار بھی ہوتا ہے اور خانگی تفکرات سے ایسا ہی آزاد ہے جیسا مجرد زندگی میں تھا، اس کی خوشی کچھ نہ پوچھئے۔ دنیا صرف اسی کے لئے ہے مشکل سے مشکل کام میں اسکو خوشی ہوگی اور سخت سے سخت محنت اسکا روزانہ مشغلہ۔

اگر آپ اپنی زندگی کو اس سرورجاودانی میں غرق کرنا چاہتے ہیں۔ تو رفیق حیات کے انتخاب میں انتہائی احتیاط سے کام لیجئے۔ اگر کوئی عورت اپنی ذات میں محو رہتی ہے۔ لباس کی بہت شائق ہے۔ خوشامد پر سب کچھ لٹا دینے کو

گذار دیتی ہے اور ہمیشہ خوش آیند چیزوں میں مشغول رہنے جاہتی ہے۔ اس میں آپ کو کبھی بھی اعتماد کی لازوال دولت نہیں مل سکتی۔ اپنی طبیعت کو بدل دینا آپکے امکان سے باہر ہے اور اگر یہ جانتے ہوئے بھی اس سے شادی کر لی تو یہ امید انصاف سے بعید ہو گی کہ وہ کسی وقت بھی آپ کی معتمد بن سکتی ہے۔ اور اگر اتفاق سے یا آپ کی خوش قسمتی سے ایسی عورت میں کسی وقت بھی اعتماد کے آثار پائے جائیں۔ پھر آپ آنکھیں بند کر اس پر اعتماد کیجئے۔ اسلئے کہ اگر آپ نے اس اعتماد کا جواب ایسے ہی اعتماد سے نہ دیا تو یہ آثار فوراً ہی فنا ہو جائینگے۔ اور آپ کی زندگی ایک ویرانہ بن جائے گی۔ بھیانک اور ہیبت انگیز۔ —— ایک عورت کو معتمد بنانے کے لئے پہلے ہی دن سے آپ اُس پر اس امر کے اظہار کی کوشش شروع کر دیں کہ آپ کو اُس پر کوئی شک نہیں کوئی خوف نہیں۔ اور اس کی طرف سے دل میں کسی طرح کا وہم نہیں۔ بہت سے مردوں نے اپنی جھگڑالو طبیعت کی وجہ سے خود کو بربادی کے غار میں گرا لیا ہے۔ اور بیوی کی ذلیل ٹھوکریں کھا کھا کر دائرۂ زندگی کو اپنے اوپر تنگ کر لیا ہے۔ ہر عورت ایسے شخص سے نفرت کرتی ہے جس میں رشک و رقابت کا مادہ ہو۔ اسلئے اگر زندگی کی بنیاد آپس کے اعتماد و اتحاد پر رکھی جائے تو کیا کہنے۔

انیسویں صدی کا مفکر ولیم کوبٹ اپنی زندگی کے حالات لکھتے ہوئے کہتا ہے کہ وہ ایک لڑکی سے ملا جسکی عمر صرف ۱۳ سال کی تھی مگر اسکے دل میں اسی وقت اس بات کی [illegible]

اُس لڑکی کا باپ جو کہ ایک فوجی افسر تھا، دوسرے مقام پر منتقل کر دیا گیا۔ اور ولیم کوبٹ بھی کسی دور دراز مقام کو بھیج دیا گیا۔ اس وقت اس نے اس لڑکی کو تحفتہً کچھ روپیہ بھیجا۔ اور یہ خواہش ظاہر کی کہ وہ اس روپیہ کو اپنا روپیہ سمجھے اور لباس اور کتابوں پر اُس کو صرف کر دے۔ مگر پانچ برس کے بعد جب کوبٹ دوبارہ اس لڑکی سے شادی کی تکمیل کے لئے ملا، لڑکی نے وہ روپیہ بجنسہٖ اسکو واپس دیدیا اور اُسکا شکریہ ادا کیا —— حقیقتہً اعتماد و اطمینان کی اس سے بڑھکر اور کوئی مثال نہیں ہو سکتی جبکہ اُس لڑکی کے اردگرد ایسی فضا موجود ہو کہ اُس روپیہ سے کہیں زائد روپیہ صرف آرائشات ہی —— خریدنے میں کھڑے کھڑے خرچ ہو جائے۔

بہت سے مرد چاہتے ہیں کہ عورت میں اس اعتماد کے ساتھ ساتھ سنجیدگی بھی فراوانی کے ساتھ ہونی چاہئے۔ مگر میرے نزدیک ایک مخصوص حد سے نکلکر سنجیدگی ایک قسم کا غم بنجاتی ہے۔ ایسی عورت سے جو خاموش سنجیدہ یا بالفاظ دیگر ہر وقت منہ بگڑی (بوری) رہے۔ محبت نہیں نفرت ہوتی ہے۔ ایسے انسان کے ساتھ زندگی تو درکنار ایک ہفتہ بھی گذارنا دوبھر ہو جاتا ہے۔ ہاں دوسروں کے سامنے سنجیدگی اور شوہر کے سامنے ہر وقت ہنستے رہنا، شرارت کرنا، اُسکا دل بہلانا اچھا ہے۔ ایک عورت کی ہر قسم کی شوخی، زندگی اپنے شوہر کے لئے ہی وقف ہونی چاہئے۔ اور وہ بھی اس وقت جب وہ تھکا ماندہ دن بھر محنت کرنے کے بعد شام کو اپنے گھر لوٹے اور اس بات کا متمنی ہو کہ کسی کا نازک ہاتھ اُسکے دھڑکتے دل کو کسی کے میٹھے میٹھے [illegible]

تھکتے دماغ کو ایک سکون بخش دیں۔ ابدی ایک کیف دیدیں۔ سرمدی اور ایک خواب لادیں شیریں۔ ایک وقت اُسکے دلنواز قہقہوں میں غم خود اپنی ہستی کو بھی بھول جائے اور دوسرے وقت اُس کی آہوں کے زیر و بم سے دنیا ہچکولے کھانے لگے۔

—— یہ ہے جذبہ —— اور یہ ہے زندگی ——

ترنم ریز نغمہ —— بے پناہ موسیقی —— خوش نصیب ہے وہ ماں جو مسرت سے بے خود ہو کر اپنے ننھے سے تندرست بچے کو سینہ سے لگائے میٹھی میٹھی لوریاں دیتی اور والہانہ طور پر طرح طرح کے گیت گاتی پھرتی ہو —— گھر کے ذرہ ذرہ سے خوشی —— مسرت کی گونج اٹھتی ہے —— اور سارا مکان ملکوتی نغمات کی بارش سے شرابور ہو جاتا ہے —— یہ ہے وہ حسین نغمہ جو محبت کی غذا ہے —— جس پر محبت پلتی ہے —— جس سے محبت کی پرورش ہوتی ہے —— وہ شور نہیں، وہ شغب نہیں جو دکھاوے کی محبت کا مرہونِ منت ہو —— جو دماغی کاوش کا نتیجہ ہو —— دل کی آواز تو کسی اور ہی لطف کی حامل ہوتی ہے سوچ کر پیدا کی ہوئی آواز میں وہ لوچ کہاں —— وہ اثر کدھر جو دل کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی آواز میں ہوتا ہے ——

دن بھر محنت کے بعد شام کو تھکاوٹ سے چور ہو جانیوالے انسان کی محبت پدرانہ کا کبھی آپ نے نظارہ کیا ہے —— واللہ آپکو رشک ہوا ہوگا۔ اس غریب کی حالت پر، اُسکی بے لوث مسرت پر، اُس کی محبت پر —— اُن ماؤں اور باپوں کو دیکھئے جو اپنے بچوں کی خاطر اچھا کھانا، اچھا پہننا اپنے اوپر [illegible]

معروف ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دولت کے نشے میں چور دُنیا و مافیہا سے بے خبر، بچے ہی نہیں، بلکہ اپنے وجود سے بھی آزاد ہیں۔ شائد آپکو ان دولت پرستوں کی زندگی سے ان بیکسوں کی زندگی بدرجہا بہتر معلوم ہو —— افلاس کی حقیقت دراصل کچھ نہیں۔ افلاس سے ڈرنے والا دولت کا لالچی ہوتا ہے اور دولت کا لالچی کبھی اپنے اخلاق و کردار کا تحفظ نہیں کرسکتا یا تو وہ خود ہی ذلیل و خوار ہوتا ہے۔ یا افلاس ہی کے بھوت کو اپنے اوپر قابض بنا کر ایک روز اپنی جان بھی اس کی نذر کر دیتا ہے۔ افلاس و امارت سے بے نیاز، حقیقی انسان ہوتا ہے۔ وہ اس کی بیوی اور بچے، گویا مختصر سے خاندان کا ہر فرد، فردوس کی ایک روح، مسرت کا ایک پیکر، اور آزادی کا ایک مجسمہ ہوتا ہے اور اس تمام مسرت، اس تمام خوشی کا سہرا، اگر غور کروگے تو معلوم ہوگا کہ عورت اور صرف عورت کے نیک تدبر اور خوش انتظامی کے سر ہے اور ان کی تخلیق ذاتی اعتماد کے خیال ہی سے ہوتی ہے۔

دولت پرست طبائع شائد میرے مرقومہ بالا الفاظ کو اپنے خلاف کوئی بغاوت سمجھیں اور اس اعتماد و سنجیدگی کو جسکے لئے میں اتنا اصرار کر رہا ہوں۔ اس جوش محبت کا فقدان تصور کریں۔ جن کی وہ ایک عورت سے متمنی ہوتی ہیں لیکن اپنے مشاہدہ اور تجربہ پر مجھے دعوےٰ ہے کہ لائیے جس جوش کے آپ متمنی ہیں۔ صرف وہی مجھے دیدیجئے۔ اور میں اپنی زندگی کی ہر دلچسپ چیز آپ کی نذر کر دونگا۔ مگر دوستو، یقین جانو کہ دنیا اب اس محبت سے خالی ہے۔ جو آپ کو [illegible]

ہیں دستیاب ہوتی یا ہوسکتی ہے۔ اب تو محبت بھی مطلب پرستی کا دوسرا نام ہوگیا ہے۔ محبت میں وہ ایثار، وہ قربانی اور خود فراموشی، جو کبھی محبت کرنے والے کا طرۂ امتیاز سمجھی جاتی تھی اب محبوب کیلئے ایک مذاق ہے (اور دنیا والوں کے لئے ایک حماقت۔ محبت کا جذبہ جتنا تیز ہوتا ہے اتنا ہی اس میں ہلکے پن کا، تیز اور مزاج بھی پایا جاتا ہے۔ طوائفیں کس جوش کے ساتھ آپ سے ملتی ہیں۔ مگر کیا کبھی انہوں نے کسی سے سچی محبت کی ہے اور کیا وہ کبھی کسی سے سچی محبت کرسکتی ہیں؟؟ اس ذریعہ سے صرف ان کے حیوانی جذبات کی طمانیت کا سامان مہیا ہوتا رہتا ہے اور بس مستقل مزاجی ان کو چھو کر نہیں گذری۔ تغیر و تبدل ان کی زندگی کا پہلا اصول ہوتا ہے۔ اور اس میں جتنی بھی ممکن ہوسکتی ہے وہ خوشی محسوس کرتی ہیں۔ کیا آپ اپنے محبوب کو کسی دوسرے شخص کے محبوب سے بدل لیں گے؟ کیا آپکا دل یہ گوارا کرلیگا؟؟ کیا دوسرا شخص اجازت دے سکیگا؟؟ مگر ان کی دنیا میں یہ سب کچھ ہوتا ہے۔ اور ضروری ہے۔ سطحی دماغ اور اُتھلے دل کی عورتیں کسی گہرے جذبہ سے قطعاً محروم ہوتی ہیں۔ محبت اس وقت تک صرف ایک جذبہ کا نام ہی تو ہے۔ جب تک کوئی مرکز نہ ہو۔ کوئی ایسی چیز نہ ہو جس سے محبت ہو لیکن وہ عورتیں جن کی زندگی میں ہلکے پن اور چھچھورے پن کا پہلو نمایاں رہتا ہے کبھی ایک مرد پر قانع نہیں رہ سکتیں۔ ان کی فطرت ہی ان سے بغاوت کرتی ہے۔ اور وہ ہر روز ایک نئی آغوش کی زینت ہوتی رہتی ہیں۔ صرف اسلئے کہ وہ جذبات کی گرمی اور تندی سے محبت کرتی ہیں۔ آپکو بہرحال عورت کی جسمانی بناوٹ اُس کی قدرتی خواہشات، فطری اقتضا، اور ملکی رسومات کا لحاظ ضرور رکھنا پڑیگا۔ ایک فرانسیسی حسینہ میں چھچھورا پن جتنی افراط سے پایا جاسکتا ہے کسی اور میں نہیں۔ ایک مرتبہ مجھے ایک فرانسیسی لڑکی سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ میں حیرت میں پڑا ہوا تھا کہ وہ کس بیباکی کے ساتھ اپنے تبسّمات کی اچھوتی دنیا کو لٹانے پر تلی ہوئی تھی ہماری تمام گفتگو کے بعد اس کی ایک عجیب حرکت۔ ایک ہاتھ اوپر کو اٹھائے، دوسرا نیچے کئے ہوئے جسم کو ایک طرف جھکا کر دوسرا پاؤں پیچھے کی طرف اوپر کو اٹھائے ہوئے گویا؟ وہ حالت پرواز میں ہو؛ مجھے آج تک نہیں بھولی ہے اور پھر اس کا سریلی آواز میں گنگنانا؛ "اگر محبت میں قوت پرواز ہے تو کیا یہ مناسب نہیں ہے کہ اس کی خوب خوب تعریف کی جائے" اور سونے پر سہاگہ تھا۔ اس وقت میری بذلہ سنج طبیعت، میری حاضر جوابی، میرے دلائل اور ایک حد تک تہذیب و آداب بھی مجھے جواب دے چکے تھے۔ اور میں مجبور ہوگیا کہ ———— مگر یہ حالت ہر جگہ نہیں ہوسکتی۔ یہ تو صرف فرانس ہی کے لئے مخصوص ہے۔

۳۔ مستعدی: مستعدی سے مراد جسمانی محنت شاقہ نہیں جو دولت کمانے یا روپیہ جمع کرنے کے لئے ضروری ہے یہ چیز یہاں بھی ضروری ہے۔ جہاں اتنی دولت ہے کہ اس کا صحیح مصرف بھی نہیں معلوم لیکن اسکے ساتھ ساتھ ممکن ہے کہ محنت و مشقت کرنیوالوں کی بیویاں سست اور کاہل ہوں۔ زندگی کا کوئی شعبہ اور کوئی موقعہ ایسا نہیں۔ جہاں بیوی کا مستعد اور چاق و چوبند ہونا اس خاندان کی فلاح و بہبود اور خوشحالی کے لئے ضروری نہ ہو جس کی وہ ایک خاص رکن ہونے کی ذمہ دار ہے۔ اگر وہ کاہل ہوگی تو اندر سے باہر تک جتنے نوکر ہونگے وہ

بھی سست ہونگے اور یہی نہیں بلکہ اس سے بدتر یہ کہ اسکی اولاد بھی کاہل وجود ہوگی۔ ہر کام کو دوسرے وقت کے لئے اٹھا کر رکھا جائیگا اور وقت پر بھی انتہائی عجلت میں بری بدسلیقگی اور بے ہودگی کے ساتھ کیا جائیگا۔ اور بہت سی حالتوں میں تو شائد اسکو چھوا بھی نہ جائے۔ شوہر کو کبھی وقت پر کھانا نہیں مل سکے گا۔ اس کا سفر کبھی دلچسپ نہیں ہو سکے گا۔ اور اور ہر وقت طرح طرح کی پریشانیوں میں اضافہ ہوتا رہے گا۔ گھر کے تمام کام اندر سے باہر تک نامکمل اور ادھورے پڑے رہیں گے۔ یہ چیز دولتمند گھروں میں اور زیادہ تکلیف دہ ہو جاتی ہے۔ اسلئے ان میں جو بچے پیدا ہوتے ہیں۔ اور ان کو کسی ضرورت سے کوئی کام نہیں ہوتا۔ جب ہی وہ صرف ورزش ہی کی خاطر کچھ نہ کچھ کرتے رہتے ہیں۔ اگر وہ کچھ نہ کریں تو ان کے اعضا معطل ہو کر رہ جائینگے۔ اور ایک وقت وہ آئیگا جب ان کو جینا تک برا معلوم ہونے لگے گا۔ اس لئے ایک عورت چاہے وہ کتنے ہی بلند نسب ہو۔ اگر کاہل ہے تو خود کے لئے، شوہر کے لئے، آنیوالی نسل کے لئے، غرضکہ سارے گھر کے لئے ایک مصیبت سے کم نہیں۔

... یہ بتانا تو حماقت ہوگی کہ فلاں عورت مستعد اور کام میں مائل ہے۔ ایک ایسے شخص کو تو جس کو کسی کی شراب ریز آنکھوں، خون آشام ہونٹوں، دلنشیں عشووں اور سریلی آوازوں نے اگر پورا نہیں تو آدھا ضرور دیوانہ بنا دیا ہے اپنی محبوبہ کی ہر برائی بھلائی اور ہر بدی صفت نظر آئے گی۔ اس معاملہ میں دلائل اتنے کارآمد ثابت نہیں ہو سکتے جتنے ظاہری آثار۔ ان ظاہری آثار سے اخذ نتیجہ میں ایک شخص اپنی قوت استدلال کو کام میں لاکر صحیح فیصلہ پر پہنچ سکتا ہے۔ بعض وقت ایسا ہوتا ہے کہ لڑکی کسی کمزوری اور برائی کو چھپانے کی کوشش خود ہی نہیں کرتی، بلکہ اس میں اسکا سارا گھر شریک ہوتا ہے اور اس وجہ سے اکثر فیصلہ قائم کرنے میں مرد دھوکے میں پڑ جاتا ہے۔ لیکن اگر اس کی نظر نکتہ نشین اور اسکا دماغ نکتہ رس ہے تو وہ اپنے مطلب میں ناکام نہیں ہو سکتا۔ اسلئے کہ عورت اپنی زندگی کی داستان گو ہوتی ہے۔ اور جو چیز ظاہر ہے۔ وہ بہر حال ظاہر ہے۔

سب سے پہلے عورت کے طرز گفتگو کو دیکھئے۔ اگر اسکی زبان کو آہستہ آہستہ جنبش ہوتی ہے۔ اور اس کے ہونٹ کاہلانہ طرز سے ہلتے ہیں۔ آواز بھی مری مری اور بڑی آہستہ سے نکلتی ہے۔ اور ادائی الفاظ میں تیزی نہیں پائی جاتی ہے۔ تو وہ عورت کبھی مستعد کار نہیں ہو سکتی۔ آواز میں تیزی، صفائی اور جھنکار کا پایا جانا مستعد عورت میں ضروری ہے۔

پھر دانتوں پر غور کیجئے۔ اگر دانت اپنا کام صحیح طور پر انجام دیتے ہیں تو جسم کا ہر عضو اور دماغ بھی اپنے وظیفۂ عمل کو صحیح طور پر پورا کرے گا۔ "زود خور تیز گام" لیکن اکثر اس جگہ آداب محفل سدِ راہ ہوتے ہیں اور ہم کو بتلایا جاتا ہے کہ ہم محفل میں کبھی جلدی جلدی نوالہ نہ چبائیں۔ یا جلد کھانا نہ کھائیں جتنے یہ کہ جب تک ایک شخص بھی کھا رہا ہے، دسترخوان سے جنبش تک نہ کریں لیکن ایک عورت چاہے وہ آخری وقت تک دسترخوان پر بیٹھی اور اس رسم کی تکمیل کے لئے آخری لمحہ تک باقیماندوں کا ساتھ دیتی رہے مگر اپنے دانتوں کی کیفیت کو نہیں بدل سکتی۔ وہ یا تو ایک ہی نوالہ دیر تک خواہ مخواہ چباتی

سے گی۔ یا چھوٹے چھوٹے نوالے کھائیگی تاکہ وقت پورا کرسکے لیکن وہ جب بھی نوالہ چبائے گی اُس چیز کو نہیں چھپا سکتی جو نطرت نے اس میں ودیعت کر دی ہے۔ اور آپ باسانی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ آیا اسکے جبڑے بھی سستی کے ساتھ حرکت کرتے ہیں۔ یا وہ عمدًا آہستہ آہستہ کھا رہی ہے۔ اسکی شستگی رہیا اسکے ہاتھ کے کاڑھے ہوئے پھول اور کشیدہ کیے ہوئے نقشے اس امر میں ممد ثابت نہیں ہو سکتے۔ اس کی بجائے اگر ممکن ہو سکے تو یہ دیکھیے یا معلوم کیجیے کہ وہ کھانے پکانے اور گھر کا کام کاج کرنے میں سستی سے کام لیتی ہے یا انتہائی پھرتی اور مستعدی سے۔ اگر وہ کاہل ہے تو اُس سے تو بہی بھلی ہے۔ بلکہ اگر آپ میں روح اور زندگی ہے تو شاید آپ کو جتنی ایک کاہل عورت سے محبت ہوگی اگر اس سے زیادہ نہیں تو حقیقت معلوم ہونے پر اتنی ہی نفرت بھی ہو جائیگی۔

مستعدی کی دوسری پہچان تیز گامی ہے۔ تیز قدم اور بھاری چاپ سے معلوم ہوتا ہے کہ فلاں عورت کو کام کرنے سے کچھ نہ کچھ خوشی ہوتی ہے۔ اور وہ ہر کام برضا و رغبت کرتی ہے۔ جسم کا تھوڑا سا آگے کو جھکا ہونا نظروں کا کسی مخصوص کام کی طرف جما رہنا اس بات کی دلیل ہے کہ اس میں وہ کام کرنے کی خواہش موجزن ہے۔

علی الصبح اُٹھنا بھی مستعدی کی نشانی ہے۔ اگرچہ بڑے شہروں میں علی الصبح اُٹھنا محنت اور کام کرنے کے سلسلے میں کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا لیکن اور لحاظ سے اس کی اہمیت نظرانداز بھی نہیں کی جا سکتی۔ میرا خیال ہے کہ ایسی [illegible] سے جو صبح اُٹھ کر درختوں کے نازک تنوں پر اوس کے

قطرے تک نہ پا سکے۔ آسمان کے شفق گوں کناروں پر طلوع ہوتے ہوئے سورج کو نہ دیکھ سکے۔ البتہ بستر سے اُٹھکر سیدھی ناشتہ کی میز پر آ بیٹھے، زیادہ عرصہ تک محبت قائم رہنا قطعی ناممکن ہے۔ اس لیے کہ اس حالت کو آپ شخص ایک ماہ دو ماہ یا زیادہ سے زیادہ ایک سال تک [illegible] برداشت کر سکتا ہے۔ یہ وقت بھی بعض اوقات ضرورت سے زیادہ معلوم ہوتا ہے۔ ان لوگوں میں جہاں بچوں کی بسر اوقات اور اپنے خورد و نوش کے لئے کوئی نہ کوئی کام کرنا ضروری ہے، عورت کا دیر میں اُٹھنا بربادی و تباہی کے مترادف ہے۔ آپ کبھی علی الصبح اُٹھنے والی بیوی نہیں پا سکتے۔ اگر وہ دیر میں اُٹھنے والی لڑکی تھی تو ہمیشہ [illegible] [illegible] اسکو ایک قسم کا آرام ملنے لگتا ہے [illegible] آہستہ آہستہ اسی آرام کی عادی ہو جاتی ہے۔ [illegible] کوئی بھی اس عادت سے باز نہیں رکھ سکتا۔ اگر اس معاملے میں اس پر ذرا بھی سختی کی جائے تو وہ اسکا باعث محبت کی کمی سمجھنے لگتی ہے۔ اسکا نتیجہ یا تو جھگڑا ہوتا ہے یا بربادی کے آگے ہتھیار ڈالدینا۔ مرد کی علی الصبح اُٹھنے کی تاکید نہ سختی ہے، نہ جھڑکی اور نہ محبت کی کمی بلکہ ایک تمنا ہے خوش لو رہنے اور عورت کے جنسی اقتدار میں اضافہ کرنے کی، جو ایک محبت کرنے والے دل ہی میں پیدا ہو سکتی ہے۔ اس دل میں نہیں جس میں محبت کم ہو جائے۔ اس کی سختی [illegible] عورت کو تندرست رکھنے۔ اس کی خوبصورتی کو تازہ اور پائیدار بنانے اور آپس کی محبت کو دائمی استحکام دینے کے برابر بلکہ اس سے بھی زیادہ ہے۔ اور اس شخص عورت [illegible] [illegible] سب اس لعنت سے محفوظ رہتے ہیں [illegible] اور [illegible]

وجہ سے خاندان کے خاندان برباد کر ڈالتی ہے۔

کفایت شعاری: فضول خرچی کے متضاد چیز کفایت شعاری ہے۔ لیکن اس سے یہ مطلب نہیں کہ بخل اور کنجوسی سے کام لیا جائے۔ اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ کاٹا جائے جسم پر چیتھڑے لپیٹ لئے جائیں۔ اور دنیا کی نظروں میں ذلیل و خوار بنکر زندگی گذاری جائے۔ دراصل ہر غیر ضروری خرچ اور ہر غیر ضروری چیز سے خود کو محفوظ رکھنے کا نام کفایت شعاری ہے۔ اور یہ صفت ہر انسان میں چاہے وہ امیر ہو یا غریب قابل ستائش اور نہایت اہم ہے۔ بعض لوگوں کے پاس روپیہ اور دنیا کے ہر آرام و آسائش کی چیز اتنی افراط سے ہوتی ہے کہ دیکھنے والے کے نزدیک اسکا استعمال مالک کے لئے ایک مستقل مصیبت ہو جاتا ہے۔ لیکن ان لوگوں کے لئے بھی فضول خرچ عورت ایک آسمانی بلا سے کم نہیں جو ایک نہ ایک دن یا تو دردر کی ٹھوکریں، یا بے کرایہ کے گھر کی ہوا کھلاتی ہے۔ اور پھر بھی کسی غلطی کا اعتراف اس سے ناممکن ہی سا ہوتا ہے۔ بڑے بڑے مالدار اور روپیہ والے دیکھتے دیکھتے اپنی نالائق بیویوں کی فضول خرچی کی قربانگاہ پر بھینٹ چڑھ گئے ہیں۔ اس میں بعض اوقات ذاتی فضول خرچیاں بھی بروئے کار رہتی ہیں۔ مگر زیادہ تر اس بربادی کا باعث وہی ہستی ہوتی ہے جسکا فرض ہے کہ وہ ایک نئے گھر میں قدم رکھنے کے بعد اس گھر کی عزت عظمت اور شہرت کی واحد محافظ و ضامن بنے۔

اگر فضول خرچی کی ستم ظریفیاں مالدار طبقہ ہی تک محدود نہیں تو بھی انکا نعم البدل ہو سکتا ہے اور ہوتا رہا ہے۔ لیکن

[illegible]

سے بچنے کی پھر کوئی صورت نہیں۔ اور اگر اتفاق سے کوئی بیوی ایسی ہو جبکہ شوہر روپیہ پیسہ اسی کے پاس رکھتا ہو۔ اور اُسے فضول خرچی کی چاٹ لگ جائے تو پھر تباہی اتنی ہی لازمی ہو جاتی ہے جتنی کہ پیری۔ اسلئے ضروری ہوا کہ محنت کرنیوالا بالکل اندھا ہو جائے اور اس مصیبت سے چھٹکارا پانے کے لئے کوئی تدبیر سوچے۔ اس وقت میری رائے میں عورت کے اختیار سے تمام چیزیں لے لینی چاہئیں اور صرف اسکا لباس اور مکان کے غیر اہم اور معمولی معمولی امور اسکی سپردگی میں چھوڑ دینے چاہئیں۔ اگر وہ ان چیزوں میں بھی روپیہ زیادہ صرف کرتی ہے اگر وہ اپنے معمولی معمولی امور میں بھی اپنی حیثیت سے زیادہ نمائش چاہتی ہے، اگر وہ ہر قیمتی چیز کو مفید و عمدہ چیز پر ترجیح دیتی ہے، اگر وہ اپنی خواہشات کو مطمئن کرنے کیلئے دیگر ذرائع میں مصروف ہو جاتی ہے یا تلاش بھی کر لیتی ہے، اگر وہ رئیس اور امیر لوگوں کی نقل کرنے میں سب سے پہلا قدم اُٹھانے پر تیار رہتی ہے۔ تو یقین رکھئے کہ جس وقت بھی اُسکو موقعہ ملیگا وہ آپکو ایک ایک پیسہ کی محتاج کر دے گی۔ ایسی حالت میں ایک عقلمند آدمی کا فرض ہے کہ ایسی عورت کے حسن و غمزہ کے جال سے جہاں تک ہو سکے جلد از جلد آزاد ہو جائے۔

فضول خرچی کی موٹی موٹی اور ظاہر و باہر نشانیاں ضرورت سے زیادہ زیورات ہیں جسم کو خواہ مخواہ غیر ضروری زیورات سے ڈھانپ کر اعضا کی قدرتی دلفریبی کو فنا کر دینا، کون سی عقلمندی ہے، یہ چیزیں محلات یا اُنکے متوازی مکانات

[illegible]

حسن مصنوعی زیبائش سے ملیامیٹ اور قدرتی سادگی سے انتہائی دلفریب ہوجاتا ہے۔ آپ کو جو چیز گاؤں کی ایک الھڑ کنیا میں ملے گی وہ زیورات سے لدی ہوئی کسی محل کی رانی میں نہیں مل سکتی۔ معمولی طبقہ کے لوگوں میں شوقین لڑکیوں کا وجود بدبختی کی نشانی ہے، اور ایسی لڑکیوں سے شادی کا ارادہ تباہی کا پیش خیمہ۔ اگر اتفاق سے آپ نے ایسی ہی لڑکی بیوی بنالی تو یاد رکھئے کہ نہ تو آپکو سکون مل سکیگا اور نہ ہی آپ کے پاس کوئی دولت رہے گی۔ روزانہ ایک نئی فرمایش آپ کے سامنے رکھدی جاتی گی۔ اور روزانہ آپکو اس کی تعمیل کرنی ہوگی اور پھر یہ سلسلہ اسوقت تک جاری رہیگا جب تک کہ یا تو آپ ختم ہو جائیں یا وہ نہ ختم ہو جائے۔ دلیل اور سمجھ اور ظاہری آرایش ایک دوسرے کی دشمن ہیں۔ جہاں ایک چیز ہوگی تاں دوسری نہیں ہوسکتی۔ پھر کیا آپکو کسی ایسی عورت سے جو ظاہری آرایش پر اپنی جان ہی نہیں بلکہ آپکو بھی قربان کرنے پر تیار ہو جائے اس بات کی امید ہوسکتی ہے کہ وہ آپ کی کسی دلیل پر کان دھرے گی۔ یا خود ہی کوئی مفید بات سوچ سکے گی۔ اور ایسی عورت جو محض کپڑوں کی زیبائش کو حقیر سمجھ کر زیورات کی دھن میں پڑی ہوتی ہے۔ کیا اس قابل ہے کہ اُسے روپیہ پیسہ کا مالک بنادیا جائے؟

۵۔ صفائی :۔ نہایت اہم چیز ہے۔ آپ کبھی کسی مرد میں ایک ایسی عورت کے لئے جو میلی کچیلی رہتی ہو سچی اور دائمی محبت نہیں پا سکتے۔ یہاں مرا تخاطب ان لوگوں سے نہیں ہے جو صفائی کی اہمیت ہی کو نہیں سمجھتے۔ بلکہ ان لوگوں سے ہے [illegible] ہونے کے [illegible] انتہائی [illegible] اسلئے

بہر حال ضرور ہوتے ہیں۔ عزیزی اور صفائی ایسی چیزیں نہیں جو ایک جگہ نہ ہوسکیں۔ آپ ہی انصاف سے بتلائیے کہ کیا آپ ایسی عورت کے لئے کسی سچی محبت کا جذبہ دل میں پائینگے جو خود ہی میلی کچیلی نہ رہے۔ بلکہ اپنے امور متعلقہ میں بھی صفائی سے کام نہ لے۔ مرد اپنی ذات سے بے پرواہ ہوسکتا ہے۔ یا ممکن ہے کہ اس کا پیشہ ہی ایسا ہو جس میں اسکو زیادہ دیر تک صاف ستھرا رہنے کا موقعہ نہ ملے لیکن وہ اس چیز کو اپنی بیوی میں گوارا نہیں کرسکتا۔ عورت کا فرض ہے کہ وہ اپنے شوہر کی دلچسپی و دلجوئی کے لئے اپنے حسن کو قائم رکھے۔ اور شاید آپ مان لیں کہ حسن اور میلاپن ایک جگہ اکٹھے نہیں ہوسکتے

عمدہ لباس صفائی کے لئے ضروری نہیں۔ صفائی تو کچھ چیزوں کی اور ہے۔ اور معمولی سے معمولی لباس بھی صفائی اختیار کرلینا بھی کوئی کار آمد نہیں [illegible]

اگر [illegible] بھی میلا نہیں دیکھ سکتے۔ میرا خیال ہے کہ اگر کوئی شوہر اپنی بیوی پر صفائی کے معاملہ میں زیادہ خرچ کرنے سے ناراض ہوتا ہے تو وہ شاید اس سے بھی زیادہ اس وقت ناراض ہوگا۔ جب صفائی نہیں دیکھے گا۔ اسلئے شوہر کی ناراضگی کا خیال عورت کو یہاں کبھی نہیں کرنا چاہئے۔

صفائی کی سب سے پہلی نشانی جلد کی صفائی ہے۔ ہاتھ اور منہ کا صاف رکھنا۔ چہرہ پر، کانوں پر یا کانوں کے پیچھے کن پٹیوں پر میل کا نہ پایا جانا۔ پاؤں اور پاؤں کی انگلیوں کی گھاٹیوں کا صاف ہونا، جلد کی صفائی میں داخل ہے۔

دوسری نشانی [illegible] ہے۔ مالدار طبقہ کو مر [illegible]

نظر انداز کرتا ہوں۔ اسلئے کہ جس طرح اسکا لباس فضول خرچی کا ثبوت ہوتا ہے۔ اسی طرح اس لباس کے پہننے اور رکھنے میں بھی وہ کبھی اپنے اعضاء کو تکلیف نہیں دیتا۔ بلکہ دوسرے ہی لوگ پہناتے اُتارتے اور رکھتے ہیں لیکن عام طبقہ میں یہ نہیں ہوسکتا۔ لباس کا اندازہ دو چیزوں سے کیا جاتا ہے۔ پہلا رنگ۔ اس سے ہی عورت کی ذاتی خوبی کا اظہار نہیں ہوتا بلکہ مرد کو سفید اور بے داغ کپڑا پہنا دیکھ کر خواہ مخواہ یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ اسکی بیوی ضرور کوئی باسلیقہ اور تمیز دار عورت ہے لیکن اگر وہ اپنے ہی لباس پر کوئی توجہ نہ دے تو کیا آپ کا لباس اُسکی توجہ کا مرہون کرم ہوسکتا ہے۔ دوسرا لباس کو پہننے کا طریقہ ـــ اس سے بحث نہیں کہ وہ کپڑا قیمتی ہے یا بہت ہی معمولی۔ دیکھنا صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ کاٹا کس طرح ہے، سلا کس طرح ہے اور پھر پہنا کس طرح گیا ہے۔ اور اگر اس میں کہیں بے قاعدگی ہے تو عورت کی ہر چیز میں بے قاعدگی اور بدسلیقگی ہوگی۔

پھر عورت کے جوتوں پر توجہ دیجئے ایک طرف سے اُدھڑا ہوا، دوسری طرف سے پچکا ہوا، کسی طرف کو مڑا ہوا، کہیں دبا ہوا، کہیں ڈھیلا ـــ خود ہی سوچئے جس عورت کا جوتا ایسا ہو اس کی چال کیسی معقول ہوگی؟ اور جس کی چال ایسی ہو کیا اس میں کوئی صفت، پاکیزگی یا سلیقہ ہے؟ پھر اس حالت سے کیا اُسکی صفائی اور احتیاط پر کوئی روشنی پڑتی ہے؟ آپکا ضمیر خود ہی اُسکا جواب دے گا۔ مجھے کسی تبصرہ کی ضرورت نہیں۔ عورتیں کبھی ان چھوٹی چھوٹی باتوں پر غور نہیں کرتیں اور میرا خیال ہے کہ وہ میرے ان بیانات سے ضرور آتش زیر پا ہوں گی اور مجھے اپنا دشمن تصور کریں گی۔ [illegible] حقیقت [illegible]

کر رہا ہوں۔ یہ ان خیالات کا اظہار جو عموماً مرد کے دماغ میں پیدا ہوتے ہیں۔ اسلئے مجھے امید ہے کہ وہ ان سے برافروختہ ہونے کی بجائے کوئی سبق حاصل کریں گی۔ اور اگر ان بیانات کے مطابق ان میں کوئی عیب یا کمزوری ہوگی تو وہ اُسکو جلد از جلد دور کرنے کی کوشش کریں گی۔

مرد بالعموم چھوٹی چھوٹی باتوں کے متعلق اپنی بیویوں سے زبانی کچھ نہیں کہتے، لیکن وہ ان پر سوچتے ضرور ہیں۔ یہی نہیں بلکہ اکثر اپنے ان خوش قسمت پڑوسیوں پر رشک بھی کرتے ہیں جو ان فکروں سے آزاد ہیں۔ اور بالآخر یہی معمولی معمولی باتیں بڑی بڑی اہم بن جاتی ہیں۔ صورت کا حسن واقعی قابل قدر چیز ہے، اور دو ہستیوں کے درمیان ایک بندش اور دائمی بندش کا سلسلہ بھی لیکن پیری میں یہ انسان کا ساتھ چھوڑ دیتا ہے۔ صفائی کا حسن اور اس کی دلفریبیاں شاید زندگی بھر ختم نہ ہوں۔ یہ انسان کا ساتھ کبھی نہیں چھوڑتیں۔ عطر آگیں پھول سوکھ جانے پر تکلیف کا باعث بنجاتے ہیں ـــ درحقیقت ایک میلی کچیلی عورت کا وجود دنیا میں ایک مصیبت ہے۔

۴۔ خانگی امور سے واقفیت۔ بغیر خانگی امور کی واقفیت کے ایک عورت، اور شاید ایک نواب زادی بھی، دنیا ایک بوجھ ہے۔ وہ زمانے گذر گئے اور جو ہیں وہ بھی گذر جا رہے ہیں۔ جب لڑکی کی اولین تعلیم صرف ان ہی امور کے سیکھنے پر مشتمل ہوتی تھی جنکا تعلق گھریلو زندگی سے ہوتا ہے۔ اور میں شاید اسکو یقین نہ کر سکوں۔ جو عورت ان باتوں سے کُلی واقفیت رکھتی ہو اسکے شوہر کو سماج میں کوئی عزت و عظمت حاصل نہ ہو

استاذ السلطان حضرت جلیل

غزل

پھر ترے تیر نظر آئیں گے　　زخم دل جب مرے بھر آئیں گے

داغ ابھرے تو پڑینگے چھالے　　پھول آئے تو ثمر آئیں گے

سلسلہ اشک رواں کا تا کے　　بہ کے اب لخت جگر آئیں گے

تا فلک آج گئے ہیں نالے　　لیکے دامن میں اثر آئیں گے

شمع ساں اشک مرے دامن میں　　شام سے تا بہ سحر آئیں گے

قبر پر حشر کا ساماں کرنے　　وہ لئے دیدۂ تر آئیں گے

ہوش یہ کہکے اڑے آج جلیل!
اب پلٹ کر نہ ادھر آئیں گے

نوشتہ روسی ادیب طالسطائی

مترجمہ حضرت علی احمد فرزند حضرت جلیل مدظلہ

"ریچھ کا شکار"

ہم ریچھ کے شکار کو نکلے ہوئے تھے۔ میرے دوست نے ایک ریچھ پر فیر کیا۔ لیکن وہ زخمی ہو کر بھاگ گیا۔ سفید گالے کے مانند برف پر خون کے سرخ نشانات نظر آرہے تھے مگر ریچھ روپوش تھا۔ ہم سب ایک جگہ اس تصفیہ کے لئے جمع ہوئے کہ فرار شدہ زخمی ریچھ کا تعاقب کیا جائے یا دو تین دن تک انتظار کیا جائے چنانچہ ایک کسان سے ہم نے دریافت کیا کہ کیا اسی روز ریچھ کے تعاقب میں روانہ ہونا مناسب ہوگا؟

"نہیں۔ یہ ناممکن ہے" اس بوڑھے تجربہ کار کسان نے کہا "زخمی ریچھ کو کچھ دنوں کے لئے یونہی چھوڑ دینا چاہئے چار پانچ دن کے بعد اسکو گھیر لینا آسان ہوگا۔ ورنہ وہ خوف کھا کر دوسرے مقام پر بھاگ جائیگا۔"

"لیکن" نوجوان ڈمیین نے اُس کی بات کو کاٹتے ہوئے کہا "ایسی نرم اور ہلکی برف پر ریچھ دور تک نہیں جا سکتا۔ اسلئے کہ وہ کافی موٹا ہے۔ شام ہونے سے پہلے تک ہم اسکو پا سکتے ہیں۔"

میرا دوست جو میرے ساتھ تھا ریچھ کا اسیوقت تعاقب کرنیکا مخالف تھا اور مجھے کچھ دنوں انتظار کرنے پر مجبور کر رہا تھا "مگر" میں نے کہا "ہم کو مزید بحث نہ کرنی چاہئے۔ تمہارا جی چاہے کرو میں ڈمیین کے ساتھ ریچھ کے تعاقب میں جا رہا ہوں اگر وہ ملگیا تو خیر اور نہ ملا تب بھی کوئی ہرج نہیں۔"

بہرحال یہ مسئلہ طے پا گیا اور سب گاؤں کو واپس ہو گئے صرف میں اور "ڈمیین" جنگل میں تنہا رہ گئے۔ ہم دونوں نے کچھ کھانا کھایا پھر گرم کوٹ پہنا اور بندوق لیکر نکل کھڑے ہوئے ہوا خوشگوار اور فضا دھندلی تھی۔ نرم برف سے پٹے ہوئے راستہ پر چلنا نہایت دشوار تھا۔ ہمارے جوتے چھ چھ انچ تک برف میں دھنس جاتے تھے۔ ریچھ کے فرار ہونیکا راستہ ہمیں صاف دکھائی دے رہا تھا۔ خون کے سرخ دھبے ہماری رہبری کر رہے تھے۔ علاوہ اسکے ریچھ کے قدم کے نشانات بھی واضح تھے۔ چند گنجان درختوں کے پاس جا کر ہم ٹھہر گئے۔

"اب اس راستہ کو ہمیں چھوڑ دینا چاہئے" ڈمیین نے کہا "انہیں گنجان جھاڑیوں میں وہ روپوش ہے۔ ہم کو اب چکر لگا کر جانا ہوگا۔ لیکن جلد اور خاموشی کے ساتھ۔ اگر ہم نے آواز کی یا کھانسا تو پھر وہ ہاتھ نہ آئے گا۔"

چنانچہ اُس راستہ کو چھوڑکر ہم بائیں طرف مڑ گئے اور سو گز چلنے کے بعد ہمیں پھر وہی راستہ ملا جس طرف سے ریچھ گزرا تھا اسلئے کہ اُسکے پیروں کے نشانات صاف نظر آرہے تھے۔

ایک میل تک ہم ان نشانات کے ساتھ ساتھ چلتے رہے پھر ہم نے دیکھا کہ اُسکا راستہ گاؤں کو جانیوالی سڑک کی طرف مڑ گیا

اور کچھ دور چلکر پھر جنگل کی طرف . . . پھر سڑک پر آ سکے بعد نشانات غائب ہو گئے۔

"یہ کوئی دوسرا ریچھ ہوگا۔" میں نے کہا۔ ڈیمین نشانات کو غور سے دیکھتا اور سوچتا رہا۔

"نہیں" اُس نے کہا "یہ وہی ریچھ ہے۔ بے حد چالاک ہے۔ اب نے ہمیں دھوکا دیا ہے۔ سڑک کو چھوڑ کر اُلٹے پاؤں جنگل کی طرف چلا گیا ہے" ہم نشانات کے پیچھے پیچھے گئے۔ اور ہمیں معلوم ہوا کہ حقیقت میں ایسا ہی تھا۔ ریچھ دس قدم پیچھے ہٹکر اور ایک درخت کے پیچھے سے مڑکر سیدھا جنگل کی طرف چلا گیا تھا۔ ڈیمین چلتے چلتے رک گیا اور کہنے لگا۔

"اب ہمیں اس کا پتہ آسانی سے مل جائیگا۔ ہمارے سامنے ایک دلدل ہے۔ اسکے قریب ہی وہ ہوگا۔ ہمیں دوسرا راستہ اختیار کرنا چاہیئے۔" ہم نے اپنا تعاقب جاری رکھا۔ میں اس وقت بہت تھک گیا تھا اور چلنا بہت تکلیف دہ معلوم ہو رہا تھا قدم بہت آہستہ اُٹھتے تھے جسم پسینہ سے تر بتر ہو رہا تھا چنانچہ میں نے اپنا گرم کوٹ اتار دیا۔ ہمارا یہ سفر طویل تھا۔ دو میل چلنے کے بعد ہم دلدل کی دوسری سمت پہنچے۔ ڈیمین یہاں رُک گیا اور اُس نے کہا "ریچھ یقیناً یہیں کہیں ہے"

میں نے ٹوپی اتار لی اور کپڑوں کے بٹن کھولدیئے۔ میرا سارا جسم بھیگے ہوئے چوہے کی مانند پسینے سے شرابور ہو گیا تھا ڈیمین تھک گیا تھا۔

"اچھا جناب" اُس نے کہا "ہم نے اپنا کام ختم کر دیا ہے اب ہمیں کچھ دیر آرام لینا چاہیئے" آفتاب غروب ہو رہا تھا۔

. . . .

برف پر چلنے والے جوتے جو ہم نے پہن رکھے تھے اتار ڈالے۔ اور زمین پر بیٹھ گئے۔ اپنی تھیلیوں میں سے روٹیاں نکالیں۔ پہلے میں نے کچھ برف کھائی پھر روٹی ــــــ پھر ہم دیر تک بیٹھے گفتگو کرتے رہے۔ ڈیمین نے مجھے بتایا کہ وہاں سے گاؤں آٹھ میل کے فاصلہ پر ہے۔ دو گھنٹے آرام لینے کے بعد ہم نے پھر برف پر چلنے والے جوتے پہنے اور روانہ ہو گئے۔ سارے جنگل میں بھیانک خاموشی تھی۔ صرف ہمارے جوتوں کی آواز آ رہی تھی۔ برف مسلسل گر رہی تھی۔ اب ہم گاؤں کی سڑک پر آ گئے تھے۔ اور آسانی سے چل سکتے تھے۔ کچھ رات گئے ہم اپنے مقام پر پہنچ گئے۔ میرا دوست سو رہا تھا۔ میں نے اُسے بیدار کیا۔ اور سارا واقعہ کہہ سنایا۔ پھر ہم سو گئے۔

میں اس قدر تھکا ہوا تھا کہ اگر میرا دوست مجھے نہ جگاتا تو میں دوپہر تک سوتا رہتا۔ میں نے دیکھا کہ وہ تیار ہو چکا ہے اور بندوق کو درست کر رہا ہے۔

"ڈیمین کہاں ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

"وہ بہت سویرے اُٹھ چکا ہے" میرے دوست نے کہا۔ "اور ہانکا کرنیوالوں کو لیکر جنگل کو گیا ہے۔"

میں نے منہ دھویا کپڑے بدلے اور دوست کو لیکر جنگل کی طرف روانہ ہو گیا دو میل چلنے کے بعد ہم جنگل کے قریب پہنچے ہانکا کرنیوالوں کا ایک مجمع تھا۔ میں مرد اور عورتیں تھیں آگ روشن کئے ہوئے گرد بیٹھا تھا۔ ڈیمین بھی وہاں موجود تھا۔ وہ لوگ کھڑے ہو گئے . . . . ڈیمین اُن سب کو لیکر جنگل کی طرف روانہ ہوا اور ہم لوگ اُنکے پیچھے چلنے لگے۔ برف اب

. . . .

جاتے تھے اور چلنا بہت دشوار تھا۔ نصف میل تک ہم چلے تھے کہ ٹھیکیدار یکایک رک گیا۔ اور ہم کو اپنے پاس آنیکا اشارہ کیا۔ [illegible] نے مجھے بتایا۔ مجھے کہاں کھڑا ہونا چاہئے [illegible] دائیں بائیں طرف اپنے اپنے درخت کھڑے تھے۔ [illegible] جھاڑیوں کی [illegible] جہاں ختم ہوتا تھا [illegible] طرف میرا دوست کھڑا تھا میں نے اپنی دونوں بندوقوں کو اچھی طرح دیکھ بھال لیا۔ ایک بندوق کو درخت کے سہارے کھڑا کر دیا جو مجھ سے صرف چار قدم پیچھے تھا اور [illegible] بندوق ہاتھ میں لے لی۔

[illegible] جنگل کا احاطہ کئے کھڑے تھے۔ دفعتہً میں نے ٹھیکیدار کی آواز سنی۔ وہ چلایا۔ ہانک "ہوشیار! ہوشیار!" ہانکا کرنیوالے مختلف آوازوں میں اسکا جواب دے رہے تھے۔

"او! او! او! او!" مردوں نے چلایا "ای! ای! ای!" عورتوں نے گھبرائی ہوئی آواز میں شور کیا۔ ریچھ احاطہ کے اندر تھا۔ سب ہانکا کرنے والے شور و غل کر رہے تھے۔ میں اور میرا دوست دونوں خاموش۔ بالکل خاموش کھڑے ریچھ کے اسطرف آنیکا انتظار کر رہے تھے۔ میرا دل دھڑک رہا تھا۔ اور میں نے بندوق کی گرفت کو مضبوط کر لیا تھا۔

"اب! اب!" میں نے سوچا "ریچھ آتا ہی ہوگا۔ میں فائر کرونگا اور وہ گر جائیگا"۔

یکایک میرے بائیں طرف ایسی آواز آئی جیسے کوئی چیز برگ پر گر پڑی ہو۔ پچاس قدم کے فاصلہ پر میں نے درختوں کے [illegible]

کا رخ اس کی طرف کر کے میں [illegible] قریب آنیکا انتظار کرنے لگا۔ میں نے دیکھا کہ وہ جنگلی ریچھ میرے سامنے آگیا ہے۔ میں نے فیر کیا لیکن نشانہ ٹھیک نہ بیٹھا گولی سنسناتی ہوئی گذر گئی ریچھ پلٹا اور درختوں میں غائب ہوگیا۔

"افسوس" میں نے دل میں کہا "موقعہ ہاتھ سے گیا۔ اب وہ ادھر نہ آئیگا۔ یا تو میرے دوست کے ہاتھوں سے مارا جائیگا یا ہانکا کرنیوالوں کی صفوں کو منتشر کرتا ہوا فرار ہو جائیگا"۔

میں نے پھر اپنی بندوق کو بھرا اور انتظار کرنے لگا۔ ہانکا کرنے والے سب اسی طرح چلا رہے تھے۔ یکایک ایک عورت چلائی "وہ یہاں ہے۔ وہ یہاں ہے۔ ادھر آؤ! ادھر آؤ!" اس دفعہ اس کا رخ میرے دوست کی طرف تھا۔ میں نے دیکھا کہ اس نے بندوق اٹھائی اور جھاڑیوں میں ریچھ کی طرف فیر کیا۔ میں سمجھا کہ ریچھ مر گیا لیکن میرا دوست وہیں کھڑا تھا۔ ریچھ کی طرف نہیں دوڑا۔ غالباً اسکا نشانہ بھی خطا کر گیا تھا۔ میں ابھی یہی سوچ رہا تھا کہ سامنے کی جھاڑیوں میں جنبش ہوئی۔ میں نے دیکھا کہ ریچھ میری ——— سیدھا میری طرف تیزی سے چلا آرہا ہے۔ چھ یا سات فٹ کا فاصلہ تھا۔ جب میں نے بندوق اٹھائی اور فیر کیا۔ وہ بالکل میرے قریب تھا۔ میں نے دیکھا کہ میرا نشانہ خطا کر گیا ہے۔ میں نے دوسرا فیر کیا گولی اسکے سر کو زخمی کرتی ہوئی گذر گئی۔ اب میں جلدی سے دوسری بندوق کی طرف بڑھا جس کو میں نے درخت کے سہارے کھڑا کر دیا تھا۔ مگر قبل اسکے کہ میں بندوق کو سنبھال سکوں ریچھ مجھ کو گراتا ہوا میرے اوپر سے گذر گیا۔

[illegible]

اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا۔

لیکن ابھی میں اُٹھنے بھی نہ پایا تھا کہ وہ پھر مجھ پر حملہ آور ہوا۔ میں نے محسوس کیا کہ اسکے بوجھ سے میں برف میں دھنسا جا رہا ہوں۔ میرے منہ پر کوئی چیز گرم معلوم ہوتی میں سمجھ گیا کہ اب ریچھ میرے چہرے کو چبا جائیگا۔ میری ناک اُسکے منہ میں تھی۔ اور میں اُس کی گرمی کو محسوس کر رہا تھا۔ وہ اپنے قوی پنجوں سے میرے شانوں کو نیچے کی طرف دبا رہا تھا تاکہ میں حرکت نہ کرسکوں۔ اُسکے تیز دانت میری پیشانی اور آنکھ کے نیچے کے گوشت میں پیوست ہوتے جا رہے تھے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کوئی چاقو سے میرے چہرے کو کاٹ رہا ہے۔ میں نے بہت کوشش کی کہ اُسے اپنے اوپر سے پھینک دوں لیکن وہ مجھ سے بہت زیادہ قوی تھا۔

اب میں نے خیال کیا یہ میرا آخری وقت آگیا ہے"۔

پھر دفعتاً مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میرے اوپر کا بوجھ کم ہوگیا ہے۔ میں جلدی سے اٹھ بیٹھا۔ ریچھ مجھ کو چھوڑ کر بھاگ چکا تھا۔

جب میرے دوست نے اور ڈیمین نے دیکھا کہ ریچھ مجھ پر چڑھ گیا ہے تو وہ میری طرف دوڑے۔ میرا دوست جلدی میں جھاڑیوں کی طرف سے جو بھاگا تو نرم برف میں پھنس کر گر پڑا اور ڈیمین جس کے ہاتھ میں صرف ایک لکڑی تھی چلاتا ہوا میرے پاس پہنچا۔ ریچھ مجھ کو چھوڑ کر بھاگ گیا۔

جب میں اُٹھا تو دیکھا کہ میرے اردگرد اس قدر خون ہے جتنا کہ بہت زخم کھانے سے جسم سے کم ہوتا ہے میرا چہرہ خون میں لتھڑا ہوا تھا میرے دوست اور دوسرے لوگ سب جمع ہوگئے میں نے اپنی تکلیف کا خیال نہ کرتے ہوئے پوچھا "ریچھ کہاں ہے۔ وہ کس طرف بھاگا؟"

اتنے میں آواز آئی "یہاں ہے یہاں ہے" ہم نے جو دیکھا تو وہ سیدھا ہماری طرف آرہا ہے لیکن زیادہ آگے ہم کو دیکھ کر لوٹ گیا۔ اسکے سر سے خون بہہ رہا تھا۔ ہم نے اس کا تعاقب کرنا چاہا لیکن میرے زخم اب بہت تکلیف دہ ہوگئے تھے۔ اور ہم بجائے کاؤں واپس ہونے کے ڈاکٹر کی تلاش میں روانہ ہوتے۔ ڈاکٹر نے فوراً میرے زخموں پر پٹی باندھی اور مجھے آرام ہوگیا۔

ایک ماہ کے بعد ہم پھر اسی ریچھ کے شکار کو گئے لیکن مجھے اُسکے مارنے کا موقعہ نہیں ملا۔ ڈیمین کے ہاتھ سے وہ مارا گیا اس کا نیچے کا جبڑا ٹوٹ گیا تھا اور میری بندوق کی گولی سے اسکا ایک دانت بھی گر گیا تھا۔ اُسکی کھال میں اپنے ساتھ لیتا آیا اور اب وہ میرے کمرے میں بچھی ہوئی ہے میرے چہرے کے زخم مندمل ہوچکے ہیں لیکن اُنکے نشانات اب تک باقی ہیں۔

جناب راجہ مہدی علی خانصاحب۔ رکن ادارہ "زمیندار" لاہور

استفسارات

ایک خط کے جواب میں

سُرخ کلیوں کی حیاؤں سے بنے ہیں تیرے گال؟
یاسمیں کے پھول سی پیاری ہے کیا تیری جبیں؟
دیکھ لیتا ہوں تصور ہی میں اُسکی آب و تاب!
سُرمئی آنکھیں تری کیا نرگسِ شہلا نہیں؟
یا یہ وہ روشن ستارے ہیں جواب ملتے نہیں؟

لعل لب پر کیا نہیں تیرے بہاروں کا ہجوم؟
نشۂ صہبا ہیں اُن کلیوں کی شیریں گرمیاں
تیرا پیکر منظرِ قوسِ قزح کی ہے جھلک؟
باغِ جنت میں ہزاروں یاسمیں کے پھول تھے
مرضیٔ یزداں نے جاں تیرے بدن میں ڈالدی
آگئیں گالوں پہ یوں تیرے حیا کی سُرخیاں

کتنی شرمیلی اداؤں سے بنے ہیں تیرے گال؟
صبح کے تارے کو نظروں سے گرا دیتی نہیں؟
بن گیا ہے اک کنول کا پھول یاسمیں آفتاب!
رشکِ چشمانِ سیاہِ آہوئے صحرا نہیں؟
باغِ جنت کے فلک سے کھو گئے تھے جو کہیں!

کیا لگا رہتا نہیں ان پر نظاروں کا ہجوم؟
لاجونتی سے بھی شرمیلی ہیں ان کی سُرخیاں؟
ہر ادا اک برقِ شوخ و شنگ کی چنچل چمک؟
جُھکے سیمیں پیکروں کی جانِ شیریں چھین کے؟
تیرے پیکر پر لطافت اور صباحت آگئی
چُھپ گئیں مخمور آنکھوں میں فسوں کی بجلیاں!

یوں چمک اُٹھا ترا چہرہ بدن گدرا گیا
حُسن تیرا دیکھ کر خود حُسن بھی شرما گیا

ہماری زبان کا نام

علامہ سید سلیمان ندوی
نے

یہ تقریر آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس علیگڈھ کے شعبۂ اردو میں ۵ مارچ ۱۹۴۲ء کو بوقت شب اسٹریچی ہال میں کی

حضرات! قوموں اور زبانوں کی تاریخ ایک دن میں نہیں بنتی، ان کا خمیر اُٹھتے، مزاج بنتے اور ایک صورت پکڑتے صدیاں لگتی ہیں۔

آج ہم جس ملک کو اس آسانی سے "ہندوستان" کہہ دیتے ہیں اور اس سے ہمالیہ کے دامن سے بحرِ شور کے ساحل تک علاقہ ہمارے ذہن میں آجاتا ہے، مسلمانوں کی آمد سے پہلے نہ اس کا یہ نام تھا، اور نہ یہ اس کی وسعت تھی، اور نہ مسلمانوں سے پہلے اس ملک کا کوئی ایک ایسا نام تھا جو اس پورے ملک کو بتا سکے جو پنجاب کی سرحد سے شروع ہو کر بنگال، مدراس اور بمبئی کے کناروں پر جا کر ختم ہوتا ہے بلکہ انتہا یہ ہے کہ اس پوری قوم کے لئے بھی جس نے آج اپنے کو "ہندو" کے نام سے ایک قوم بنا لیا ہے، کوئی ایک نام نہ تھا۔ کہتے ہیں کہ اس ملک کے ایرانی ہمسایوں کی زبان میں اس ملک کا نام سندھو تھا، اور قدیم ایرانی اور سنسکرت زبانوں میں "س" اور "ہ" کا باہم بدلا جاتا ہے، اس طرح سندھو ہندو ہوا۔ اس ملک کے دوسرے عربی ہمسایہ کی زبان میں دو لفظ تھے، السند و الہند، کشمیر کی [illegible] سے لے کر موجودہ سندھ کے کنارا [illegible] تک کو [illegible]

گجرات اور لار سے باقی اندرونی ملک کو وہ ہند کہتے تھے، اس ہند نے یورپ جا کر اند کی اور اند نے انڈیا کی صورت اختیار کر لی۔ ہند والوں کو عرب "ہندی" اور خراسانی "ہندو" کہتے تھے، اور عرب ہندی کی جمع "ہنود" اور خراسانی "ہندوان" بناتے تھے۔

مسلمان جب اس ملک میں آئے تو ان میں سے اہلِ عرب نے اس ملک کو ہند کہا، اور اہلِ خراسان نے ہندوستان کا نام دیا۔ لفظ ستان، جگہ یا زمین کے لئے فارسی اور سنسکرت دونوں میں بولتے ہیں، اس لئے ہندوستان ہندواستھان بھی ہو سکتا تھا۔

اس ملک میں جو بولی بولی جاتی تھی وہ بھی ایک نہ تھی۔ ہر صوبہ کی بولی الگ تھی، لیکن مسلمانوں نے یہاں کی ہر بولی کا ایک ہی نام رکھا یعنی ہندی یا ہندیہ۔

اس تفصیل سے معلوم ہوگا کہ اس سرزمین کے ایک ملک کا ایک نام ہند، یا ہندوستان، اور یہاں کی رہنے والی قوموں کا ایک نام ہندو، اور یہاں کی مختلف زبانوں کا ایک نام ہندی مسلمانوں نے رکھا، حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں [illegible]

ذہانت تھی، جس نے اس پوری سرزمین کو ایک ملک اور یہاں کے بسنے والوں کو ایک قوم، اور یہاں کی بولیوں کو ایک زبان سمجھنے کا تصور پیش کیا۔

اس ملک میں عرب، عربی، ایرانی، فارسی اور ترک ترکی بولتے ہوئے آئے مگر کچھ ہی دنوں کے بعد یہاں کے اصلی باشندوں سے گھل مل گئے اتنا کہ یہیں کی کوئی زبان بولنے لگے جس کا نام انہوں نے ہندی یا ہندوی رکھا، اس نام کی کوئی زبان اس ملک میں ان کے آنے سے پہلے نہیں بولی جاتی تھی اس زبان نے ترقی شروع کی تو گجرات میں اس کو گجری، دکھن میں دکھنی، اور اودھ میں اودھی کہنے لگے لیکن صوبہ وار ناموں کو چھوڑ کر پورے ملک کی اس ملی جلی بولی کا نام ہندوستان کی نسبت سے ہندوستانی بھی پکارا جانے لگا میں نے آج سے چند سال پہلے یہاں "ہندوستان میں ہندوستانی" کے نام سے جو مقالہ پڑھا تھا اس میں ہندوستانی نام کے بارے تاریخی حوالے پیش کئے ہیں۔

شاہجہان کے زمانہ میں جب دہلی شاہجہان آباد بنی تو شاہی تعمیر بازار کے لئے ترکی لفظ "اردو" اردوئے معلیٰ کی توصیفی ترکیب سے رواج پایا، اور صوبہ وار نئی دیسی بولیوں کے لئے اس اردوئے معلیٰ کی شستہ بولی ہر ڈھنگ اس زبان کی شستگی اور صفائی کا معیار بنا، اور اس طرح اس نئی معیاری بولی کو اضافت کے ساتھ "زبان اردوئے معلیٰ" کہنے لگے۔ اور آج سے کوئی سوا دو سو برس پہلے زبان اردوئے معلیٰ کی لمبی ترکیب کے بجائے "زبان اردو" یعنی اردو کی زبان بنی، اور پھر اس سے بھی مختصر ہو کر "اردو"

جب انگریزوں کے اقبال کا ستارہ چمکا تو فورٹ ولیم میں سیاست کے کھلاڑیوں نے علم و دانش کے پانسے پھینکے۔ دور بینی سے ملک کی دو قوموں کو جو ایک ہزار سال کی محنت اور جدوجہد کے بعد ایک قوم بنی تھی جس کا تمدن جس کی زبان اور جس کی سیاست ایک ہو رہی تھی۔ اسکو پھر دو قوموں میں بانٹ کر علیحدہ علیحدہ کئے جانے کے لئے کوششیں شروع کیں اور ہندی اور ہندوستانی یا اردو دو زبانیں بنا کر ایک کے لئے پنڈت اور دوسری کے لئے منشی اور مولوی نوکر رکھ کر دو زبانوں کے لئے سامان درست کر لیا، ابھی انیسویں صدی ختم بھی نہیں ہونے پائی تھی کہ فورٹ ولیم کے کاریگروں کے تراشے اردو اور ہندی کے دو خاکی پتلے فولادی سپاہی بنکر ملک کے طول و عرض میں مرنے کٹنے لگے۔

ہندو بھائیوں کے دلوں میں یہ خیال زور پکڑنے لگا کہ اب جب مسلمانوں کی سلطنت کے دباؤ سے وہ آزاد ہو چکے ہیں تو ہم کو اسلامی اثر کی ہر چیز سے آزاد ہونا چاہئے، اسی بنا پر انگریزوں کی تفریق کی سیاسی تحریک بہت کارآمد ثابت ہوئی، اور سب سے پہلے اس کا اثر زبان کے معاملہ میں ظاہر ہوا۔ اور ہندی کے نام سے ایک زبان کی تبلیغ شروع ہوئی۔ بعض صوبوں میں یہاں تک کیا گیا کہ اردو خط عدالتوں سے خارج کر دیا گیا، اور اب یہ تحریک یہاں تک زور پکڑ رہی ہے کہ یہ کوشش کی جا رہی ہے کہ اس صوبہ کے چند شاعروں نے جس بھاشا میں کچھ مذہبی نظمیں یعنی بھجن لکھے تھے وہی پورے دیس کی زبان بنا دی جائے۔

اور مسلمان یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے بزرگوں نے ایک ہزار سال کی محنت میں جس زبان کو پیدا کیا اور بڑھایا اور یہاں تک پہنچایا وہی ہمارے دیس کی زبان ہو، اور جو ہندو مسلمان دونوں قوموں کے میل ملاپ کی پہچان ہے۔

بہرحال اب صورت یہ ہے کہ ملک کی اس زبان کی جسکو ہم بولتے ہیں اور جسکو ہمارے بزرگ ہندی یا ہندوی کہتے تھے، ہندو بھائی زبردستی اپنی ایک خاص زبان اور رسم الخط کو ہندی کہنے لگے اور اس نام کو اس زبان کے معنی پر اتنا انہوں نے برتا کہ وہ انہی کی چیز ہو گئی اور مسلمانوں نے بھی غیرت کے مارے غیرت، بددلی اور خوشی سے یہ نام انکے لئے چھوڑ دیا اور اپنی زبان کو پہچان کے لئے ہندی یا ہندوی کے بجائے اردو کہنے لگے، اور اس طرح سارے ہندوستان کے میدان کو چھوڑ کر صرف اردوئے معلی کی چہار دیواری میں سمٹ کر رہ گئے۔

یہ حالت دیکھ کر آج سے چند سال پہلے اسی یونیورسٹی کے یونین ہال میں سب سے پہلے یہ تحریک پیش کی گئی کہ اس زبان کا "اردو" کے بجائے جو اٹھارہویں صدی کے خاتمہ کی ایجاد ہے، جب واقعی ہندوستان کی شاہی سمٹ کر اردوئے معلی کے صحن و ایوان میں محدود ہو گئی تھی، اسکو واقعی طور سے اس کے پرانے نام ہندوستانی سے یاد کیا جائے، جو اس وقت کا نام ہے، جب ہندوستان کی شہنشاہی سارے ملک ہندوستان پر پھیلی ہوئی تھی تاکہ یہ زبان پورے ملک کی ملکیت کا دعویٰ کر سکے۔

مسلمانوں [illegible] سمجھ [illegible] ہندوؤں [illegible] خوشنودی [illegible]

لئے ہے یا ہندوؤں کا یہ سمجھا کہ یہ انکو دھوکا دینے کے لئے سازش کی جا رہی ہے بدگمانی کی انتہا ہے۔

یہ تحریک خالص لسانی اصول و مبادی کی بنا پر اٹھائی گئی ہے، جسکے بہت سے سبب ہیں، میں ان میں سے ایک ایک کو بہت ہی اختصار کے ساتھ بیان کرتا ہوں۔

۱۔ اس زبان کے دو پرانے نام تاریخوں میں ملتے ہیں، زیادہ تر ہندی یا ہندوی اور اسکے بعد ہندوستانی، اب چونکہ ہندی کا نام ایک خاص زبان اور رسم الخط کے لئے بولا جانے لگا ہے۔ اس لئے دوسرے پرانے نام ہندوستانی کو اس زبان کے لئے خاص کرنا چاہیئے، جسکو اب غلطی سے عام طور سے "اردو" کہنے لگے ہیں۔

۲۔ دنیا کی ساری یا اکثر زبانوں کے نام کا قاعدہ یہ ہے کہ وہ اس قوم کی نسبت سے مشہور ہوتی ہے، جو اس کو بولتی ہے یا اس ملک کی نسبت سے موسوم ہوتی ہے جس میں وہ بولی جاتی ہے، اسی اصول کی بنا پر عرب کی زبان عربی، فارس کی زبان فارسی، ترکستان کی زبان ترکی، انگلستان کی انگلش، فرانس کی فرنچ، جرمن قوم کی جرمن، ترکی قوم کی ترکی وغیرہ کہی جاتی ہے۔ اسی اصول کے مطابق اس زبان کو جو ہندوستان کے طول و عرض میں بولی جاتی ہے، ہندوستانی کا نام دینا چاہیئے۔

۳۔ ایک شائستہ اور مہذب زبان کا خاصہ یہ ہے کہ اس کے نام لینے کے ساتھ وہ قوم یا ملک سننے والے کی سمجھ میں آ جائے جسکو اس زبان سے نسبت ہے، نہ یہ کہ زبان کا نام لینے کے بعد اسکے ساتھ ایک تاریخ [illegible] اضافہ کیا جائے جس

سے اسکے تجسم مجموعہ کی کہانی معلوم ہو، لفظ "اردو" سے اس قسم کی کوئی مدد ذہن انسانی کو نہیں ملتی اس لئے اس کی جگہ اس کے اصلی نام ہندوستانی کو رواج دینا چاہئے۔

۴۔ ہم کو اپنی بولی کا ایک ایسا نام رکھنا چاہئے جس کے سننے کے ساتھ یہ معلوم ہو جائے کہ یہ اس پورے ملک کی بولی ہے لفظ اردو کے ساتھ اس قسم کا کوئی تصور ذہن میں نہیں آتا برخلاف اسکے پورے ملک کی بولی ہونے کا یقین منطق کی آمیزش کے بغیر، صرف نفسیاتی اثر سے ہمارے اندر، اور ہر سننے والے کے دل کے اندر پیدا ہو جاتا ہے۔

۵۔ اس زبان کو ایک غیر متعلق بدیسی لفظ سے موسوم کرنے سے ہر اجنبی کے ذہن میں یہ خیال آتا ہے کہ جیسا بدیسی نام ہے ویسی زبان بھی ہوگی، اور ہم کو اس کی اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے ایک ہی تقریر کی ہمیشہ ضرورت ہوتی ہے۔ یہ نقص ہندوستانی نام قبول کرنے سے فوراً دور ہو جاتا ہے۔

۶۔ ہم کو اپنی زبان کے لئے ایک ایسا نام چاہئے جس سے ملک کے ہر صوبہ کو برابر کی نسبت ہو تا کہ ہر صوبہ اس کو اپنے وطن کی بولی سمجھنے اور قرار دینے کا برابر کا دعویٰ کر سکے، لفظ اردو میں یہ بات ہندوستانی کو حاصل ہے جس کی بنا پر صرف لکھنؤ اور دہلی ہی نہیں بلکہ بمبئی، مدراس، لاہور، کلکتہ، پٹنہ، پشاور سب کو اس کی ملکیت کا حق پہنچتا ہے، اور سب کو اس سے یکساں ملکی اور وطنی محبت معلوم ہوتی ہے، اور کسی صوبہ میں وہ اجنبی اور بیگانہ نہیں قرار دی جا سکتی ہے

۷۔ لفظ اردو میں ایک فوجی تسلط اور شخصی شہنشاہی کی
[illegible]

کا جذبہ نمایاں نہیں ہوتا، اگر ہم اپنے پیارے ملک کی نسبت سے اس زبان کو پکاریں، تو اس نام سے ہر ہندوستانی کے دل میں وطنی محبت کا جذبہ اُبھریگا۔

۸۔ اس ملک کا نام ہندوستان مسلمانوں کے آنے کے بعد پڑا، اسی طرح یہ بولی بھی مسلمانوں کے اس ملک میں آنے اور اس ملک کے لوگوں سے میل جول پیدا ہونے کے بعد نکلی، اس لئے اس بولی کا نام ہندوستانی رکھنا مناسب ہے تاکہ تاریخی مناسبت کے ساتھ ہندو مسلمانوں کے برابر کے میل جول کی کہانی بھی ہم کو ہمیشہ یاد رہے۔

۹۔ لفظ اردو سے یہ دھوکا ہوتا ہے کہ مسلمان ترکستان و خراسان سے کوئی بولی لیکر یہاں آئے تھے، جسکو وہ ترکی میں اردو کہتے ہیں، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ باہر سے آنے والے مسلمانوں کی زبانیں اور تھیں، اور وہ یہ بولی ہے، جسکو انہوں نے ہندوستان میں آکر اختیار کر لیا، یہ واقعہ اس بولی کو ہندوستانی کے اصلی اور صحیح نام سے پکارنے سے ساری دنیا کے سامنے روشن ہو جاتا ہے، اور اس کے بدیسی پن کا بے وجہ شبہ دور ہو جاتا ہے۔

۱۰۔ اس زبان کو اردو کہنے کا نتیجہ یہ ہے کہ ناواقف گروہ نے اس کی صرف و نحو کو عربی فارسی کی صرف و نحو سے جانچکر اس کے اصول بنانے لگے، اور انہوں نے اس غلط طریق و روش کی بنا پر بہت سی غلطیاں کیں، اور اسکے جوڑوں کو عربی و فارسی قاعدوں سے جوڑنے لگے، گو اب ہماری زبان کے نئے نحویوں نے اس غلطی کو جڑ سے دور کرنے کی کوشش کی، مگر ابھی تک بات حلق سے نیچے نہیں اتری ہے اب اسکو عام طور سے ہندوستانی کہکر
[illegible]

ایران وخراسان وترکستان کی طرف سے مڑکر ہندوستان کے صحیح قبلہ کی طرف ہو جائیگا۔ اور اس سے زبان کی اصولی و معنوی تحقیقات کی بہت سی راہیں کھلیں گی۔

۱۱۔ اگر ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ یہ پورے ملک کی مشترک زبان ہے تو اس دعوے کی اس سے زیادہ مضبوط دلیل کوئی نہیں۔ کہ اس کا نام ہندوستانی ہے اس کے اس پرانے نام کو رفتہ رفتہ بھلا دینے سے غلط طور کی ہمدردی کر کے ہم نادانستہ اپنے دعوے کی بنیاد کھوکھلی کر رہے ہیں۔

۱۲۔ چونکہ شروع شروع میں جو پرتگالی یا اسپینی یا اور انگریز یہاں آئے۔ بلکہ خود انگریزوں نے بھی اس زبان کو صحیح طور سے ہندوستانی کہا تو ہم سے اکثروں کو یہ دھوکا ہوا کہ یہ نام انگریزوں کا بخشا ہوا ہے، حالانکہ اس زبان کا یہ نام ہم اپنے ہندوستانی کے مقالہ میں بتا چکے ہیں کہ بادشاہ نامہ اور تاریخ فرشتہ میں موجود ہیں، فرشتہ میں عادل شاہ ثانی والی بیجاپور کے متعلق ہے کہ "وہ ہندوستانی متکلم نمی شد"۔ شاہجہان کی درباری تاریخ بادشاہ نامہ میں ہے "بزبان ہندوستانی" تلاش سے اور بھی مثالیں مل سکتی ہیں، اس لئے یہ شبہ دور ہو جانا چاہئے کہ اس زبان کا یہ نام فرنگیوں نے دیا ہے بلکہ یقین کرنا چاہئے کہ ہندی کے بعد ہماری زبان کا یہ وہ نام ہے جو ہمارے بزرگوں نے رکھا تھا۔ اور ہم کو اسی نام کو باقی رکھنا چاہئے۔

۱۳۔ اہل نظر سے چھپا نہیں کہ اس زبان کی صحیح تاریخ کے سمجھنے میں میر امن دہلوی سے لیکر سرسید، بابا آزاد مرحوم تک جو غلط فہمی ہوئی ہے [illegible]

"جب اکبر بادشاہ تخت پر بیٹھے تب چاروں طرف کے ملکوں سے سب قوم قدردانی اور فیض رسانی اس خاندان لاثانی کی سنکر حضور میں جمع ہوئے لیکن ہر ایک کی گویائی اور بولی جدی جدی تھی، اکٹھے ہونے سے آپس میں لین دین سودا سلف سوال جواب کرتے ایک زبان مقرر ہوئی"۔

"جب حضرت شاہجہاں صاحب قِران نے ... شہر دہلی کو اپنا دارالخلافت بنایا ... اور وہاں کے بازار کو اردوئے معلیٰ خطاب دیا۔"

سرسید نے یہی حکایت شاہجہان کے عہد کی نسبت لکھی ہے، اور لکھا ہے کہ چونکہ یہ زبان خاص بادشاہی بازاروں میں مروج تھی اس واسطے اسکو زبان اردو کہا کرتے تھے، اس غلطی کا سبب صرف لفظ اردو ہے، اسلئے اس نام کو باقی رکھنا اس غلط تاریخ کا باقی رکھنا ہے [illegible] کی اصلی تاریخ کو جواب پیدا ہوئے کو پہنچ چکی ہے برباد کرنا ہے۔

۱۴۔ بعض دوست کہتے ہیں کہ چونکہ نہرو رپورٹ اور پنڈت جواہر لال نہرو آپ کہتے ہیں ہندوستانی زبان کی اکثریت کو تسلیم کیا ہے اور اپریل سنہ ء میں جامعہ ملیہ کے اجلاس ناگپور میں ہندی یعنی ہندوستانی کی تجویز منظور ہوئی، اور ان سب کی مراد ہندی سے ہے، اسلئے ہندی اور ہندوستانی ہم معنی لفظ ہو گئے ہیں، اسلئے ہم کو اس لفظ سے پرہیز کرنا چاہئے۔

میری عرض یہ ہے کہ یہ تو مسلمانوں کی بے احساسی ہے ایسا ہوا، شاہ عبدالقادر صاحب کے زمانہ تک اردو کا نام ہندی مشہور تھا، اور سرسید نے آثار الصنادید کے طبع اول میں اردو کو [illegible]

تھے۔ ہندی والوں نے اس پر ایسا قبضہ کیا کہ آپکو اس نام سے ہاتھ دھونا اٹھانا پڑا۔ اب ایک لفظ "ہندوستانی" رہ گیا تھا۔ جو خاص طور پر اردو کے معنی میں ہمیشہ استعمال ہوا ہے۔ اگر آپ اسکو بھی چھوڑ دینگے تو دوسروں کے قبضہ میں آ جانے سے وہ ہرگز نہیں بچ سکتا۔ یہی وقت ہے کہ آپ اس معاملے کی سنجیدگی کو سمجھیں اور اپنے قبضہ سے خود ہاتھ اٹھا لینے کا نام نہ لیں۔ لیکن ہم اپنے بدگمان دوستوں کو یاد دلانا چاہتے ہیں کہ یہ لفظ ہندوستانی مسلمانوں کے ابتداء سے اور مسلمانوں ہی کی طرف سے استعمال ہوتا رہا ہے اور اس سے مراد ہماری ہی زبان ہے جو ہماری عام بول چال میں ہے۔ ہم کو جو کچھ شکایت ہے وہ یہ ہے کہ ہندی اور ہندوستانی کو ہم معنی اور مرادف کیوں ٹھہرایا گیا ہے۔ افسوس ہے کہ اپنے مسئلہ کو جو سراسر ادبی اور لسانی ہے غلط طور سے سیاسی بنا دیا جاتا ہے حالانکہ بات سے خالی ہو کر واقعات اور دلائل پر غور کرنا چاہئے اور وہ قدم اٹھانا چاہئے جو ہماری زبان کی حفاظت اور ترقی کا باعث ہو۔

یہ تجویز کسی تحریک و تائید اور رائے شماری کی غرض سے نہیں پیش کی جا رہی ہے اور نہ اس طرح سے ادبی و لسانی مسئلوں کا فیصلہ ہوتا ہے۔ بلکہ ہم کچھ یہ ہماری سامنے ہے وہ یہ کہ زبان کی بھلائی اور ترقی کا خیال ہے۔ اس قسم کی تحریکیں پیدا ہوتی ہیں۔ پھر آہستہ آہستہ بڑھتی جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ دورانئے عامہ کو متاثر کر لیتی ہیں۔ اردو کا نام اردو کسی ایک شخص یا کانفرنس نے رکھا۔ یہ تو پہلے کسی کی زبان پر آیا۔ پھر بڑھتا اور پھیلتا گیا یہاں تک کہ سب پر چھا گیا۔ غور کیجئے کہ ابھی چند سال ہوئے کہ اس خیال کہ اردو کا موزوں نام ہندوستانی ہے آپ کے درمیان پیش کیا گیا۔ اور کبھی کبھی مضمونوں میں ادھر اشارے کئے گئے اتنے پر یہ نام مدراس وغیرہ کے رسالوں میں چھپنے لگا۔ اور کہیں کہیں اسکا چرچا ہونے لگا۔ یہاں تک کہ آج اس کھلے اجلاس میں اس بحث تک نوبت پہنچ گئی۔ غرض ضرورت مباحثہ اور مناظرہ کی نہیں ہے بلکہ اس کی ضرورت ہے کہ جو صاحب اس تجویز سے اتفاق رکھتے ہیں وہ اپنی زبان اور قلم سے اسکا استعمال شروع کر دیں اس سلسلہ میں ہماری مدد سب سے زیادہ اخباروں اور رسالوں کے ایڈیٹر کر سکتے ہیں۔ امید ہے کہ وہ ادھر توجہ فرما کر اپنی زبان کے قدیم نام کو زندہ کر کے پچھلے سو برس کی غلطی کو دور کریں گے اور ثابت کرینگے کہ ہندوستان کی عام زبان کا نام "ہندوستانی" ہی ہونا زیادہ موزوں ہے اور یہ وہی زبان ہے جو عام طور سے ہم ہندوستانیوں کے بول چال میں ہے۔

یہ بھی صحیح نہیں ہے کہ اردو کا علمی نام ہندوستانی رکھنے کی تحریک آج کل کی زبانی کشمکش کا نتیجہ ہے بلکہ عجیب اتفاق یہ ہے کہ اسی ناگپور میں جس میں ساہتیہ پرشد نے اپنا مشہور فیصلہ سنایا۔ آج سے چھبیس[۲۶] برس پہلے ۱۹۱۲ء کی مسلم لیگ کے اجلاس میں مرزا سمیع اللہ بیگ مرحوم نے جینیئن یہ تحریک پیش کی تھی اور اسکے بعد ساہتیہ پرشد کے اجلاس سابق سے چند سال پیشتر اسی یونیورسٹی کے یونین میں یہ تجویز دوبارہ پیش کی گئی تھی۔

یہ سمجھنا بھی درست نہیں کہ اس تجویز کے پیش کرنے والوں کا یہ مقصد ہے کہ ہم اپنی زبان میں کوئی ایسی تبدیلی کریں جس سے وہ ہندی یا ہندی سے قریب ہو جائے۔ ناشاد کا اس قسم کی کوئی بات نہیں ہے بلکہ مقصد یہ ہے کہ اس اردو ہی زبان

ی بول چال کو جو ہم بولتے ہیں، ہم ہندوستانی کہتے ہیں۔

ہم کو اس سے بھی اختلاف نہیں کہ اس زبان کا گھریلو نام اردو باقی رہے۔ لیکن عمومی طور پر اسکے پرانے نام ہندوستانی ہی کو رواج دیا جائے۔ ہمارے بزرگوں نے اس زبان کو دو موقعوں پر تقسیم کر رکھا تھا۔ ایک کا نام ریختہ جو غزل کی زبان تھی اور دوسرے کا نام ہندی بنایا تھا جو عام بول چال کی زبان تھی۔ ہندی کا نام چھین گیا۔ اب جو کچھ ہم چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ آپ اس کے پرانے نام ہندی کی جگہ اُسکے دوسرے پرانے نام ہندوستانی کو رواج دیجئے۔ خواہ اپنی غزلوں کا نام ریختہ کی جگہ اردو ہی رکھنے میں کچھ ہرج نہیں۔ مگر اپنی علمی، تعلیمی، وطنی اور سیاسی تحریکات میں عام طور سے اسکو ہندوستانی کے صحیح نام سے یاد کر کے ثابت کیجئے کہ یہ پورے ملک ہندوستان کی زبان ہے اور اسکا یہی نام اُسکے پورے ملک کی زبان ہونے کی دلیل ہے۔

ہم اس فریب میں مبتلا نہیں ہیں کہ اس صحیح نام ہندوستانی کے رواج دیدینے سے ہماری زبان کی ساری مشکلیں ختم ہو جائینگی گویا یہ نام کوئی جادو کی چھڑی ہے۔ جسکے گھماتے ہی ساری باتیں درست ہو جائیں گی۔ بلکہ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ آج جب ہم اپنی زبان کی اصلی پوزیشن کو دنیا پر واضح کرنے اور اُسکے ہمہ گیر تخیل کو ثابت کرنے اور اس کو سارے ملک کی زبان منانے کا تہیہ کر رہے ہیں۔ تو ضرورت ہے کہ ہم سب سے پہلے لوگوں کو اس کے اس نام سے روشناس کرائیں جس سے اس کی اصلی حیثیت واضح ہوتی ہے اور پورے ملک کی اسکے ذریعہ نمائندگی ہوتی ہے اور یہ ثابت ہوتا کہ یہ واقعی اس پورے ملک کی زبان ہے اور جو اس پورے ملک کی زبان بننے کی مدعی ہو اسکا یہی نام ہونا چاہئے۔

ہم کو امید ہے کہ اس زبان کے بہی خواہ اس تحریک کی تائید کرینگے اور بحث و مناظرہ کے بجائے جو افسوس ہے کہ ہر مفید تحریک میں ہماری عادت ہو گئی ہے، عملاً اسکے رواج دینے کی کوشش کرینگے تاکہ [illegible] وہ عوام میں پھیل جائے۔

ابھی مولوی عبدالحق صاحب نے [illegible] جو صدارتی خطبہ پڑھا ہے اس میں انگریزی کے جتنے پرانے اقتباسات انہوں نے پیش کئے ہیں، آپ نے خیال کیا ہوگا کہ ان میں ہر جگہ اس زبان کا نام یورپ کے سیاحوں تاجروں، کمپنی کے حاکموں اور لکھے پڑھے ہندوستانیوں کی زبان پر ہندوستانی ہی آیا ہے۔ اس سے معلوم ہوگا کہ اس کا اصلی نام پہلے ہی مشہور و معروف تھا، جو اب عام طور سے متروک ہو رہا ہے۔ ہمارا مقصد اسی غلطی کی اصلاح اور اسی مردہ نام کو دوبارہ جلانا ہے۔

ضروری گذارش ہم بارہا لکھ چکے ہیں کہ جو خریدار اصحاب جواب طلب امور کے لئے خط و کتابت کرتے ہیں انہیں خریداری نمبر کا حوالہ دینا نہایت ضروری ہے۔ مگر پھر بھی متعدد خطوط ایسے موصول ہوتے ہیں جن پر خریداری نمبر بالکل نہیں ہوتا۔ آیندہ ایسے کسی خط کا جواب نہیں دیا جائیگا۔ مطلع فرمانا غرض ہے۔ (مینیجر)

حضرت عدمؔ

بہار کے دن

ہجوم رنگ و ضیا ہے بہار کے دن ہیں — نکھر رہی ہیں بہاریں نکھار کے دن ہیں
یہ دیکھتے نہیں رنگوں کا اجتماعِ عظیم — یہ مجھ سے پوچھنے کیا ہو "بہار کے دن ہیں"؟
یہ مسکراتی ہوئی نطق کوش سی آنکھیں — بتا نہیں رہیں تم کو، بہار کے دن ہیں؟
یہ لہلہاتے ہوئے وجد آفریں چہرے — دکھا نہیں رہے تم کو، بہار کے دن ہیں؟
یہ رقص کرتی ہوئی مست و عنبریں زلفیں — سنا نہیں رہیں تم کو، بہار کے دن ہیں؟
لطیف و ہوشربا آنچلوں میں اڑتے ہیں — شبابِ ملتہب و شعلہ بار کے دن ہیں
مچل رہی ہیں امنگیں، امڈ رہا ہے جنوں — بہار و گرمیِ ہوشِ بہار کے دن ہیں
ہر اک شعور میں ہے امتزاجِ کیف و سرور — ہر اک دماغ پہ طاری بہار کے دن ہیں
نشاط کوشیِ صد رنگ کا زمانہ ہے — شراب نوشیِ دیوانہ وار کے دن ہیں
اٹھو! کہ عشرتِ بے انتہا کا موسم ہے — چلو! کہ سرخوشیِ بے شمار کے دن ہیں
نشاط و کیف و مسرت کی جانفزا رت ہے — خرام و مستی و عیش و بہار کے دن ہیں
عجیب خوبیِ تقدیر کا زمانہ ہے — عجب موافقتِ روزگار کے دن ہیں
بھگو کے پھولوں کو میں اڑا دوں جانبِ چرخ — کہ آسماں کو خبر ہو بہار کے دن ہیں

خوشا نصیب کہ گستاخیوں کا موسم ہے
میں آ رہا ہوں ترے گھر کہ پیار کے دن ہیں

جناب قیسی رامپوری

(افسانہ)

ریاض کی رشی

"تم دلی سے ہو جس سے کل کلکتہ روانہ ہو جاؤ۔ تمہارے سسرال والے تم کو دیکھنا چاہتے ہیں" اپنے والد سے ان الفاظ سے ریاض مسرت و پریشانی کی درمیانی حالت میں کھڑا رہ گیا۔ کہاں مظفر پور کی مختصر سی بستی اور کہاں کلکتہ جیسا عظیم الشان شہر۔ ریاض نے آج تک دہلی کی شکل بھی نہیں دیکھی تھی۔ ہمیشہ سے قصبہ ہی میں رہا اور دیہاتی آب و ہوا ہی پاروہ شہر کی تمام چیزوں سے مطلق ناآشنا تھا۔ آج تک کبھی سفر کرنے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔ تہذیب یافتہ بستیوں میں اسکا کبھی گذر بھی نہیں ہوا تھا۔ اور فیشن ایبل سوسائٹیوں کی اسکو ہوا بھی نہ لگی تھی۔ بیچارہ سیدھا سادہ سا نوجوان تھا۔ کلکتہ کے سفر کے خیال سے اسکے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ وہ کتنا بڑا شہر ہوگا۔ وہاں کے لوگ کیسے تیز ہونگے۔ سسرال والے اس کی سادہ وضعداری اور دیہاتی پن دیکھ کر اسکا کس قدر مذاق اڑائیں گے۔ کاش اس نے اپنی عمر کا کچھ حصہ بڑے شہروں کی سیر و سیاحت میں صرف کیا ہوتا۔ کیا اچھا ہوتا کہ اسکا کوئی دوست موجودہ شہری سوسائٹیوں کے اصول سے باخبر ہوتا۔ جو اس وقت اس کی مدد کر سکتا!

ہیں تو تقدیر پر ... اپنے بہترین کپڑے اور اعلیٰ [illegible] ساز و سامان سے مزین ہو کر کلکتہ روانہ ہوگیا۔ [illegible]

... سے اونچی کی [illegible] لمبا تھا۔ ولایتی [illegible] چہرہ [illegible] کے باوجود [illegible] ترتیب [illegible] سکتا تھا [illegible] شہروں [illegible] کی انگشت [illegible] بھی [illegible] کا شوق [illegible] جو اسے [illegible] خیال تھا [illegible]

[illegible] والدین [illegible] سسرال [illegible] دیر ہو آرہی تھی۔ اپنے ابا کو [illegible] کلاس کا [illegible] حصول کرنے میں [illegible] کامیاب ہو گیا تھا۔ غرض اپنی دانست میں [illegible] بیٹھ گیا تھا۔

دہلی تک اسکے ڈبہ میں کوئی نہ آیا۔ دہلی سے ایک [illegible] کی گاڑی [illegible] بیٹھا۔ [illegible] اسباب [illegible] سگریٹ [illegible] دھواں اڑانے لگا۔ [illegible] ریاض اسکو

انگریز ہی [illegible] کیونکہ اس کا رنگ بہت گورا تھا۔ [illegible] دیر تکلف تھی۔ [illegible] ناک کوٹ پتلون [illegible] سوٹ [illegible] [illegible] سے نہیں دیکھی۔

ریاض [illegible] حیرت سے [illegible]

[illegible]

[illegible] نوجوان نے ریاض سے دریافت کیا۔ [illegible] ہوئے انسان کے منہ سے [illegible] سے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا تھا۔ نوجوان نے جب اپنا سوال دہرایا۔ تو اسکو ہوش آیا [illegible] "میں [illegible] رہا ہوں"

[illegible] اتفاق سے میں بھی [illegible] کا عادی ہوں"

"واللہ بڑی خوشی کی بات ہے۔ کیا میں آپ کا نام دریافت کرسکتا ہوں" ریاض نے دریافت کیا۔

"نام معلوم کرنے سے آپکا [illegible] ہو گا کہ آپکو میرا مذہب و قومیت بھی معلوم ہو جائے گی [illegible]

نوجوان نے [illegible] کہا۔

"نہیں ---- جی نہیں میں نے تو نام ویسے ہی پوچھا تھا"

"میرا نام ریاض ہے۔ ریاض احمد۔ میرے خیال میں اب یہ بتانے کی [illegible] ضرورت نہیں رہی کہ میں ہندو ہوں یا مسلمان یا عیسائی" نوجوان نے [illegible] کہا۔

"ہاں [illegible] ضرورت [illegible] معلوم کرنے کی ہے کہ آپ کیا [illegible] کرتے ہیں" ریاض نے دریافت کیا۔

"ابھی [illegible] یہ سوال آپکا قبل از وقت ہے — لیکن اگر آپ [illegible] دیتا ہوں میں دنیا میں وہ کام کرتا ہوں جس کو آپ جیسے معزز لوگ زیادہ تر چوری سے نامزد کرتے ہیں"

"جی کیا فرمایا؟ میں سمجھا نہیں" غریب ریاض نے اس معزز نوجوان کے منہ سے چوری کا نام سنکر گھبرا کر دریافت کیا۔

"چوری" نوجوان نے مختصر جواب دیا۔

"اچھا؟ وہ کس طرح؟" ریاض نے سادگی سے دریافت کیا۔

"اس طرح" یہ کہہ کر اس نے ریاض کے گلے پر ہاتھ رکھ [illegible] "یوں تو میں لوگوں کے گلے دباتا ہوں اور چلتی ہوئی ریل سے کود کر فرار ہو جاتا ہوں"

"ارے مرا" ریاض نے نوجوان کی [illegible] سے [illegible] کر کہا [illegible] دور جا بیٹھا۔

"تم بہت بیوقوف انسان معلوم ہوتے ہو۔ کہاں تک

ہنے والے ہو؟" نیاز نے ریاض کی سادہ اطواری سے متاثر ہو کر دریافت کیا۔

"مظفرپور کا رہنے والا ہوں۔ میں نے آج تک کوئی شہر نہیں دیکھا نہ تم جیسے لوگوں سے کبھی ملنے کا اتفاق ہوا۔ کیا میں تم کو شکل سے چور معلوم ہوتا ہوں؟" نیاز نے ہنس کر پوچھا۔

"نہیں۔ نہایت بھلے آدمی نظر آتے ہو۔ کیا تم واقعی چلتے ہو؟" ریاض نے پوچھا۔

"میرے عزیز دوست! تم کلکتہ جیسی بہت بڑی بستی میں ایسا کم سمجھ دماغ اور اس قدر دیہاتی اطوار لیکر جاتے ہو؟ وہاں کے لوگ تو تم کو الو بنا کر رکھ دیں گے۔"

"تو میں کیا کروں؟" غریب ریاض نے کھسیانے ہو کر دریافت کیا۔

نیاز جس قدر اسکو موجودہ آداب و اطوار سے آگاہ کر سکا کرتا رہا۔ ریاض ہر بات کو دلچسپی سے سنتا رہا۔ جس قدر وہ عصر حاضرہ کے آداب سے آگاہ ہوتا جاتا تھا۔ اس کی الجھن میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ سادہ زندگی بھی کس قدر نعمت ہے؟

ریاض نے اپنے کلکتہ جانے کا مقصد بھی نیاز کو بتادیا تھا۔ وہ اس امر میں بھی اس کی استعانت کا متوقع تھا۔ غرض شام کو دونوں کلکتہ پہنچ گئے اور ایک نہایت شاندار ہوٹل میں مقیم ہو گئے۔ ریاض کی خواہش تھی۔ کہ سفر کی تکان سے آسودہ ہو کر وہ صبح اپنے سسرال جائے۔ نیاز نے ہوٹل پہنچتے ہی ایک ہنگامہ بپا کر دیا۔ ملازم اسکے اشارے پر دوڑتے پھرتے تھے۔ منہ سے اسکے حکم کی تعمیل ہوتی [illegible] لذیذ [illegible] جاتا تھا۔ ریاض ان تمام باتوں کو نہایت حیرت سے دیکھ رہا تھا وہ موجودہ آداب و تہذیب سے کس قدر ناواقف تھا! اسکا تجربہ کس قدر وسیع تھا!

شام کو کھانے پر بڑا اہتمام کیا گیا۔ نیاز نے عمدہ عمدہ غذائیں تیار کرائیں۔ مرغ مسالم خاص طور پر تیار کیا گیا تھا۔ غریب ریاض نے پیٹ بھر کر کبھی ایسی چیز نہ کھائی تھی وہ انتہا سے انتہا و فرط حرص میں دو مرغ ڈکار گیا۔

کھانے سے فارغ ہو کر دونوں اپنے اپنے کمرے میں سونے کو چلے گئے۔ ریاض بستر پر لیٹا ہی تھا کہ مرغ نے اسکے پیٹ میں اذان دینی شروع کر دی۔ اسکو نفخ ہو گیا اور تھوڑی دیر میں وہ بلا کا درد پیٹ میں محسوس کرنے لگا۔ وہ اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ لیکن درد آہستہ آہستہ بڑھتا ہی گیا اور آدھ گھنٹہ میں تو ناقابل برداشت ہو گیا۔ وہ نہ [illegible] بے چینی سے مرغ بسمل کی طرح بستر پر تڑپنے لگا۔ بڑی مشکل سے ڈاکٹر طلب کیا گیا۔ لیکن اس کی حالت خراب ہی ہوتی گئی رات کے گیارہ بجے ہونگے کہ کسی نے آکر نیاز کے کمرہ کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ وہ سو رہا تھا۔ ہڑبڑا کے اٹھا اور باہر نکلا۔ دیکھا کہ ایک [illegible] آدمی پریشانی کی حالت میں باہر کھڑا ہے۔

"کیا ریاض نامی نوجوان کے آپ کوئی رشتہ دار ہیں؟"

"کیوں خیرت ہے؟" نیاز نے حیرت سے دریافت کیا۔

"میں ڈاکٹر ہوں۔ اس کی حالت بہت نازک ہے۔ مشکل وہ صبح تک جی سکے گا۔"

"افسوس [illegible]" نیاز نے منہ [illegible] زیادہ [illegible]۔

اسکے پاس رہ سکتا ہوں۔ لوکنا لی جو ست سے وہ بیاض تک کرنے کے بعد رخصت ہو۔ سوچتی تھی۔ سید تعید کرتا ہے۔ امدنت غنی کی اس حالت میں نے ہمیشہ اسکا ہو رہا۔ کیا ہوش آنے میں ستے مرد وادا میں نیاز سے کہا گیا۔ مرد عالمت بہت خراب ہو گیا تھا۔ احمد میاں نے آنے والے حصے، ستہ خان یہ بچہ میری عدالت کی اطلاع کرنے کی زحمت کرتے ہو۔ اسکے بعد آتے اسکو کے مکان اور محلہ کا پتہ بتا دیا۔ نیاز نے اسکو مستعدی کے ساتھ اس خدمت کو انجام دینے کا یقین دلایا اور اسکے مرنے کے بعد یا آپ بچے ہوتے غریب الوطن ریاض ان جہاں سے کوچ کر گیا۔

نیاز صاحب نے دیکھا۔ نوجوان بھی اس غیر متوقع افتاد سے پہلے تو گھبرا گیا۔ لیکن جلد اپنے حواس پر قابو پاکر اس نے منیجر ہوٹل کو ہدایات کر دیں کہ تجہیز و تکفین کا تمام انتظام کر دیا جائے لیکن میت کو رات کے سات بجے جب وہ متوفی کے چند اعزا و اقربا کو ساتھ لے آئے دفن کیا جائے۔

صبح اس نے غسل بھی نہیں کیا، اپنے سفری کپڑے پہنے اور احمد میاں کی طرف روانہ ہو گیا۔ گھنٹہ آدھ گھنٹہ کی مسافت کے بعد گاڑی ایک عالیشان مکان کے سامنے جاکر رکی۔ نیاز اتر پڑا۔ دروازہ پر پہنچکر گھنٹی بجائی۔ ملازم دروازہ کھلا۔ اور ایک خوبصورت ملازمہ نمودار ہوئی۔ "احمد میاں کا مکان یہی ہے ---؟"

"جی سرکار یہی ہے۔ ہاں یہ ہے میاں جی ہیں" اس نے منکسر نیاز کا فقرہ کاٹتے ہوئے کہا۔ اور بے اختیار اندر بھاگ گئی۔ سرکار وہ آگئے۔ وہ لمبا سالار آگئے" ادھر ملازمہ نے

کی اٹھتی ہوئی آواز میں یہ الفاظ تھے۔

"رضیہ ذرا ادھر تو آ ---- نیچے سنتا لو رہی تھی"

تو سنتے رو رہی تھی۔ کی خوشی میں دیوانی ہو رہی تھی۔ تھوڑی دیر میں ایک معزز سفید ریش معمول سا آدمی باہر آیا۔ اسکے چہرے سے مسرت نمایاں تھی۔ آتے ہی اس نے غریب نیاز کو اپنی لوند سے لگاکر بھینچ لیا۔ اور اسکی پیشانی چوم کر بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ واللہ تصویر سے کس قدر اختلاف ہے۔ کس قدر وجیہ نوجوان ہو تم میرے فرزند! چلو اندر۔ تمہاری ماں اور تمام عزیز و اقارب تمہارے انتظار میں مرے جا رہے ہیں۔ یہ کہکر احمد میاں نے غریب نیاز کا ہاتھ پکڑ کر اندر گھسیٹ لیا۔

"مگر سنئے تو سہی قبلہ! میں وہ ----"

"اچھا گاڑی والے کو کرایہ دیکر آؤ۔ اسکو ایک اٹھنی انعام بھی دیدینا۔ وہ بھی کیا یاد کریگا" جب واقعات نے یوں پلٹا کھایا تو غریب نیاز نے بھی اپنے کو تقدیر کے حوالہ کر دیا۔ قضا و قدر کو جب یہی منظور تھا کہ وہ متوفی کی قائم مقامی کرے تو وہ کیا کر سکتا تھا۔ اندر پہنچتے ہی نوجوان لڑکیوں نے نیاز کو دیکھ کر اپنے آنچل پلو درست کر لئے۔ عمر رسیدہ عورتوں نے اسکو پیار کی نظروں سے دیکھنا شروع کیا اور بچے حیرت و مسرت کے ساتھ اس سے لپٹنے لگے۔

نیاز سینہ تانے پرسکون بشرے کے ساتھ گھبراتے کے ذاد کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ عورتوں نے فخریہ اس کے دم چہرے کو دیکھا اتنے میں احمد میاں بولے "منجو کی اماں اے اسنے والا داد کو ---- [illegible]

نوجوان ہے؟ اللہ نے بڑا اچھا جوڑا ملایا ہے"!

عورتوں کے مجمع میں سے ایک ادھیڑ عمر کی عورت بھی اور پیار سے چٹاچٹ نیاز کی بلائیں لینے لگی۔

"بیٹا یہ تمہاری ساس ہیں۔ اور یہ تمہاری ممیا ساس ہیں۔ اور یہ تمہاری نانی ساس ہیں تمہاری سالیاں ہیں یہ بڑی سالی ہے" احمد میاں نے سب سے نیاز کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

ایک نوجوان جو خاموشی اور حقارت سے نیاز کو بیٹھا ہوا دیکھ رہا تھا۔ اب تک غیر متعارف تھا۔ اُس نے زرق لباس پہن رکھا تھا اور اسکی حرکات سے پتہ چلتا تھا کہ وہ اپنے متعلق کسی بڑے مغالطہ میں مبتلا ہے۔ جب سب سے تعارف ہو چکا تو وہ اپنی جگہ سے اُٹھا اور نیاز سے بولا میں احمد میاں کا بھتیجا ہوں"

"ہاں یہ تمہارے سالے ہیں میں بھول گیا۔ ان سے تمہارا تعارف کرانا تھا"

"میں ابھی کسی کا سالا نہیں ہوں۔ پہلے نکاح ہو جانے دیجئے۔ جب یہ رشتہ قائم ہو گا" اُس نے ایک انداز استہزا کے ساتھ نیاز کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ نیاز اب تک اس شخص کی حرکات کو سمجھ نہیں رہا تھا۔ وہ حیران تھا یہ شخص کیوں مجھ سے بیزار ہے؟

گھنٹہ بھر کے بعد نیاز غسل کرنے اوپر چلا گیا۔ غسل خانہ میں پہنچنے سے قبل وہ ایک مختصر سے خوشنما کمرے میں سے گذرا لیکن برآمدے میں پہنچکر ٹھٹھک کر رہ گیا۔ ایک حسین دوشیزہ آرام کرسی پر دراز تھی۔ اور نہایت محویت کے عالم میں کچھ پڑھ رہی تھی۔ نیاز کے پیروں کی آواز نے اُسکو چونکا دیا۔ اُس نے [illegible]

اجنبی کو حیرت سے دیکھا۔ دفعتاً حقیقت حال اس پر منکشف ہوئی اور وہ اُٹھکر بھاگی لیکن نوجوان نیاز سامنے آکھڑا ہوا۔ "خاتون! ایک منٹ"

"میرے سامنے سے ہٹ جائیے" نازنین نے غصہ سے کہا۔

"کیا میں دریافت کر سکتا ہوں کہ مجھ خوش نصیب کی ہونے والی بیوی آپ ہی ہیں؟" نوجوان نے حسینہ کے غصہ کی پروا نہ کرتے ہوئے کہا۔

"بیوی؟ اگر جاہل اقوام کی طرح لڑکی کو کسی مرد کے سپرد کر دینے کے معنی شادی ہو سکتے ہیں۔ تو آپ مجھے اس نامبارک لفظ سے نامزد کر سکتے ہیں" حسینہ نے اسی غصہ سے کہا۔

"خاتون! آپ مجھ پر بہت ظلم کر رہی ہیں"

"ظالم و بے درد آپ لوگ ہیں جو دوسروں کے جذبات کی مطلق پروا نہیں کرتے۔ میرا خیال تھا کہ . . . . ."

"ہاں آپکا کیا خیال تھا؟" لیکن نیاز کے اس سوال پر نازنین خاموش رہی رہی۔

"کیا خاتون! میں تمہاری حسین توجہ حاصل کرنے میں ذرا بھی کامیاب نہیں ہو سکتا ہوں؟ حسینہ تم شاید مجھ کو اور نوجوانوں کی طرح بہیمیت پسند تصور کر رہی ہو گی۔ مگر واللہ میں اپنے سینے میں ایک بڑا ایثار دل رکھتا ہوں۔ جو شب و روز تمہاری ناز برداری و محبت پر نثار رہے گا"

حسینہ کے چہرے پر نفرت و غصہ کے آثار آہستہ آہستہ کم ہونے لگے۔ انکے بجائے ترحم و سنجیدگی کے آثار نمایاں ہو گئے [illegible]

وجاہت کی تعریف کی اور اُسکے مردانہ اطوار کو سراہا۔ آخر نازک لب کھلے اور بہت آہستہ سے یہ الفاظ اُس کی زبان سے نکلے "افسوس خدا نے مجھ کو آپ پر بہت دیر میں الہام ہوا"۔

"کیا اسکے یہ معنی ہیں کہ مجھ سے پیشتر وہ کسی اور پر ہوچکا ہے؟" نیاز نے غصہ سے دریافت کیا۔

"جی" نازنین نے اُس کی شعلہ ریز آنکھوں کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

"اچھا! وہ کون ہے؟ کیا وہ فوجی ہے؟"

شرافت سے منہ پھیر کر چلی گئی۔

"خوب۔ دیدہ خواہد شد" یہ کہکر وہ غصہ سے کانپتا ہوا غسل خانہ میں چلاگیا۔ نہاکر جب وہ باہر نکلا تو اس کا رقیب حالتِ انتظار میں اُسکو باہر ملا۔ نیاز کو دیکھتے ہی وہ اُس کی طرف بڑھا اور حقارت آمیز تبسم سے بولا "کیوں صاحبزادہ! تم کو شمشیر آزمائی کا بھی کچھ شوق ہے؟"

شمشیر آزمائی! پچاس سال پہلے کے ہتھیار کا اب کیا ذکر کرتے ہو۔ بابا میں نے تو کبھی تلوار چھوئی بھی نہیں"۔

"بزدل انسان۔ اسی برتے پر تو میری محبوبہ کو مجھ سے چھیننے آیا ہے۔ یاد رکھ پہلے محمود کی لاش گرے گی تب کوئی حسینہ کو ہاتھ لگا سکے گا۔ اچھا پانچ بجے پائیں باغ میں ملو۔ میں وہاں تمہارا منتظر رہونگا" یہ کہہ کر محمود فوجی شان سے غریب نیاز کو بہت افسردگی میں چھوڑ کر چلاگیا۔

نیاز ہکا بکا ہوکر رہ گیا۔ "یا خدا! کیسی مصیبت میں آپھنسا ہوں ... [illegible]"

کشمکش و پیچ کی حالت میں وہ اپنے کمرے میں گیا۔ کپڑے پہنے اور پریشانی میں کمرے میں ٹہلنے لگا۔ چند منٹ بعد ملازم کھانے کے لئے بلانے آیا۔ ڈرائنگ روم میں تمام افراد جمع تھے۔ اسکا رقیب بھی سامنے ہی بیٹھا ہوا تھا جسکو دیکھکر اُسکا کلیجہ دھک سے ہوگیا۔ پاس والے کمرے میں حسینہ تھی۔ جو چھپکر نوجوان نیاز کو دیکھ رہی تھی۔

نیاز چند منٹ تک تو افسردہ و پریشان سا رہا لیکن جلد اپنی اصلی حالت پر آگیا۔ وہ نہایت خوش تقریر، شیریں بیان انسان تھا۔ دورانِ طعام میں اسکی وسیع معلومات، پرمذاق فقرے اور خوش بیانی سے سب دنگ تھے۔ احمد میاں اور اُن کی بیوی اپنے لائق داماد کو نہایت فخر و مباہات کے ساتھ دیکھ رہے تھے۔ اور محمود بیٹھا ہوا جل رہا تھا۔

کھانے سے فارغ ہوکر نیاز اپنے کمرے میں گیا۔ تنہائی میں پھر اُسکو خوفِ شمشیر آزمائی نے آدبایا۔ تھوڑی دیر تک کچھ پڑھتا رہا پھر سو گیا۔ دفعتاً کسی نے آکر اسکو جگایا۔ نوکر سرہانے کھڑا تھا اور اسکے ہاتھ میں ایک کاغذ تھا۔ یہ محمود کا رقعہ تھا "ارے کیا پانچ بج گئے۔ افوہ میں کس قدر سویا ہوں" نیاز نے جھٹ پٹ ہاتھ منہ دھوئے۔ کپڑے پہنے اور پائیں باغ میں پہنچا۔ محمود اسکا منتظر تھا۔ اُسکے ہاتھ میں دو تلواریں تھیں ایک تلوار نیاز کو دیکر بولا "ذرا ہوشیاری سے مقابلہ کرنا میری شمشیر زنی زبان زدِ خلائق ہے۔"

نیاز: ہا! کیوں نہ ہو ماشاء اللہ آپ فوجی آدمی ہیں۔ اور یہ خاکسار تو بہاتِ کا رہنے والا ہے۔ اچھا ارے سنبھل رہئیے

دو بجلیاں چمکیں اور وار ہونے شروع ہوئے۔ محمود نے پے در پے نیاز پر حملے کئے۔ مگر اس کو بہت جلد معلوم ہوگیا کہ نیاز ایک آہنی دیوار ہے۔ وہ اسکو محض ایک ناتجربہ کار اور بزدل انسان سمجھتا تھا۔ لیکن بحقیقت اسپر جلد منکشف ہوگئی کہ اسکا مقابل شمشیر زنی میں اس سے کہیں زیادہ بڑھا ہوا ہے۔ دیر تک محمود کا مقابلہ ہوتا رہا حتیٰ کہ محمود بری طرح ہانپنے لگا۔ آخر ایک بے پناہ حملہ کے ساتھ اپنی جگہ سے ہلا۔ محمود کے سر پر بجلی سی گری۔ اس کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ نیاز چاہتا تو بہت آسانی سے اسکو جان سے مار سکتا تھا لیکن اس نے ایک جھٹکی دی جس سے محمود کے ہاتھ سے تلوار چھوٹ کر دور جا گری۔ نیاز نے لپک کر اسکو اٹھا لیا۔ اور مسکراتا ہوا اس سے بولا "مجھے افسوس کہ سکندر سطوت لفٹیننٹ صاحب کی قسمت نے آپکا ساتھ نہیں دیا۔ میرے کمزور بازو آپکے قوی بازو پر غالب آگئے۔" محمود غصہ و شرم کے عالم میں کھڑا تھا۔ آخر آہستہ سے بولا "اچھا میری تلوار تو دیدو"

"مجھے افسوس ہے کہ میں اسکو نہیں دے سکتا۔ کم از کم آپکو نہیں دونگا۔" یہ کہکر نیاز سینہ تانتا ہوا مکان کی طرف چلدیا۔ دروازہ کے باہر ہی اس کی حسینہ سے مڈبھیڑ ہوگئی حسینہ کو یقین تھا کہ اب محمود نیاز کو شکست دیکر آتا ہوگا۔ [illegible] نیاز کو دیکھ کر [illegible] نیاز [illegible] کے سامنے [illegible] ہوا اور [illegible] حسینہ کی [illegible] بولا۔ [illegible] تحفہ آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ اور خود اجازت چاہتا ہوں۔"

"مجھ [illegible]

"مطمئن رہئے وہ زندہ و سلامت ہیں۔ افسوس شمشیر آزمائی میں ان کو شکست ہوئی۔ آپ کے ہزیمت خوردہ عاشق صاحب ابھی تشریف لاتے ہی ہونگے۔ آپ ان سے ٹھاٹھ کیساتھ شادی کیجئے۔ یہ خاکسار آپ کے راستہ سے ہٹا جاتا ہے۔" یہ کہکر نیاز چلدیا۔

"نیاز صاحب میں آپ سے محبت ـــــ" حسینہ نے بے قرار ہوکر کہا۔ نیاز نے مڑکر دیکھا اور بولا "افسوس حسینہ! اب کچھ نہیں ہوسکتا۔" یہ کہکر وہ ہال میں سے گذرا۔ اس کو تیزی سے جاتے دیکھ کر احمد میاں لپکے اور بولے "کیوں فرزند خیریت ہے کہاں چلے؟"

"حضرت مجھے اجازت دیجئے مجھے سات بجے اپنے جہاز میں شریک ہونا ہے۔"

"کیا آپ جا رہے ہیں؟ [illegible] خود [illegible] فارغ ..."

[illegible] فارغ تو [illegible] اگر [illegible] بات [illegible] آپ گرانڈ ہوٹل میں [illegible] کر [illegible] شام کو فون [illegible] باہر نکل [illegible]

احمد میاں [illegible] دروازے [illegible] پہنچے وہ غائب ہوگیا۔

رات کو [illegible] احمد میاں [illegible] گرانڈ ہوٹل [illegible] گئے اور [illegible] معلوم [illegible] کہ وہ [illegible] [illegible] ہوئے [illegible]

محمود صاحب بولے: [illegible] کہ وہ [illegible] کی [illegible] تھی جو آج ہمارے [illegible] تب ہی تو میں کہتا ہوں کہ [illegible] جیت گئے [illegible]

لسان العصر حضرت احسان دانش

خانہ بدوش

میداں کے صاف سینے پہ آبادیوں سے دور
ٹھہرا ہوا ہے خانہ بدوشوں کا کارواں

چہرہ پہ گرد، سینہ پہ انفاس سیز تیز
آلام نے نگاہ کو بخشی ہوئی زباں

سنگین فطرتوں کے شرارے دبے ہوئے
اجسام آہنی سے شلوکے ہیں دھجیاں

زلفیں گندھی گندھی ہیں تو چہرے سنے سنے
بازو بھرے بھرے ہیں ارادے جواں جواں

ٹوٹے ہوئے کھٹولوں پہ بورے بچھے ہوئے
چولہے سے کمنا کے نکلتا ہوا دھواں

کچھ فاصلہ پہ کھیت میں چرتے ہوئے گدھے
بیٹھی ہوئیں چٹائی کے کونے پہ بکریاں

ان کا کسی کو شہر میں رہنا نہیں پسند
دشمن ہے گر زمیں تو مخالف ہے آسماں

تاریخِ ہند کے یہ پریشان سے ورق
بیمار سی ضعیف تمدن کی داستاں

برباد ہیں، ذلیل ہیں، رسوا ہیں، خوار ہیں،
القصہ جنگلوں میں بھی ملتی نہیں اماں

دیکھ اے نگاہِ دیدۂ خودبین و خودپسند
تارا ہے اب کنوئیں کا جو تھا مہرِ آسماں

اللہ رے انقلابِ زمانہ کہ ہمیں قوم
ہے کس قدر زبون و حزین رواں دواں

جنکے مکاں پہ فتح کے پرچم تھے موج ریز
وہ میلے ہیں سر پہ اٹھائے ہوئے مکاں ،

میرزا ادیب (افسانہ)

زرینہ

رات دم توڑ رہی تھی۔ صبح کا دیوتا مشرق کے دریچے سے نکل کر اپنی شعاؤں کی نورانی انگلیوں سے سازِ ہستی کے تاروں کو چھیڑ کر دنیا کو نغمۂ بیداری سنا رہا تھا۔ زرینہ ہجومِ خیالات میں غرق بستر پر بیٹھی ہوئی تھی۔ نگاہیں سامنے دیوار پر جمی تھیں اور ٹھوڑی کو دائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر رکھا ہوا تھا۔ گذرے ہوئے واقعات ماضی کے دھندلکے میں سے ابھر ابھر کر روشن نقوش کی صورت میں اُسکے حافظے کی نگاہوں کے سامنے پھر رہے تھے۔ ایک دفعہ وہ پھر محسوس کر رہی تھی کہ وہ دوشیزہ ہے۔ مسرور و خرم دوشیزہ۔ اس کی زندگی ایک نغمہ ہے ۔۔۔ نغمۂ مسرت ایک قہقہہ ہے قہقہۂ معصوم۔ روح کی پاکیزگی نے جبینِ حیات کو اس قدر روشن و منور کر رکھا ہے کہ وہ اپنے اردگرد روشنی ہی روشنی ۔۔۔ نور ہی نور دیکھ رہی ہے۔ کائنات کے ہر ایک گوشے میں، زندگی کے ہر ایک پہلو میں اسکے لئے مسرتوں کی ایک دنیا آباد ہے۔ گناہ، بدی، تلخی و سوزش سے وہ یکسر نا آشنا ہے۔ اور کیونکر نہ ہو؟ اسکی زندگی عبادت ہے پاکیزگی و معصومیت سے۔ مجموعہ ہے لطافتوں اور مسکراہٹوں کا۔ شباب کی منزل میں قدم رکھتے ہی وہ سینے میں ایک ہلکی سی خلش محسوس کرتی ہے۔ اسکا ترین سہیلی گلنار سے اُسنے کئی بار 'محبت' کا لفظ سنا ہے مگر اسکا حقیقی مفہوم کیا ہے؟ وہ نہیں جانتی ۔۔۔ وہ نہیں جان سکتی۔ کتابوں میں اُس نے یہ لفظ ہزاروں دفعہ پڑھا ہے مگر وہ حیران ہے کہ ایک شخص کیوں عورت کے لئے اپنی جان قربان کر دیتا ہے۔ ایک عورت کس لئے مرد پر اپنی جان فدا کر دیتی ہے۔ دونوں میں کیا چیز ہے۔ جو انہیں ہر گھڑی ہر لمحہ ایک دوسرے کے قریب رہنے پر مجبور کرتی ہے۔ جب وہ گلنار سے محبت کا لفظ سنتی ہے تو جھنجھلا کر کہتی ہے۔

"محبت ۔۔۔! میں نہیں جانتی محبت کیا چیز ہے؟"

"تو مجھ پر کیوں خفا ہوتی ہو ۔۔۔؟ صبر کرو ایک دن خود بخود جان لوگی" گلنار مسکرا کر جواب دیتی ہے۔

"میں جانتی تو ہوں محبت کیا ہے لیکن جس قسم کی محبت کا تذکرہ تم کرتی ہو، اُس سے میں واقف نہیں!"

"پھر تم کونسی 'محبت' سے واقف ہو؟"

"یہی جو والدین اور اولاد میں ہوتی ہے ۔۔۔ بھائی، بہنوں میں ہوتی ہے"

"اونہہ ۔۔۔ تم تو سب کچھ جانتی ہو۔"

زرینہ اس طنز آمیز لہجے پر جھنجھلا جاتی ہے۔ اس کے

ایک دن زرینہ گلنار کے ہاں جاتی ہے۔ اور حسبِ معمول بے تکلفی سے اسکے کمرے میں داخل ہوجاتی ہے۔ کرسی پر گلنار کا بھائی سرفراز بیٹھا ہوا ہے۔

"گلنار کو ڈھونڈ رہی ہو زرینہ؟"

"ہاں بھائی جان! کہاں ہے وہ؟"

"وہ یہاں نہیں ہے۔!"

"تو پھر کہاں ہے؟"

"جالندھر میں اپنے ماموں کے ہاں۔"

"آئے گی کب؟"

"تار بھیج کر معلوم کرلو۔"

"آپ یونہی باتیں بنا رہے ہیں۔" یہ کہتے ہوئے وہ سرفراز کے چہرے کو دیکھتی ہے۔ سرفراز کی آنکھوں میں مسکراہٹ رقص کررہی ہے۔

"میں نے کہا اگر تم تار نہیں بھیج سکتیں تو ——"

"تو میں چلی جاتی ہوں" یہ کہتے ہوئے وہ کمرے سے باہر نکل جاتی ہے۔ دوچار دن بعد وہ پھر سرفراز کو دیکھتی ہے اس کی نگاہیں زرینہ کی نگاہوں سے کچھ کہتی ہیں۔ اور وہ اپنے سینے میں ایک عجیب لذت انگیز خلش محسوس کرتی ہے۔ دن گذرتے جاتے ہیں، سرفراز کی نظریں موقعہ پاکر معصوم حسینہ کی نگاہوں کو پیغامِ محبت سناتی رہتی ہیں یہاں تک کہ محبت کے مفہوم جنگل کے ایک گوشے میں معمولی سی چنگاری سلگتی ہے آگ بڑھتی ہے۔ اور پھر خوفناک آتشیں شعلے، ہوا کی لہروں کا دامن پکڑ کر بجلی کی سی تیزی کے ساتھ آگے بڑھتے ہوئے

یہی حال زرینہ کی محبت کا ہوتا ہے، محبت کا جذبہ کے ساتھ پیدا ہوکر اس کی زندگی کو بدل دیتا ہے۔ اب کے دلگداز شعلے ہیں، اور وہ عشق کا سنہری جال ہے، دل ودماغ کائنات کے گوشے گوشے میں مسرتوں کی دنیا محسوس کرنے والی لڑکی اپنے محبوب کی جدائی میں دنیا دار المحن سمجھتی ہے۔ زندگی کے ایک پہلو میں نئی نئی خوشیاں یقین رکھنے والی نوجوان حسینہ، سرفراز سے دور رہ کر کو ایک خوابِ پریشاں سمجھنے پر مجبور ہوجاتی ہے۔ اب زندگی، اس کی کائنات دو ستاروں کی روشنی سے ہے۔ یہ دو ستارے کیا ہیں؟ سرفراز کی محبت انگیز اور سبز الیں آنکھیں۔ اپنی محبت کے راستے میں رکاوٹ کر وہ کہیں دور چلے جانا چاہتے ہیں۔ دیوانی لڑکی اور بدنامی سے بالکل بے نیاز ہوکر نہایت مسرت کے اس تجویز کو خوش آمدید کہتی ہے، چند دن کے بعد دیکھتی ہے، کہ ایک تاریک رات کے آغوش میں دو کرنے والے انسان، محبت کے ہاتھوں مجبور کر، گھر سے جاتے ہیں ——

دونوں بمبئی پہنچ جاتے ہیں، اور وہ خواب جس کی آرزوئے محبت اکثر دیکھا کرتی تھی، اب مرد محبت کرتا ہے۔ مگر بالکل محبت نہیں اسکے برعکس عورت محبت کرتی ہے۔ اور اپنے آپ کو کے حوالے کردیتی ہے۔ سرفراز، محبت کا پیغام دیکر مستقبل سے بالکل غافل نہیں ہوجاتا، لیکن زرینہ

اس کے بعد سرفراز اکتا جاتا ہے، اور زرینہ اور جاہ
پن کو چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ وہ دلآویز نغمہ، جسے زرینہ
ہمہ تن گوش بنکر سن رہی تھی ـــــ موت تک سننے کی متمنی تھی
یکلخت ایک بھیانک، خوفناک آواز میں تبدیل ہو جاتا ہے
اس کی آرزوؤں کا منتہا، اس کی تمناؤں کا مرکز، اسکا محبوب
اس کی محبت کو ٹھکرا کر کہیں چلا جاتا ہے۔ وہ اب
وہاں جو سکتی ہے، مگر نہیں جا سکتی۔ سوسائٹی اس کا قصور
معاف کر دے گی؟ اسکا اسے یقین نہیں۔ وہ ہر وقت ظالم
سرفراز کا انتظار کرتی رہتی ہے ـــــ اس کی نگاہیں
سرفراز ہی کو ڈھونڈتی رہتی ہیں اور پھر [illegible]
یہاں پہنچکر اسکے خیالات کی رو ختم ہو گئی۔ اس نے تکئے
کے نیچے سے ایک ملفوف کاغذ نکالا اور چہرے کے قریب
لا کر آہستہ پڑھنے لگی۔ اس تحریر کو وہ تین بار پیشتر بھی پڑھ چکی
تھی۔ اور ہر بار دوران مطالعہ میں ایک نیا خیال اُسکے ذہن
میں ایک نیا جذبہ اُسکے دل میں پیدا ہوا تھا۔ اب بھی اُس کا
دل و دماغ ایک تازہ جذبہ و خیال سے بہرہ ور ہو رہا تھا۔ وہ آہستہ
آہستہ پڑھ رہی تھی۔

عزیز سہیلی!

مجھے اطلاع دیئے بغیر تمہارا اس طرح چلے جانا
عارضی مصلحت کے لحاظ سے درست ہو تو ہو
مگر اقتضائے محبت کے ضرور خلاف ہے۔ تم
نے کبھی مجھے اپنی داستان درد سنانے کی
کوشش نہیں کی، اور نہ اس کی [illegible]
ہے۔ تاہم میں تمہاری زندگی کا ایک راز
ضرور جانتی ہوں، اور یہی راز شاید تمہارا سب سے
بڑا راز ہے ـــــ تمہاری داستان درد کا
اہم ترین حصہ۔ تمہاری مصیبت کا اصلی سبب!
عورت کا دل خدا نے کس چیز سے بنایا ہے
کہ غیر شخص کی مصیبت کا حال سنکر بھی تڑپ
جاتا ہے۔ میں بھی تڑپ رہی ہوں۔ کیونکہ میری
سہیلی۔ میری زرینہ مصیبت میں مبتلا ہے
مانا کہ تم گاؤں میں ہو اور جہاں تک
اخراجات کا تعلق ہے، شہر کے مقابلے میں تمہیں
بہت سی سہولتیں حاصل ہیں۔ تاہم تم زندگی
کی اہم ضروریات سے بے نیاز نہیں ہو سکتیں
میری آرزو ہے کہ اپنی زرینہ کی مدد کروں۔ کاش
میری سہیلی میری درخواست کو قبول کر لے۔
پیاری زرینہ! دنیا میں ہمدردی کی ہمیشہ کمی
رہی ہے لیکن بے رحمی کی کبھی کمی نہیں ہوتی۔
خدا کے لئے اپنے آپ کو اس بے دردی کی ٹھوکروں
کے سپرد نہ کرو۔ میرے پاس اللہ کا دیا سب کچھ ہے
پھر کیوں میری زرینہ دنیا کی ٹھوکریں کھائے؟
میں تم سے تین چار برس بڑی ہوں مگر ان سرسری
ملاقاتوں نے مجھ پر بہت زیادہ اثر ڈالا ہے۔
اور اسی اثر کا نتیجہ ہے کہ میں نے تمہیں ڈھونڈھ
نکالا ہے
[illegible]
بھیج رہی ہوں۔ اسے پڑھتے ہی تم اس کے

ساتھ چلی آؤ۔ میں منتظر ہوں۔

تمہاری "زمرد"

تحریر کو شروع سے لیکر آخر تک پڑھنے کے بعد کاغذ انگلیوں میں پکڑے آنکھیں ٹکٹکی لگائے پر جملے تو وہ خیالات میں غرق ہوگئی۔ یہ تحریر ایک ایسی عورت کی طرف سے تھی جو اسے پہلی دفعہ قیام شہر کے دوران میں، شام کے وقت ایک ساحل پر ملی تھی۔ رضیہ تنہا بنچ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ کہ وہ عورت بھی اسکے پاس آبیٹھی۔ رسمی تکلف کا مظاہرہ ہوا۔ چند باتیں ہوئیں۔ دوسرے دن بھی ملاقات ہوئی۔ اب کے زیادہ دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ تیسری بار جب زمرد اسکے ہاں آئی۔ اسوقت ظالم سرفراز، بیکس عورت کو چھوڑ کر کہیں جا چکا تھا۔ اور وہ آنسو بہا رہی تھی، زمرد کو دیکھ کر اس نے آنسو پونچھے۔ اور ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگی۔ نسوانی فطرت اظہار ہمدردی و محبت سے بے حد متاثر ہوتی ہے۔ اسلئے جب زمرد نے اس سے مردوں کے مظالم کی باتیں کہیں۔ تو اسکے دل پر بڑا اثر ہوا، وہ سمجھنے لگی کہ زمرد بھی کسی مرد، کے مظالم کا نشانہ بنی ہے۔ اگرچہ اس نے اپنے گذشتہ واقعات زمرد کو سنانے کی کوشش نہیں کی تاہم چالاک عورت اسکے لہجہ گفتگو اور اسکے چہرے کی علامتوں سے سب کچھ سمجھ گئی۔

چند دن بعد ایک نہایت دردانگیز و روح فرسا واقعہ کی خبر اسکے کانوں میں پہنچی۔ اس نے سنا کہ سرفراز موٹروں کے تصادم سے ہلاک ہوگیا ہے۔ دفور رنج و غم سے اس کا برا حال ہوا۔ سرفراز نے اسے دھوکا دیا تھا۔ مگر جب اس نے سنا کہ زندگی نے سرفراز کو دھوکا دیا ہے۔ تو بیچاری عورت کے دل کو سخت صدمہ پہنچا۔ اسکے بعد وہ اپنی بچی کو ساتھ لیکر جلد گاؤں میں پہنچ گئی۔ اسکے پاس تھوڑی سی رقم تھی اسی پر گذر اوقات ہونے لگی۔ یہ حقیر رقم کب تک انکا ساتھ دیتی۔ مفلسی نے بھیانک چہرہ دکھایا۔ اپنی تو اسے پروا نہیں تھی۔ مگر بیچاری لڑکی کے غم انگیز مستقبل کا اندازہ کرکے وہ لرز اٹھی زندگی سے اسکا دل اکتا چکا تھا۔ مگر وہ کیا کرتی اس کی بیکسانہ زندگی کے ساتھ ایک معصوم زندگی بھی وابستہ تھی اسلئے وہ زندہ تھی ——— اسی لئے وہ زندہ رہنا چاہتی تھی اسی اثنا میں زمرد کی طرف سے یہ تحریر ملی۔ اظہار ہمدردی سے اسکے دل کی ڈھارس تو بندھی، تاہم جب اس نے شہر میں جانے کا ارادہ کیا تو ایک قسم کا مبہم خوف اس کے دل و دماغ پر چھا گیا۔ وہ شہر میں جانا بھی چاہتی تھی اور وہاں جانے سے ڈرتی بھی تھی۔ جانا کیوں چاہتی تھی اسکی وجہ ظاہر ہے اور جانے سے ڈرتی کیوں تھی۔ اسکی وجہ اسے خود بھی معلوم نہیں تھی۔

بوڑھے آدمی کو، جو رقعہ لے کر آیا تھا اس نے یہ کہہ کر بھیج دیا کہ میں خود آجاؤں گی؟

بوڑھے کو گئے ہوئے تین دن گذر چکے تھے۔ اور ابھی تک وہ کوئی فیصلہ نہیں کر سکی تھی۔ اسوقت بھی وہ اسی کشش و پنج میں مبتلا تھی۔ لڑکی جاگی۔ رضیہ نے اسے مادرانہ شفقت سے اپنے سینے کے ساتھ لگا لیا۔ اسکا ہاتھ منہ دھلایا۔ اتنے میں دروازے پہ دستک ہوئی۔ رضیہ نے جاکر دروازہ کھولدیا، اور بھاگی ہوئی اندر آئی۔

"امی! ایک عورت آئی ہے۔ [redacted]

خوبصورت ہیں!"

زرینہ کے دل میں فوراً خیال پیدا ہوا کہ وہ عورت سوائے زمرد کے اور کوئی نہیں!! اور واقعی، چند لمحوں کے بعد اُسکے سامنے 'زمرد' موجود تھی۔

"یہ تکلیف کیوں کی؟"

زرینہ نے اُسکے آگے مونڈھا رکھتے ہوئے کہا۔

"تکلیف کے سوال کو چھوڑ دیجئے — آپ کی آرزو تو پوری کر دی ہے نا؟"

"میری آرزو — کیا؟"

"یہی کہ میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوں، اور چلنے کی درخواست کروں!"

"میں نے آپکو یہ کب کہا؟"

"تم نے تو نہیں کہا۔ مگر تمہاری باتوں سے یہی ظاہر ہوتا — زرینہ! کیا تمہارا خیال تھا کہ میں تمہیں بھول گئی ہوں؟"

"یہ آپ کی مہربانی ہے۔ کہ آپ مجھے نہیں بھولیں۔"

"تو پھر چلو"

گویا آپ مجھے لینے آئی ہیں؟"

"سہیلی ہونے کی حیثیت سے یہ میرا فرض ہے خدا کے لئے مجھے اپنا فرض ادا کرنے دو۔"

زرینہ انکار کرتی رہی — مگر کافی اصرار کے بعد چلنے پر رضامند ہو گئی۔

(۲)

راہ میں 'زمرد' نے طرح طرح کی باتیں سنا سنا کر، بار بار اپنی مخلصانہ محبت کا اظہار کر کر کے، اسکے دل پر پوری طرح قبضہ کر لیا۔ اور یہ زمرد کی اطمینان بخش باتوں کا اثر تھا کہ مبہم خوف کے وہ اثرات، جو مکان کو چھوڑتے وقت، گاڑی میں بیٹھتے وقت اُسکے دل پر چھائے ہوئے تھے بہت حد تک دور ہو گئے۔ اسکی گفتگو کا بیشتر حصہ عورتوں کی مظلومیت اور مردوں کی سفاکانہ سردمہری کے واقعات پر مشتمل تھا۔ آخرکار ان کا تانگہ ایک عالیشان مکان کے سامنے رکا۔ 'زمرد' نے مسکرا کر اُسے اترنے کے لئے کہا اور دونوں چلنے لگیں پہلی سیڑھی پر قدم رکھتے ہی 'زرینہ' کا دل دھڑکنے لگا۔ ایک ناخوشگوار احساس اُسکے رگ و پے پر طاری ہو گیا — 'زمرد' نے اُسکا بازو پکڑ کر صوفے پر بٹھا دیا۔ اب وہ ایک عالیشان، آراستہ و پیراستہ کمرے میں بیٹھی ہوئی اپنی سہیلی کے حسن سلوک اور مخلصانہ ہمدردی پر اظہار تشکر کر رہی تھی۔ آہ! اس محبت، اس مخلصانہ خاطر و مدارات پر خوش ہونے والی خوش ہو ہو کر اپنی سہیلی پر ناز کرنے والی بھولی بھالی عورت کو کیا معلوم تھا کہ جس کمرے میں وہ بیٹھی ہوئی ہے اُسکے ذرے ذرے کے سینے میں گناہوں کی دنیا آباد ہے۔ اس بے چاری کو کیا خبر تھی کہ اس شاندار کمرے میں حسن کی قیمت لی جاتی ہے۔ عصمت کو بیچا جاتا ہے اور گناہوں کا سودا ہوتا ہے۔ دو دن تک تو اُسکے دل میں یہ خیال تک بھی پیدا نہ ہوا کہ وہ ایسی ذلیل جگہ پہنچ گئی ہے تیسرے دن شام کے وقت اسے اپنی موجودہ حالت کا اندازہ ہوا جبکہ وہ آراستہ و پیراستہ کمرے میں گناہ کے مہیب و آہنی پنجے میں گرفتار تڑپ رہی تھی۔ سائیں سائیں کی آواز اُسکے کانوں میں آ رہی تھی چند منٹ کے بعد اُسے محسوس ہوا کہ وہ ذلت کے غار کی گہرائیوں میں گر رہی ہے۔ بجلی کی رو کی مانند تلخ، روح کش، دماغ

خراش احساس اسکے دل و دماغ میں پیدا ہوا۔ وہ غضبناک شیرنی کی مانند جھنجلائی، بھڑکتے ہوئے شعلے کی طرح تڑپی لیکن آہستہ آہستہ اس جھنجلاہٹ، اس غضبناکی نے اس کی نسوانی کمزوری کے سامنے ہتھیار ڈالدیئے۔

"میری سہیلی: عورت مرد کے دل بہلانے کا ایک کھلونا بھی جاتی ہے۔ وہ اسے جس وقت چاہے توڑ ڈالے جب چاہے پرے پھینکدے۔ تمہارے ساتھ مرد نے کیا کیا؟ یہی کہ گھر سے کوسوں دور لاکر بے بسی کی حالت میں چھوڑ کر چلا گیا۔ مرد اسی طرح ظلم کرتے رہے ہیں ــــ اسی طرح ظلم کرتے رہینگے ــــ پھر کیوں ہم اس سے انتقام نہ لیں کیوں ہم بھی اسے کھلونا نہ سمجھیں؟"

زمرد دیر تک اسی قسم کی باتیں کرتی رہی۔ گناہ کی بھیانک تصویر، رنگین و دلآویز نقوش میں تبدیل ہونے لگی چند مہینے کے بعد بمبئی کی حسن پرست فضاؤں میں "زرینہ" کا نام بھی گونجنے لگا۔ اسکے حسن وجاذبیت کا شہرہ پھیلنے لگا حسن پرست لوگ اس کی دہلیز پر سجدے کرنے لگے۔ ہزاروں دھڑکتے ہوئے دلوں کی آرزوئیں اسکا طواف کرنے لگیں۔ اسکی رنگین اداؤں کے حضور میں محبت بھرے دل، اور محبت بھری جبین پیش ہونے لگیں، اپنے حسن کی اس مقبولیت پر اپنے اس دور عیش ومسرت میں گذشتہ واقعات اسے فراموش ہونے لگے۔ تاہم جب ــ وہ خلوت میں ہوتی تو اپنی لڑکی کو سینے سے بھینچ لیتی اور آنسوؤں کے موٹے موٹے قطرے اسکے رخساروں پر بہنے لگتے۔

اسی اثناء میں ... رضیہ بیمار ہوگئی ... ۱۹ ... ۳۱ ... کی

بیماری خطرناک صورت اختیار کرنے لگی۔ زرینہ کے پاس اتنا وقت کہاں کہ وہ بیمار لڑکی کے پاس بیٹھی رہے۔ اسلئے لڑکی کو ہسپتال میں داخل کرادیا گیا۔ اسکا معمول تھا کہ ہر روز دو وقت ہسپتال میں جاتی اسکی تیمارداری کرتی مگر قیمتی وقت کا اس طرح ضائع جانا، اسکے چاہنے والوں کی آنکھوں میں کھٹکنے لگا۔ اتفاق سے وہ دو دن ہسپتال نہ جاسکی۔ تیسرے دن اسے خبر ملی کہ لڑکی فوت ہوگئی ہے۔ اور اُسے دفن بھی کر دیا گیا ہے۔

یہ سنکر اُسے بہت صدمہ ہوا ــــ حسن فروش ہونے کے باوجود وہ ماں تھی مہر مادری سے لبریز سینہ رکھنے والی ماں ــــ آخرکار غم، قہقہوں کے آغوش میں کروٹ لیتا ہوا، اُسکے دل کی گہرائیوں میں سوگیا۔ وقت گذرتا گیا اور زرینہ اپنے حسن کی قیمت وصول کرتی رہی۔ اُسکی بارگاہ میں یوں تو سینکڑوں عاشق اپنے عشق کا ثبوت، مال و زر سے بھری ہوئی جیبوں کی صورت میں پیش کرتے تھے۔ مگر چند دن سے ایک شخص فیروز نامی خاص طور پر دولت لٹا رہا تھا، اور یہی وجہ تھی کہ دوسرے چاہنے والوں کے مقابلے میں اُسے خاص امتیاز حاصل تھا، آج بھی وہ زرینہ کے پہلو میں بیٹھا ہوا، نہایت قیمتی زیورات اُس کے حضور میں پیش کر رہا تھا۔ زرینہ اپنے حسن کی خوش قسمتی پر مسکرا رہی تھی۔ اور اپنے عاشق صادق کی طرف پیار بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اتنے میں سیڑھیوں پر دھم دھم کی آواز آنے لگی۔ چند لمحوں کے بعد تین شخص اوپر آئے جن میں سے

ایک ... تھا ... دو سپاہی ... تھے ...

پر ٹوٹ پڑے۔ وجیہ نوجوان نے زیورات اُسکے ہاتھ سے چھین لئے۔ اور خشمگیں نظروں سے اُسے دیکھ کر کہنے لگا۔

"کم بخت! چوری کرتے ہوئے تجھے شرم نہیں آتی۔ یہ نا حسنہ عورت کے لئے اتنا ذلیل کام؟" اتنا کہتے ہوئے اس نے زور سے لات اس کی پشت پر ماری۔

"یہ الزام ——" فیروز کے منہ سے نکلا۔

"الزام؟ یہ لفظ کہتے ہوئے تجھے شرم تو نہیں آئی ہوگی"۔ نوجوان نے ایک اور لات اس کی پشت پر ماری۔

اپنی محبوبہ کے سامنے اپنے ساتھ یہ ذلت انگیز سلوک دیکھ کر، فیروز شرم سے پانی پانی ہوگیا۔ جھنجھلا کر اٹھا اور نوجوان کی طرف بڑھا۔ مگر سپاہیوں نے اُسے مضبوطی سے پکڑ لیا۔ اور سیڑھیوں کی طرف لے گئے۔

(۱۳)

دن کا اجالا آہستہ آہستہ رخصت ہو رہا تھا۔ افسردہ آفتاب، پہاڑ کی چوٹی پر پگھلتے ہوئے برف کے تودے کی مانند مغرب کی خونیں وادی میں غائب ہوتا جا رہا تھا۔ شالا مار باغ پر لوگ سیر و تفریح میں مشغول تھے۔ ہر ایک شخص شاداں و فرحاں نظر آرہا تھا۔ ہر ایک چہرہ مسرور و خرم تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ رنگین و معطر فضا قہقہوں کے سیلاب میں تیر رہی ہے۔

آہستہ آہستہ لوگوں کی تعداد میں کمی ہونے لگی۔ یہاں تک کہ بہت کم آدمی وہاں رہ گئے۔ اور جو وہاں نظر آرہے تھے وہ بھی جانے کی تیاریاں کر رہے تھے۔

سورج غروب ... سحر کا تھا اور چاند کا سہرا کرنوں ...

ہر طرف پھیلی ہوئی تھیں۔

——— ——— ——— ——— ———

——— ——— ——— ——— ———

——— ——— ——— ———

ایک گوشے میں زرینہ تنہا بنچ پر بیٹھی ہوئی سہانے خیالات میں محو تھی۔ وہ کیا تھی، پھر واقعات کے ظالم ہاتھ نے کس طرح دھکیل کر اسے ذلت کے غار میں گرا دیا۔ یہ تمام واقعات یکے بعد دیگرے اس کی آنکھوں کے سامنے پھر رہے تھے۔ اپنی بچی کا خیال آتے ہی وہ تڑپ گئی۔ آنکھوں سے دو آنسو گر کر نوکِ مژگاں پر لرزنے لگے۔ اتنے میں اس کے قریب ایک قہقہہ بلند ہوا۔ اُس نے اُس طرف نظر ڈالی۔ چند قدموں کے فاصلے پر دائیں طرف دوسرے بنچ کے اوپر ایک خوبصورت نوجوان جوڑا بیٹھا ہوا ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا۔ نوجوان عورت کی گود میں ایک ننھی بچی اپنے ننھے ننھے ہاتھ اٹھا اٹھا کر ماں کے بالوں کو پکڑنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ادھر دیکھتے ہی زرینہ کے سامنے ایک بجلی سی لہرائی اور اسے محسوس ہوا گویا وہ عالم خواب میں ہے۔ اسکی رگ رگ، ریشے ریشے میں حیرت اندوز مسرت، مسرت انگیز حیرت موجزن ہو گئی۔ اس کی معصوم بیٹی جو ماضی کی تاریکیوں سے نکل کر، اس کی دلدوز آہوں کے دھوئیں میں سے جھانکتی ہوئی، دلخراش آنسوؤں کا دامن پکڑے غائب ہو جاتی تھی۔ اب ایک خوبصورت نوجوان عورت کی صورت میں چند فٹ کے فاصلے پر اُسکے سامنے موجود تھی۔

"رضیہ تم بعض اوقات بڑی ضدی بن جاتی ہو۔"

نوجوان مردنے کہا۔

"رضیہ کا لفظ روشنی کی ایک لہر بنکر اُسکے ذہن سے ٹکرایا۔ دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس وقت وہ چاہتی تھی ——— بے اختیار چاہتی تھی کہ اپنی لڑکی سے لپٹ جائے۔ اسے سینے سے لگاکر کہے "بیٹی! میں تیری ——— ماں ——— تیری ماں ——— ہوں" مگر یہ الفاظ اُس کی لبوں تک آکر رُک گئے شرم سے پسینہ پسینہ ہوکر اسنے منہ دوسری طرف پھیرلیا۔ وہ اپنا منہ ——— ایک قابلِ نفرت طوائف کا منہ اپنی معصوم بیٹی کو نہیں دکھانا چاہتی تھی۔

"میں نے کب ضد کی ہے"؟ رضیہ نے شیریں آواز میں کہا۔

"کہہ جو رہی ہو کہ باپ اپنی اولاد کے لئے بالکل قربانی نہیں کرسکتا"۔ نوجوان مرد نے کہا۔

"میں نے تو یہ بالکل نہیں کہا"۔

"تو پھر کیا کہتی ہو؟"

"میں نے تو صرف یہی کہا اور یہی کہتی ہوں کہ باپ بھی اولاد کے لئے قربانیاں کرتا ہے مگر جو قربانیاں ماں کرسکتی ہے وہ باپ سے ممکن نہیں"۔

"یہ ضد نہیں تو اور کیا ہے؟"

"تم اسے ضد کہو مگر دنیا اسے حقیقت سمجھتی ہے!"

"رضیہ! تم عورت ہو اسلئے عورتوں کو فوقیت دیتی ہو ——— یہ فطری کمزوری ہے!"

"اور تم مرد ہو اسلئے مردوں کو عورتوں سے ممتاز سمجھتے ہو!"

زرینہ کا اُ... ...رہا تھا۔ اسکے سامنے ... ...

کے فاصلے پر اپنی محبوب بیٹی کو دیکھتے ہوئے بھی بیٹی سے محروم تھی۔ اسکے دل میں بیتابی بڑھتی جاتی تھی۔ سینہ پھٹا جاتا تھا۔

نوجوان مرد کہہ رہا تھا "تاریخ کی زبان بھی میری رائے کی تائید کررہی ہے۔ باپ کی قربانی سے تو تم ناواقف نہ ہوگی: کیا نسوانی دنیا ایسی مثال پیش کرسکتی ہے!"

"ہزاروں اور اس سے بدرجہا بڑھکر"۔

"مثلاً"۔

"مثلاً ایک دفعہ ایک بادشاہ کا بیٹا شکار کرتا ہوا ایک دریا کے کنارے پہنچا۔ وہاں اُس نے ایک نہایت خوبصورت لڑکی کو دیکھا۔ وہ دیکھتے ہی اسپر عاشق ہوگیا۔ اور اُسے اپنے ساتھ گھوڑے کی پشت پر بٹھا کر محل میں لے گیا۔"

"مزیدار کہانی معلوم ہوتی ہے"۔ نوجوان مردنے مسکراکر کہا۔

"سنتے ہو یا خاموش رہوں"؟

"ساتھ ساتھ تعریف بھی کرتا جاؤں تو بہتر ہوگا"۔

"نہیں خاموشی سے سنو"۔

زرینہ ایک ناقابلِ برداشت دورِ ابتلا میں سے گذر رہی تھی، اپنے جگر کے ٹکڑے کو پاس دیکھ کر بھی اسے سینے سے نہیں لگاسکتی تھی

کس قدر ظلم، کس درجہ ستم؟؟

رضیہ کہنے لگی "خبر دینے والوں نے بادشاہ کو بتایا کہ شہزادے کی محبوبہ ——— اور ہونے والی بیوی ایک طوائف کی ... ہے"

طوائف کا لفظ سنتے ہی زرینہ کو محسوس ہوا کہ طوفان کی ہیبتناک موجیں اس سے ٹکرا رہی ہیں۔ اور ابھی اسے بہا کر لے جائیں گی!

اس نے اپنے چہرے پر ہاتھ رکھ لئے۔ رضیہ کہے جا رہی تھی۔

"اتنا سنتے ہی بادشاہ غصے سے آگ بگولا ہو گیا شہزادے نے لاکھ سمجھایا کہ یہ خبر میرے دشمنوں نے اڑائی ہے۔ مگر بادشاہ کب اس کی سنتا تھا، اسی وقت خبر دینے والوں کو ساتھ لیکر بادشاہ اس لڑکی کے گھر کی طرف چلا۔ لڑکی کی ماں جو طوائف تھی، ان واقعات سے بالکل بے خبر گھر میں بیٹھی ہوئی تھی۔ جب بادشاہ نے اسکے مکان کی پہلی سیڑھی پر قدم رکھا تو اس نے کھڑکی میں سے ایک شخص کو کہتے سنا "یہ کہ شہزادے کی محبوبہ کی طوائف ماں کا مکان یہی ہے" اتنا سنتے ہی وہ سب کچھ سمجھ گئی۔ اس وقت وہ کیا کر سکتی تھی؟ گھر میں اس کی موجودگی۔ اس کی بیٹی کے حق میں ایک بہت بڑے ظلم کا حکم رکھتی تھی۔ وہ تیزی سے اٹھی۔ آخری کمرے میں پہنچکر، کھڑکی میں سے دریا میں چھلانگ لگا دی۔"

"خوب! واقعی اچھی کہانی ہے۔" نوجوان مرد نے کہا اور مسکرانے لگا۔

زرینہ کا دل زیادہ بیتاب ہوتا جا رہا تھا۔ اضطراب اپنے نقطۂ کمال کو پہنچ چکا تھا۔

"یہ زرینہ طوائف ہے!" نوجوان مرد نے بظاہر آہستہ کہا مگر اس کی آواز زرینہ کے کانوں میں پہنچ گئی۔

"طوائف زرینہ" رضیہ نے حیرت زدہ لہجے میں کہکر زرینہ کی [illegible] رضیہ نے حقارت سے منہ دوسری دوسری طرف پھیر لیا۔ "میری حقیقی بیٹی اپنی ماں سے اتنی نفرت کرے۔ لیکن میں کون ہوں، ایک ذلیل طوائف ۔ اف کیا؟" زرینہ نے دل ہی دل میں کہا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں۔ وہ اٹھی اور ایک طرف چلنے لگی۔ اس وقت وہ ایک ایسے قیدی کی طرح تھی جسکے پاؤں میں بھاری زنجیریں ہوں۔ مگر جو اس حالت میں بھی چلنے پر مجبور کیا جا رہا ہو ۔۔۔ آہ ستم!

کچھ دور جاکر وہ درخت کی اوٹ میں سے اپنی بیٹی کو دیکھنے لگی۔ چاندنی میں اس کی بیٹی کا چہرہ چاند کی مانند چمک رہا تھا۔ زرینہ نے جیب سے ایک کاغذ نکالا یہ رضیہ کی اسوقت کی فوٹو تھی جب وہ پانچ سال کی تھی۔ فوٹو کو اس نے سینے سے لگا لیا۔ اور رضیہ کو دیکھنے لگی۔ اسکے لب تھرتھرانے لگے۔

رضیہ! میری بیٹی ۔۔۔ میری بیٹی!! یہ کہتے ہوئے اسکی آنکھوں سے سیل گریہ جاری ہو گیا" میری بیٹی رضیہ! تو میرے پاس ہے۔ مگر بیٹی! میں تجھے کیونکر بتاؤں میں تیری ماں ہوں ۔۔۔ تیری ماں ۔۔۔ میری رضیہ تیری ماں ہے" اسکی سسکیوں کی آواز فضا میں لرزنے لگی۔ اچانک اسے ایسا محسوس ہوا کہ کسی نے اسکے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا ہے۔ اس نے مڑکر دیکھا فیروز اسکے پاس کھڑا تھا۔ اس کی آنکھوں میں شیطانی مسکراہٹ نمودار تھی۔

"اسوقت یہاں سے چلے جاؤ فیروز!" زرینہ نے دو قدم پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔

"اب تو میں اپنا فرض ادا کر کے جاؤنگا" یہ کہتے ہوئے اس نے زرینہ کے ہاتھ سے فوٹو چھین لیا۔ اور پیچھے ہٹکر

اسے دیکھنے لگا ۔ زرینہ اس پر جھپٹی مگر بے سود ۔

"فیروز !"

"بائی جی! معاف کرنا ذرا گستاخی سے پیش آرہا ہوں ۔"

"فیروز تصویر دو اور یہاں سے چلے جاؤ ۔"

فیروز نے اس کی بات سنی ان سنی کر کے شاخوں کو بنا کر رضیہ کی طرف دیکھا ۔ اسکے لبوں پر شرارت انگیز مسکراہٹ رقص کرنے لگی ۔

"میں سب کچھ سمجھ گیا ہوں ۔ قدرت نے آج مجھے انتقام لینے کا موقعہ دیا ہے ۔ کیا تمہارا خیال ہے ۔ میں اس موقعہ سے فائدہ نہیں اٹھاؤنگا ۔؟"

"کیا کہہ رہے ہو تم ؟"

"میں کیا کہہ رہا ہوں ——— تم نے نہیں سمجھا خیر اب سمجھ لو ۔ وہ شخص جو تمہاری بیٹی کے پہلو میں بیٹھا ہوا ہے ۔ تمہاری بیٹی کا خاوند ہے ۔ اس دن اس نے مجھے ذلیل کیا تھا ۔ مجھے کہا تھا ۔ کہ میں نے ایک فاحشہ عورت کو خوش کرنے کے لئے ذلیل کام کیا اور آج اسی فاحشہ عورت کی بیٹی اس کی بیوی ہے ——— آہاہاہا ——— ہاہا ——— ہاہا ۔"

یہ الفاظ سنتے ہی زرینہ کو ایسا محسوس ہوا کہ اسکی پشت پر ایک پہاڑ آگرا ہے کانوں میں کسی نے تیزاب ڈالدیا ہے ۔

"فیروز" اسکے لبوں سے باریک سی آواز میں نکلا ۔

"فاحشہ عورت کی بیٹی ——— اور اس کی بیوی کتنا عجیب واقعہ ۔ کتنا عجیب !!"

"فیروز خدا کے لئے خاموش رہو ۔"

"اب خاموشی کا وقت ہے ؟؟"

"کیا کرنا چاہتے ہو تم ؟؟"

"کیا کرنا چاہتا ہوں یہ تم ابھی دیکھ لوگی ۔ اس بدمعاش نے اس دن مجھے ذلیل کیا تھا اب میں اسے ذلیل کروں گا ۔ میں نے ایک فاحشہ عورت کو خوش کرنا چاہا تھا ۔ اور وہ فاحشہ عورت کی بیٹی کو بیوی بنائے ہوئے ہے ۔ آہاہا جب اسے معلوم ہوگا کہ اس کی بیوی فاحشہ عورت کی بیٹی ہے تو ———"

"تم یہ نہیں کہہ سکتے ۔ تم یہ ہرگز نہیں کہہ سکو گے" زرینہ نے یہ الفاظ ایسے لہجے میں کہے جس سے اسکے بے پیمانہ جوش کا اظہار ہوتا تھا ۔

"مجھے روکنے والا کون ہے ؟"

"میں"

"تم ۔ اوہ" فیروز آگے بڑھنے لگا ۔

"ٹھہرو تم آگے نہیں بڑھ سکتے" یہ کہتے ہوئے زرینہ نے پھر جھپٹ مارا مگر فوقیت حاصل نہ کر سکی ۔

"زرینہ! دنیا کی کوئی طاقت مجھے اپنی آرزو پوری کرنے سے نہیں روک سکتی ۔ میرے راستے سے ہٹ جاؤ ۔"

"فیروز! سنو ۔ تمہیں میرے سر کی قسم ہے ۔ اس ارادے کو چھوڑ دو ——— میں ہمیشہ کے لئے تمہاری ہو جاؤں گی تصویر دو اور چلے جاؤ ۔"

"میں اس وقت تمہاری کوئی بات سننے کے لئے تیار نہیں ہوں ۔"

"کیا تم میری التجا کو رد کر دو گے ——— مجھے ٹھکرا دو گے" زرینہ نے عاجزانہ لہجے میں کہا ۔

"اتنا تمہارا دل رکھنے کے لئے میں تمام دنیا کی ...

نعرا دونگا۔ ہٹ جاؤ۔"

"تم ایسا نہیں کر سکتے۔ میں نہیں ہرگز ایسا نہیں کرنے دوں گی۔"

"تو مجبوراً مجھے سختی سے کام لینا پڑیگا۔"

"تم جو چاہو کرو۔"

"اب بھی موقعہ ہے، میرے راستے سے ہٹ جاؤ ورنہ"

——فیروز کے ہاتھ میں پستول چمکنے لگی۔

"نہیں، ہزار بار نہیں۔"

"میرے راستے سے نہیں ہٹو گی؟"

"نہیں۔ نہیں۔"

فیروز کی انگلیوں کو جنبش ہوئی۔ گولی زرینہ کے سینے پر لگی اور وہ لڑکھڑا کر گر پڑی۔ فیروز آگے بڑھنے لگا۔ یکایک زرینہ خون میں لت پت ایک زخمی شیرنی کی طرح اٹھی اور فیروز سے لپٹ گئی۔ معلوم نہیں اسوقت اس کے بدن میں کہاں سے اتنی طاقت پیدا ہو گئی تھی کہ وہ فیروز کو پیچھے دھکیلتی جا رہی تھی۔ قوی اعضا شخص سنبھلنے کی انتہائی کوشش کر رہا تھا مگر اس کے پاؤں جمنے کا نام ہی نہ لیتے تھے۔ یہاں تک کہ دونوں چوٹی کے کنارے پہنچ گئے اور چشم زدن میں دونوں نیچے گر پڑے۔

گولی کی آواز معمولی سا واقعہ نہیں تھا۔ لوگ بھاگم بھاگ وہاں آ رہے تھے ان میں رضیہ اور اسکا شوہر بھی تھا۔ ہر ایک شخص عجیب عجیب تاویل کر رہا تھا —— چند منٹ کے بعد رضیہ اور اس کا شوہر لوٹنے لگے۔

"مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تمہاری بات حقیقت پر مبنی ہے ماں باپ کے مقابلے میں زیادہ قربانیاں کر سکتی ہے۔"

اس کے شوہر نے کہا۔

"تمہارا خیال اتنی جلدی کیوں بدل گیا؟"

"معلوم نہیں کیوں، مگر میرے دل میں یہ یقین ہو گیا ہے۔"

"درست۔"

رضیہ نے پیار بھری نظروں سے اپنی بچی کو دیکھا۔ اور فرط محبت سے اسے سینے کے ساتھ بھینچ لیا۔

جناب ابو الاعجاز سیف اکبر آبادی

سوزِ ناتمام

صحبتِ پیرِ میکدہ عمر ہوئی حرام ہے
میرے لبوں پہ آج تک پھر بھی حدیثِ جام ہے

ہائے یہ نامرادیاں، ہائے یہ تیرہ بختیاں
صبحِ امید بھی مری ہجر کی ایک شام ہے

مجھ کو بلائیں گے کبھی، آپ وہ آئیں گے کبھی
وہ بھی خیالِ خام تھا، یہ بھی خیالِ خام ہے

خواب و خیال ہو گئیں، اہلِ وطن کی صحبتیں
اب نہ سحر ہے وہ سحر، شام نہ اب وہ شام ہے

ہجر کی ہے ہر ایک سانس، دعوتِ وصل کا پیام
اور ذرا سی دیر میں قصۂ غم تمام ہے

طولِ شبِ فراق میں زیست سے بدگماں نہ ہو
اپنی قضا سے کھیلنا اہلِ وفا کا کام ہے

آج نہیں تو کل سہی، زادِ سفر کی فکر کر
کس کو یہاں ثبات ہے، کس کو یہاں قیام ہے

سیف یہ تیری بے رخی اچھی نہیں ہے یار سے
تیرے لئے تو لازمی حسن کا احترام ہے

جناب خلیل بی۔ اے

دیوتا اور انسان

منظر ایک بوڑھا دیوتا اپنی ہی بستی کے اندرونی کمرے میں بیٹھا ہے اور حیات نرم روکی جادو سا ماحول سے اپنی زندگی کو قوت بخش رہا ہے۔ رسم و رواج کے لحاظ سے بظاہر اس میں کوئی دیوتاؤں کی نشانی نہیں۔ اس برعکس سکوت طاری ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کڑکتے ہوئے طوفان اسکے اردگرد سے گزر چکے ہیں لیکن اس کی پیشانی پر مطلق بل نہیں آیا۔ ایک تماشائی کی حیثیت سے اس نے عقل و دانش کا بے پایاں سمندر اپنے سینے کے اندر بند کرلیا ہے اور محنت شاق سے ایک غیر فانی تجربۂ حیات اسے حاصل ہو چکا ہے وہ اپنی ہی تجلی میں "کتاب زندگی" کا مطالعہ کر رہا ہے۔ جب ورق الٹتا ہے تو ایک دھندلی سی روشنی صفحات میں سے نکل کر اس کے پرسکون، مطمئن اور متین چہرے پڑتی ہے۔ چہرے کی ہلکی سی جھریاں اس کی ضعیف العمری کا پتہ بتا رہی ہیں۔ ایک سپید روشنی کا کرہ اس کے ایک ہاتھ کے نیچے ہے جس میں کبھی کبھی مختلف رنگ حرکت کرتے ہیں۔ فضا کے ماحول سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی تخلیقی دنیا میں اطمینان سے بیٹھا ہے۔

ایک دروازہ جو بادلوں کی دھندلی آمیزش سے بنا ہوا ہے نظر آتا ہے۔ دروازے پر ایک دستک ہو۔ تھوڑے وقفے کے بعد دہرائی جاتی ہے۔ "خاموش دیوتا" (اسکے مطمئن اور پرسکون اطوار سے اسے خاموش دیوتا ہی کہنا مناسب ہوگا) آواز سنتا ہے لیکن چہرے سے پتہ چلتا ہے کہ اسکے سکون کا سلسلہ برہم نہیں ہوا۔ وہ ورق الٹ رہا ہے اور ساتھ ہی نہایت تسکین آمیز لہجہ میں کہتا ہے۔)

خاموش دیوتا۔ اندر آجاؤ۔

(وہ شخص اندر آتا ہے بالکل مختلف کردار ہے سپاہی بھی معلوم ہوتا ہے اور پجاری بھی۔ دیوتاؤں کا امتیازی نشان اسکی شخصیت سے نمایاں ہے سینکڑوں برس سے وہ دیوتاؤں کا روپ دھارن کئے ہوئے ہے اور وہ لوگ جو اسکے آگے سرتسلیم خم کرتے ہیں۔ اسکی ظاہری تمکنت اور جلال سے خوفزدہ ہو سکتے ہیں۔ ایک وقفہ کے لئے نیچی نگاہیں کئے ہوئے وہ اسکی طرف دیکھتا ہے۔ اور اسے دیکھ کر کچھ پریشان سا ہو جاتا ہے غالباً اس خیال سے کہ اسکا استقبال اس قدر گہری خاموشی کے ساتھ ہوا ہے۔ نووارد دیوتا مہر سکوت توڑتا ہے)

خاموش۔ کہئے کیا حال ہے؟

نووارد۔ (مسرت کے ساتھ) (وہ) بہت اچھا۔ بڑا [illegible]

خاموش - بوڑھا ہوتا جا رہا ہو۔

نووارد - بوڑھے ہوتے جا رہے ہو؟ لیکن دیوتا تو بوڑھے نہیں ہوا کرتے وہ تو لازوال ہوتے ہیں۔

خاموش - ہاں میں بھی ایسا ہی خیال کیا کرتا تھا لیکن میں غلطی پر تھا تمہیں معلوم ہوگا کہ آج بہت سے دیوتا بالکل بوڑھے ہو چکے ہیں۔ انسانوں نے انہیں بھلا دیا تو ان کی ہستی بھی نابود ہو گئی۔

نووارد - ہاں! وہ دیوتا جھوٹے ہوتے ہیں۔

خاموش - لیکن اپنے وقت میں وہ سچے دیوتا تھے انسان ان کی پوجا کیا کرتا تھا۔ جب اس نے پوجا کرنا ترک کر دی تو وہ دیوتا بھی صفحۂ ہستی سے مٹ گئے۔

نووارد - دیوتا کی زندگی کا انحصار انسان کے اعتقاد پر منحصر نہیں ہے لیکن شرط یہ ہے کہ وہ دیوتا صحیح معنوں میں دیوتا ہو۔

خاموش - لیکن تمہارے اس اصول پر مجھے شبہ ہو گیا ہے اپنی زندگی کا وہ زمانہ میرے ذہن سے مٹ چکا ہے جبکہ میرے پجاری دنیا میں نہ تھے!

نووارد - لیکن تم نے اپنی دنیا انسان کی آفرینش سے پہلے بنائی تھی اور میں نے بھی۔

خاموش - ہاں! اس وقت میں نیم شعوری حالت میں تھا شعورِ مطلق کا احساس مجھے اس وقت ہوا جب انسان دنیا میں آیا۔ اس کی پیدائش سے پہلے تمہیں یاد ہے دنیا میں کیا ہوتا تھا؟

نووارد - ہاں! طلاطم، طوفان، آندھیاں، سمندروں کا غضبناک شور، عقاب اور بھیڑیوں کی چیخیں، شیروں کی گرج، بادلوں کی کڑک، بجلی کی چمک، اندھیرا ــــ دور تک اندھیرا ــــ موت کا سایہ اور قدرت کی ہنگامہ خیزیاں ــــ ہماری پیدا کی ہوئی طاقتیں۔

خاموش - لیکن ان کے سوا کچھ اور بھی تھا؟ جب تک انسان نہ آیا تھا ہم کیا تھے؟ انہیں طاقتوں کے شور و غل میں سرگرداں یہ طاقتیں ہماری ہی آوازیں تھیں یا صدائے بازگشت، کیا ہمیں اس وقت یہ احساس تھا کہ ہم دیوتا ہیں؟ تم اپنی طاقت کا اظہار کسی پر کرنا چاہتے تھے لیکن تم یہ نہ سمجھ سکے کہ تمہارا عتاب کون برداشت کریگا۔ ایک بھوکے شیر کی طرح ہوا سے جھپٹتے ہوئے ادھر ادھر پھر رہے تھے۔ لیکن تم نہیں جانتے تھے کہ تم کیا چاہتے ہو؟

نووارد - کیا کوئی دیوتا اس چیز کی بھی خواہش کرتا ہے جس کا سرے سے وجود ہی نہ ہو؟

خاموش - بالکل! میری طرف نگاہ ڈالو میں آج اس چیز کے لئے تڑپ رہا ہوں جو انسان نے مجھے ابھی تک نہیں دی اور ممکن ہے میں اس چیز کی آرزو ہی میں مر جاؤں لیکن امید پر بیٹھا ہوں اور آخری لمحوں تک انتظار کرونگا

نووارد - اور اسی انتظار میں تم بوڑھے ہو رہے ہو، میں بوڑھا نہیں ہو سکتا،

خاموش - تم کیا کرتے ہو؟

نووارد - حکومت۔ شاہنشاہی، میں اپنی مرضی سے انسان کو اپنے اشاروں پر چلا رہا ہوں۔

خاموش - کیا تم نے اسے [illegible] تمہارا کہنا مانتے ہیں؟

نووارد۔ جب وہ آسمانی حکم کی تعمیل نہیں کرتے تو میں انہیں سزا دیتا ہوں۔

خاموش۔ کیا سزا کے بعد وہ تعمیل نہیں کرتے؟

نووارد۔ کبھی کرتے ہیں کبھی نہیں کرتے!

خاموش۔ اور اگر نہ کریں تو؟

نووارد۔ تو پھر دوبارہ سزا دیتا ہوں۔

خاموش۔ اسکا مطلب ہے کہ تمہاری سزا کا سلسلہ کبھی ختم نہیں ہو سکتا؟

نووارد۔ ہاں اسکے بغیر نظام کائنات کے بگڑ جانے کا اندیشہ ہے۔

خاموش۔ میں اب انسانوں کو سزا نہیں دیا کرتا۔

نووارد۔ اسی لئے تو بوڑھے ہوتے جا رہے ہو؟

خاموش۔ ہاں ایک مدت مدید کے بعد میں نے اس راز کو پایا ہے' جب انسان گناہ کرتا ہے تو میں اس لئے اُسے چھوڑ دیتا ہوں کہ وہ خود اپنے آپ کو سزا دے۔

نووارد۔ (بے اعتنائی سے) اس کا انجام؟

خاموش۔ نہایت خوفناک' انسان جب اپنے آپ کو سزا دیتا ہے وہ اس قدر کڑی ہوتی ہے کہ ہماری سزائیں اس کے مقابلے میں خاک بھی حیثیت نہیں رکھتیں' اور ہماری سزائیں تو انہیں مغرور اور باغی کر دیتی ہیں انسان اپنی سزا ہی سے انسان بن سکتا ہے۔

نووارد۔ اس طرح وہ کیا حاصل کرتے ہیں؟

خاموش۔ اپنی غلطی کا احساس' انسان کو سزا۔ ولیکن اسکے بعد وہ اپنی رائے پر اڑا رہیگا' اپنے آپ کو سزا دینے کے لئے اسے رہا کر دو' وہ اپنی فراست سے اپنی غلطی کا اعتراف کریگا۔

نووارد۔ تم بھی عجیب دیوتا ہو!

خاموش۔ ہاں میں بھی محسوس کر رہا ہوں کہ میں عجیب ہوں۔ میں باخبر ہو رہا ہوں۔

نووارد۔ کیا تم اپنے آپ کو سزا دے رہے ہو؟

خاموش۔ یونہی سمجھ لو' میں اس بات سے آگاہ ہو رہا ہوں کہ میں نے کہاں کہاں غلطی کی۔

نووارد۔ دیوتا کبھی غلطی نہیں کیا کرتے۔

خاموش۔ یہ بات صرف تمہارے پجاری کہا کرتے ہیں۔ ورنہ درحقیقت دیوتا بھی غلطی کرتے ہیں۔ تم انسانوں کو سزا دیکر اپنے آپ کو جوان اور لافانی بنا رہے ہو۔ اور میں . . . میں تو بوڑھا ہو گیا ہوں

نووارد۔ کیا تم نے بوڑھے ہونے کا ارادہ کر لیا ہے؟

خاموش۔ ہاں!

نووارد۔ لیکن جب تم اتنے بوڑھے ہو گئے کہ اس سے زیادہ بوڑھے نہ ہو سکو گے تو پھر کیا کرو گے؟

خاموش۔ پھر میں مر جاؤنگا۔

نووارد۔ لیکن دیوتا تو نہیں مرا کرتے۔

خاموش۔ یہ بھی تمہارا غلط خیال ہے' آج کتنے دیوتا ہیں جو بالکل مر چکے ہیں اور جو اپنے وقت ہیبتناک دیوتا ہوا کرتے تھے۔ وہ جھوٹے دیوتا نہ تھے۔ وہ ہمارے بھائی تھے لیکن انسان انہیں فراموش کر چکا ہے۔ اسلئے وہ مر چکے ہیں' غور کرو ہماری ہیبتناک اور مقدس

ہستیاں کس کام کی ہیں۔ ہم تو سراسر انسان کے رحم پر جی رہے ہیں۔ انسان چاہے تو ہمیں زندہ رکھے اور اگر نہ چاہے تو نہیں۔ دوتا بود کر دے۔ وہ ہمارے بھائی وہ باجبروت دیوتا تو تمہیں بھولے نہ ہوں گے۔؟

نووارد۔ تو کیا تم بھی انہیں کی طرح مٹ جانا چاہتے ہو؟

خاموش۔ ان کی طرح تو نہیں، وہ بیچارے کہاں مٹنا چاہتے تھے، ان کو مٹانے والا انسان تھا۔

نووارد۔ اسکا مطلب ہے کہ تم ارادتاً مرجانا چاہتے ہو۔

خاموش۔ بالکل اپنی مرضی سے۔

نووارد۔ تم سے باتیں کرنے میں بھی ایک مزہ ہے تم اپنی مرضی سے کس طرح مر و گے؟ اگر دیوتا مر جائے تو اسکا مطلب ہے کہ انسان اس کی ضرورت محسوس کرنا بھول جائیگا۔

خاموش۔ بالکل۔

نووارد۔ پھر وہ دیوتا دیوتا نہیں رہیگا۔

خاموش۔ یہ بھی میں مانتا ہوں۔

دیوتا۔ پھر دیوتا کی ہستی کا کیا مقصد ہوتا؟

خاموش۔ انجام کا ایک آلہ، کہ وہ انسان کو اپنا آپ پہچاننے میں مدد دیتا ہے اور جب انسان نے اپنے آپکو پہچان لیا تو پھر اسے دیوتا اور انسان ایک ہی ہستی میں سما جاتے ہیں۔ میں ایک ان کا منتظر ہوں۔

نووارد۔ تو کیا تم اسی لئے بڑا پا محسوس کر رہے ہو؟

خاموش۔ ہاں میرا خیال یہی ہے!

نووارد۔ کچھ انسانوں کو اب تمہاری ضرورت نہیں رہی؟

خاموش۔ ابھی تک تو انہیں میری ضرورت ہے کیونکہ میں ابھی موت کے دامن میں نہیں آیا۔ لیکن ایک وقت آئیگا کہ وہ مجھ سے بالکل بے نیاز ہو جائیں گے جب اس نے مجھ سے محبت کے سبق کی تکمیل کر لی تو اسکے بعد میرا کام ختم ہو جائیگا۔

نووارد۔ لیکن سچ کہنا۔ کیا تم اپنے لئے کچھ نہیں چاہتے؟ کیا تم اپنی تسکین کے لئے ہمیشہ معبود نہیں بننا چاہتے؟

خاموش۔ جب تک وہ میری عبادت کرنے جائیں گے میں قبول کرونگا۔ لیکن میں انہیں مجبور نہیں کر سکتا۔

نووارد۔ تو فیصلہ ہوا؟

خاموش۔ ابھی تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ہم دونوں کچھ سمجھوتہ کر سکیں تو بہتر ہوگا۔

نووارد۔ میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکتا۔ تم نے اپنے آپ کو بالکل گرا لیا ہے۔ مجھ سے ایسے نہیں ہو سکیگا اگر انہیں کی مرضی پر چھوڑ دیں تو وہ ہمیں خاک دینگے میں تو ان سے وہ چیز بھینٹ لیا کرتا ہوں جو وہ نہ دینا چاہیں،

خاموش۔ مثلاً۔

نووارد۔ یہ کہ میں انسانوں سے بھینٹ کے لئے وہ چیز طلب کرتا ہوں جو انکو عزیز ترین ہو۔ بعض اوقات انکے بچے بھی!

خاموش۔ لیکن یہ قربانیاں ان کی رضا پر ہی منحصر ہیں۔ اگر ان کی مرضی نہ ہو تو وہ نہ دینگے، ہم تو بالکل ان کے ہاتھوں میں ہیں اور وہ بیچارے یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ ہمارے ہاتھوں میں ہیں۔

نووارد۔ خیال نہیں بلکہ یہ ان کا اعتقاد ہے۔

خاموش۔ لیکن میں اس کے خلاف ہوں۔ بڑھاپے نے مجھے بہت کچھ سکھا دیا ہے۔ ان قربانیوں کی اہمیت کا راز مجھ پر منکشف ہو چکا ہے۔ انسان صرف اپنے ذاتی مفاد کو مدنظر رکھ کر قربانی کیا کرتا ہے۔

نووارد۔ تم آج کل ان سے کون سی قربانی طلب کیا کرتے ہو؟

خاموش۔ محبت

نووارد۔ محبت؟ وہ تو ہمیشہ سے کیا کرتے تھے۔

خاموش۔ یہ غلط ہے۔ پہلے وہ مجھ سے خوفزدہ ہو کر خون اور گوشت کی قربانی دیا کرتے تھے۔ وہ مجھ سے محبت نہیں کرتے تھے۔ اور نہ ہی میں ان سے کرتا تھا۔

نووارد۔ تم کیا کرتے تھے؟ ان سے خوف نہیں کھاتے تھے؟

خاموش۔ نہیں میں ان سے کبھی بھی خوفزدہ نہ ہوا۔ لیکن میں یہ نہ جانتا تھا کہ یہ کس لئے، بہت عرصے کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ وہ مجھ سے خوفزدہ ہیں۔ اگر میں ان سے خوف کھاتا تو اس راز کو بہت جلد پا لیتے۔

نووارد۔ وہ کیونکر؟

خاموش۔ اس طرح میں انسانوں کے نزدیک تر ہو جاتا۔

نووارد۔ نزدیک تر؟

خاموش۔ ہاں! دیوتا اور انسان میں یکسانیت نہایت ضروری ہے۔ صحیح عبادت کا عظیم ترین مقصد یہی ہے کہ معبود اپنے بندے کو فوراً جواب دے۔ کیونکہ عابد و معبود کا صحیح رشتہ اسی وقت قائم ہو سکتا ہے جبکہ انسان عبادت کرے اور معبود اسکو فوراً [illegible]

خوف اور ہیبت انسان کو دیوتا سے جدا کرتے ہیں جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ وہ مجھ سے ڈرتے ہیں تو میں [illegible] پشیمان [illegible] کہ وہ مجھے نہ سمجھ سکے۔

نووارد۔ [illegible]؟

خاموش۔ [illegible] نہیں [illegible] کی کبھی خواہش نہیں کی اگرچہ مجھے [illegible] پر ترس آتا تھا لیکن میں کچھ کہہ نہ سکتا تھا۔ کیونکہ اس راز کو معلوم کرنا انکا اپنا فرض تھا [illegible] مدت دراز کے بعد [illegible] یہ بھید کھلا۔

نووارد۔ [illegible]؟

خاموش۔ [illegible] قربانیاں کرتے [illegible] کی عقیدتمندیاں ان کی خودی پر ایک پردہ ڈالے ہوئی ہیں۔ جو چیز [illegible] بھی نہیں ہوتی [illegible] حقارت کی نگاہ سے دیکھنے لگا۔ مجھے ان سے خون کی بو آنے لگی میری بے اعتنائی پر انہوں نے قربانیاں کرنا بند کر دیں [illegible] اس موقع کی تلاش میں تھا، وہ اس وقت بھی میری پوجا کرتے تھے لیکن کسی اور رنگ میں۔

نووارد۔ [illegible]؟

خاموش۔ [illegible] بلکہ وجد میں میری پرستش کر [illegible] نگاہوں سے ان کی طرف [illegible] انقلاب [illegible] تھا، ایک [illegible] یہ کہ وہ میری [illegible] کی [illegible] ہیں۔ [illegible]

نووارد - اف! اتنا کفر! کیا وہ کامیاب ہو گئے؟

خاموش - افسوس! وہ کامیاب نہ ہوئے۔ یہ سب میری غلطی کا نتیجہ تھا۔ جس طرح وہ مجھ سے خوف کھاتے تھے اس طرح وہ دنیا پر اپنی ہیبت پھیلانے لگے۔ گذشتہ تعلق سے انہوں نے یہ سبق حاصل کیا کہ دیوتاؤں سے ہمیشہ خوفزدہ رہنا چاہئے۔ حالانکہ میرا ارادہ یہ نہیں تھا۔ ان پر ہیبت طاری کرنے کی میری آرزو کبھی نہ ہوئی تھی لیکن ہم دیوتاؤں کے اصول ہی اس قسم کے ہیں کہ انسان صرف خوف کی وجہ سے ہمارے ساتھ تعلق قائم رکھتا ہے یہ میری بڑی غلطی ہے۔

نووارد - میں خوف و دہشت میں کوئی عیب نہیں سمجھتا۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ میں صرف انہیں دو چیزوں سے آج دنیا پر حکومت کر رہا ہوں اور تمہاری طرح بڑھاپا محسوس نہیں کر رہا۔ ایک دفعہ پھر آزماؤ! اپنی بے پناہ طاقتوں کو سرد نہ پڑنے دو۔

خاموش - نہیں نہیں!! جو راستہ میں پامال کر آیا ہوں اس پر واپس نہیں جانا چاہتا۔ البتہ میرے دل میں بھی انسانوں کا سا ہوس پیدا ہو جائے تو میں کامرانی تصور کروں گا۔

نووارد - اپنی پیدا کی ہوئی چیز انسان سے دیوتا کبھی خوفزدہ نہیں ہو سکتے

خاموش - آخر ایک دن موت کا خوف پیدا ہو جائے تو یہی ہو سکتا ہے

نووارد - موت؟

خاموش - ہاں! موت سے دیوتا کو کبھی نہیں خوفزدہ ہونا چاہئے۔ میں اس راز کو پا چکا ہوں کہ جب دیوتا موت سے نہ ڈرے تو انسان بھی اس سے ڈرنا چھوڑ دے بلکہ اس کی محبت میں مخمور ہو جائے۔ اس حالت میں دیوتا اپنے پجاریوں کے دلوں میں جاگزیں اور حقیقی معنوں میں امر ہو جاتا ہے۔

نووارد - میں نہیں سمجھ سکا!

خاموش - میں بھی اس وقت تک نہیں سمجھ سکا تھا جب تک کہ میں نے اپنا زوال محسوس نہ کیا!

نووارد - لیکن تم نے ابھی کہا تھا کہ تم بالکل نیست و نابود ہونا چاہتے ہو۔

خاموش - ابھی تک انسان ایک اور رنگ میں میری پرستش کر رہے ہیں۔ جب میں دیکھوں گا کہ انہوں نے میری پوجا بالکل ترک کر دی ہے۔ تو اس وقت میں نہایت مسرت سے نابود ہو جاؤں گا۔

نووارد - تم انہیں مجبور کرو کہ وہ ہمیشہ تمہاری پوجا کرتے رہیں

خاموش - یہ میرے بس کا روگ نہیں۔

نووارد - لیکن مجھے تو یہ ایک ذلت آمیز انجام محسوس ہوتا ہے

خاموش - میرا بھی یہی خیال تھا لیکن میں نے ایک روز اپنے پجاریوں کو کہتے سنا "خدا محبت کا دوسرا نام ہے" پہلے تو میں حیران ہی رہ گیا۔ لیکن بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ ان الفاظ میں کس قدر صداقت تھی! میں بھی پجاریوں سے محبت کرنے لگا۔ میں عشق کے بے پایاں سمندر میں بہتا جا رہا تھا۔ میں اپنے دوست اور دشمن سے محبت کرنے لگا۔ جس دن مجھے یہ محسوس ہوگا کہ میری اور انسان کی محبت بالکل ہم پلہ اور یکساں ہے اور جس دن میں نے یہ سن لیا کہ "انسان محبت کا دوسرا نام ہے" انہیں میری ضرورت نہ رہے گی۔ (باقی منظر)

سے پرے ہٹ جاؤنگا جب انہیں یہ محسوس ہوگیا
کہ انسان محبت کا دوسرا نام ہے۔ تو وہ تمام دیوتاؤں
سے بے نیاز ہوجائینگے۔ لیکن ابھی اس کے لئے ایک
طویل مہلت کی ضرورت ہے۔!

نووارد۔ اور اسی لئے تم بوڑھے ہو رہے ہو؟

خاموش۔ ہاں! مجھے تو بوڑھے ہونے کا مطلق غم نہیں۔
اسکا مطلب یہ ہے کہ وہ وقت قریب آرہا ہے۔ جب
انسان میری ذات سے بے نیاز ہوجائے گا۔ ابھی
تو اسے میری ضرورت ہے اور اسی انتظار میں میں
نے ایک ایسا راز معلوم کیا ہے جس کا تجربہ مجھے
پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔

نووارد۔ وہ کیا ہے؟

خاموش۔ ایک حسین وجمیل راز جس سے میرے بڑھاپے
کو ایک گونہ تسکین ہورہی ہے۔

نووارد۔ وہ ہے کیا؟

خاموش۔ وہ دیوتا جنہیں انسان محبت کرتا ہے ـــ
بہت بوڑھے ہوکر مرتے ہیں، مجھ سے انسان محبت
کرتا ہے۔ اس لئے میں بہت ہی بوڑھا ہوکر مرونگا
ــــــ کتنا زریں مستقبل!

(ترجمہ)

نقد و نظر:

سالنامہ شاعر۔ (مرتبہ حضرت اعجاز صدیقی اکبرآبادی، کتابت وطباعت جاذب نظر، ضخامت پانچسو چوبیس صفحات، قیمت عـہ، مقام اشاعت قصر الادب آگرہ)

اردو کے موجودہ ممتاز لسانی مراکز میں قصر الادب آگرہ کو جو حیثیت حاصل ہے وہ دنیائے اردو سے پوشیدہ نہیں۔ اپنے قابل احترام بانی مولانا سیماب اکبرآبادی کی زیر قیادت اس مرکز ادبیہ نے حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ ہزاروں اس سرچشمے سے سیراب ہوچکے ہیں اور ہزاروں ہورہے ہیں۔ قارئین کرام جانتے ہیں کہ کچھ عرصہ پیشتر "شاعر" کا آگرہ نمبر شائع ہوا تھا جسمیں قدیم وجدید آگرہ کے شعراء ومصنفین کے حالات زندگی اور ان کی دماغی کاوشوں پر تبصرہ شائع ہوا تھا۔ اور اب "شاعر" کا حسین وجمیل اور اسکے ساتھ ہی ضخیم سالنامہ بغرض تبصرہ دفتر میں وصول ہوا ہے۔ یہ سالنامہ تین حصوں پر مشتمل ہے!

پہلا حصہ۔ اس میں اردو کے ممتاز اہل قلم کے مضامین نظم ونثر شائع ہوئے ہیں۔ مولانا سیماب کی نظم "تاج شاہی محبت کی ٹھوکروں میں" نہایت جدید اور پرکیف نظم ہے۔ اسمیں ایڈورڈ ہشتم اور انکی محبوبہ کے افسانۂ عشق کو بہت رنگین پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ اشتراکی شاعری حضرت جوش، حسن منٹو کا ایک کامیاب مضمون ہے اور "مرد و عورت" محترمہ حجاب امتیاز علی کا دلچسپ افسانہ۔ حصہ نظم خاص طور پر بلند و ممتاز ہے۔

دوسرا حصہ۔ اس میں آگرہ سکول کی خصوصیات پر روشنی ڈالی گئی ہے، بالخصوص مولانا سیماب کی شاعری کے مختلف پہلوؤں کو

موضوعِ بحث ہیں۔ مگر ان کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کیا گیا ہے۔

تیسرا حصہ بھی مولانا کے یکسو یا دہ شاگرد ابن رشید کے مختصر سے حالاتِ زندگی، انکے کلام کا انتخاب اور بہتوں کے فوٹو بھی دیے گئے ہیں۔ آغاز میں مدیر محترم کے قلم سے اپنے کارواں کے نام ایک پیام ہے جسکے بعض فقرات تو کئی کئی لیکچروں پر حاوی ہیں۔

شاعر کا یہ ضخیم سالنامہ اردو میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہے۔ امید ہے ملک جناب اعجاز صدیقی کی جانفشانیوں کی قدر کرے گا۔ اور ان کی یہ کوشش ان کی اعجاز طرازی پر شاہد ہے۔ (م - ل)

ساقی کا افسانہ نمبر

(مرتبہ حضرت شاہد احمد بی اے (آنرز) کتابت و طباعت حسین و جاذبِ دل ضخامت ۲۰۴ صفحات- قیمت ایک روپیہ۔ مقام اشاعت دفتر ساقی دہلی)

ماہنامہ ساقی اردو کے ان رسالوں میں شمار ہوتا ہے جو حقیقی معنوں میں اردو کی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ جناب شاہد احمد صاحب بی اے (آنرز) ایڈیٹر ساقی ایک مخلص سرگرم نوجوان ہیں اور خود بھی نہایت اچھے مترجم و نقاد ہیں۔ فاؤسٹ کا ترجمہ جو ساقی کے تین نمبروں میں بالاقساط شائع ہوا ہے ان کی مترجمانہ صلاحیت و قابلیت کا بدرجۂ اتم شاہد ہے۔ افسانہ نمبر آپ نے بڑی محنت و جانفشانی سے مرتب کیا ہے اور ساقی کے دیگر خاص نمبروں کی طرح شاندار ہے۔

افسانہ نمبر میں جناب میرزا محمد سعید ایم اے، آئی ای ایس، جناب ایم اسلم، جناب مرزا عظیم بیگ چغتائی، جناب صادق الخیری ایم اے، محترمہ حجاب امتیاز علی، جناب اختر رائے پوری، جناب ل احمد، جناب احمد علی ایم اے، جناب سید بادشاہ حسن اور محترمہ طاہرہ دیوی شیرازی کے مضامین اور افسانے خاص طور قابلِ مطالعہ ہیں۔ منظوم افسانے بھی بہت بلند اور دلچسپ ہیں۔!

بیسویں صدی

(مدیر حضرت خوشتر گرامی، صفحات ۷۶، کتابت و طباعت اعلیٰ۔ سالانہ چندہ دو روپے۔ فی پرچہ تین آنے۔ مقام اشاعت دفتر بیسویں صدی پرانی میوہ منڈی لاہور)

حضرت خوشتر گرامی ایک کہنہ مشق، تجربہ کار صحافی ہیں۔ ملک کے متعدد رسائل و جرائد میں آپ مدیرانہ فرائض نہایت خوش اسلوبی کیساتھ انجام دے چکے ہیں اور اب آپ نے "بیسویں صدی" کے نام سے ایک بلند پایہ رسالہ نکالا ہے۔ اسوقت ہمارے پیشِ نظر اسکا چوتھا نمبر ہے جسمیں بہت دلچسپ رنگین اور اسکے ساتھ ہی کارآمد مضامین نظم و نثر موجود ہیں۔ "نمکدان" کے عنوان سے خوشتر صاحب نے چند ایک واقعات کو مزاحیہ رنگ میں پیش کیا ہے۔ مضمون کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ خوشتر صاحب جہاں سنجیدہ مضامین لکھنے میں خاص دسترس رکھتے ہیں وہاں مزاحیہ مضامین میں بھی انہیں یدِطولےٰ حاصل ہے۔ "پریم بھرے گیت" پنڈت اندرجیت شرما کا ایک پیارا گیت ہے۔ "کالج گرل" مشہور مزاح نگار حضرت "لق لق" کا دلچسپ افسانہ ہے۔ "مقدس گناہگار" کے نام سے جذباتی شاعر حضرت اختر انصاری کا ایک رنگین افسانہ ہے۔ ان حضرات کے علاوہ حضرت اختر شیرانی، مولانا حسرت موہانی، غیر معروف جرنلسٹ، حامد اللہ افسر، خان اصغر حسین صاحب نظیر کے مضامین نظم و نثر موجود ہیں۔ رسالے میں علمی مضامین بھی موجود ہیں جنکا مطالعہ بہت مفید ہے!!

امید ہے رسالہ ہمارے عزیز دوست حضرت خوشتر گرامی کی ادارت میں برابر ترقی کرتا جائے گا۔"

مکمل فائدہ ہونے کے بعد قیمت دیجئے

اشتہار بازی سے مشرقی طریقہ علاج کو سخت نقصان پہنچ رہا ہے۔ لہٰذا پبلک کے اعتماد اور فن طب کے وقار کو واپس لانے کے لئے ضروری ہے کہ
اطباء کرام عملی طور پر اس میدان میں آنا چاہئے۔ گزشتہ دنوں ہم نے چند عجیب اور تیر بہدف ادویات کا اشتہار شائع کیا تھا کہ قیمت بعد تکمیل صحت
چنانچہ یہ تجربہ کامیاب ثابت ہوا اور بیماروں اور ستم خوردہ غریب مریضوں نے بعد صحت خوشی و شکریہ کے ساتھ قیمتیں ادا کر دیں۔ اب سلسلہ کو
جاری رکھتے ہوئے مندرجہ ذیل ادویات پیش کی جاتی ہیں جو ضعف مردی سے بچاتی ہیں اور شوقین مزاجوں میں حیرت انگیز طور پر مقبولیت حاصل کر
چکی ہیں۔

فولاد

شنجرف بسنگسیا جیو کو پانی کی طرح بہا کر طلا تیار کیا جاتا ہے جو عضو خاص کی ہر قسم کی سستی، کمزوری دور کرتا ہے۔ عضو کو مکمل طور پر بحال رکھتی ہیں۔ چند روز کے بعد بدن کی حقیقت بدل جاتی ہے۔ پھر عمر بھر کسی طلاء کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ آبلہ نہیں پڑتا۔ ہر آدمی استعمال کر سکتا ہے۔ اس کے ساتھ کسی طلاء کی کوئی بھی ضرورت نہیں رہتی۔ طبابت پیشہ اصحاب کی رائے ہے کہ عضو خاص کے لئے اس سے بہتر نسخہ شاید دنیا کی کوئی طلاء آج تک نہیں بنا۔

قیمت پانچ روپے پانچ آنے (۵ روپے ۵ آنے)

معجون خاص

واجد علی شاہ کی شہرت ہے کہ کسی ملازم نے بادشاہ کے پان کا فضلہ کھا لیا تھا تو وہ قوت باہ کی زیادتی کی وجہ سے بے چین ہو گیا تھا جو کچھ ہوا ہو اس میں شک نہیں کہ عجیب و غریب چیز ہے۔ حکیم اجمل خاں کے جد امجد حکیم محمد شریف خاں نے لکھا ہے کہ اس سے عضو خاص میں اس قدر سختی اور قوت آ جاتی ہے کہ ہر وقت ..... رہنے سے شرم محسوس ہوتی ہے۔ یہی نسخہ ہے جس سے ساٹھ برس کے بوڑھوں میں جوانی کا شعلہ چمک اٹھتا ہے۔ غیر شادی شدہ بالضرور تا عمر شوقیہ طلب فرمائیں۔ جریان، سرعت، ضعف دل و دماغ قوت حافظہ اور بے پناہ امساک کے لئے جادو کا اثر رکھتا ہے۔ قیمت ۔۔۔

ملک کی آبادی بے شمار مفلس و غریب لوگ ہیں جو سخت مصیبت میں مبتلا ہیں ان کے لئے یہ کوئی خصوص رعایت کہ قیمت مکمل بحکم صحت وصول کر کے صرف اشتہارات
سے ... قیمت سے اصحاب پوری قیمت دیں اور اس میں متوسط الحال اشخاص نصف قیمت پہلے اور نصف بعد صحت۔ جو لوگ نصف قیمت بھی
ادا کرنے سے مجبور ہوں وہ مکمل یقین کے ساتھ مندرجہ ذیل حلف نامہ کے ساتھ بلا قیمت پیشگی طلب فرمائیں۔ یہ بات کہ آپ کل قیمت یا نصف قیمت ادا کر سکتے
ہیں آپ ہی پر چھوڑتے ہیں۔

حلف نامہ

میں خدا کو حاضر ناظر جان کر حلفیہ اقرار کرتا ہوں کہ مکمل فائدہ ہونے کے بعد قیمت مکمل بحکم ہلاک ... یا دو روپیہ کر کے پانچ ماہ
ادا کر دوں گا۔ اس کی قیمت رکھ لینا مجھ پر حرام ہے نیز میں اقرار کرتا ہوں کہ دوا کا خرچ مجھے کتنا ہی ... کرنے سے گریز نہ کروں گا
اور جلد سے جلد ادا کروں گا۔ بعد صحت یابی اعتدال اور جائز طریقہ پر قائم رہوں گا اور فوراً پہلی قسط ... دو روپے بذریعہ منی آرڈر
روانہ کروں گا خدا میری مدد کرے۔

لیکن بعض ... لوگوں نے ... تکلیف ... برداشت کریں یہ انصاف سے بعید اور ہمارے لئے
ناممکن ہے کیونکہ بغیر پیسہ کے موجودہ سلسلہ قائم نہیں رہ سکتا۔ لہٰذا حلف نامہ آنے پر ایک روپیہ دس آنے کا وی پی پارسل روانہ ہوگا۔ فوراً
منگا لینا چاہئے۔ خط و کتابت پوشیدہ رہے گی۔ پارسل پہنچنے پر کوئی یہ نہیں معلوم کر سکتا کہ اس میں کیا ہے۔ اگر خدانخواستہ ایک
ماہ تک مکمل فائدہ نہ ہو تو ہم دوبارہ سہ بارہ ادویات مفت روانہ کریں گے۔ ہر شخص اس سے اطمینان رکھے کہ یہاں کوئی دھوکہ نہیں ہے مگر
... حالات ... نسخہ جات۔ اول اطباء فہرست دوا پارسل کے ہمراہ ہوگی۔ اپنا اور پورا پتہ صاف اور خوشخط لکھئے۔

... دواخانہ ... الہ آباد ... انڈیا

مرض کی صحیح شناخت

یعنی

تشخیص الامراض

نصف علاج کے برابر تسلیم کی جاتی ہے۔ اور صحیح علاج اسی وقت ہو سکتا ہے جبکہ معالج مریض سے دریافت کئے بغیر (یعنی تعین تکلیف کیلئے) تشخیص کر سکے۔ انا المرض کیلئے پہچان وشناخت ہی ایک قابل طبیب کی امتیازی خصوصیت ہے۔ آج کل وہ بیشتر امراض محض اس وجہ سے ناقابل پذیر ہو رہی ہیں کہ ان کا علاج صحیح تشخیص نہ ہونے کی وجہ سے نامکمل رہا۔ یہ غلط ہو گیا آپ کے شہر میں معالج قابل سے قابل موجود ہیں مگر کتنے ایسے ہیں جو فن تشخیص کے ماہر اور تجربہ کار ہیں۔ اگر آپ شاکی ہیں تو مایوس نہ ہوں۔ اس مقصد کیلئے ہماری خدمات سے استفادہ کیجئے ہم مریض سے کچھ دریافت کئے بغیر اپنی ذہنی کاوش اور تجربہ کی بنا پر اصولی تشخیص کرتے ہیں ہمارے اس دعویٰ کی تصدیق کا انحصار آپکے اطمینان پر ہے۔ ایک بار تجربہ کر کے بعد آپ ہمارے معیار علاج اور تشخیص کے متعلق کسی صحیح نتیجہ پر پہنچ سکیں گے بعض بیماریاں ایسی ہوتی ہیں جو ظاہری علامات سے شناخت نہیں کی جا سکتیں مگر اندر ہی اندر مریض کے جسم کو کھوکھلا کر دیتی ہیں ایسے امراض کی تشخیص کیلئے ہم سے رجوع کیجئے۔ نوٹ۔ حال دریافت کرنے کیلئے خواہشمند حضرات اپنا قارورہ ہمراہ لائیں اور اگر تشریف نہ لا سکیں تو بذریعہ خط وکتابت پتہ ذیل پر کل حال تحریر فرمائیں۔

المعلن۔ خادم المرضیٰ حکیم حامد حسین (مستند طبیہ ناجیہ کالج لکھنؤ) تیز اب حاطہ بلڈنگ شیخ سلام الدین لاہور

حضرت یوسف علیہ السلام کی پیش کردہ تعبیر کے مطابق خواب کی تعبیر معلوم کرنا چاہتے ہیں تو

مجموعہ خواب نامہ یوسفی

خواب کی تمام مشہور عربی فارسی اردو کی بڑی بڑی نایاب کتابوں کے مطالعہ کے بعد تالیف کیا ہے مثلاً کرمطالو کہیں موجودہ زمانہ کی ایجادات ریل تار ٹیلیفون ہوائی جہاز بسکوپ گراموفون۔ بائیسکوپ تھیٹر امیگریشن موٹر سائیکل موٹر بائیسکل وغیرہ وغیرہ جیسی اشیاء کو جو کہ خواب میں دیکھنے کی تعبیر پرانی کتابوں میں نہیں ملتی۔ اس میں معنی کی تعبیر درج ہیں۔ غرضیکہ یہ خواب کی کتاب تمام خواب اور تعبیری کتابوں سے اعلیٰ اور عمدہ ہے کتاب کے آخر میں خواب دیکھنے کا علم جسے سامری کہتے ہیں درج ہے۔ اس کے علاوہ قیافہ شناسی کے متعلق ایک ایسا نایاب لاجواب مضمون درج ہے کہ جو آپ نے آج تک نہ دیکھا نہ سنا ہوگا باوجود اسقدر خوبیوں کے اور صفات کے قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے مجلد سنہری صرف دو روپیہ علاوہ محصول ڈاک۔

فہرست مضامین کتاب ہذا

ملنے کا پتہ [illegible]

ادیب شہیر ایم اسلم صاحب کے دو جدید شاہکار

شائقین ادب کیلئے

نفسیات، نکات، اخلاقیات، اقتصادیات کے دلچسپ تخیلات

تفسیر حیات

چالیس افسانوں کا مجموعہ

جن اصحاب نے ایم اسلم کے افسانے پڑھے ہیں ان کو معلوم ہے کہ زندگی کے وہ معمولی واقعات جو انسان کی نگاہ میں کچھ وقعت نہیں رکھتے۔ ایم اسلم صاحب اس میں ایسا رنگ بھر دیتے ہیں کہ پڑھنے والا اُس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا لہذا یہ افسانے کیا ہیں زندگی کے وہ واقعات ہیں جو ہر مرد اور عورت کو کسی نہ کسی وقت ضرور پیش آتے ہیں۔ ایم اسلم کے افسانوں کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ایک معمولی واقعہ سے متاثر ہو کر ایک ایسا رومان خیز افسانہ لکھتے ہیں کہ سو بار پڑھکر بھی طبیعت سیر نہیں ہوتی پھر ان کا طرز تحریر اسقدر دلکش اور اتنا خوبصورت ہوتا ہے کہ ہر افسانہ ایک مکمل ڈرامہ معلوم ہوتا ہے نہایت میٹھے اور سادہ الفاظ میں زندگی کی ایک مکمل اور دلفریب تصویر کھینچکر پیش کرتے ہیں مبدا فیاض سے جو کمال اسلم صاحب کو عطا ہوا ہے وہ دور حاضر کے افسانہ نویسوں میں بہت کم ہے۔ تفسیر حیات قابل مصنف کے ۴۰ افسانوں کا مجموعہ ہے جس کا حجم سوا سات سو صفحات ہے اور نہایت خوشخط کتابت عمدہ کاغذ اور عمدہ چھپائی خوبصورت جلد بندی۔ ہمارا دعویٰ ہے اس دور میں افسانوں کی اتنی ضخیم کتاب آج تک شائع نہیں ہوئی قیمت صرف [illegible]

آشوب زمانہ

یہ بھی ایم اسلم صاحب کی جدید تصنیف ہے جس کا ماخذ کسی کشتہ محبت کا وہ خط ہے جو اتفاقاً یا عمداً دریائے راوی کی نذر ہوا اور راوی کی تیز رو لہروں نے اسے ساحل تک پہنچایا ساحل سے پنجاب کے مشہور و معروف مصنف میاں ایم اسلم صاحب نے حاصل کیا جس کی تحریر سے متاثر ہو کر قابل مصنف کا تخیل کشتگان ناز کی باہمی خط و کتابت کے متعدد خطوط میں تبدیل ہو کر صفحات قرطاس پر ظہور پذیر ہوا ہے ان خطوط میں قابل مصنف نے اپنی وسعت مشاہدہ عمیق نظری معلومات نفسیات انسانی کے مطابق مرد و عورت کا باہمی ربط و ضبط و جذبات محبت کا فلسفہ بیان کیا ہے بلکہ اخلاق ادب تمدن و معاشرت پر بھی بحث و تمحیص کی گئی ہے ایک خط طنز و دلچسپ افسانے کی شکل اختیار کر لی ہے۔ آخری صفحات پر نالہ فراق کے نام سے قابل مصنف نے ایک ایسا المیہ محبت کا ایسا دلکش بیان دیا ہے جس کو پڑھکر پتھر دل انسان بھی آنسو بہائے بغیر نہیں رہ سکتا قیمت صرف [illegible]

[illegible] ملنے کا پتہ:- دین محمد اینڈ سنز پبلشرز و تاجران کتب بل روڈ لاہور


ماہنامہ
مقام اشاعت مکتبہ اردو
لاہور



ایک شریف زادی کی سرگذشت جسکی آپ بیتی ہے۔ یہ کوئی افسانہ ہے نہ کہانی
بلکہ ایک سچا واقعہ ہے۔ جس کے پڑھنے سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں
کتاب دو حصوں میں تقسیم ہے۔ دوسرے کی ازدواجی زندگی اور انجام۔

کتاب بیحد دلچسپ اور واقعات بالکل سچے اور ہوشربا ہیں۔
سرورق مصور چہار رنگ' ولایتی کاغذ حجم چار سو صفحات
قیمت مجلد دو روپے آٹھ آنے

ملنے کا پتہ مکتبہ اردو ۱۵ سرکار روڈ، لاہور

بچوں کے لیے دلچسپ اور سبق آموز کتابیں

ساربان قیمت ۴ر	شیطان کا چرخہ اور دوسری کہانیاں ۳ر	موصل کا یہودی ۳ر	کولمبس ۸ر
چار سہیلیاں قیمت عہ ر	محنت کا پھل ۴ر	چڑیا گھر ۴ر	چند پند ۸ر
بڑی بی بی قیمت ۱۲ر	حقائق اسلام ۴ر	شیر غزنا طہ ۳ر	دورنگی تحفہ عہ ر
دامن مریم ۸ر	ملک ثم ثم ۴ر	غیور مسلمان ۳ر	اخلاقی نظمیں ۴ر
غزال ۱۰ر	حکایات شب بہشت ۶ر	سرفروش مسلم ۳ر	شعور ۶ر
کربلا شہزادہ ۳ر	طالب علم کی زندگی ۱۲ر	مرزا پھو نیا ۲ر	میش دوست ۱۰ر
ہجرت ۳ر	نعیم چیپی ۳ر	چھوٹا لڑکا ار	ولیم ٹیل ۸ر
ادمغان عرب ۴ر	سنہری گیت ۴ر	بہادر لڑکا ار	نپولین بونا پارٹ ۶ر
حکایات عرب ۳ر	پر پرواز ۵ر	سچا لڑکا ار	اچھے گیت ۴ر
انتقام ۴ر	قیدی شیر ۴ر	مشعل صداقت ار	فن تیغ زنی ۱۰ر
چیدا اور گرہ کٹ ۴ر	بازیچہ ۴ر	محمدی کوا ۴ر	علمی کہانیاں عہ ر
نور ہدایت ۴ر	دربارچہ ۶ر	سوتیلا بھائی ۳ر	منتخب الحکایات ۸ر
امانت ۳ر	غنچہ حکمت ۴ر	دکن کی پری ۴ر	اصغر کی دیانتداری ۴ر
ٹھیس لگ رہا ۳ر	عجیب انتقام ۳ر	چہیتا بھائی ۸ر	فضلا چوکیدار ۴ر
ان وفا ۵ر	نقلی شہزادہ ۴ر	تب تم اچھی بچی ہو ۴ر	آخری سپاہی اور دوسری کہانیاں

ملنے کا پتہ: مکتبہ اردو ۱۵ سرکلر روڈ لاہور

میری کہانی پنڈت جواہر لال نہرو کی سوانح عمری حصہ اول عہ حصہ دوم عہ		روح نظم اول عہ دوم عہ	تائیس عہ
تاریخ حریت اسلام ستے	تاریخ اسلام فصیح ستے	روح انتخاب اول ۱۲ر دوم عہ	مصنوعی بیوی ۱۲ر
ترکان احرار عہ	حیات سعدی ۱۲ر	نقش دوام عدم عہ	خیالستان عہ
مرقع چغتائی ستے	نقش چغتائی صہ	کہکشاں عہ	دو آتشہ ستے
انقلاب فرانس ۱۲ر	تین ٹوپیاں ۸ر	ناٹک ساگر علہ	ظفر کی موت ۴ر
درانتی اور دیگر مضامین علہ	لاشوں کا شہر اور دیگر افسانے عہ	معاشقہ نپولین تمکین سید علہ آزاد ۶ر	زوال غازی (۲ سلطان) ستے
شمع شبستاں عہ	پر اسرار دوشیزہ ۸ر	بہار جاوداں مجلد ستے	مصطفٰے کمال اتاترک مجلد عہ
میکدہ مجلد ۱۲ر	پیام زندگی تین جلدوں میں فی جلد علہ	تعلیمی لغات پاکٹ ایڈیشن عہ	فیروز اللغات اردو مجلد کلاں ستے خورد ستے
سیل حوادث	فیروز اللغات فارسی کلاں ستے	روح سیاست ۸ر	قدیم افسانے عہ
بگڑے دل ۸ر	رہنمائے اردو انشا پردازی ۱۲ر	ویرا ۹ر پیکار عہ	جمہوریت روس مظہر علی اظہر عہ ۱۴ر

ملنے کا پتہ: مکتبہ اردو ۱۵ سرکلر روڈ لاہور

منظور کردہ ڈائرکٹر صاحب بہادر سررشتۂ تعلیم پنجاب لاہور بموجب لیٹر نمبر ۲۳۲۱۱ سی مورخہ ۱۰ ر فروری ۱۹۳۶ء

منظور کردہ محکمۂ تعلیم حیدرآباد دکن ۔ ۲۴۲ سنہ ۱۳۴۲ ف مثل نمبر ۱۲ / ۱۱۳ ۱۳۴۳ ف

مکتبہ اردو لاہور کا

کثیر الاشاعت و ارزاں ترین ماہنامہ

ادبِ لطیف
رسالہ لاہور

ماہِ ستمبر ۱۹۳۷ء

ادارۂ تحریر

چودھری برکت علی بی۔ اے

میرزا ادیب بی۔ اے

مقامِ اشاعت

مکتبہ اردو لاہور

فی پرچہ ۲

پرنٹر و پبلشر چودھری نذیر احمد

سالانہ چندہ بمعہ ضخیم سالنامہ (افسانہ نمبر) ... روپے

ممالک غیر سے آٹھ شلنگ

فہرس

جلد ۶ | بابت ماہ ستمبر ۱۹۳۷ء | نمبر ۱

ادارِیہ

نذرِ اولین

اس نمبر میں "رسالہ شہنشاہ حبشہ" کا پہلا ایکٹ شائع کیا گیا ہے۔ یہ ڈراما چار ایکٹ پر مشتمل ہے۔ اور تین اشاعتوں میں ختم ہو جائیگا۔

ڈراما کے متعلق صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ یہ اردو کے مشہور نقاد اور صاحبِ قلم حضرت اختر اورینوی ایم اے کے قلم سے ہے۔ اختر صاحب نے کافی تحقیق و تفتیش اور غور و تفکر کے بعد ان مؤثر واقعات کو سپردِ قلم کیا ہے۔ جو ابھی ابھی دنیا کی نظروں کے سامنے پیش ہوئے ہیں۔ مسولینی کے جارحانہ اقدامات، اہلِ حبشہ کی دھن پرستی، شہنشاہ حبشہ کی بے چارگی، بیکسی، جمعیتِ اقوام کی پیمان شکنی، الغرض جو کچھ وقوع پذیر ہوا اسے دلآویز پیرائے میں آپ نے قلم بند کر دیا ہے۔ ڈرامائی نقطۂ نظر سے بہت کامیاب ہے۔

حضرت مولانا روش صدیقی پہلی دفعہ "ادبِ لطیف" کی محفل میں تشریف لائے ہیں۔ روش صاحب جیسا کہ قارئین جانتے ہیں اردو کے ان کامیاب شعرا میں سے ہیں جن پر اردو کو فخر ہے۔ روش صاحب کی اور نظمیں بھی قریب میں موصول ہو چکی ہیں۔ جو ادبِ لطیف میں شائع ہونگی۔

میراجی بھی پہلی دفعہ تشریف لائے ہیں۔ آپکی نظم نئی قسم کی شاعری کا قابلِ قدر و تحسین نمونہ ہے۔ میراجی جدید شاعری کے علمبرداروں میں شمار ہوتے ہیں۔

شمارہ حاضرہ میں ایک ڈراما "صولت کی موت" ایڈیٹر کے قلم سے شائع ہو رہا ہے۔ یہ ڈراما "سورس ہیترلنک" کے ایک ڈرامے سے متاثر ہو کر لکھا گیا ہے۔ آج سے چار پانچ سال پیشتر میں نے مجیم کے [illegible] مفکرِ اعظم کا ایک ڈراما پڑھا تھا۔ اسی کے تاثرات [illegible] اس کی تخلیق کے باعث ہوئے ہیں۔

گوپال متل بی اے کا طرزِ تحریر خوب ہے۔ اگرچہ پلاٹ کے انتخاب میں آپ کی کوشش زیادہ قابلِ تحسین نہیں۔

اس نمبر میں جناب تنو چوہنی لال کاوش کا ایک گیت بھی شائع کیا جا رہا ہے۔ کاوش صاحب ایک نہایت متین، سنجیدہ اور محنتی نوجوان ہیں۔ اور ساتھ ہی ساتھ پیکرِ خلوص بھی۔ ممکن نہیں کہ آپ [illegible] سے [illegible] متاثر ہوا [illegible] لیتے ہیں [illegible] وہ کامیاب ہونگے!

احمد ندیم قاسمی اردو کے نوجوان شاعر [illegible] میں خاص [illegible] رکھتے ہیں۔ آپ کا یہ افسانہ دلچسپ ہونیکے علاوہ سبق آموز بھی ہے۔

افسانہ نمبر پر ریویو اور حکیم یوسف حسن صاحب

ہمیشہ سے یہ دستور [illegible] ہم نے ریویو [illegible] تنقید [illegible] ذاتی مناقشت سے متاثر ہو کر یا تجارتی امور کو مد نظر رکھتے ہوئے [illegible] کتاب یا رسالے کے خلاف نہیں لکھا۔ تنقید اور تبصرے کو غیر جانبدار ہونا چاہیے۔ منتقمانہ جذبات کے زیرِ اثر کسی کتاب یا رسالے کے خلاف لکھنا صحیح معنوں میں صحافتی بددیانتی ہے۔

ہمارے دیرینہ کرمفرما حکیم یوسف حسن صاحب نے نیرنگ خیال کے اگست نمبر میں ادب لطیف کے افسانہ نمبر پر جس حکیمانہ شان سے ریویو کیا ہے وہ بیک وقت متضاد بھی ہے اور مضحکہ خیز بھی۔ حکیم صاحب سے کبھی یہ امید بھی نہیں ہو سکتی تھی کہ آپ اس قسم کا رویہ اختیار کر بیٹھیں گے۔ حکیم صاحب فرماتے ہیں کہ مالکان ادب لطیف نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا مگر ادب لطیف کو وہ مقبولیت حاصل نہیں ہوئی جس کا یہ حقدار تھا۔ اسمیں کوئی شک نہیں کہ موجودہ رسائل بازاری میں ہر ایک رسالے کو شکایت ہے۔ خود نیرنگ خیال بھی اس سے مستثنٰے نہیں مگر جس طرز سے نیرنگ میں آپنے یہ سطور رقم فرمائی ہیں وہ صرف آپکی ذات گرامی ہی سے مخصوص ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی رسالے کی کامیابی حکیم صاحب کی طبع نازک پر ذرہ گراں گزرتی ہے۔ اور تو بس نہیں چلتا کسی نہ کسی بہانے سے اسکے خلاف لکھ کر طبیعت کے لئے سامان تسکین پیدا کرنیکی کوشش کر لیتے ہیں۔ پھر کیونکر ممکن تھا کہ آپ ادب لطیف کی کامیابی کو دیکھتے اور چپکے بیٹھے رہتے۔ حکیم صاحب لکھتے ہیں کہ ایڈیٹر ادب لطیف نے نیرنگ خیال کے خلاف کبھی زہر چکانی کی تھی۔ معلوم نہیں وہ کونسی زہر چکانی تھی جسکے اثر سے ہمارے محترم حکیم صاحب ابھی تک تڑپ رہے ہیں۔ بات یہ ہے کہ نیرنگ خیال کے ایک سالنامے پر تبصرہ کرتے ہوئے ہم نے لکھا تھا کہ حکیم صاحب نے تصاویر کی پشت پر اشتہارات بھی دئے ہیں۔ یہ بات اردو (اور نگ آباد) نے بھی لکھی تھی۔ اتنی سی بات تھی جسے حکیم صاحب نے "افسانہ" بنا دیا۔

ہمیں حکیم صاحب کی اردو خدمات کا اعتراف ہے اور ہم نے معاصرانہ تعلقات کو بگاڑنے کی بھی کوشش نہیں کی۔ مگر معلوم ہوتا ہے حکیم صاحب اپنی عادت سے مجبور ہیں۔ بہرحال ہم آپ کی "نیرنگ سازیوں" کے ممنون ہیں!

آغا حشر کی یادگار اور اُن کے ڈرامے۔

کچھ اشاعتوں سے آغا حشر ان کی یادگار کے قیام اور ان کے ڈراموں کی اشاعت کے متعلق لکھا جا رہا ہے۔ خدا خدا کرکے ملکی صحافت نے اس طرف توجہ کی ہے اور بعض رسائل و جرائد میں آغا حشر کی یادگار کے قیام اور ان کی تصانیف کی نشر و اشاعت سے متعلق متعدد مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ مگر یہ سوال تو عالمگیر تائید کا مستحق ہے۔ [illegible] چند سطریں لکھ دینے سے کچھ حاصل نہیں۔ ملک کو اس طرف خاص توجہ دینی چاہئے۔ سنا ہے۔ آغا حشر کا ڈراما "بھیشم [illegible]" آپنے اپنی زندگی کے آخری ایام میں مکمل کرنا شروع کیا تھا اور جو آپکی مرگ ناگہانی کی وجہ سے مکمل نہیں ہو سکا تھا۔ اب فرانٹیر فلم [illegible] کے زیر انتظام مکمل ہو گیا ہے۔ یہ خبر مسرت افزا ہے کہ اسی [illegible] آغا حشر کی یادگار کے قیام کے سلسلے میں بھی توجہ دینی شروع کی ہے۔ خدا کرے یہ خبر صحیح ہو۔

مکتبہ اُردو کی ادبی سرگرمیاں۔

مکتبہ اردو کی دو جدید مطبوعات "تین پیسے کی چھوکری" دیگر افسانے اور "پیغمبر صحرا" بالکل تیار ہو گئی ہیں۔ اور ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو رہی ہیں۔ "چاند کا گن" اور دیگر افسانے ایک [illegible] تک شائع ہو جائیں گے۔ مولانا کوثر چاندپوری کے افسانوں کے دو مجموعے "دنیا کی حور" اور دیگر افسانے اور "عورتوں کے [illegible]" [illegible] پریس میں ہیں۔ پیو پلز کتابیں ستمبر کے وسط تک [illegible]

سالنامہ ادب لطیف ۱۹۳۷ء

ہمارے گذشتہ سالنامے بہت مقبول ہوئے ہیں [illegible]
[illegible] ظاہری خوبیاں کے لحاظ سے بھی نہوان [illegible]
[illegible] سالنامہ [illegible]

جناب سید راحت مولائی بی۔ اے۔ (علیگ)

جوان امنگ والے

ایک بڑے خاندان کے معاملات کا انتظام کبھی نوکروں چاکروں نے بہتر نہیں پا سکتا اور بہت سے معاملات ایسے بھی ہوتے ہیں جہاں شوہر کا دخل دینا صد درجہ کی حماقت یا بدتمیزی شمار کیا جاتا ہے۔ جب تک ایک عورت اپنے گرد کی خادماؤں کے چال چلن اور ایمانداری و بے ایمانی کی حقیقت و اصلیت سے واقف نہ ہو کوئی بلند رتبہ حاصل نہیں کر سکتی۔ ان کی نگہداشت خود کرنی چاہیئے۔ اور تو اور بڑے بڑے آدمیوں کی عبادات اور طمانیت قلب ان لوگوں کے اثر سے نہیں بچ سکتی جو ان کے چاروں طرف رہتے ہیں۔ وہ لوگ ایک ہی چھت کے نیچے زندگی بسر کرتے اور رہتے ہیں بالکل ان ہی لوگوں کی [illegible] ہوتے ہیں جن سے وہ متعلق کر دیئے گئے ہیں۔

ایک قنوطیت پرست انسان کے لیئے پرانے زمانے [illegible] گئے اور ان کے واپس آنے کی بھی اب کوئی امید نہیں [illegible] ایک امید پر جینے والے کے لئے اب بھی عورتوں [illegible] میں وہ سب کچھ ہے جس سے وہ اخلاق و ادب [illegible] اور نوجوانوں کو ہر طرف پھیلتی ہوئی اور [illegible] طوائف الملوکی تعداد سے بچا سکتی ہیں۔

یہاں مرا تخاطب دراصل درمیانی طبقہ سے ہے۔ [illegible] عورتوں کے لیئے خانگی امور پر پورا پورا عبور ہونا ازبس لابد و لازم ہے۔ اور وہ عبور اس طرح کا ہو کہ عورت نہ صرف یہی نہ جانتی ہو کہ فلاں کام کس طرح ہونا چاہیئے یا فلاں فلاں چیز کیسے تیار ہو سکتی ہے، بلکہ وہ اس کام کو خود کرے اور اس چیز کو اپنے ہاتھ سے بنا دے۔ آخر اس درمیانی طبقہ میں نوکروں کا کام بھی کیا۔ کیا وہ منہ میں نوالہ دینگے یا حلق میں پانی ٹپکاتے رہیں گے۔ یا لوری دے دے کر سلا دینگے ہاں اگر کسی کے بچے ہوں اور وہ بھی چھوٹے چھوٹے تو ضرور نوکر کی ضرورت ہوتی ہے لیکن جب بچے بڑے ہو جائیں تو نوکروں کی کوئی ضرورت نہیں۔ بالخصوص ایسی حالت میں جبکہ نوکر رکھنے والا اپنے ہی آرام و آسائش کے لئے صد درجہ محنت کرتا ہو۔

اس لحاظ سے ایک محنت کرنے والے کے لئے اگر وہ واقعتہً اپنی محبت میں اندھا نہیں ہے، سخت ضروری ہے کہ وہ یہ دیکھے کہ اس کی ہونے والی بیوی یا موجودہ محبوبہ گھر کے کام کیسے انجام دیتی ہے۔ اس وقت غور و فکر کی ضرورت نہیں جب مرد اس حالت میں ہو کہ اپنی بیوی کو خوب ٹھاٹ باٹ سے رکھ سکتا ہے۔ کھانا اور پینا زندگی کے اجزائے لاینفک ہیں نفیس غذائیں اور انکو بہترین طریقہ سے پکانا چاہے آپ کی توجہ کو کتنا ہی جذب کرے۔ مگر

بہرحال ثقیل غذا اور جلا بھنا کھانا اجیرن معلوم ہونے لگتا ہے آپ یہ چیز ایک مرتبہ یا زیادہ سے زیادہ دو مرتبہ برداشت کر سکتے ہیں لیکن اگر میری مرتبہ بھی دستر خوان پر ایسی ہی اشیا نظر آئیں تو کیا آپ اس وقت کی کوفت کا تجزیہ کر سکیں گے؟ اور اگر یہی حالت بدستور رہے تو آپ کی اندرونی خلش کو شاید مسرت کے چند حسن تری لمحات بھی دور نہ کر سکیں۔ اور بالآخر ایک کشاکش دوام اور ایک اضطراب پیہم ہوتا ہے اور آپ کی مصروف و بے کیف زندگی نتیجہ آخری —! وقت گذر جانے پر آپکو صحیح طور پر احساس ہوتا ہے کہ آپ کی رفیقۂ زندگی آپ کی طبیعت کے موافق نہیں، اور وہ غیر فانی محبت جو ایک انتہائی تعلیم یافتہ بیوی میں ملتی یا ملنے کی امید ہوتی ہے، اور جس تلاش و آرزو میں آپ اپنے نیاز مندانہ ہاتھ بیقرارانہ بڑھا دیتے ہیں آپ کی خوش آئند و طرب انگیز زندگی کو ایک مصیبت بنا دیتی ہے۔ شوہر چاہے کتنا ہی سمجھدار اور خاموش طبیعت انسان ہو، وہ ایسی بیوی کی ذرہ برابر قدر نہیں کر سکتا جو تیز و طرار تو ہو مگر تکمیلِ فرائض میں کوتاہ اور انتہائی لاپروا بھی۔

پیشہ ور لوگوں کو (مثلاً وکیل۔ ڈاکٹر۔ سوداگر وغیرہ) ایسی بیوی نہیں چاہئے جو امور خانہ داری میں صرف دستی مہارت رکھتی ہو۔ دراصل ان کو اپنے گھروں میں ایسی بیوی کی ضرورت ہے جو زبانی ہدایات بھی دے سکتی ہو، عقلی تدابیر سے بھی مالامال ہو، اور یہ بھی دیکھ سکتی ہو کہ فلاں کام ہو گیا یا نہیں۔ کھانے کا عمدہ طور پر تیار کرانا، پانی کا صفائی کے ساتھ انتظام رکھنا۔ گھر میں ہر چیز کی کافی مقدار کا موجود رہنا چیزوں کو زیادہ سے زیادہ کارآمد بنانا اور اسکے زیر نگرانی مکان میں کسی ایسی چیز اور ایسی بات کا کسی وقت نہ پایا جانا جو شوہر کے عزو وقار اور شان کے خلاف ہو — وغیرہ وغیرہ — ایسے فرائض ہیں جو ہر نیک اور صالح بیوی میں پائے جانے ضروری ہیں۔ ایک مصروف شوہر یہ تمام چیزیں اپنی بیوی کی واحد ذات پر چھوڑ دیتا ہے۔ صرف اتنی ذمہ داری اپنے سر رکھتا ہے کہ ان تمام چیزوں کے لئے خرچ کی تعداد وہ خود متعین کرے اور بیوی کو دیدے۔

اسکے برخلاف ایک مزدور کے یا ایک چھوٹے طبقہ کی عورت کے لئے ہر کام کی دستی مہارت ضروری ہے۔ کیا آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ ایک دوسرے انسان کو کوئی کام انجام نہ دے سکنا: جیسے کہ ایک شخص جانتے ہوئے ہوتا ہے جو خود کام کرتا یا کر سکتا ہو، کتنا مشکل ہے۔ ایسے موقع پر مرد کا فرض ہے کہ وہ یہ حکم دیدے کہ اسکے گھر میں ایسی چیز نہ پائی جائے جو اس کی بیوی نہ تیار کر سکتی ہو۔ ممکن ہے اس طرح وہ کم از کم ان چیزوں کا تیار کرنا جلد ہی سیکھ جائے جنکے سیکھنے کی اس کی خواہش ہوتی ہے، مگر وہ بنانا نہیں جانتی۔ آپ عورت کی محنت سے کبھی نہ ڈریں، اسلئے کہ محنت و مشق سے عورت کی تندرستی سنبھلتی ہے، اور تندرستی سے اسکا حسن۔ "بیمار حسن" آپکے اندر رحم کا مادہ پیدا کر سکتا ہے جو ایک چیز ہے۔ "تندرست حسن" بعض اوقات آپکو خود سے محبت کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ جو ایک مستقل صورت ہے۔ یہ شباب تندرستی کی نشانی ہے اور آپ جانتے ہیں کہ شباب سے بھرپور دوشیزائیں بغیر کسی رنگ و حسن کے امتیاز کے خوا

[illegible] دلچسپ معلوم ہوتی ہیں۔ بیمار عورت کی طرف آپ دیکھئے [illegible] بینائی کے لئے ایک سزا سمجھتے ہیں انکو ہزاروں ایسی [illegible] ملیں گی جو صرف ایک رات کی اس ٹھنڈی نیند کے لئے [illegible] نصف اندوختہ نذر کر سکتی ہیں جس سے ایک محنت کرنے [illegible] والی عورت اتفاقیہ ہی محروم ہو جاتی ہے۔

لیکن اگر کوئی نوعمر مزدور یا درمیانی طبقہ کا کوئی نوجوان [illegible] عورت سے شادی کر ہی لیتا ہے جو گانے بجانے کی [illegible] شوقین ہو۔ کاغذ قلم اور روشنائی کا جو طول طویل [illegible] خطوط لکھنے میں خون کرتی ہو، کھیل تماشہ سے جس کا [illegible] سکتا ہو۔ نادل خوانی جسکا واحد مشغلہ ہو —— اگر کوئی [illegible] شباب دل ایسی بدنصیب عورت پر ریجھ ہی جائے۔ تو [illegible] اسکے نتائج بھی برداشت کرنے کے لئے تیار رہنا چاہئے [illegible] حالات خود ایسے شخص کو نیک برتاؤ سکھا دیگا۔ وہ قدرتاً ایسی [illegible] کشمکش کے لئے مجبور ہوگا جس سے وہ عورت بحیثیت [illegible] بیوی کے اپنے فرائض سمجھے۔ اس کو مجبوراً صابر بننا پڑیگا [illegible] اور آخرکار وہ اس نتیجہ پر پہنچیگا کہ حقیقتاً ظاہری نمائش اور [illegible] فضول آرائش نے اسکے دل کو وقتی خوشی دے رکھی تھی۔ اس حالت میں اپنے نفس حیوانیہ کو سکون پذیر کر لینے کے بعد وہ شخص انتہائی جابر ظالم اور حیوان ہے جو ایسی عورت سے [illegible] باتوں کی امید کرے۔ جنکے متعلق وہ پہلے سے دیکھتا تھا [illegible] نہیں ہوں گی اور پھر نہ پا کر اسکو ملزم ٹھہرا دے۔ [illegible] یہ کہ کسی قسم کی سختی کرے پہلے تو اس کی اصلاح ہی کرنی چاہئے اگر سدھر جائے تو زہے نصیب ورنہ پھر مجبوری کا نام [illegible] صبری ہوا کرتا ہے۔

میرے نزدیک اس عورت سے زیادہ کوئی اور بدنصیب نہیں جو بے انتہا تعلیم یافتہ ہو جسکے پاس شادی کے وقت لاتعداد دولت ہو۔ مگر جس کو اپنی حیثیت و کردار کا ذرا پاس نہ ہو یہیں نہیں سمجھ سکتا کہ اسکے کارنامے اسکے گانے بجانے اس کے رومانی خطوط اس کے دلگداز افسانے کسی کام کے اگر وہ اپنے شوہر کو سچی خوشی نہ پہنچا سکے۔ اگر کوئی عورت اپنی فطرت پر قائم اور ایک صحیح شوہر کی ہے تو ایک معصوم نوزائیدہ ہستی کی پہلی آواز پر جو اولین مرتبہ اس دنیا میں داخل ہو رہی ہوتی ہے۔ اس کا ہر کارنامہ اسکا ہر گانا، اس کی ہر تحریر اس کی ہر مصوری اس کے لئے ایک خواب ہی نہیں ہو جاتی۔ بلکہ اسکے دماغ کو بھی خیرباد کہہ دیتی ہے جتنی چاہے وہ کسی انسان میں اصل سے کتنی ہی نادانہ کیوں نہ ہو کھانے اور پینے کی قیمت ادا نہیں کر سکتا۔ جب تک اس کے مصرف کو رائیگاں نہ کر لیا جائے۔ اور اس کی عظمت کو تباہ نہ کر دیا جائے ایک مرتبہ ایک ایسی عورت کے شوہر کو، جو سوائے گانے بجانے اور دیگر وقتی دلچسپیوں کے دنیا کی کسی دوسری چیز کا نام بھی نہیں جانتی تھی، قید ہو گئی لیکن قید خانہ میں اس عورت کو مع ایک ننھے سے حسین بچہ کے اس قیدی کا سچا سہارا اور اس بچہ کی پیاری ماں پایا گیا۔ اس کی برگزیدہ وہی ہوا میں اڑ چکی تھی، قید خانہ میں اس کو اپنے شوہر سے سچی محبت و ہمدردی دکھانے کا ایک ایسا موقعہ بن گیا تھا۔ جسکو دوسرے لوگ دیکھ کر قیدی کی قسمت پر رشک کرتے تھے۔ لیکن ایسی مثالیں شاذ ہی ہوتی ہیں۔ ان دونوں میں جو کمیاں تھیں انکو محبت کے جذبہ نے پورا کر دیا تھا۔ اور ان کے لئے کوئی تکلیف و نقصان کوئی نیت نہیں رکھتے تھے مشہور انگریزی افسانہ

نوبیں چارلس ڈکنس کی بیوی سے جب پوچھا گیا کہ اسکا پیا نو کہاں ہے۔ تو اس نے مسکراتے ہوئے اس بچہ کی طرف اشارہ کر دیا۔ جسکو وہ اپنی گود میں لئے کھلا رہی تھی۔ اس احساس فرض کا ہر جگہ پایا جانا قریب قریب ناممکن ہے۔ عام لوگوں میں چونکہ محنت ہی سے کچھ پیدا کیا ہوا ہوتا ہے۔ اس لئے بیوی کو اس بات کا احساس ہونا چاہئے کہ وہ ہر وقت شوہر کی امداد کے لئے تیار رہے اور وہ امداد اسی طرح ہو سکتی ہے کہ اس کی ہر قسم کی ملکیت کو اپنی ملکیت سمجھکر اس کی حفاظت کرے۔ روپیہ زیادہ سے زیادہ فائدہ مد نظر رکھتے ہوئے خرچ کرے۔ کوئی چیز ضائع نہ ہونے دے۔ شوہر کو ہر وقت مسرور رکھنے کی کوشش میں مسرور بخت گھر کے ہی کام اور کسی انتظام میں شوہر کو کوئی فکر دامنگیر نہ ہونے دے۔ وغیرہ وغیرہ اور یہ کام وہ عورت کبھی نہیں کر سکتی۔ جس کو ابتدا ہی سے ان امور کیطرف توجہ نہ دلائی گئی ہو۔ اور جس نے ان تمام فرائض کو صرف اتنی اہمیت دے رکھی ہو کہ ان پر غور کرنا اس سے کسی پست درجہ والی عورت کا کام ہے اُس کا نہیں۔

جاہلیت' واقفیت کی اس کمی کا نام ہے۔ جو دراصل آپ سے متعلقہ کام میں یا امور کے سلسلے میں آپکو ہوتی ہے۔ ایک ہل چلانے والا' ان معنوں میں کبھی "جاہل" نہیں کہلایا جا سکتا جو عام طور سے رائج ہیں۔ اس لئے کہ لکھنا پڑھنا اسکا کام ہی نہیں ہے۔ وہ اپنا کام (ہل چلانا) خوب جانتا ہے۔ اس لئے جاہل نہیں۔ اس طرح وہ عورت دراصل جاہل ہے۔ جو تعلیمیافتہ ہونے کے باوصف یہ نہیں جانتی کہ شوہر کے لئے کھانا کیا اور کیسا تیار کرے' ایک بھوکے آدمی سے یہ کہنا کہ تمہاری بیوی بڑا اچھا

گاتی ہے یا خوب لکھتی ہے۔ شاید اسکا پیٹ نہ بھر سکے۔ محبت کرنے والے ممکن ہے ہوائی غذا پر زندہ رہ سکیں۔ مگر شوہر کو محسوس غذا کی ضرورت ہوتی ہے' دوسرے گھر جانیوالی بچیوں اور بہنوں کو میرے خیال سے اتنی نصیحت کافی ہوگی کہ مستقل صفائی' عمدہ کھانا' با ترتیب مکان' منتظم گھر' تبسم ریز چہرہ اور میٹھے میٹھے دو بول وہ لازوال دولتیں اور ایسا پیار ہیں جنکے آگے سونا سنگا۔ اور دنیا کی تمام آرائشیں بھی شوہر کا دل موہ لینے کے لئے ہیچ ہیں۔

خوش مزاجی۔ خوش مزاجی کی کسی انسان میں قبل از وقت تصدیق کر لینا ذرا مشکل ہے۔ فی زمانا تبسمات حد درجہ ارزاں ہیں۔ ان کا استعمال ہر موقعہ پر (جا و بے جا سب) جاہوتے لیکن فوراً ہی تیوری کی بل' جبین کی شکنیں' عاشقوں کے لئے خدا جانے کس چیز کے ترجمان بن جاتی ہیں۔ خوش مزاجی سے نہ تو وہ بے تکلفی مراد ہے جو ہمہ شما کے لئے عام ہوتی ہے اور نہ ہی وہ سنجیدگی مراد ہے جس سے طبیعت کے غرور کا پتہ چلتا ہے ایسی خاموش طبیعت سے جو قریب قریب "غمگینی" کی مظہر ہو جہانتک احتراز کیا جائے بہتر ہے۔ خاموش مرد ہی وبال جان ہوتا ہے۔ پھر کسی ایسی ہستی کا' جس سے مرد کی تمنائیں وابستہ ہوں جو ہر وقت کی رفیق ہو اور رات دن کی ہمدرد بنائی جائے۔ کہنا ہی کیا۔ بھلا وہ خوشی دراصل خوشی ہوگی کہ ایک جگہ رہو سہو۔ ایک جگہ کھاؤ پیو' اور ایک جگہ سوؤ جاگو' مگر گفتگو ایک لمحہ بھی نہ ہو اور جو ہو بھی تو وہ نہ ہونے کے برابر ہو۔ اگر آپ ذرا بھی غور سے کام لیں اور انصاف کا کسی وقت خون نہ کریں تو آپ چیز کے آثار ہی آپکو ایسی طبائع کا اندازہ کرا سکتے ہیں۔ اگر کسی

عورت کی طبیعت واقعی ایسی ہی ہے تو کسی وکسی وقت وہ سکو یا تو اپنے کسی خاندان والے کے ساتھ ہی بر رونے کار لانے گی اور یا ممکن ہے کہ کسی وقت آپ پر بھی اس ہتھیار کا حملہ کر بیٹھے۔ اور اس صورت میں کہ یہ خیال صحیح ہو سکتا ہے شاید شادی کے بعد اسکا رویہ بدل جائے خاموشی و مایوسی کی یہ عمارت صرف بے وجہ ناخوشی پر کھڑی ہوتی ہے جسکے علل و اسباب کا پتہ کبھی نہیں چل سکتا۔ عورت کسی واہمہ سے قطعاً غلط طور پر برا مان جاتی ہے اور چونکہ وہ اظہار شکایت کا کوئی ذریعہ نہیں پاتی، اسلئے سوائے خاموش ہو کر کڑھنے کے اور کچھ نہیں کر سکتی۔ اور کڑھنے کا علاج تو یہی ہے کہ اسکو معراج کمال تک یا تو پہنچا دو یا خود ہی پہنچ جانے دو لیکن بہرحال یہ بہتر ہے کہ ایسے مریض کو اپنے گھر ہی میں داخل مت ہونے دو در اصل ایسی عورت سے شادی کرنا اگر مکمل نہیں، تو نصف دیوانہ پن ضرور ہے۔

جھگڑالو عورت بھی جہنم کی آگ سے کم نہیں۔ ہر وقت کا جھگڑا، اٹھتے بیٹھتے یہ شکایات کہ تم دیر سے کیوں آئے۔ تم بے وفا ہو۔ تم ہماری پرواہ ذرا نہیں کرتے۔ تم فلاں کے ساتھ اتنا کیوں رہتے ہو یہ رات کے بارہ بارہ بجے تک کہاں کی تفریحیں ہوتی ہیں۔ گھر کے فلاں شخص نے آج مجھے ایسی بات کہدی، وغیرہ وغیرہ، اگر اتفاقیہ ہوں تو خیر حق بجانب ہیں لیکن اگر روزانہ ان کا دفتر آپکے سامنے دھرا جانے لگے تو ایک وقت آپ کو اس اعادہ سے نفرت سی ہونے لگتی ہے۔ اور شاید کوفت بھی، اگر بظاہر نہیں تو بباطن آپ یہ نتیجہ نکال لیتے ہیں کہ اس عورت میں صبر و استقلال اور عقل و فہم کی کمی ہے، اور ایسے نتیجہ کے بعد آپکے اور بیوی کے درمیان سخت ناخوشگواری ہوگی ظاہر ہے آپ بھی بیوی سے کھنچے کھنچے رہنے لگتے ہیں اور وہ بھی آپ سے کشیدہ خاطر ہو جاتی ہے کیا یہی لطف زندگی ہے؟ کیا آپ ایسی عورت کو اس عورت پر ترجیح دے سکتے ہیں جو آسمانی مسکراہٹوں سے آپکے نفس نفس کو جگمگا دے۔ جو آپ کی تمناؤں کو بالیدگی بخشدے جو آپکے ساتھ نہایت اچھا برتاؤ کرے۔ جو آپکے آرام و تکلیف کا ہر وقت خیال رکھے۔ جب آپ گھر سے جائیں تو اس پر وہی ملکوتی مسرت طاری ہو جو آپ کے گھر میں داخل ہوتے وقت اسکے چہرے پر دیکھتے ہیں۔

ضد کا مادہ ہر انسان میں بری چیز ہے۔ اور بالخصوص بیوی میں۔ یہ امر یقینی ہے کہ اگر فریقین میں سے کسی میں بھی یہ چیز موجود ہے۔ تو علاوہ اسکے کہ وہ آئے دن دلوں میں نفاق ڈالے، روز بروز بڑھتی بھی جائے گی۔ اور پھر کبھی نہ کسی دن اپنا پورا پورا رنگ دکھائے گی۔ ضد سے کسی کو خاموش کر دینا کوئی نمایاں فتح نہیں بلکہ ایک قسم کی ذہنی بیماری ہے۔ بیوی میں اسکا موجود ہونا شوہر کے لئے انتہائی تکلیف دہ ہو رہا ہے۔

یہاں ایک یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے۔ کہ اگر گھر کی کسی خادمہ میں ضد کا مادہ ½ ہے تو اس کی مالکہ میں اس کی مقدار بلا مبالغہ ½ ہوگی۔ آپ ایک خادمہ سے بھی کسی گھر کی مالکہ اور مالکہ کی اولاد کی طبیعتوں کا پتہ چلا سکتے ہیں۔

بعض عورتوں میں فریب دینے کا مادہ ہوتا ہے۔ خواہ

خواہ بات بات پر مچلتی ہیں۔ اور کچھ نہیں تو غمگین صورت ہی بنا کر اپنا اُلو سیدھا کر لیتی ہیں۔ آہستہ آہستہ ان کی یہ حرکت ایک روز فطرت ثانیہ بن جاتی ہے۔ ایسی عورتوں کا اگر کوئی علاج ہے تو صرف یہ کہ ان کی گود ان کے ہاتھ کسی وقت بھی بچوں سے خالی نہ ہوں۔ لیکن اگر اس طرح بھی حالت سدھرتی نظر نہ آئے تو پھر ایسی عورت کو تھوڑی بہت سزا دینا سخت ضروری ہے۔

۸۔ حُسن۔ اس چیز کا سب سے آخر میں تذکرہ کرنے سے یہ مراد نہیں کہ یہ سب سے کم ضروری ہے میرے خیال میں عورت میں اس کا ہونا سب سے مقدم ہے۔ اس لئے کہ عورت محبت کی چیز ہے۔ اور محبت حُسن ہی سے ہو سکتی ہے لیکن بہرحال بدصورت عورتیں اس لئے بھی ضروری ہیں کہ آخر بدصورت مرد کو کیا حق ہے کہ وہ کسی حسین عورت کو تحفۂ محبت دے۔ بدصورت عورت اور بدصورت مرد، دونوں کا اجتماع ٹھیک، بالکل ٹھیک ——

ہاں تو بیوی کے اندر صرف صورت ہی کا حُسن نہ ہو، بلکہ اسکی سیرت میں بھی ہو۔ یہ صحیح ہے کہ ہم حسین تصویر چاہتے ہیں۔ حالانکہ اس کی اصلیت کاغذ اور پنسل کے چند خطوط سے زیادہ کچھ نہیں واقعہ یہ ہے کہ بیوی حسین وہی ہے جو بظاہر حسین ہونے کے ساتھ اپنا ہر عمل بھی حسین رکھتی ہو۔ صرف جسمانی حسن سے وفاشعاری کی امید، نسوانی خوبیوں کا خیال، کرداری بلندیوں کا یقین اکثر ایک وہم و خواب سے زیادہ نہیں۔ اور وجہ صرف اتنی ہے۔ کہ ایک حسین چیز خواہ مخواہ آپ کی توجہات کا انجذاب اس چیز سے بدرجہا زیادہ کر لیتی ہے۔ جو حسین نہ ہو۔ اور اسلئے انتہائی حسین بیوی کا زوال اگر ضروری نہیں تو کم از کم مشکوک ضرور رہتا ہے۔

مرد اپنی طمانیت نفس کے لئے اپنی بیوی سے زیادہ حسین کوئی اور عورت تلاش کر لیتا ہے۔ حالانکہ یہ نہایت قابل نفرت فعل ہے۔ کیونکہ اس نے خود ہی اپنی بیوی سے پورے ایمان وایقان کے ساتھ ایجاب وقبول کی تکمیل کی تھی۔ اگر اسکے اندر اس کی طبیعت کے موافق حسن نہیں تھا۔ تو اسکو پہلے ہی کوئی اور عورت تلاش کرنی چاہئے تھی۔ اور اگر اس نے دولت وعزت کو حسن پر ترجیح دی ہے تو وہ شوہر انتہائی بے حیا انسان ہے، جو دولت وعزت دلانے والی ہستی کو کسی وقت بھی کوئی تکلیف پہنچائے یا پہنچنے دے۔

لباس کے معاملہ میں حسین بیوی، بدصورت بیوی سے کم خرچ کرے گی۔ مشاہدہ اور تجربہ بتلاتا ہے کہ وہ عورتیں جو حسین نہیں ہیں، لباس میں حد درجہ محتاط ہوتی ہیں۔ اور اگر آپ کو کبھی اس بات کا تجربہ نہ بھی ہوا ہو تب بھی عقل سلیم اس بات کو ضرور قبول کرلے گی، بہت کم حسین عورتیں ایسی ملیں گی جو یہ نہ جانتی ہوں کہ وہ واقعی حسین ہیں اور حسن کا یقین ہونے کے بعد بھی کیا وہ کبھی اس امر کی کوشش کرینگی کہ خواہ مخواہ بناؤ سنگھار کرکے وہ اپنے حُسن کو مصنوعی بنا لیں یا چمکیلے زیورات اور قیمتی لباس میں اپنے قدرتی حُسن کو محدود کردیں۔

آداب و فطرت کے لحاظ سے بہت کم حسین عورتیں ہوں گی جو ضدی اور ناسمجھ ہوں۔ اور چونکہ ایسی حسین عورتیں ہر طور سے خود کو خوش رکھنا چاہتی ہیں۔ اس لئے وہ آپ کے واسطے بھی ہر وہ سامانِ تفریح مہیا کریں گی۔ جو آپ کے دل کو از حد مرغوب ہو۔ اور یہ سامان تفریح ورغبت شادی شدہ حالت میں کیا کیا تاثرات پیدا کرسکتے ہیں۔ اسکا اندازہ انہی لوگوں

کو ہوگا جو اس خود ساختہ فردوس میں سانس لے رہے ہیں بعض حسین عورتیں بے جان ، سست اور بے روح ہوتی ہیں ـــــ بالکل موم کی گڑیوں کی طرح ـــــ حالانکہ حسن وہی ہے جو صرف صورت ہی میں نہ ہو بلکہ ہر حرکت میں بھی ہو اور جس کی فطرت حسین اشیاء ہی میں نہیں بلکہ بدصورت چیزوں میں ایک مستقل روح پھونک سکے ۔ مہذب شرارتیں ، دلفریب شوخیاں ، لطف انگیز بے باکیاں ، اور باادب گستاخیاں وہی دماغ سوچ سکتا ہے جو ایک حسین عورت کے پاس ہو ـ

نسوانی حسن کا منزلی زندگی میں سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ شوہر کا یہ احساس کہ اس کی بیوی انتہائی حسین ہے اسکو ایک بے پایاں مگر پنہاں مسرت دیتا رہتا ہے جس سے وہ ہر روز جوان اور ہر وقت تروتازہ معلوم ہوتا ہے ـ کوئی محنت اور کوئی مصیبت اسکو افسردہ نہیں بنا سکتی ـ

جب بڑھاپا آتا ہے اور فریقین کی باہمی محبت ، آپس کی ہمدردیوں اور دکھ درد کی شرکتوں سے انتہائی مستحکم ہو جاتی ہے ـ یہ بھی یاد رہے حسن اکثر بالذات ہوتا ہے ـ آپ کو ایک چیز انتہائی حسین معلوم ہوتی ہے ، دوسرا اس سے نفرت کرتا ہے ـ اور واقعۃً یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ قدرت نے پسندیدگی و ناپسندیدگی کے معاملے میں ہماری فطرتوں کے اندر یہ تفاوت پیدا کر دی ہے پھر بھی بہت سی چیزیں ایسی ہیں جنکو ہم یکساں طور پر بیک وقت پسند کرتے ہیں ـ اور ایک شوہر ہمیشہ اس خیال سے خوش ہوتا ہے کہ انہی چیزوں میں سے ایک چیز بالکل کالیک جزو اسکے قبضے میں بھی ہے ـ

انسانی زندگی میں ہزارہا نشیب و فراز ہوتے ہیں ـ جنکا خیال و شمار قطعی ناممکن ہے بعض حالتوں میں اکثر مرد پریشان ہو جاتے ہیں ، ایسی حالتوں میں محبت کرنیوالی حسین بیوی ہر زخم کا مرہم بنتی اور ہر درد کی دوا معلوم ہوتی ہے ـ ایک حسین بیوی اپنے شوہر سے جس قسم کی محبت کرتی ہے وہ اس محبت سے بالکل علیحدہ ہوتی ہے ، جو ایک غیر حسین عورت کو اپنے شوہر سے ہو حسین عورت کا جذبہ محبت اس لئے تیز ہوتا ہے کہ اُسے خود مرد کی طرف سے بے پایاں محبت ملنے کا یقین ہوتا ہے ـ مگر بدصورت عورت جانتی ہے کہ وہ اس قابل نہیں کہ مرد اسے اپنے جذبات کو تمام قوت و صلاحیت کے ساتھ چاہے ـ اس لحاظ سے حسین عورت اور حسین مرد کی محبت کا شعلہ روز بروز تیز ہوتا رہتا ہے ـ اور جیسے جیسے تیز ہوتا ہے ، اس کی روشنی بھی بڑھتی رہتی ہے

ایک مرد کسی وجہ سے ایک عورت سے شادی کرتا ہے ـ لیکن کچھ ہی دنوں کے بعد اسکے لب ان حروف سے آشنا ہوتے ہیں کہ "میری بیوی حسین نہیں" ـ ایسے مرد کو میں نہیں سمجھ سکتا کہ کونسی سزا دینی چاہیئے ، اور اس سے بڑھ کر اگر وہ بیوی کے ساتھ برتاؤ بھی سخت کرے تو حقیقتاً قابل نفریں ہے ـ ایسی حالتوں میں مردوں کو کوئی راستہ بنانے اور کوئی صحیح رویّہ پیدا کرنے میں غیر معمولی غور و تفکر کی ضرورت پڑتی ہے جس میں اکثر ان باتوں کو نظرانداز کرنا پڑتا ہے ـ جن کی تکمیل بھی ان کے فرائض میں سے ہے ـ اسلئے بہتر یہی ہے کہ حتے الوسع کسی ایسی وجہ کو انکے التفات میں درخور نہ ملے جو آخر میں یا تو ان سے انصاف کا خون کرانے

یا فرائض کی طرف سے لاپروا بناتے۔ اور یہ اس وقت ممکن ہے جب آپ ایسی عورت سے شادی ہی نہ کریں جو آپ کی نظروں میں حسین نہ ہو۔ اس کے لئے آپکو اپنی نظروں کے استغنا کی بڑی ضرورت ہوگی۔

اپنے اس بیان کے اختتام پر اگرچہ میں اور موضوعات پر بھی روشنی ڈالنی چاہتا تھا۔ مگر محسوس کر رہا ہوں کہ باوجود سکے کہ وہ افعال شنیعہ جن پر میں کچھ قلم فرسائی کرنا چاہتا تھا۔ مہذب طبقے میں نظر آتے ہیں لیکن ان کے اظہار و بیان کے لئے زبان کا دامن تہی مایہ ہے۔ کیا یہ حقیقت قابل افسوس نہیں کہ ہمارے مہذب نوجوانوں میں وہ حرکات رائج ہوں جنکے لئے ان کی زبان اپنی بے بضاعتی کا افسانہ بیان کرنے لگے۔ بہرحال چونکہ میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ یہاں تذکرۃً ان کا بیان بھی کر دوں' اسلئے زبان اور مہذب زبان مجھے جتنی بھی اجازت دے سکے گی میں اظہار مطلب کی کوشش کرونگا۔

میں مانتا ہوں کہ ۹۹ فیصدی واقعات میں جہاں نفس کو حیوانی طریقوں پر محظوظ کیا جاتا ہے' عورت کو فریب دینے کا شائبہ بھی نہیں ہوتا۔ ہوس نیکی کا فقدان جرم کا ارتکاب اور اس سے ملی جلی چیزیں بسا اوقات بعض مردوں بلکہ اکثر مردوں کو حرام کاری کی طرف لے جاتی ہیں۔ دیگر حالتوں میں ایک مرد ایک عورت تک پہنچتا ہے اور اظہار محبت سے اس مقصد کی تکمیل کی درپردہ کوشش کرتا ہے جو اس کیلئے اپنے اندر چاہے کتنی ہی لذتیں رکھتا ہو۔ مگر عورت کو بلاشک و شبہ بربادی کے غار میں گرا کر اس کی تمام زندگی کو ایک مستقل مصیبت بنا دیتا ہے۔ مرد کو ہم گالیاں بھی دے سکتے اور دیتے ہیں اور یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ وہ انسان نہیں۔ لیکن کیا عورت کی طرف سے ایسی غلطیوں کے ارتکاب میں کوئی درپردہ سامان جرأت نہیں ملتا۔ کیا وہ مرد کی برابر کی شریک نہیں ہوتی۔ اس لئے کیا مرد کے مقابلہ میں عورت کا فرض نہیں ہے کہ وہ خود بھی اپنی حفاظت کرے۔ اور ایسے مرد کو کبھی اتنی جرأت نہ ہونے دے کہ وہ اس کی عصمت و عفت پر حملہ کرنا تو درکنار حملہ کرنے کا خیال بھی دل میں نہ لا سکے۔ حتیٰ کہ وہ کسی وقت نگاہ بھر کر دیکھ لینے کی بھی جرأت نہ کر سکے۔ ان کو یہ احساس واقعی ہونا چاہئے کہ ان کا کردار صرف ان ہی کی ذات تک محدود نہیں۔ بلکہ اس میں ان کا خاندان' گھروالے اور تمام جنس بھی شامل ہے۔ زلیخا نے جو کچھ کیا لوگوں کی نظر اب اس پر نہیں بلکہ زلیخا نے عورت کی جس کمزور فطرتی کا مظاہرہ کیا اس سے مرد آج بھی ناجائز فائدہ اٹھا رہا ہے۔

کسی مرد کو بھی یہ حق نہیں ہے کہ وہ عورت کے جذبات کے ساتھ کھیلے۔ اور اس کو ایسے وعدے کے جال میں پھنسائے جو گویا بقول اس کے کبھی ٹوٹنا ہی نہ جانتے ہوں۔ یہ خام خیال کہ فلاں عورت آپ سے محبت کرتی ہے۔ اسی وقت جائز ہو سکتی ہے جب آپ بھی اسکو اسی طرح چاہیں۔ اگر آپ کے دل میں یہ تمنا کسی وقت بھی جڑ پکڑ گئی کہ کوئی عورت آپ سے بہر طور محبت کرے تو یقین جانئے کہ آپ کی انسانیت کا خاتمہ ہوگیا۔ آپ کسی عورت سے جسکو آپ واقعی دھوکا دیرہے ہیں شادی کا کسی وقت بھی وعدہ نہ کریں۔ لیکن کم از کم عورت کے خیال میں آپ کا ہر عمل اس حقیقت کا ترجمان ہوگا کہ آپ اسکو واقعی دل کی ملکہ بنانا چاہتے ہیں۔ اگر آپ اسے دھوکا دے

رہے ہیں۔ اور اس کے ساتھ ہی آپ کے تعلقات زیادہ مضبوط ہو رہے ہیں۔ اور اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ آپ کی ملاقاتوں کا نتیجہ اس عورت کے لئے سوائے پابوسی کے اور کچھ نہیں اور آپ اپنے سابقہ تعلقات جو دوسری جگہ قائم ہیں۔ اس عورت سے بصیغۂ راز رکھتے ہیں تو آپ اس عورت پر ظلم، اس کے ساتھ ناانصافی اور اپنے ضمیر کو سیاہ و تاریک کر رہے ہیں آپ خدا کی اُن نعمتوں کا کفران کر رہے ہیں۔ جن کی وجہ سے آپ کو اتنا موقعہ ملا کہ آپ کسی معصوم ہستی کی عفت پر ڈاکہ ڈالیں اور خود کو فتحمند تصوّر کریں۔ ہر دل رکھنے والا انسان آپ کو ذلالت و ملامت کی نظروں سے دیکھے گا۔ عورت کی اِن کمزوریوں کا لحاظ بہرحال مرد کو رکھنا چاہئے۔ اگر تھوڑی دیر کو یہ مان بھی لیا جائے کہ اس وقت جب آپ کسی عورت کی محبت میں سرشار تھے۔ نوشتۂ تقدیر سے یا کسی اور وجہ سے آپ کی کسی دوسری عورت سے ملاقات ہوگئی، اور اس دوسری عورت پر بھی آپ نے یا تو خود یا جواباً محبت کا اظہار کر دیا، تو کیا آپ انصاف سے بتلا سکتے ہیں کہ آپکا یہ فعل مستحسن ہے۔ اور آپ کے اس عمل میں کسی غلطی کا امکان نہیں۔ میرے نزدیک تو یہ گناہِ عظیم ہے۔

داستان بہت طویل ہوگئی، اور اب بھی محسوس کر رہا ہوں کہ جو کچھ چاہتا تھا وہ سب نہیں کہہ سکا لیکن یہ چیز کچھ تسکینِ قلب کر رہی ہے کہ

یار زندہ ——— صحبت باقی

(ماخوذ)

جناب نسیم حجازی

غزل

کہتے ہیں جس کو وقت گزرتا چلا گیا　اک سایہ تھا جو آپ ہی ڈھلتا چلا گیا

سمجھے تھے جس کو زندگی دلفریب ہم　ایسا خمار تھا جو اترتا چلا گیا

فرصت نہ انقلاب سے پائی کہ سوچتا　بنتا چلا گیا کہ بگڑتا چلا گیا

دنیا کے رنگ تھے کہ بدلتے گئے نسیم　اپنا نصیب تھا کہ بگڑتا چلا گیا

جناب عزیز احمد عزیز منتظم بی۔اے نظم

التجا

"اک ذرا چھیڑ تو دے تشنۂ مضراب ہے ساز"
ایک مدت سے ہے خاموش رباب ہستی
کروٹیں لیتا ہے رہ رہ کے شباب ہستی
حامل قصۂ غمگیں ہے کتاب ہستی
آلگا دامن ساحل سے حباب ہستی
"اک ذرا چھیڑ تو دے تشنۂ مضراب ہے ساز"
جلوۂ ہوش کو بیگانہ بنانے والے
زندگانی کو اک افسانہ بنانے والے
حسن کی شمع کو پروانہ بنانے والے
مطرب روح کو مستانہ بنانے والے
"اک ذرا چھیڑ تو دے تشنۂ مضراب ہے ساز"
نغمے بے چین ہیں مدہوش بنانے کے لئے
بزم کی بزم کو مینوش بنانے کے لئے
شاخ امید کو گلپوش بنانے کے لئے
منظر ہوش کو بیہوش بنانے کے لئے
"اک ذرا چھیڑ تو دے تشنۂ مضراب ہے ساز"

جناب نذیر میرزا برلاس بی۔ اے

"منثورات"

موسم بہار کے آوارہ پرندے دریچہ میں آکر مجھے گیت سناتے ہیں اور اڑ جاتے ہیں۔ اور خزاں زدہ زرد زرد پتے جو نغمے نہیں رکھتے اک آہ کے ساتھ لڑکھڑاتے ہوئے وہاں گرتے ہیں اور ڈھیر ہو جاتے ہیں۔

صبح کا سہانا وقت ہے۔ میں دریچہ سے لگا کھڑا ہوں، دنیا ایک نو وارد کی طرح سامنے سے گزرتی ہے۔ دم بھر کو ٹھہرتی ہے۔ اور واقف کارانہ انداز سے تسلیم کو جھکتے ہوئے اپنی راہ لیتی ہے۔

میری آرزوئیں دیوانی ہیں۔ میرے آقا! وہ تیرے نغموں کے دوران میں چلّا اٹھی ہیں۔ مجھے صرف سننے کی توفیق دے۔

"لڑکھڑاتے پتوں کی سرسراہٹ طوفان کا جواب ہے۔ لیکن تم اتنے خاموش۔ اتنے بے حس و حرکت کیوں ہو؟"

"میں صرف ایک پھول ہوں"

میرے دل کی لہریں دنیا کے ساحل سے ٹکراتی ہیں۔ اور آنسوؤں کے قطروں سے یہ الفاظ لکھ دیتی ہیں "ہم تمہیں چاہتے ہیں"

پرندے کی آرزو ہے کاش میں ابر ہوتا۔
ابر چاہتا ہے وہ اک پرندہ ہوتا۔

آبشار گا رہا ہے۔
"مجھے آزادی ملتے ہی نغمے دیتے جاتے ہیں"

میرا دن بیت چکا۔ میں اُس ناؤ کی طرح ہوں جو شام کے دھندلکے میں خلیج کے کنارے سے لگی لہروں کا نغمۂ رقص غور سے سن رہی ہے۔

ننھی کلی چٹکنے پر چلائی "پیاری دنیا! مرجھائیو مت۔"

زندگی ایسی حسین بنایئے جیسے بہار کا پھول اور موت جیسے اک خزاں زدہ زرد پتہ۔

طاقت نے تنتے ہوئے دنیا سے کہا: "تم میری ہو۔"
دنیا اسے فریب دے کر اپنے تخت کے قریب لائی اور زنجیروں سے جکڑ دیا۔
محبت نے دنیا سے کہا: "میں آپ کی ہوں۔"
دنیا نے اس کی پیشانی چومی اور گھر کی رانی بنا لیا۔

راہ چلتے چلتے ٹھہر ٹھہر کر پھول نہ توڑیئے۔ گزرتے جایئے۔ پھول آپکے لئے اپنی تازگی راستہ بھر قائم رکھیں گے۔

اندھیری رات! میں تیرے حُسن کو اُس محبوبہ کے حُسن کی طرح محسوس کرتا ہوں جس کے ہاتھوں میں ابھی کافوری شمع گل ہوئی ہے۔

میں اپنے دل کی غمناک تاریکیوں کی اوٹ میں اک آہٹ سی سن رہا ہوں ——— لیکن کوئی نظر نہیں آرہا۔

یاسمین کے پھول سے بارش کے قطرے نے سرگوشی کی "مجھے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنے دل میں رکھ لیجئے۔"
پھول نے اک آہ کی اور مرجھا کر زمین پہ آرہا۔

(ٹیگور)

افسانہ

صاحبزادہ احمد ندیم قاسمی بی۔اے

گناہ کے پجاری

ابھی تک وہ اُن فریبوں سے ناآشنا تھا جن کی گود میں اُسے پرورش دی گئی تھی۔ اُسکا خمیر جھوٹ۔ فریب اور ریاکاری کا ایک ایسا غلیظ مرکب تھا۔ کہ اکثر رات کو اس کے ٹھونے سے سینے سے ایک چیخ بلند ہوتی۔ جو اُسے کسی کا گلا کاٹنے کسی معصوم لڑکی کو ورغلانے یا کسی پرہیزگار کا تقوی توڑنے پر آمادہ کرتی۔ مگر یہ صرف احساس تھا۔ ابھی تک وہ اس سنّ تک نہیں پہنچا تھا۔ جہاں اُسے یہ کام روزمرہ کی ضروریات معلوم ہوسکیں۔ وہ ان کے تصوّر سے بھی ہچکچاتا تھا۔ وہ ان خیالات کے طوفانی سلسلے کو منقطع کرنے کی ازحد کوشش کرتا۔ کروٹیں لے لیکر دھندلے مکانوں کی چنیوں پر نگاہیں گاڑ دیتا کہ شاید وہ اِس دھن میں سو جائے۔ وہ گاتا کہ شاید اس سے روح کو چین نصیب ہو۔ اُٹھ اُٹھ کر ادھر اُدھر دوڑتا۔ کودتا۔ پھاندتا۔ مگر دماغ میں جیسے اُن تصورات نے پنجے گاڑ دئے تھے، اور اُن پنجوں کی نکیلی شاخیں اُس کی کھوپری کی ہڈی ہڈی کریدتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ اُسکا لرزتا ہوا دل لمحہ بھر کے لئے رُک جاتا، مگر پھر اُس کی روح سے پھر وہی فریاد بلند ہوتی۔ ایک ٹیس سی۔ اور جس چیز پر نگاہ ڈالتا وہ روح کی آواز کو دہراتی ہوئی معلوم ہوتی۔ ایک دن تو اُسے خود اپنی تصویر یہ کہتی ہوئی معلوم ہوئی "تجھے انسانی خون سے دھوڈالو!" ——— اور پھر یہ تمام تصورات اچانک اُسکے دماغ سے غائب ہوجاتے اور وہ کالج کی مسرور فضاؤں میں کھو جاتا، آدھی رات گئے اُسے نیند آتی اور دن چڑھے اُٹھ بیٹھتا۔ اُسکا باپ ڈاکو تھا۔ اور اُس کی ماں اُن "مقدس" خواتین میں شامل تھی۔ جو معزز گھرانوں کی بہو بیٹیوں کو ہوس پرستوں کے آستانوں پر جبہ سائی کرنے پر مجبور کرتی ہیں اُسکا گھر گناہ اور ریاکی درسگاہ تھا۔ رات اُسکا باپ اکثر دو بجے واپس آتا تھا۔ اُس کی ماں اُس سے کوئی سرگوشی کرتی، الماری کے کھلنے کی آواز آتی۔ اور پھر اُس کا باپ مصنوعی طور پر کھانستا اور ایک مخصوص انداز سے جس میں سکون واطمینان کو مجتمع کرنے کی کوشش کی ہوتی پوچھتا۔

"کیوں بیگم۔ اصغر تو سوگیا ہے نا؟"

اور پھر اصغر کو احساس ہوتا۔ کہ اس کے باپ کی زندگی کتنی اچھی ہے، سکون واطمینان جوان روح کے لئے گناہ ہے مہم پسند طبیعتیں اور مضطرب روحیں اس دنیا میں ایک ایسا بے نام سا سکون حاصل کرلیتی ہیں۔ جن کی تعریف کرنا ایسا مشکل ہے جیسے روح کی حقیقت تک پہنچنا۔

پھر وہ رات کو اپنے کمرے کے دروازے کے پاس ایک نوجوان کو بے چینی سے اِدھر اُدھر چلتے پھرتے دیکھتا دور سے

اس کی ماں آتی ہوئی نظر آتی۔ اس کے پیچھے کوئی برقعہ والی عورت ہوتی اور جب وہ نزدیک آتے تو نوجوان بے تابی سے بڑھ کر برقعہ والی کا برقعہ دور کر دیتا۔ لڑکی سہمی ہوئی نظریں زمین پر گاڑے کھڑی رہتی۔ وہ حیران ہوتا کہ اس لڑکی نے کیا قصور کیا ہے۔ اور اس لڑکے کا کیا حق ہے کہ ایک پردہ والی عورت کی اس طرح بے آبروئی کرے ——؟

سب کچھ وہ دیکھتا۔ مگر نہ اُسے باپ سے نفرت تھی، نہ ماں سے اجتناب۔ وہ ان دونوں کی پوجا کرتا تھا۔

ایک دفعہ اُسے کالج گیلری میں ایک سو کا نوٹ پڑا ملا تھا۔ اور اس نے تلاش کے بعد سو اس کے حقیقی مالک کو دیدیا تھا اور جب اس کے والدین نے یہ واقعہ اس کی زبانی سنا تو اُسے "کمزور عورت کی طرح بزدل۔ گیدڑ" کا لقب دیا گیا۔ اور یہی وجہ تھی کہ اُسے اپنی بے بضاعتی کا احساس ہوتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ان کاموں میں والدین کا ہاتھ بٹائے۔ مگر پھر اس کی روح میں وہی جنگ شروع ہو جاتی تھی۔ جس سے آدھی آدھی رات تک اُس کی آنکھیں کھلی رہتی تھیں۔ اسکا دل لرزتا رہتا تھا۔ اُس کی رگیں کانپتی رہتی تھیں!

ایک شب وہ نشاط سے "دیوداس" دیکھ کر آرہا تھا کہ راستے میں اُسے اپنا باپ ملا۔ سیاہ عبا میں چھپا ہوا سر پر ایرانی ٹوپی۔ ہاتھ میں عصا! اصغر حیران رہ گیا۔ بڑھ کر پوچھا۔

"ابا کہاں جا رہے ہو؟"

"چلو آج میرے ساتھ آؤ" اصغر کے باپ نے اُسکا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ اصغر اُس کے ساتھ ہو لیا۔ اُس کے دل میں کئی عجیب عجیب توہمات کروٹیں لینے لگے۔ "ابا کہاں جا رہا ہے؟ کسی کو قتل کرنے؟ کسی کا گلا گھونٹنے؟ کسی کا خون کرنے؟ کسی کو دھوکا دینے؟ کہاں جا رہا ہے؟ ان کاموں کے سوا اور اُس کا مقصد ہو ہی کیا سکتا ہے! اور میں! میں کیا کروں؟ میں کیا کرونگا؟ مجھے تو کلیجے میں کانٹے سے چبھتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ ایک جلن سی ہے، جو ہڈیوں کے گودے تک کو بھونتی ہوئی معلوم ہوتی ہے ایک خلش سی ہے جو جسم کے روئیں روئیں کو چھلنی ہوتی معلوم ہوتی ہے۔ میں کہاں جا رہا ہوں؟ ابا۔ میں کہاں جا رہا ہوں؟" ——

آخری الفاظ اس نے ذرا اونچی آواز میں کہہ ڈالے۔ بوڑھے ڈاکو نے اپنے بیٹے کی طرف دیکھا۔ اور آہستہ سے کہا "چلو۔ آج تمہیں اپنے پیشے کا پہلا سبق دوں" —— اور اصغر کا دماغ چکرا گیا۔ اُس نے باپ کو روکتے ہوئے کہا "ابا! مجھے چھوڑ دو میں جا کر کیا کرونگا؟"

باپ مسکرایا۔ اور اصغر کو بازو سے کھینچتے ہوئے بولا۔ "یہ آثار اچھے نہیں اصغر بیٹا! چلو۔ دُنیا شرافت کی دشمن ہے پاکیزگیٔ اخلاق زہر ہے، جو انسان کا جینا محال کر دیتی ہے۔ میں بھی اپنی جوانی کے دنوں میں شریف رہ چکا ہوں۔ میں نے بھی زندگی کو زہد اور اتقا کے رنگ میں رنگنا چاہا مگر بے شرمی بے حیائی نفس پرستی اور بد اخلاقی کی بارش نے اُن کی آن میں اس رنگ کو دھو دیا۔ اور پیچھے سے وہی دنیا والوں کی زبان میں ناپاک، غلیظ۔ ہوس پرست زندگی نکل آئی مسکراتی ہوئی انسان کی موہوم امیدوں کا مضحکہ اڑاتی ہوئی —— میں نے دیکھا۔ کہ یہ زہد کے دیوتا۔ شرافت کے پجاری، مذہب کے علمبردار دراصل شیطان کے کارندے ہیں، بھیڑوں کے بھیس میں بھیڑیئے

پتلیوں کے لباس میں شعلے، سندائی فوجدار ــــ اور پھر اصغر بیٹا! میں نے ان سب سے بڑھ کر اس میدان میں قدم رکھا۔ سینکڑوں کی جانیں تباہ کیں۔ ان گنت معصوم لڑکیوں کی عصمتوں پر ڈاکے ڈالے۔ بیشمار گھر گھروندے بنا ڈالے ــ چوریاں کیں۔ راہزنی کی۔ سب مزے سے گزران ہو رہی ہے کوئی فکر نہیں۔ ہزاروں روپے بنک میں جمع ہیں۔ لاہور کی سوسائٹی کا جزو لاینفک ہوں۔ میرے بغیر ہر جلسہ، ہر میٹنگ ہر پارٹی سنسان سی معلوم ہوتی ہے۔ صرف اس لئے کہ میں تیز ہوں، چلتا پرزہ ہوں، اگر میں شریف ہوتا۔ تمہاری طرح اگر میں ان کاموں سے ہچکچاتا۔ تو سوسائٹی مجھے ٹھکراتی، لوگ مجھے کمزور کہتے ــــ کمزور اور بزدل ــــ جس طرح آج میں تمہیں کہہ سکتا ہوں!"

اصغر حیران، سب کچھ سنتا چلا گیا۔ موٹروں کی گھر گھر، گھوڑوں کے سموں کی کھٹ کھٹ، سائیکلوں کی فر فر سے بے خبر وہ باپ کی انوکھی نصیحتوں کو سنتا رہا۔ اسکا دل یہ فیصلہ کرنے سے معذور تھا کہ وہ کونسی راہ پکڑے ــــ مگر آج کی رات باپ کا ساتھ ضرور دینا تھا۔ ورنہ وہ اُسے پھر "کمزور اور بزدل" کہے گا۔

وہ چلنے لگے۔ اور آخر ایک عالیشان کوٹھی کے پاس پہنچے۔ اصغر کا باپ جھاڑیوں کی آڑ میں لیٹتا کھسکتا۔ دیوار سے چمٹتا۔ برآمدوں میں رینگتا جا رہا تھا۔ اور اصغر اس کے پیچھے تھا۔ اپنے باپ سے سبق لے رہا تھا۔ گناہ کی ابجد یاد کر رہا اس کے جسم پر خراشیں پڑ گئیں۔ انگلیاں زخمی ہو گئیں۔ ٹھوڑی زمین پر لگ لگ کر چھل گئی۔ مگر وہ باپ سے "کمزور اور بزدل" کے القاب نہیں سننا چاہتا تھا۔ اور آخر وہ ایک کمرے میں پہنچے ایک سیٹھ سو رہا تھا۔ بے خبر! ــــ اصغر کا باپ بڑھا سیٹھ کے منہ میں ایک رومال ٹھونس دیا۔ اور پھر ایک رسی سے کس کر باندھ دیا۔ تجوری کو ایک آلے سے توڑا۔ اور روپوں کے ڈھیر نوٹوں کے گٹھے اپنی جیبوں میں ڈالتا اصغر کو اشارہ کرتا یہ جا وہ جا۔ احتیاط سے دوسرا شو دیکھ کر آنیوالے تماشائیوں میں مل گیا اصغر نے دیکھا کہ اُس کے باپ کے چہرے پر ایک قسم کی طمانیت اور تسلی سی ہے، اور اصغر وہ سر سے پاؤں تک کانپ رہا تھا۔ اف۔ جس وقت سیٹھ اپنی آنکھوں سے اپنی عمر بھر کی کمائی لٹتی ہوئی دیکھ رہا تھا۔ اور اصغر کا باپ روپوں کو دونوں ہاتھوں سے گھسیٹ گھسیٹ کر اپنی لمبی جیبوں میں ڈالتا جاتا تھا! اصغر کی آنکھوں میں دھندسی پھیل گئی تھی۔ اس نے اپنی آنکھوں میں پولیس، لاٹھی، ہتھکڑی جیل چکی۔ پھانسی کو ایک ایک کر کے لہراتے ہوئے دیکھا۔ اور پھر جب وہ بھیڑ میں آکر مل گیا۔ تو اُسے ہر شخص پر خفیہ پولیس کے سپاہی کا گمان ہوتا تھا۔ وہ سب سے الگ چل رہا تھا۔ تار کے کھمبوں کی اوٹ لیتا۔ سڑک کے درختوں کے پیچھے چھپتا۔ میکلوڈ روڈ کے دونوں جانب کی سبز گنجان باڑ کے ساتھ ساتھ چلتا جا رہا تھا۔ اور اُسکا باپ! ــــ اُسکا باپ ایک دکان سے شراب خرید رہا تھا۔ اصغر کی روح چیختی ہوئی معلوم ہوئی۔ اس کے جی میں آئی کہ پکار پکار کر لوگوں کو بتا دے کہ میں مجرم ہوں میں ڈاکو ہوں۔ مگر یہ سب الفاظ اس کے سوکھے ہوئے حلق میں آکر اٹک گئے۔

آخر وہ گھر پہنچے۔ اُس کی ماں موجود نہ تھی۔ اصغر باپ سے کچھ بات کئے بغیر اپنے کمرے میں آلیٹا۔ وہ سوچنے لگا۔

"کر چوری کرنا کتنی مشکل بات ہے۔ مگر کس قدر فرحت بخش۔ اب اگر ابا اس سال تک بھی کسی کی چوری نہ کرے تو ہم ایک نواب سے بڑھ چڑھ کر زندگی بسر کر سکیں گے مؤا کہ بڑی چیز نہیں۔ آخر ہمارا بھی کوئی حق ہے نا! ہم اس دنیا میں ماتم کے لئے تو نہیں بھیجے گئے۔ خوب دیا۔ خوب کیا" —— مگر پھر اسے خیال آیا — وہ بیچارا سیٹھ۔ اس کی حالت کیا ہوگی؟ آخر وہ بھی انسان تھا۔ اس نے اپنی محنت سے سب کچھ کمایا تھا۔ وہ کیوں لوٹا گیا۔"

یکایک اُس کے کمرے کا دروازہ کھلا۔ اس کی ماں دروازے پر کھڑی مسکرا رہی تھی۔ اصغر تعظیماً اٹھ کھڑا ہوا۔

"بیٹا" ماں نے آگے بڑھ کر کہا "مبارک ہو!"

اصغر اس مبارکبادی کا مطلب سمجھ گیا۔ شرمایا۔ مسکرایا اور سر جھکا کر پلنگ پر بیٹھ گیا۔ یکایک اُسے اپنے پاس کسی غیر کی موجودگی کا احساس ہوا۔ اس نے نظریں اٹھائیں۔ دروازہ بند تھا۔ اور اس کے سامنے ایک لڑکی کھڑی تھی۔ نوخیز —— نگاہیں فرش پر گاڑے ہوئے، پسینے سے شرابور، کانپتی ہوئی پلکوں پر دو چار آنسو بھی لرز رہے تھے۔ اصغر حیران رہ گیا۔ اُسکا کلیجہ پھیل کر سمٹا۔ اور اُس کے جسم کا تمام خون اُس کی آنکھوں میں آگیا۔ اسے اپنے سر کے گرد دوزخی آگ بھڑکتی ہوئی معلوم ہوئی۔ اس نے بولنے کی کوشش کی مگر زبان پتھر کا ٹکڑا بنکر رہ گئی۔ اسے لڑکی کی ایک ہچکی بھی سنائی دی۔ اصغر کو رحم سا آگیا۔ اُٹھا اور بولا۔

"تم رو کیوں رہی ہو لڑکی؟"

لڑکی حیران رہ گئی۔ اس نے نظریں اٹھائیں۔ اف اصغر

ہونٹ۔ گول گلابی چہرہ۔ موزوں قد۔ اٹھتی جوانی۔ اس نے اصغر کو آنکھ بھر کر دیکھا۔ اصغر نے چیخنا چاہا۔ اُس کی روح ایک پہاڑ تلے دبتی معلوم ہوئی۔ مگر اس نے ہمت کرکے پوچھا۔

"تم یہاں کیسے آئیں لڑکی؟"

"آپ نے جو بلایا ہے" لڑکی نے جواب دیا۔ مگر ایسی آواز میں جس میں مظلومیت۔ دردمندی اور رحم کی التجا کانپ رہی تھی۔

"میں نے بلایا ہے؟" اصغر حیران رہ گیا "میں نے تمہیں نہیں بلایا بھولی لڑکی مجھے تم سے کیا کام!"

لڑکی قدرے آگے بڑھی اور فرش پر بیٹھ گئی۔ اصغر پلنگ پر ذرا پرے کھسک گیا۔ ایک غیر لڑکی کو اپنے اس قدر قریب دیکھ کر اسے شرم سی محسوس ہوتی تھی۔ لڑکی نے کہا۔

"اگر یہ بات ہے تو مجھ پر رحم کیجئے"

"کیسا رحم؟ میں تمہارے لئے کیا کر سکتا ہوں؟"

"مجھے میرے گھر پہنچا آیئے"

اور لڑکی نے مسکرانے کی کوشش کی۔ ادھر وہ مسکرائی اُدھر اصغر کا دل اچھلا۔ وہ پلنگ سے اٹھا۔ اور پوچھا۔

"تو چلو"

مگر اب اسے اندر ہی اندر کوئی احساس پکار پکار کر کہہ رہا تھا "اصغر اسے جانے نہ دینا" اور خدا جانے کس لئے۔ کس بات سے مجبور ہو کر۔ اصغر نے اُس کی انگلی اپنے ہاتھ میں لی۔ بجلی کی ایک سخت لہر اُس کی رگوں میں دوڑ گئی۔ اس کی آنکھوں پر نیند سی بھر گئی۔ اُسے ایک انگڑائی بھی آئی۔ اس نے ایک آہ بھر

دروازے کے پیچھے سے اپنے والدین کے ہنسنے کی آواز آئی۔ وہ قدرے سہم گیا۔ مگر وہ اس لڑکی کو نگل جانا چاہتا تھا کتنی لطف انگیز اور وجد آمیز خصوصیتوں کی مالک تھی وہ لڑکی ——— صبح ہو گئی۔ لڑکی باہر نکلی۔ اصغر نے دیکھا کہ اس کی ماں لڑکی کو پانچ روپوں کا ایک نوٹ دے رہی ہے وہ مسکرایا اور اپنا سر تکئے پر رکھ کر سو گیا۔

———

ایک سال گذر گیا۔ اصغر نے اپنے باپ کی کارکردگیوں کا ریکارڈ توڑ دیا۔ گناہوں کا زنگ اس کے احساسات پر اس سختی سے چھا گیا۔ کہ اس نے چوریاں کیں۔ بنکوں میں چھاپے مارے سیٹھوں کے پیٹوں میں خنجر بھونکے۔ بیواؤں کی پونجیاں اڑائیں اور زندگی کو ایک کھلونا سمجھ لیا۔ اسکا باپ اسی طرح اپنے کام میں مشغول رہا۔ اور اس کی ماں اسی طرح اپنے فرض میں گمن رہی۔ خدا انہیں ایک بے حس و حرکت نور کے سوا اور کچھ نہ معلوم ہوتا تھا۔ خدائی ان کے لہو و لعب کا ایک میدان تھی۔ جس میں رکاوٹیں نابود تھیں۔ اور پھر غضب یہ کہ اصغر لاہور کی معزز ترین کلب کا پریذیڈنٹ بھی تھا۔ ایک کروڑ پتی اور ایک کروڑ پتی کا بیٹا! ایک ایسی خاتون کا لڑکا جس کا اثر لاہور کے تمام شریف گھرانوں پر چھایا ہوا تھا۔ اصغر بازار سے گزرتا تو لوگ اسے سلام کرتے، عورتیں جھک جاتیں۔ اصغر مسکراتا ہوا چلا جاتا۔ اسے ان نیک اور متقی بندوں پر رحم آتا جو ہاتھوں میں تسبیحیں لٹکاتے، داڑھیاں بڑھاتے مسجدوں میں خدا کی خوشامدیں کر رہے تھے۔ اور ان پجاریوں کی بدحالیوں کو دیکھ دیکھ کر کڑھتا جو مندروں میں مورتیوں کے قدموں سے سر رگڑ رگڑ کر اپنا جیون نشٹ کر رہے تھے!

اسے یہ سنسار گناہ کا ایک طویل چوڑا عظیم سمندر معلوم ہوتا۔ جس پر وہی کشتی چل سکتی تھی۔ جو گناہ کے چپوؤں سے چلائی جا رہی ہو۔ شرافت نیکی۔ اور پرہیزگاری کی کشتیاں اس سمندر میں کچھ دیر تیرتیں مگر اچانک غرق ہو جاتیں۔ اور سطح آب پر مصلّے تسبیحیں۔ خرقے۔ سجادے تیرتے ہوئے چھوڑ جاتیں۔

———

ایک رات کا ذکر ہے۔ کہ اصغر کی ماں اپنے بیٹے کیلئے ایک ایسی لڑکی لینے گئی۔ جسکا غرور بڑے بڑے کجکلاہوں کی التجاؤں کو روند چکا تھا۔ اور جسکا استغنا بڑے بڑے دماغ والوں کا سر غرور جھکا چکا تھا اسکا باپ اس کے کمرے میں آیا اور کہنے لگا۔

اصغر بیٹا! کتنی اچھی زندگی ہے تمہاری۔ گناہ اور ثواب کا احساس روح کے لئے موت ہے بیٹا! گناہ کیا ہے؟ ثواب کیا ہے؟ ڈھکوسلے۔ خدائی فوجداروں کی خود غرضانہ موشگافیاں ثواب حاصل کرنے والوں کو دیکھتے ہو بے چارے بدحال نچلے طبقے کے ذلیل لوگ، اور ہم ——— بتاؤ۔ کون ہے۔ جو ہماری عزت نہیں کرتا۔ یہ ثواب کی گٹھڑیاں اٹھانے والے زاہد لوگ بھی ہمیں سلام کرتے ہیں۔ آخر کیوں؟ کوئی وجہ تو ہے نا؟ یہی کہ گناہ اس دنیا کی بنیاد ہے، اگر گناہ کا وجود نہ ہوتا تو بابا آدم جنت ہی میں پھنسے رہتے۔ فطرت کی اس نئی اور انوکھی جنت کو نہ دیکھ سکتے، یہ جنت ہے۔ اصغر مگر کئی بدبختوں کے لئے دوزخ بھی ہے۔ مگر دنیا تو موم کی طرح نازک چیز ہے، جدھر موڑو مڑ جائے گی۔ میں نے تمہیں بتایا تھا تا۔ کہ میں بھی

شرافت کی ہوا میں سانس لے چکا ہوں۔ اُسوقت یہ جہان میرے لئے بھی دوزخ تھا۔ اور اب ـــــــ اب جنت سے کچھ بلند ہی ہے' ہاں۔ اگلی دنیا کا احساس کبھی کبھی ہوتا ہے۔ مگر کون جانے اگلی دنیا میں کیا ہوگا! آخر وہ ہستی جسے لوگ خدائے رحیم اور رب کریم کہ کر پکارتے ہیں' اپنی رحمت کو کام میں تو لائے گی۔ اور اگر نہ لائی۔ تو دوزخ سہی' جل مرینگے بس!

جب حشر کا دن آئے گا
اُسوقت دیکھا جائے گا

ہاں تمہیں اپنی شرافت کی داستان بھی سنا دوں تاکہ کہیں تم پھر اس غلیظ خطے میں نہ پھنس جاؤ۔ میں لاہور میں پڑھا کرتا تھا۔ طالبعلمی کے زمانے میں میری شادی ہوگئی۔ کالج کا ہر فرد میری شرافت اور سادگی کی تعریف کرتا تھا۔ اور میں واقعی اس قدر شریف تھا۔ اس قدر سادہ اور متین۔ کہ آج وہ دن یاد کر کے مجھے تعجب ہوتا ہے۔ ہاں۔ تو سب میری تعریف کرتے تھے مگر انکی تعریف میں ایک قسم کا مزاح سا تھا۔ ایک نفرت انگیز لہجہ۔ جس میں کئی شریر قہقہے درپردہ گونج رہے ہوں۔ کوئی ایسا ہفتہ نہ تھا جس میں میری چوری نہ ہو جاتی ہو۔ کبھی گھڑی گم ہے تو کبھی ٹوپی غائب، کبھی سوٹ نہیں تو کبھی بوٹ نہیں۔ اور کبھی بٹوا کی تلاش ہو رہی ہے! لڑکے مجھ سے ہمدردی کرتے' اور بیٹا! انہی ہمدردوں میں چور بھی ہوتے' میرے خیر خواہوں کی اس فوج میں میرے بدخواہ سب سے بڑھ چڑھ کر مجھے سہارا دینے کی کوشش کرتے' "ارشاد بھائی! روز لٹ جاتے ہو۔ بتاؤ ہمارے لائق کوئی خدمت ہے؟ ہم چندہ کر کے تمہارا نقصان پورا کر سکتے ہیں۔" ـــــ میں شریف تھا۔ شرم سے سمٹ جاتا۔ اور کہتا "بھائی۔ مضی ما مضی۔ اب کیا ہو سکتا ہے' تم خوش رہو۔ تمہاری ہمدردی ہی بہت ہے۔" خیر آخر کالج چھوٹا۔ میری بیوی کا نام جس سے میں انتہائی محبت کرتا تھا۔ عفیفہ تھا۔ اور میں اُسے اسم بامسمیٰ سمجھتا تھا۔ بیروزگاری کی لعنت سے مجھے بھی دو سال دوچار ہونا پڑا۔ اس نے کبھی شکایت نہ کی کہ ہم بھوکے مرجائیں گے' صبر و شکر سے جو مل جاتا کھا لیتی۔ وہ مجھے اپنی وفا کا احساس دلاتی میں اسے اپنی محبت کی داستان سناتا۔ اور اگر وہ مجھے فرشتہ سمجھتی تھی تو میں اُسے حور جانتا۔ اور بیٹا! ایک دن میں نے کیا دیکھا۔ وہ آدھی رات کو چارپائی پر سے اُٹھی۔ میں نے دل میں کہا یہ کہاں جا رہی ہے؟ اُسکے پیچھے ہو لیا۔ وہ باہر نکلی۔ دروازے پر ایک نوجوان کھڑا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں ہاتھ دیا۔ اور پھر ـــــ پھر میں نے ایک اینٹ اٹھائی۔ اور پوری طاقت سے نوجوان کے سر پر دے ماری' وہ چیخا۔ اور تڑپ کر ٹھنڈا ہو گیا۔ پھر میں نے بیوی کو بالوں سے پکڑا۔ اُسے گھسیٹ کر اندر لے آیا۔ اور اُس کی خوبصورت ناک کا آخری حصہ کاٹ لیا۔ اور گھر سے باہر نکال دیا وہ تمہاری ماں تھی!"

"کیا؟" اصغر کی آنکھوں سے شعلے برسنے لگے۔

"وہ تمہاری ماں تھی۔" اصغر کے باپ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"وہ میری ماں تھی!"

ہاں۔ میں نے لاش کو ٹھکانے لگایا۔ اور بعد میں سنا کہ تمہاری ماں نے ایک اور جگہ شادی کر لی ہے۔ اور سال کے بعد اُس کے ہاں ایک لڑکی بھی پیدا ہوئی ہے۔ بس پھر مجھے کچھ معلوم نہیں

اس دن سے نیکی اور پرہیزگاری کی مقدس نقاب اُٹھ گئی
مجھے مذہبوں کے پردوں میں کئی چیتے پنجے پھیلائے دانت نکالتے
ہوئے یتیموں پر جھپٹتے ہوئے نظر آتے۔ اور میں نے عزم کر لیا
کہ اب گناہ کرونگا۔ گنہگار بنونگا۔ اور گنہگاری کی سند لیکر
قیامت میں اُس "رحیم وکریم" ہستی کے سامنے پیش ہو جاؤنگا
دیکھو۔ کسی پہ یقین نہ کیا کرو۔ ہر شخص میں کوئی نہ کوئی برائی
ضرور ہوتی ہے۔ یہ بڑے بڑے پرہیزگار ہم سے بھی زیادہ
گنہگار ہیں۔ یہ لاشوں کو بیچ کر پیسے کمانے والے مردوں کی
ہڈیاں چچوڑنے والی گدھیں۔ ہاں۔ سمجھے۔ پھر میں لاہور سے
نکل بھاگا۔ اور ایک اور شہر میں اُس بازار کے چکر کاٹنے
شروع کئے۔ جہاں حسن کوڑیوں کے مول بکتا ہے۔ وہاں سے
ایک عورت کو ورغلایا۔ شادی کر لی۔ اور لاہور آگیا۔ وہی آجکل
تمہاری ماں بنی ہوئی ہے۔ اب تم ہی کہو میں گنہگار بنا نہیں
بنا گیا ہوں، اور آخر خود بنتا۔ تو کون سی بڑی لغزش تھی۔ بیٹا
میرا تو یقین ہے کہ اس دنیا میں گناہ کرنا ثواب ہے اور نیکی
کرنا گناہ۔"

اصغر پہلے ہی شرافت سے متنفر تھا۔ اور اب تو نیکی
اُسے ایک بھوت معلوم ہونے لگی۔ ہڈیوں کا ڈھانچہ جو انسانیت
کے گلے کو دباتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ اُس نے کہا "ابا! میں
ان حالات کو سمجھ چکا ہوں۔ شکر ہے میں نے شرافت کو
زیادہ نہیں پوجا۔ میں اس زندگی سے مانوس ہو گیا ہوں
ابا ــــ"

آخر اُس کی ماں آگئی۔ اُس سراپا غرور کو اپنے ساتھ
لئے ہوئے۔ اور پھر کمرے میں اصغر اور وہ نخوت پسند
لڑکی تھی اور بس!

ہوس نے کروٹیں لیں۔ نفس نے پر پھیلائے۔ اور شرافت
کا گلا کٹ کر دور جا گرا۔ آدھی رات گزر گئی۔ کمرے میں بجلی کی روشنی
تھی۔

اصغر لڑکی کے قریب ہو کر کہنے لگا۔
"پیاری۔ تم کہاں کی رہنے والی ہو۔ اگر تم میری اور
صرف میری ہو جاؤ تو ــــ"

لڑکی بولی "اصغر پیارے۔ تم نے مجھے اپنا بنا لیا ہے
میں نے آج تک کسی غیر مرد سے بات تک نہیں کی۔ میری
بے کس ماں اور بوڑھے باپ کے سوا میرا اس دنیا میں کوئی
نہیں۔ نوجوان طبقہ میرے قدموں پر جھکا پڑتا تھا۔ مگر میں
اسے ٹھکراتی رہی، کیونکہ ماں نے مجھے یہی تعلیم دی تھی۔ میری
ماں۔ بے چاری۔ بدنصیب عورت، وہ ایک شریف گھرانے
کی لڑکی تھی۔ اسکا خاوند پہلے تو اس پر بہت مہربان تھا۔
مگر ایک روز خدا جانے کیوں اُس نے میری ماں کو مارا۔ اور
اُس کی ناک کاٹ کر گھر سے باہر نکال دیا۔

"کیا؟" اصغر کا دم گھٹ گیا "کیا کہا؟"
"ناک کاٹ کر گھر سے باہر نکال دیا اور ــــ"

اصغر ہکا بکا رہ گیا۔ لڑکی بدستور باتوں میں مشغول رہی۔
"اور آخر۔ میری ماں نے ایک ادھیڑ عمر شریف سوداگر سے
شادی کر لی۔ ناک کے کٹ جانے سے وہ موت کو زندگی پر
ترجیح دیتی تھی۔ مگر میرے باپ نے اُسے سمجھایا۔ کہ اُس کی
نظر میں صورت سے سیرت زیادہ قیمت رکھتی ہے میں ان کی
اکلوتی بیٹی ہوں۔"

"تمہاری ماں کا نام کیا تھا؟"

"عفیفہ"

"عفیفہ؟"

اصغر بجلی کی سی تیزی کے ساتھ پلنگ پر کھڑا ہو گیا۔ اُس کے بازو اکڑ گئے۔ اس پر سکتہ کا عالم چھا گیا۔ لڑکی نے حیران ہو کر پوچھا "کیوں کیا ہے اصغر؟"

"تم میری بہن ہو!"

"بہن؟" اور لڑکی نے دیکھا کہ اصغر کی آنکھیں بے نور ہو گئی ہیں۔ جسم ڈھیلا پڑ گیا ہے۔ اُس نے دیوار کا سہارا لیا۔ جھکتا گیا، جھکتا گیا۔ اور آخر فرش پر گر پڑا۔ اُس کے ماں باپ اندر دوڑے آئے، دیکھا تو اصغر سرد ہو چکا ہے۔ دونوں نے تعجب سے لڑکی کی طرف دیکھا۔ لڑکی کا رنگ اُڑ چکا تھا۔ پتلیاں پھر گئی تھیں۔ اس نے اصغر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "یہ میرا بھائی تھا۔"

"بھائی؟" دونوں یک زبان ہو کر بولے اور قبل اس کے کہ وہ لڑکی کو سنبھالتے وہ گر کر ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ اصغر کے باپ نے اپنی بیوی کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرا دی! وہ خود بھی مسکرایا اور کہنے لگا۔

"بیچارے گناہ کی نوعیت کو نہ سمجھ سکے!"

دونوں نے قہقہے لگائے۔ اور اصغر اور اُس کی بہن کو باہر قبرستان میں دفن کر آئے۔

جناب آسی رام نگری

افسانہ

قسمت کی ہیٹی

دائی کے منہ سے بات نکلی ہی تھی کہ سارے گھر میں کہرام مچ گیا۔ "لڑکی پیدا ہوئی! لڑکی پیدا ہوئی۔" سب کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ گئے۔ لوگوں کے چہروں پر اداسی چھا گئی جس نے سنا اسی نے ٹھنڈی سانس لیکر کہا "ہے ایشور! بیٹی پیدا ہوئی۔ بھلا پانچ لڑکیوں کا کیسے گذارا ہوگا؟"

بابو شیام سندر نیچے دالان میں بیٹھے ہوئے تھے لڑکی ہونے کی خبر ان کے کانوں میں بھی پہنچی۔ انہیں یقین نہ ہوا۔ انہوں نے فوراً نوکر کو بلا کر پوچھا۔ مگر نوکر نے جب اس نے بھی دھیرے سے وہی بات دہرائی تو ان کا دل کانپ اٹھا۔ انہوں نے ایک لمبی سانس لی۔ جیسے انکے اوپر مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہو۔ وہ تھوڑی دیر کے لئے پاگل سے ہو گئے۔ پھر سنبھلے۔ اور اپنے دل کو سمجھانے بہت کوشش کی لیکن ان کی یہ سعی غم و غصہ کی آندھی میں پنکھے کی ہوا بنکر رہ گئی۔ ان کا چہرہ غصہ سے لال ہو رہا تھا۔

اسی وقت ان کے بہنوئی رادھے موہن نے آکر کہا—"لڑکی مبارک ہو!" جلتی ہوئی آگ میں تیل کا چھینٹا پڑ گیا۔ شیام سندر جھنجھلا کر بولے——"رہنے دیجئے مبارکبادی۔"

"لڑکی کے نام سے آپ اتنے ناخوش کیوں ہو گئے؟"

"آپ کے بھی پانچ پانچ لڑکیاں ہوتیں تو پتہ چلتا"

"واہ بھئی لڑکیاں کوئی آفت ہیں جو آپ ان سے اتنا گھبرا رہے ہیں۔ جیسے بیٹے ویسے بیٹیاں۔ دونوں ایشور کی دین اور دل بہلانے کے انمول کھلونے ہیں۔"

"بھائی صاحب! مجھے آپ کا اپدیش اچھا نہیں لگتا یہ سب اس کمبخت نالائق عورت کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ اگر پانچ بیٹے ہوتے تو میرا سر اونچا ہو جاتا۔ ان لڑکیوں کی بدولت مجھے زندگی بھر خوشامد کرنے اور ناک رگڑتے گزرے گی۔ میرا اونچا سر نیچا ہو جائے گا۔ اور تنی ہوئی مونچھیں جھک جائیں گی۔"

"بھابی جی کو تو آپ ناحق ہی الزام دے رہے ہیں اس میں ان کا کیا قصور ہے؟ یہ سب تو بدھاتا کی لیلا ایشور کی مایا ہے۔"

"تمہاری بھابی جی چولہے میں جائیں۔ میرے سامنے ان کا نام نہ لو۔ پانچ پانچ لڑکیوں کی ماں تمہاری بھابی ہوں گی۔ مجھے تو ان کے نام سے بھی نفرت ہوتی جاتی ہے"

رادھے موہن نے ان کی الٹی سیدھی باتوں کا جواب دینا مناسب نہ سمجھا۔ اور چپ چاپ اٹھ کر چلدیئے۔

شیام سندر بیٹھے ہوئے خیالات کی رو میں بہہ رہے تھے کبھی اپنی آئندہ زندگی پر غور کرتے کبھی قسمت کو کوستے۔

کچہری کا وقت آگیا۔ نوکر نے حسب معمول آکر کہا "بابو جی بھوجن تیار ہے" شیام سندر بگڑ کر بولے "سامنے سے چلا جا۔ بک بک مت کر۔ میں بھوجن نہ کروں گا۔ مہراج سے کہہ دے رسوئی اٹھا دے۔

بارہ بجے ان کا غصہ کچھ کم ہوا۔ انہوں نے اٹھ کر کپڑے بدلے۔ اور بغیر کھانا کھائے کچہری چل دیئے کسی کو ہمت نہ ہوئی کہ ان سے دوبارہ کھانا کھانے کو کہتا۔

جس کمرے میں شیام سندر اور ان کے بہنوئی باتیں کر رہے تھے۔ زچہ خانہ سے لگا ہوا تھا۔ لیلاوتی اپنے پتی اور اُنکے بہنوئی کی ساری باتیں کان لگا کر سن رہی تھی۔ ان کی باتیں سنکر اور یہ جان کر پتی دیو بیٹی کے پیدا ہونے کی خبر سن کر غم و غصہ کے مارے کھانا کھائے بغیر کچہری چلے گئے۔ اس کے دل کو سخت صدمہ پہنچا۔ وہ پہلے ہی سے جانتی تھی کہ اگر اس بار لڑکی پیدا ہوئی تو خیریت نہیں۔ لیکن وہ کر ہی کیا سکتی تھی؟ وہ سوچتی تھی کہ یہ کچھ اس کے بس کی بات تو تھی ہی نہیں۔ وہ تو خود چاہتی تھی کہ اسے اب اولاد ہی نہ ہو۔ لیکن وہ بے بس تھی۔ لیلاوتی اپنی مجبوری اور شوہر کے غصہ پر رو پڑی۔ اور قسمت کو کوسنے لگی کہ اسے اس بارے میں ایسا بے بس کیوں بنایا گیا؟ جذبات سے مغلوب ہو کر اس نے طے کیا کہ اگر اسی لڑکی ہی کی وجہ سے پتی دیو کی زندگی اجیرن ہو رہی ہے تو اسکا خاتمہ ہی کیوں نہ کر ڈالوں؟"

لیلاوتی نے اِدھر اُدھر کمرے میں دیکھا۔ کوئی نہ تھا اس نے بے قصور بچی کو ہمیشہ کے لئے دھرتی ماتا کو سونپ دینے کے لئے اسے گود میں اٹھا لیا۔ لیکن ممتا کی ماری ماں کا ہاتھ کانپ اٹھا۔ اس کی نظر بچی کی پیاری صورت پر پڑی۔ وہ اپنی چنچل چتون سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

لیلاوتی کو ایسا معلوم ہوا۔ جیسے بے گناہ بچی اپنی حسرت بھری نگاہوں سے رحم کی بھیک مانگ رہی ہو۔ ماں کا دل نرم تو ہوتا ہی ہے۔ ممتا اور محبت سے لبریز ہو گیا۔ لیلاوتی اپنی کمزوری اور بے بسی پر تڑپ اٹھی۔ اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اور سوچنے لگی بھلا اس بیگناہ بچی کو مار ڈالنے کے لئے میں کیوں آمادہ ہو گئی تھی؟ اور مجھے کیا حق حاصل ہے کہ ایک بے گناہ بچی کو جان سے مار ڈالنے کے ننگِ انسانیت خیال کو بھی اپنے دل میں جگہ دے . . . . ؟

ماں ہو کر بھی وہ اتنا سخت برتاؤ کرنے کے لئے کیوں آمادہ ہو گئی؟ وہ بچی اسکے گوشت اور خون سے بنی ہے۔ اُسکے لئے اس نے کتنی مصیبتیں اٹھائی ہیں؟ کتنی تکلیفیں برداشت کی ہیں۔ لیکن آج اُسے اپنے ہاتھوں موت کے گھاٹ اتارنے جا رہی ہے جس اولاد کی انگلیاں دکھنے پر ماں کی چھاتی پھٹ جاتی ہے۔ جسکے رونے پر ماں کا کلیجہ ہل جاتا ہے۔ اُس کے گلے پر اپنے ہاتھ سے چھری پھیرنے جا رہی ہے؟ ہے ایشور! مجھے کیا

ہوگیا۔ . . . ؟ مجھے اچھی سمجھ دے۔ میری بیٹی مجھے معاف کر۔ . . . ."

لیلاوتی نے خیالات کے رو میں بہتے بہتے ایک بار پھر بچی کے منہ کو چوما۔ اور پیار کیا۔ اس سے اس کے دل کو کچھ سکون حاصل ہؤا۔ اور وہ بچی کو چھاتی سے لگا کر لیٹ گئی۔

کسی نہ کسی طرح بارہ دن گذر جانے کے بعد لیلاوتی زچہ خانہ سے باہر نکلی لیکن پتی پتنی میں ابھی دل کھول کر بات چیت نہیں ہوئی تھی۔

بچی کے پیدا ہوتے ہی سارے گھر میں افسردگی چھا گئی تھی۔ اس لئے لیلاوتی اسے ابھاگنی کہہ کر پکارتی تھی۔ دھیرے دھیرے ابھاگنی دو مہینے کی ہوگئی۔ ماں کی طرف دیکھتے ہوئے کبھی کبھی مسکرا دیتی تھی۔ اس کی آنکھیں چنچل ہرنی کی طرح تھیں۔ اسکا پیارا مکھڑا چاند کی طرح چمکتا تھا۔ اور وہ لکشمی کا نیا اوتار معلوم ہوتی تھی۔ اُسے جو دیکھتا بے پیار کئے نہ رہتا۔ اور لیلاوتی کا کیا پوچھنا۔ وہ تو اس پر جان چھڑکتی تھی۔

آج ابھاگنی کچھ بیمار تھی۔ اس کی علالت کی وجہ سے لیلاوتی فکرمند اور اداس تھی۔ وہ رہ رہ کر گھبرا اٹھتی تھی۔ اور طرح طرح کے بُرے خیالات اُسے پاگل بنا رہے تھے۔

لیلاوتی ابھاگنی کو دم بھر کے لئے بھی اپنے سے الگ نہ رکھتی تھی۔ چار دن تک برابر ڈاکٹر وید آتے رہے دوا دارو ہوتا رہا۔ ماں ممتا کی ماری بلا رہی ... جانے کتنے

تعویذ اور گنڈے ٹونے باندھے۔ لیکن مرض برابر بڑھتا ہی گیا۔ اور ساری دوا دوش بیکار ثابت ہوئی۔ جس ابھاگنی کو وہ پیدا ہوتے ہی مار ڈالنے کے لئے تیار تھی۔ جس کی پیدائش کی خبر نے باپ کو متفکر اور مغموم بنا دیا تھا۔ وہ ابھاگنی آج خود ہی اس بے رحم باپ کو ٹھکرا کر چل بسی۔

بچی کے سدھار جانے کے بعد ماں کی ممتا کی ندی آنسوؤں کے روپ میں آنکھوں کی راہ اُمنڈ پڑی۔ لیلاوتی کی گود سونی ہوگئی۔ اس کی سونے کی چڑیا جسے وہ جان سے زیادہ پیار کرتی تھی اڑ گئی۔ وہ ابھاگنی ابھاگنی چلا رہی تھی۔ اسے ایسا معلوم ہو رہا تھا۔ جیسے ابھاگنی اب بھی اسے رو رو کر بلا رہی ہو۔

ابھاگنی چلی گئی لیکن لیلاوتی کے دل میں ایک ٹیس چھوڑ گئی۔ رات دن جاگ کر پریشان ہوئی۔ ہزاروں دکھ سہے۔ لڑکی پیدا ہونے پر لوگوں کے طعنے سنے صحت برباد کی۔ لیکن کچھ ہاتھ نہ آیا۔ جو ملا تھا وہ بھی چھن گیا۔ لوگوں کے لئے ابھاگنی کی پیدائش رنج و ملال کا موجب تھی۔ لیکن لیلاوتی کے لئے ابھاگنی کی موت ناقابل برداشت صدمہ تھی۔ اور اسے کچھ ممتا کی ماری ماں کا دل ہی جانتا تھا۔

× × × × ×

ایک دن کمرے میں پتی پتنی بیٹھے تھے۔ ابھاگنی کو مرے ہوئے کافی عرصہ گذر چکا تھا۔ اس کے مرنے کا سانحہ گذر گیا ... رات ہو چکی تھی ... شام سے ... اور

لیلا وتی میں کچھ بات چیت ہو رہی تھی۔

"لیلا وتی! آج تم بہت زیادہ اداس ہو۔ کہو طبیعت تو اچھی ہے؟"

شیام سندر نے لیلا وتی کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"اداس تو نہیں ہوں"

"لیکن اور دنوں کی طرح آج تمہارے ہونٹوں پر مسکراہٹ تو نہیں دیکھ رہا ہوں"

"نہ ہوگی مسکراہٹ۔ کسی کی جوانی سدا تھوڑی ہی رہتی ہے۔ یہ تو چلتی پھرتی چھاؤں ہے۔"

شیام سندر ذرا تیز آواز میں بولے "تمہیں نہ جانے کیا ہوگیا ہے کہ جب دیکھو ٹیڑھی باتیں کرتی ہو سیدھی بات کرنے کے لئے جیسے قسم کھا رکھی ہے۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے تمہیں میرے سایہ سے بھی نفرت ہوگئی ہے"

"نہیں ایسا تو نہیں ہے" لیلا وتی مسکراتی ہوئی بولی۔

"اگر ایسا نہیں ہے تو پھر تم مجھ سے کوسوں دور کیوں بھاگتی ہو؟ جب میں تمہارے قریب آتا ہوں۔ تو تم پیچھے کھسک جاتی ہو"

"اسلئے کہ بہت دنوں تک ساتھ رہ چکی۔ اب ساتھ رہنے کو جی نہیں چاہتا" لیلا وتی نے ہنستے ہوئے کہا۔

"تو کیا مجھ سے علیحدہ ہونا چاہتی ہو؟"

"ہاں آپکے خیالات اور برتاؤ تو مجھے اسی کے لئے اکساتے ہیں۔ کیونکہ میرے ہمیشہ بیٹیاں ہی پیدا ہوتی ہیں۔ اگر اس بار پھر میری بدقسمتی نے وہی دن دکھائے تو میرے لئے یہ گھر نرک بن جائے گا" لیلا وتی بھی ذرا تیز ہو کر بولی۔

شیام سندر نے منانے کا انداز اختیار کرتے ہوئے اور لیلا وتی کے گالوں کو چھوتے ہوئے کہا——

"ارے تم ہنسی ہنسی میں برا مان جاتی ہو؟"

لیلا وتی نے شیام سندر سے تھوڑی دور پیچھے ہٹتے ہوئے کہا—"میں روٹھ کر یا آپ سے خوشامد کرانے مزہ لینے کے لئے یہ باتیں نہیں کہہ رہی ہوں۔ بلکہ جو کچھ کہہ رہی ہوں سچے دل سے۔ اور خوب سوچ سمجھ کر کہہ رہی ہوں۔ تاکہ میری افسردہ صورت اور روکھے برتاؤ سے آپ کو تکلیف نہ ہو۔ اور آپ کی زندگی بے مزہ نہ ہو جائے یہ کہنا کہ بیٹی کے حقیقی پیدا کرنے والے آپ یا میں ہوں غلط ہے۔ یہ تو ہم اپنی بے سمجھی اور غصہ کی وجہ سے بیٹی پیدا ہونے پر کڑھتے ہیں۔ یا دوسروں کو الزام دیتے ہیں۔ ابھاگنی کی پیدائش سے آپ کو رنج ہوا۔ اور آپ نے مجھے نفرت کی نگاہ سے دیکھنا شروع کر دیا۔ آپ نے ابھاگنی کو بھی اپنے اور خاندان کے لئے شرم وندامت اور کلفت و مصیبت کا باعث سمجھ کر اس سے نفرت کی۔ آپ ابھاگنی کے باپ تھے۔ اسکے پیدا ہونے سے آپکو رنج ہوا۔ اور اُسکے مرنے پر خوشی ہوئی۔ یہ ہے باپ کی محبت۔ ابھاگنی کی پیدائش نے ہمارے ——

زندگی بھر کے تعلق کو انتہائی ناخوشگوار بنا دیا تھا۔ کیا

پتہ کہ بھگوان مجھے پھر آگے چن کر چھوٹی ابھاگنی بچی کی ماں بنادے۔ مجھے تو اپنی اولاد پیاری ہے۔ ابھاگنی کی پیدائش سے میری زندگی میں نئے سر سے بہار آگئی تھی۔ اس کے مرجانے سے میں بے جان ہوگئی ہوں۔ آہ کیسی ہنسی؟ ہنسی تو مردوں کے لئے سدا بہار بنکر آئی ہے۔ تم ہنسو اپنی بیٹی کی موت پر۔ تم باپ تھے۔ باپ کا دل پتھر کا ہوتا ہے میں ماں تھی۔ ماں کی ممتا تم کیا جانو۔ ماں کا دل موم کا ہوتا ہے۔

شیام سندر اب زیادہ نہ سن سکے اور اپنی پتنی کے پیروں پر گر پڑے ان کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ پھر بھی ان کے دل کی گہرائی سے نکلے ہوئے الفاظ صاف سنائی دے رہے تھے —— "معاف کرو لیلاوتی میں بڑا ظالم بڑا سنگدل ہوں۔!"

"ہاں ہاں یہ کیا ناتھ —— !" کہتی ہوئی لیلاوتی نے بڑھکر پتی کو اٹھا لیا۔ اور آنسو پونچھتی ہوئی بولی۔ —— "یہ کیا کرتے ہو ناتھ! کیا مجھے نرک کے لائق بھی نہ رکھو گے . . . . . ؟"

جناب چونی لال کاوش سرحدی

گیت

پریم کا میں نے روگ لیا ہے
روگ بسا کر جوگ لیا ہے
اُن کے ہوتے سوگ لیا ہے
پیت کی یہ ہے ریت۔ سکھی ری پیت کی یہ ہے ریت
پہلے پیتم پریم لگاوے
پھر برہن کو آنکھ دکھاوے
کایا کو سو روگ لگاوے
یہ ہے اِن کی پیت۔ سکھی ری پیت کی یہ ہے ریت
جگ کو نفرت مجھ سے پڑے
نینن مورے نیر وہ برسے
موتی جن کی جوت کو ترسے
کس کے یہ ہیں میت سکھی ری پیت کی یہ ہے ریت

حضرت نوحؔ ناروی

غزل

چین ہو یا بے چینی ہو پہلے دل گھبرائے گا
جاتے جاتے جائے گی آتے آتے آئے گا

قاصد آنے جانے میں تھک تھک کر گھبرائے گا
جائے گا پھر آئے گا آئے گا پھر جائے گا

ڈھونڈنے والی نظروں سے بھینگے پہلو کی طرف
انکی اس دلجوئی پر میرا دل اترائے گا

دل میں امیدیں لاکھوں تھیں کچھ نکلیں کچھ باقی ہیں
خیر کبھی پھر آؤ گے پھر کبھی دیکھا جائے گا

دیر و حرم کے مالک سے ہم کبھی کچھ مانگیں تو سہی
ہے وہ بڑا دینے والا دے گا یا دلوائے گا

دل کے خود آزار و الم دل کی قدر بڑھائینگے
ہوگا یہ اکسیر مگر خاک میں جب ملجائے گا

ناصح آنے والا ہے دو ہی باتیں ہونی ہیں
یا اُسے ہم سمجھائینگے یا وہ ہمیں سمجھائے گا

شکوۂ غم ہو محشر میں اس کی کچھ امید نہیں
سامنے وہ آجائیں گے ہوش کسے رہ جائے گا

دل دینے والا غم سے چھوٹ جائیگا دل دیکر
دل لینے والا دل میں دل لے کر پچھتائے گا

نوحؔ کے رونے پر ہنسنا بے دردوں کا خوب نہیں
بحرِ محبت میں اس سے اور بھی طوفاں آئے گا

جناب کسرے منہاس

روضہ تاج محل آگرہ کی تعمیر!

روضہ تاج محل ہندوستانیوں کی عظمتِ گذشتہ کا مرقع اور ان کے کمالِ ہنرمندی کا غیر فانی شاہکار ہے۔ یہ آج سے تین سو سال قبل تعمیر ہوا تھا۔ لیکن آج بھی ایک آبدار موتی معلوم ہوتا ہے جس میں ہندوستانی صناعوں نے اپنے کمالِ فن اور جادوگری سے حسن و وفا اور خلوص و محبت کے جذبات کو بھر دیا ہے۔

لیکن افسوس کہ آج ہندوستانی اس نکبت و افلاس کے درجہ تک پہنچ چکے ہیں۔ کہ یقین نہیں آتا۔ کہ اس عجائبِ عالم اور نادرِ روزگار عمارت کے بنانے والے اسی ہندوستان کے باشندے تھے۔ چنانچہ یورپ والے طرح طرح کے حیل و حجت سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کہ روضہ تاج محل کا نقشہ بنانے اور اس کی تعمیر کرنے کا سہرا یورپین انجینئروں کے کے سر ہے۔

ہر چند کہ ہندوستان کی تاریخ اور اس کی گذشتہ عظمت سے واقفیت رکھنے والے یورپ والوں کے دعویٰ کو پرِکاہ کے برابر بھی وقعت نہیں دے سکتے۔ تاہم ہندوستانی مورخین کا فرض ہے۔ کہ وہ مذکورہ بالا دعوے کی حقیقت کو واضح طور سے بیان کریں۔ تاکہ ہر کوئی اصل معاملہ سے واقف ہو جائے۔ چنانچہ انگریزی معاصر "ٹوئنٹیتھ سنچری" میں مسٹر نند لال چیٹرجی نے روضہ تاج محل کی نسبت یورپ والوں کے دعویٰ کی تردید میں ایک مضمون شائع کیا ہے۔ جس کا ترجمہ ذیل میں درج ہے۔

تاج محل آگرہ کی تعمیر کے متعلق یورپ والے دو نظریے پیش کرتے ہیں۔ سلیمین نے سب سے پہلے پہلی مرتبہ یہ خیال پیش کیا۔ کہ روضہ تاج محل کی نسبت تاریخوں میں جو استاد عیسیٰ کا ذکر آتا ہے۔ وہ فرانسیس آسٹن ڈی بورڈ ہے۔ چونکہ وہ عیسائی مذہب رکھتا تھا۔ اس لئے لوگ اسے استاد عیسےٰ کے نام سے یاد کرتے تھے لیکن اس زمانہ کی تاریخوں کا مفصل طور سے مطالعہ کرنے کے بعد معلوم ہوتا ہے۔ کہ استاد عیسےٰ نام در اصل مکمل نام محمد عیسےٰ آفندی کا مخفف ہے۔

روضہ تاج محل کی نسبت دوسری کہانی جسے کپتان سمتھ اور پادری ہوسٹن ایسے مورخ صحیح تسلیم کرتے ہیں یہ ہے کہ شاہجہان کے عہد میں ایک ہسپانوی سیاح مانرک نام آیا تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ گرونیمو ویرونا نام ایک اطالوی انجینئر نے روضہ

تاج محل کا نقشہ تیار کیا تھا۔ اس نظریے کی صحت کا یہ حال ہے کہ مانرک کی یادداشت کے علاوہ اطالوی انجینئر کا نام کسی اور تذکرہ میں درج نہیں لیکن اس کی تائید میں یورپین مورخ عجیب عجیب دلیلیں پیش کرتے ہیں مثلاً کہا جاتا ہے کہ ہندوستانی تذکرہ نویسوں نے دیدہ دانستہ اطالوی انجینئر کا نام نظرانداز کر دیا تاکہ روضہ کی تعمیر کا سہرا کسی غیرملکی کے حصہ میں نہ جائے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مانرک نے ممتاز محل کے والد آصف خاں سے دوستی اور رسوخ پیدا کر لیا تھا۔ اس لئے اس نے ذاتی واقفیت کی بنا پر روضہ کے بنانے والے کی نسبت لکھا ہے۔ اس کے علاوہ وہ تسلیم کرتے ہیں کہ روضہ تاج محل کا نقشہ یورپین طرز کا نہیں لیکن ایک ہوشیار یورپین انجینئر کے لئے ممکن تھا کہ ہندوستانی ماہرین فن کے مشورہ کے بعد خود نقشہ مرتب کر لیا ہو۔ ایک اور بات جو اس نظریئے کی تائید میں پیش کی جاتی ہے کہ ویرونیو کا انتقال لاہور میں ہوا لیکن اس کو آگرہ میں دفن کیا گیا جس سے اس کی اہمیت اور شخصیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ممکن ہے ویرونیو کے انتقال کے بعد استاد عیسےٰ نے روضہ کی تکمیل کی ہو۔ اس لئے اس کا نام مشہور ہو گیا۔ ایک اور دلیل یہ دی جاتی ہے کہ روضہ کے اندر سنگ مرمر پر نقاشی اور منبت کاری میں اطالوی اثر ظاہر ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ تمام روضہ کو اطالوی انجینئر نے تعمیر کرایا۔

اس قسم کی دلیلوں کی خوب وضاحت سے تردید کی جا چکی ہے۔ موجودہ زمانے کے نقادوں میں سے اول اور سرجان مارشل نے مانرک کے نظریے کی غلطی کو واضح کیا ہے: تاریخی اور فنی ہردو اعتبار سے ثابت ہوتا ہے کہ روضہ تاج محل کی تعمیر کے متعلق یورپینوں کا خیال بالکل بے بنیاد ہے۔

فارسی تاریخوں میں روضہ کے بنانے والوں کے نام۔ کاریگروں کی تنخواہیں۔ اور تعمیر پر کل خرچ تمام باتیں مفصل درج ہیں۔ حتیٰ کہ جو مصالحہ استعمال کیا گیا اس کا بھی ذکر موجود ہے۔ ان تاریخوں میں ترکی ایرانی اور ہندوستانی صناعوں اور ماہرین فن کا تذکرہ موجود ہے۔ لیکن یہ کیونکر ممکن ہو سکتا ہے کہ ان میں سے کوئی بھی یورپین انجینئر کا ذکر تک نہ کرے۔ یہی نہیں بلکہ مانرک کے علاوہ کسی اور یورپین سیاح نے اطالوی انجینئر کی بابت کچھ نہیں لکھا۔ اگر روضہ تاج محل کی تعمیر میں کسی اطالوی کا دخل ہوتا۔ تو ڈاکٹر برنیئر۔ ٹریورنیئر اور نکولس منوچی جو سب یورپین تھے۔ اطالوی انجینئر کا ضرور تذکرہ کرتے خصوصاً نکولس منوچی کیونکہ وہ خود بھی اطالوی تھا۔

یہ بہت ممکن ہے کہ ابتدا میں کسی اطالوی نے معمولی حیثیت میں روضہ کی تعمیر میں کام کیا ہو چونکہ وہ عمارت کی تکمیل سے پہلے فوت ہو گیا۔ اس لئے اس کا تذکرہ ضروری نہ سمجھا گیا۔ امر واقع یہ ہے کہ روضہ تاج محل کا نقشہ مقبرہ ہمایوں سے بہت ملتا ہے یہی نہیں بلکہ فنی اعتبار سے بھی جو باتیں مقبرۂ ہمایوں میں پائی جاتی ہیں۔ انکو روضۂ تاج محل میں انتہائے کمال تک پہنچایا گیا ہے۔

بحیثیت مجموعی روضہ تاج محل بالکل ہندوستانی ہے۔ اس لئے کسی یورپین انجینئر کی مداخلت کا خیال ہی مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے اور روضہ کے اندرونی حصہ میں جو نقاشی کے نمونے ملتے ہیں۔ اس سے تو مذکورہ بالا نظریے کی کوئی حقیقت باقی نہیں رہتی۔

جناب انجم رضوانی

ارتباط

میری اُن سے خاص رسم و راہ تو کوئی نہ تھی
تھی شناسائی یونہی سی، چاہ تو کوئی نہ تھی

بے توجہ میں گذر جاتا تھا اُن کے پاس سے
اور قطعاً بے خبر تھا دل کسی احساس سے

ہاں کبھی اُن پر نگاہیں یونہی پڑ جاتی بھی تھیں
بے سبب معصوم سے چہرہ پہ گڑ جاتی بھی تھیں

ق

مجھ پہ پڑ جاتی نظر انکی، تو جھک جاتی تھیں یہ
ہم کو شرما کے آنکھوں ہی میں رک جاتی تھیں یہ

دیکھ کر یہ رنگ کچھ مبہوت ہو جاتا تھا میں
سحر ہو جاتا تھا مجھ پر یعنی کھو جاتا تھا میں

میری اس حالت پہ اکثر مسکرا پڑتے تھے وہ
ہو نہ سکتا ضبط تو بس کھلکھلا پڑتے تھے وہ

رفتہ رفتہ کچھ مجھے احساس سا ہونے لگا
اور اس معصومیت کا پاس سا ہونے لگا

ہاں حسیں تھے وہ، متاعِ حسن کے سرمایہ دار
انکے رخ سے جلوۂ حسن آفریں تھا آشکار

شوخیاں، رنگینیاں، زیبائیاں بے انتہا
ایک پیکر حسن کا رعنائیاں بے انتہا

دلربا، دلکش، جہاں آرا وہ تصویرِ جمال
آرٹ کی اک روح، فطرت کے نمونہ کا کمال

حقیقت تھی، اور اس پر وہ بجا مسرور تھے
ناز و عشوہ تھا، مگر نخوت سے کوسوں دور تھے

الغرض میری طرف رک رک کے وہ آنے لگے
یعنی دنیائے دلِ انجم پہ چھا جانے لگے

میں اُدھر بڑھنے لگا، کچھ وہ اِدھر بڑھنے لگے
لطف کے سائے میں دل پروان یوں چڑھنے لگے

اس طرح آہستہ آہستہ ملاقاتیں بڑھیں
قسمتوں نے رنگ بدلا، پیار کی باتیں بڑھیں

ہر ادا اُن کی مرے دل کو پسند آنے لگی
پیار کرنے پر کوئی شے مجھ کو اکسانے لگی

لیکن ان کیفیتوں میں مبتلا دونوں ہی تھے
روح پرور لذتوں سے آشنا دونوں ہی تھے

چاہتا تھا میں انہیں، تو مجھ پہ مرتے وہ بھی تھے
صدقِ دل سے دم مری الفت کا بھرتے وہ بھی تھے

ہر طرح سے کرتے رہتے تھے وہ دلداری مری
انکے ہر انداز سے ظاہر تھی غمخواری مری

یوں انہیں مجھ سے، مجھے اُن سے محبت ہو گئی
زندگی میں روح بھرنے کی یہ صورت ہو گئی

اب میں اُنکا ہوں، وہ میرے، زندگی کیا خوب ہے
ہمنشیں! یہ ارتباطِ باہمی کیا خوب ہے

جناب گوپال متل بی۔ اے

(افسانہ)

سرسوں

بھادوں کا مہینہ تھا اور پالم پور میں سرسوں بوئی جا رہی تھی۔ جو وہاں کی خاص فصل تھی۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہاں اور کوئی فصل ہوتی نہ تھی حقیقت یہ ہے۔ وہاں کی سرزمین اس قدر زرخیز تھی کہ خواہ کوئی چیز بوئی جاتی کثرت سے ہوتی۔ مگر سرسوں کے لئے تو وہ غیر معمولی طور پرساز گار رہتی۔ اسی لئے اس کے بونے میں بھی خاص اہتمام کیا جاتا تھا۔

اس سال بھی کسانوں نے نہایت احتیاط سے ہل چلایا تھا اور پہلے سے اچھا بیج فراہم کیا تھا۔ جب تمام تیاریاں مکمل ہو چکیں اور فصل بونے کا دن آگیا تو وہ لوگ منہ اندھیرے ہی اپنے کھیتوں میں پہنچ گئے، اور پورے انہماک کے ساتھ زمین میں بیج ڈالنے لگے۔ جو شخص سب سے زیادہ انہماک کا ثبوت دے رہا تھا۔ وہ "منو" تھا۔ آج وہ اس قدر تندہی سے کام کر رہا تھا کہ اس کے پرانے واقفکاروں کو حیرت ہوتی تھی۔ انہیں یہ بھول کر بھی گمان نہ ہوا تھا کہ "منو" اس قدر جانفشانی سے کام کر سکتا ہے۔ جس شخص کی تمام عمر آوارگی میں بسر ہوئی ہو جس کا دامن ہر قسم کے عیوب سے داغدار ہو اور جو شخص جوئے میں اپنی بیوی کے زیوروں تک کو ہار دیتا ہو وہ یکایک اپنی تمام بری عادتوں کو چھوڑ کر ایک غنی کسان بن جائے۔ اس سے بڑھ کر عجوبہ کی بات اور کیا ہو سکتی ہے۔ آج تک یہی سمجھا جاتا تھا کہ منو اور احساس فرض دو متضاد چیزیں ہیں لیکن آج وہ اپنے طرز عمل سے اس خیال کی تکذیب کر رہا تھا۔

منو کے گھر والے نہایت خوش تھے۔ لیکن ان سب سے زیادہ خوشی لالہ مکٹ بہاری کو تھی۔ انہیں منو سے تقریباً پانصد روپیہ لینا تھا جس کی وصولی کا کوئی امکان نہ رہا تھا۔ لیکن اب منو کو کام میں مصروف دیکھ کر ان کی ٹوٹی ہوئی آس بندھ گئی تھی۔ وہ دور سے منو کو کام کرتے ہوئے دیکھ رہے تھے اور اس خیال سے خوش ہو رہے تھے کہ فصل پک جانے میں روپے کی وصولی کی کوئی صورت ہو جائے گی۔

اگر یہ سب لوگ دور سے تماشا کرنے کی بجائے منو کے نزدیک آکر دیکھتے تو ان کے جذبات بالکل مختلف ہوتے منو جو چیز زمین میں ڈال رہا تھا۔ وہ سرسوں نہ تھی بلکہ مٹی تھی محض مٹی۔ کیا کثرت شراب نوشی سے منو کا دماغ ماؤف ہو گیا تھا، اور یہ حرکت اس سے عالم دیوانگی میں سرزد ہو رہی تھی؛ بھلا جب تک کوئی شخص عقل و خرد کو بالکل ہی جواب نہ دیدے اس مجنونانہ طریقے سے اپنے وقت کو کیونکر برباد کرتا ہے لیکن ایسا نہیں تھا۔ منو دیوانہ نہ تھا۔ اور نہ اس

مدد اس نے شراب پی رکھی تھی۔ بلکہ حقیقت تو یہ تھی۔ کہ جو واقعہ اسے آج پیش آیا تھا۔ وہ اگر شراب کی حالت میں بھی پیش آتا تو تمام نشہ ہرن ہو جاتا۔

آج صبح جب وہ گھر سے چلا تو اس کے پاس واقعی سرسوں تھی۔ اور وہ اسے بیج ڈالنے کی غرض سے گدھے پر لاد کر اپنے کھیت کی جانب جا رہا تھا۔ لیکن قسمت کی ستم ظریفی دیکھیے کہ راستہ میں اسے ایک جواری دوست مل گیا۔ اور چند داؤ لگانے پر مجبور کرنے لگا۔ منو نے لاکھ کہا کہ وہ توبہ کر چکا ہے اور ذمہ دارانہ زندگی بسر کرنے کا تہیہ کئے ہوئے ہے۔ لیکن وہ کمبخت نہ مانا۔ اور برابر مجبور کیا گیا۔ جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ منو کے پائے استقلال میں تزلزل آ گیا "آخر چند داؤ لگانے میں کیا نقصان ہے" اس نے خیال کیا اور اپنے دوست کے ساتھ جوا کھیلنے میں مصروف ہو گیا۔ منو نے تین داؤ لگاؤ۔ اور تینوں ہی ہار گیا۔ اس کے بعد اُٹھنے کا سوال ہی پیدا نہ ہو سکتا تھا۔ جب وہ کھیل سے فارغ ہوا تو سب کچھ ہار چکا تھا۔ نہ صرف نقدی بلکہ وہ سرسوں بھی جسے بو کر اسے سال بھر رزق کا سامان کرنا تھا۔ اور دنیا پر ظاہر کرنا تھا کہ منو بھی کام کر سکتا ہے اور دوسروں کی طرح اسے بھی اپنے فرض کا احساس ہے۔

اب اس کے بعد گھر واپس جانا اور بیوی کے سامنے اس امر کا اعتراف کرنا کہ وہ بیج تک کو جوئے میں ہار گیا ہے ایک ایسا ذلیل کن فعل تھا۔ جسے منو کی حمیت کسی حالت میں بھی گوارا نہ کر سکتی تھی۔ لہٰذا اس نے فیصلہ کیا کہ اس بات کو صیغہ راز ہی میں رکھے۔ اور کھیت میں فرضی بیج ڈال کر شام کو گھر چلا جائے۔ کچھ دن تو چین سے بسر ہو جائیں گے جب انشا ئے راز ہو گا اس وقت دیکھا جائیگا۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ لیکن شام کے وقت جب وہ اپنا پارٹ خوش اسلوبی سے انجام دیکر گھر پہنچا اور اس کے گھر والوں نے اس کی غیر معمولی طور پر آؤ بھگت کی۔ تو اسکا ضمیر سرزنش کرنے لگا۔ ایک مرتبہ تو اسے خیال آیا کہ حقیقت پر سے پردہ اٹھا دے لیکن ایسا کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ وہ خاموش ہو رہا۔ البتہ ضمیر کی سرزنش کا اتنا اثر ضرور ہوا کہ اُسکے انقلاب ذہنی کی تکمیل ہو گئی۔ اس کے دل کے دامن پر جو تھوڑا بہت میل باقی تھا۔ اشک ندامت نے اسے بھی دھو دیا۔ اور اب منو ایک ایسا جفاکش اور ایماندار انسان بن گیا تھا۔ جسے شیطان اپنے تمام حربوں کے ساتھ بھی گمراہ نہ کر سکتا تھا۔

جب ایک ماہ گذر گیا اور منو کے کھیت میں کونپل تک نہ پھوٹی تو اسکے گھر والوں کو تشویش ہونے لگی۔ کیا اس کی محنت اکارت ہی جانے گی؟ آخر کھیت کو کیا ہو گیا؟ منو جب اپنے گھر والوں کو اس قسم کی باتیں کرتے دیکھتا تو اس کے قلب وجگر پر چھریاں چل جاتیں۔ وہ اپنے آپ کو بے حد ملامت کرتا اور دل ہی دل میں کہتا "افسوس میں نے ان عزیزوں کو کتنا بڑا دھوکا دیا ہے۔ یہ بے چارے کیا جانیں کہ اس میں کھیت کا کوئی قصور نہیں۔ قصور تو سب مجھ نالائق کا ہے۔ جو بیج کو جوئے میں ہار گیا جب بوئی مٹی گئی ہو تو کھیت میں سرسوں کہاں سے اُگ آئے۔

آخر منو کے گھر والوں کو یقین ہو گیا کہ ان سے یا تو کوئی بدشگونی ہوئی ہے۔ یا کسی نے کھیت پر جادو کر دیا ہے

ورنہ غیر ممکن ہے کہ ایک ماہ تک کھیت میں کونپل نہ پھوٹے منو کی بوڑھی والدہ کو ان باتوں میں خاص دسترس تھی۔ لہٰذا معاملہ کے نشیب و فراز پر اچھی طرح غور کرنے کے بعد جب اس نے یہ فیصلہ دیا کہ دوسری بات صحیح ہے تو اسے ناطق مان لیا گیا۔ اور اس امر پر غور ہونے لگا کہ ایسا کرنے والے کو نہ کیونکر دی جانے۔ منو کی والدہ اس میدان میں بھی فرد تھی۔ اس نے فوراً ہی ایک ہنڈیا میں لوہے کے چند ٹکڑے اور پانی ڈال کر اس کو آگ پر رکھدیا جب پانی خوب اُبلنے لگا اور لوہے کے ٹکڑے آپس میں ٹکرا کر شور کرنے لگے تو اس نے خاندان کے دیگر افراد سے کہنا شروع کیا کہ جو حالت لوہے کے ٹکڑوں کی ہوتی ہے وہی حالت اس شخص کی ہوگی جس نے ہمارے کھیت پر جادو کیا ہے۔ جب تک ہنڈیا کو آگ کے نیچے نہ اتارا جائے گا اُسے چین نصیب نہ ہوگا۔ تم دیکھ لینا کہ ابھی وہ شخص ہاتھ جوڑ کر یہاں آموجود ہوگا۔ اور معافی مانگ کر ہنڈیا کو آگ سے نیچے اتارنے کی درخواست کرے گا اگر وہ آئے تو ہنڈیا اتارنے سے پہلے اس کی اچھی طرح مرمت ہوجانی چاہئے۔

ادھر یہ منصوبے ہو رہے تھے اور اُدھر لالہ مکٹ بہاری سوچ رہے تھے کہ اگر منو کی فصل نہ ہوئی تو وہ اپنا قرض کس طرح وصول کریں گے۔ آخر انہوں نے تمسک لیا اور تقاضا کی غرض سے منو کے گھر کا رُخ کیا۔ ممکن ہے وہ اسے اپنا گھر بیچنے پر آمادہ کر سکیں۔ ان کا وہاں پہنچنا تھا کہ سب ان پر پل پڑے۔ جس روز منو بیج ڈال رہا تھا۔ اس روز لالہ مکٹ بہاری کھیت کے گرد منڈلا رہے تھے۔ اور منو کی بیوی کو اس کا پتہ بھی چل گیا تھا۔ اس لئے ان کو آتے دیکھ کر یہی خیال کیا گیا کہ وہ ہنڈیا کو اثر سے آتے ہیں۔ اور کھیت پر جادو انہی نے کیا ہے۔

ابھی لالہ مکٹ بہاری کے ایک یا دو گھونسے ہی پڑے ہونگے کہ وہ جان بچا کر بھاگ گئے۔ اور اس بھاگڑ میں قرضے کا تمسک بھی وہیں چھوڑ گئے جب تھوڑی دیر بعد گھر میں امن و امان ہوا تو وہ منو کے ہاتھ آگیا۔ اس نے چپکے سے اسے آگ میں ڈالدیا اور دل ہی دل میں کہنے لگا۔ محنت بھی رائیگاں نہیں جاتی۔ خواہ مٹی ہی بوئی جائے وہ بھی پھل لاتی ہے آخر یہ تمسک اسی کا ثمرہ تو ہے۔

"مستفاد"

حضرت ثاقب کانپوری

ایک دوست سے آخری ہمدردی!

ترا دل جب پریشاں ہو گا جذباتِ محبت سے
تو میں بہلاؤں گا اُسکو کسی شاداب جنگل میں

جہاں ہو گی ہوا، لبریز پھولوں کے تعطر سے
جہاں خوابیدہ ہوں گی فرحتیں نمناک بادل میں

جہاں دل رقص میں آجائیگا وادی کے منظر سے
جہاں ہونگی فضائیں غرق عشرت کی تمنا میں

جہاں جذبات و احساسات میں نشو و نما ہو گی
جہاں ہوگی خلش دیدار کی ذوق تماشا میں

میں اکثر چاندنی راتوں میں تیرے مضطرب دلکو
ضیائے ماہ میں نہلاؤں گا فرطِ مسرت سے

جہاں خوابیدہ ہو گی حسن کی مسحور رعنائی
جہاں اظہار ہو گا حسن کا خود حسنِ فطرت سے

جہاں اشجار نگرانی کرینگے مضطرب دل کی
جہاں نغمے بدل دینگے پریشانی کا یہ عالم

جہاں ساری فضا میں ہوتا ہے اک کیف روحانی
ٹپکتی ہے شعاعِ مہر سے ہر خار پر شبنم

وہیں لیجاؤں گا تیرے دلِ برباد ارماں کو
وہیں شاید بدل جائیں ترے آلامِ روحانی

کبھی تو دور ہو گا دل سے یہ رنج و الم تیرا
کبھی تو ختم ہو گی تیری یہ آشفتہ سامانی

نہ بہلے گا اگر تیرا دلِ وارفتہ اس پر بھی
اگر سو جائے گا وہ موت کی آغوش میں جاکر

تو اُس کو دفن کر دونگا اسی شاداب وادی میں
جہاں ہوتی رہیگی بارشِ گل اُسکے مدفن پر

کریگی شبنم اپنے آنسوؤں سے مرثیہ خوانی
ہوا ہر صبح کو آہیں بھرے گی آکے تربت پر

نہیں موقوف کچھ انسان پر اشجار بھی غم سے
کفِ افسوس ہی ملتے رہینگے تیری فرقت پر

تمنا ہے یہی میری کہ تیرے کام آجاؤں
کسی صورت سے حاصل ہو سکونِ دائمی مجھ کو

اگر دیدیگا اپنے آپ کو میری حفاظت میں
نہ دیگا پھر فریب ایسا فریبِ زندگی تجھ کو

میرزا ادیب

(ایک ایکٹ کا ڈراما)

صولت کی موت

افرادِ ڈراما ——————!

صولت —————— ایک مریض، قریب مرگ

یوسف —————— صولت کا بیٹا

خالدہ —————— صولت کی بڑی بیٹی

صابرہ —————— صولت کی چھوٹی بیٹی

رحیم —————— ان کا خادم

موت ——————

منظر:۔ ایک وسیع وشاندار عمارت۔ دائیں طرف ایک ندی بہ رہی ہے۔ بائیں جانب باغات کھڑے ہیں۔ اور عقب میں۔ تھوڑا تھوڑا فاصلہ چھوڑ کر، مکانات استادہ ہیں عمارت کے وسطی کمرے میں ایک طرف پلنگ پر صولت دراز ہے۔ اس کی عمر بمشکل سنتیس سال ہوگی۔ لیکن طویل بیماری نے اس کی آنکھوں سے جلالت، چہرے سے سرخی اور جسم سے توانائی چھین لی ہے۔ گال پچک گئے ہیں۔ آنکھوں کے گرد حلقے پڑے ہوتے ہیں۔ اور چہرے کی رنگت سیاہ ہوگئی ہے، پلنگ کے قریب، سنگِ مرمر کی ایک اونچی سی میز پر گلدانوں میں نہایت خوبصورت اور دلآویز گلدستے رکھے ہوئے ہیں۔ جن کی خوشبو سے کمرے کی فضا مہک رہی ہے دیوار سے لگا ہوا کلاک ٹک ٹک کر رہا ہے۔ چھت سے ایک بڑا سا شمعدان لٹک رہا ہے۔ صولت دایاں ہاتھ سینے پر اور بایاں سر کے نیچے رکھے، سو رہا ہے، پلنگ کے پاس ایک کرسی پر بوڑھا رحیم بیٹھا ہے مسلسل شب بیداری کے باعث اس کی آنکھیں سرخ ہیں۔ کرسی سے کچھ دور، ایک صوفے پر ننھی صابرہ سو رہی ہے اس کے رخساروں پر آنسوؤں کے نشان دکھائی دے رہے ہیں۔ جن سے معلوم ہوتا ہے وہ ابھی ابھی روئی ہے۔

باہر پھیکی پھیکی چاندنی پھیلی ہوئی ہے۔ یوسف اور خالدہ کھڑکی کے پاس کھڑے باہر دیکھ رہے ہیں۔ یوسف نے ایک ہاتھ کھڑکی پر رکھا ہے۔ اور دوسرے میں پھول پکڑ رکھا ہے۔ خالدہ نے بھی ایک ہاتھ کھڑکی پر رکھا ہے —— وہ مڑ کر بیمار باپ کو دیکھتی ہے۔ یکا یک اس کے لبوں سے نکلتی ہے

خالدہ (مغموم آواز میں) نہ معلوم اباجان کو کب آرام آئیگا؟ ـــــ تین ماہ کتنی لمبی مدت ہے!

یوسف۔ اباجان کو بیمار ہوتے تین ماہ ہوگئے!

خالدہ۔ تین ماہ سے بھی زیادہ!

یوسف۔ اتنی لمبی مدت میں ہر گھڑی، ہر لمحہ بستر پر پڑے رہنا ـــــ کتنی بڑی مصیبت ہے!

خالدہ۔ اور ابھی معلوم نہیں ـــــ (مایوسانہ بھائی کو دیکھتی ہے)

یوسف۔ مایوس نہیں ہونا چاہئے خالدہ ـــــ!

خالدہ۔ میں، مایوس نہیں ہوں بھائی جان! خدا اباجان کو جلد صحت دے۔ ان کے سوا ہمارا دنیا میں کون ہے؟

یوسف۔ کوئی بھی نہیں ـــــ اماں کو دنیا سے رخصت ہوتے چار سال گذر گئے (اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہوجاتی ہیں) اب دنیا میں آخری سہارا اباجان ہیں۔

خالدہ۔ تم رونے کیوں لگے بھائی جان! آنسو پونچھ لو۔ کہیں اباجان نہ دیکھ لیں۔ انہیں تکلیف ہوگی!

یوسف۔ (آنسو پونچھتے ہوتے) تمہاری آنکھیں بھی آنسوؤں سے لبریز ہیں۔

خالدہ۔ میں روتی تو نہیں بھائی جان! یونہی آنسو آنکھوں میں آگئے ہیں (آنسو پونچھ لیتی ہے)

یوسف۔ اباجان کو سوتے ہوئے ایک گھنٹہ تو ہوگیا ہے!

خالدہ۔ سوتا رہنے دو۔ کئی راتوں کے بعد اس وقت آنکھ لگی ہے۔ خدا کرے آنکھ کھولتے ہی ان کی تمام بیماری رفع ہوجائے۔

یوسف۔ خدا غمگین دلوں کی دعا ضرور قبول کرتا ہے۔ ہماری دعا بھی قبول ہوگی۔

خالدہ۔ اس وقت ہم کتنے خوش ہونگے ـــــ کتنے خوش!

یوسف۔ (مدہم چاند کی طرف دیکھتے ہوتے) آج رات چاند روشن نہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کسی نے اس سے روشنی چھین لی ہے!

خالدہ۔ درختوں کے پتے گر رہے ہیں۔ اور ندی کا پانی سوکھ گیا ہے!

یوسف۔ پودوں پر پھول بھی نہیں رہے۔

(صولت پہلو بدلتا ہے۔ اور آنکھ کھولدیتا ہے۔ رحیم عجلت اُٹھ کر اس کے پاس جا کھڑا ہوتا ہے۔ خالدہ اور یوسف بھی وہاں جا کھڑے ہوتے ہیں صولت کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ ہویدا ہے)

خالدہ۔ اباجان! اب آرام ہے؟

صولت۔ قدرے ـــــ افاقہ ہے بیٹی! صابرہ کہاں ہے؟

خالدہ۔ وہ سو رہی ہے۔

صولت۔ سو رہی ہے۔ بیچاری بچی بڑی دیر تک جاگتی رہی!

یوسف۔ اباجان! آپ کو صحت ہو تو ہمیں بھی آرام آسکتا۔ اس بے چینی میں کون سو سکتا ہے؟ کیسے نیند

آسکتی ہے !

رحیم۔ (صولت سے) آدھی رات ہو گئی ہے نہ تو یوسف ایک گھڑی کے لئے سویا ہے اور نہ خالدہ!

صولت۔ (معصوم آواز میں) تم کیوں نہیں سوتے ۔۔؟ آتنی رات سو گئی اور تم جاگ رہے ہو ۔۔۔ رحیم تم بھی جاگ رہے ہو۔

رحیم۔ میری فکر نہ کیجئے آقا! انہیں کہیئے سو رہیں۔ میں نے ہزار با کہا مگر نہیں سنتے۔

خالدہ۔ ابا جان! آپ کو جب آرام آجائے گا اس وقت ہم بڑے مزے سے سوئیں گے۔

یوسف۔ اس بے چینی میں کیونکر نیند آسکتی ہے ابا جان!

صولت۔ مجھے آرام ہے اب۔ پرسوں اترسوں تک بالکل تندرست ہو جاؤں گا۔

خالدہ۔ آپ درست کہہ رہے ہیں!

صولت۔ کیوں نہیں!

خالدہ۔ ابا جان! وہ جو ہماری لمبی سیر کا پروگرام ۔۔

صولت۔ (مسکرا کر) ضرور ۔۔۔ جہاں! ہو گی لے چلیں گے تمام دنیا کے گرد چکر لگاویں گے ۔۔۔ اب جاؤ سو رہو۔ مجھے بھی نیند آرہی ہے!

خالدہ۔ آپ سو جائیں ابا جان!

صولت۔ تم بھی سو جاؤ ۔۔۔ دیکھو میں کہتا ہوں۔ تم بھی رحیم ۔۔۔! جب ضرورت ہو گی میں تمہیں آواز دے دوں گا!۔

(خالدہ ایک طرف صوفے پر دراز ہو جاتی ہے۔ رحیم بھی لیٹ جاتا ہے۔ یوسف نہیں سوتا۔ وہ کھڑکی کے پاس جا کھڑا ہوتا ہے۔ صولت دوسری طرف منہ پھیر لیتا ہے۔ وقفہ ۔۔۔ نیچے دروازے پر دستک ہوتی ہے۔ یوسف کھڑکی میں دروازے کو دیکھتا ہے۔ ایک سیاہ بلی صولت کے پلنگ کے نیچے سے نکلتی ہے اور ادھر ادھر دیکھتی ہوئی سنگ مر مر کی میز پر چڑھ جاتی ہے پھر وہاں سے بھاگتی ہے گلدان دھم سے نیچے گر پڑتے ہیں گلدستے کہیں جا پڑتے ہیں۔ اور گلدان ٹوٹ جاتے ہیں۔ یوسف یہ منظر دیکھتا ہے۔ اور میز کے قریب آتا ہے۔ اسکے لبوں سے کلمہ تاسف نکلتا ہے۔ بلی کمرے سے نکل جاتی ہے۔ یوسف پھر کھڑکی کے پاس پہنچ جاتا ہے۔ کھڑکی میں سے دیکھتا ہے۔ رحیم اٹھکر آنکھیں پھیچ پھیچ کر ادھر ادھر دیکھ رہا ہے۔ یوسف اس کے قریب آتا ہے۔ اور اُسے دروازہ کھولنے کے لئے کہتا ہے۔ رحیم چپ چاپ چلا جاتا ہے آندھی کے تیز رو جھونکوں سے پلنگ کے قریب کھڑکی کے سیاہ پردے کو جنبش ہوتی ہے۔ اور وہ صولت کے چہرے کو چھونے لگتا ہے شمعدان کی روشنی خود بخود کم ہو جاتی ہے۔ پلنگ کے اوپر چھت میں سے، جہاں چڑیا نے گھونسلا بنا رکھا ہے۔ چند تنکے اور تھوڑی سی مٹی گرتی ہے اور صولت پر پڑتی ہے۔ صولت کے منہ سے آہستہ آہستہ نکل رہا ہے "دروازہ نہ کھولو ۔۔۔

دروازہ ــــــ دیکھو لو۔ کوئی بھی اس کی آواز نہیں سن سکتا۔ صابرہ کے ہاتھ سوتے میں اخود بخود آگے بڑھتے ہیں۔ اور وہ خوف کے زیر اثر چیخ مار کر بیدار ہو جاتی ہے۔ صولت اپنا ہاتھ بند کرتا ہے ــــ کروٹ لیتا ہے۔ اور گھبراہٹ میں اِدھر اُدھر دیکھتا ہے۔ خالدہ اور یوسف صابرہ کو لئے کھڑکی کے قریب چلے جاتے ہیں۔)

یوسف۔ کیا ہوا صابرہ !

خالدہ۔ سوتے میں ڈر گئی ہے۔

یوسف۔ (صابرہ کو چپ کراتے ہوئے) ابا جان سو رہے ہیں ــــــ تمہارے رونے سے جاگ اٹھیں گے۔!

صابرہ۔ آبا ــــــ ابا !!

(صابرہ حیران و ششدر دونوں کو دیکھ رہی ہے خالدہ ٹوٹے ہوئے گلدانوں کو دیکھتی ہے)

خالدہ۔ گلدان ٹوٹ گئے۔

یوسف۔ کمبخت بلی توڑ گئی ہے۔

(خالدہ کے لبوں سے کلمہ تاسف نکلتا ہے)

خالدہ۔ اب پتے زیادہ گرنے لگے ہیں۔ آسمان پر چاند اور پھیکا ہو گیا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے۔ گویا ایک زرد پتا پانی میں بہ رہا ہے ــــ ندی کا پانی تو کہیں نظر ہی نہیں آتا !

(دونوں کی آنکھوں کی گہرائیوں میں خوف و دہشت نمایاں ہے۔ دوسرے کمرے سے پاؤں کی آہٹ سنائی دیتی ہے۔ شمعدان کی روشنی اور کم ہو جاتی ہے۔ بلی پھر آتی ہے۔ اور چپکے سے ایک گلدستے کے پھول نوچنے لگتی ہے)

یوسف۔ تم ڈر کیوں بہن خالدہ !

خالدہ۔ میرا دل بیٹھا جاتا ہے بھائی جان !

یوسف۔ حوصلہ کرو ــــ ابا جان جاگ اُٹھے ہیں۔

(دونوں اس طرف جاتے ہیں۔ صولت بیقرارانہ کروٹ لیتا ہے۔ آندھی کے تیز و تند جھونکے روشندانوں سے ٹکراتے ہیں۔ سمع خراش شور پیدا ہوتا ہے رحیم آتا ہے۔ اس کے پیچھے ایک سایہ حرکت کر رہا ہے۔ جھونکے روشندانوں سے ٹکرا کر ایسی آواز پیدا کرتے ہیں جو قبرستان کے پرانے زنگ آلود دروازے کے کھلنے سے پیدا ہوتی ہے چند لمحوں کے بعد موت ــــــ ایک سیاہ رنگ خوفناک صورت بوڑھی عورت جس کے لمبے لمبے دانت ہونٹوں سے باہر نکلے ہوئے ہیں۔ موٹے موٹے کالے بال شانوں اور زرد گالوں پر بکھرے ہوئے ہیں، داخل ہوتی ہے۔ اور بے تکلفانہ پلنگ کی طرف بڑھنے لگتی ہے۔ تمام حیران ہو جاتے ہیں صولت، خوفزدہ نظروں سے اُسے دیکھتا ہے۔ سیاہ بلی اُسے گھور گھور کر دیکھتی ہے اور چیخ مار کر تیزی کے ساتھ چلی جاتی ہے۔ صابرہ ڈر کر بھائی کے سینے سے چمٹ جاتی ہے)

صولت۔ یہ کون ہے یوسف! اسے نکال دو۔

یوسف۔ (موت سے) تم کون ہو؟

موت۔ (صولت سے) ڈر گئے ــــ تمہیں مجھ سے ڈرنا ہی چاہئے۔ (بلند قہقہہ لگاتی ہے)

یوسف۔ تم کون ہو؟

موت۔ لوگ میرے عمل سے مجھے جان لیتے ہیں۔

صولت۔ یوسف! اسے باہر نکال دو۔ اس کی آنکھیں اندھے کنویں کی طرح تاریک دکھائی دے رہی ہیں۔ اس کے بال سلاخوں کی طرح نظر آتے ہیں۔

موت۔ میں خود بخود چلی جاؤں گی!

یوسف۔ تم کون ہو آخر؟

موت۔ تم پوچھنے پر مصر ہو تو بتاتی ہوں۔ میں وہ ہستی ہوں، جو چاند کو روشنی سے محروم کر دیتی ہے ــــ پھولوں سے ترو تازگی چھین لیتی ہے۔ نہر کا پانی چوس لیتی ہے۔ درختوں کے پتے گرا دیتی ہے۔ تباہی میرے بالوں کے گہوارے میں جھول رہی ہے خزاں میرے سانس کی لہروں میں رہتی ہے۔ اور تخریب میری آنکھوں کی گردش میں زندگی کے سانس لے رہی ہے۔

خالدہ۔ اسے نکال دو بھائی جان!

یوسف۔ یہاں تمہارا کیا کام؟

موت۔ یہاں بھی میں اپنا فرض ادا کرنے آئی ہوں۔

یوسف۔ کیا فرض؟ یہاں درخت نہیں، نہر نہیں، پودے نہیں!

موت۔ یہاں ایک پھول ہے جس سے میں اس کی رنگت، خوشبو اور ترو تازگی چھیننے آئی ہوں۔

(صولت بیقرارانہ کروٹ لیتا ہے۔ اس کے چہرے کا رنگ بہت پھیکا پڑ گیا ہے۔)

صولت۔ (کمزور و ضعیف آواز میں) پانی ــــ ان میرے سینے میں سخت ــــ درد ہو رہا ہے۔

(خالدہ ایک کونے میں جا کر گلاس میں پانی ڈالتی ہے۔ اور گلاس لا کر صولت کو دیتی ہے)

یوسف۔ کیا کہہ رہی ہو تم؟ یہاں سے چلی جاؤ۔

موت۔ میں نے جو کہہ دیا خود بخود چلی جاؤں گی ــــ لیکن اپنا فرض ادا کرنے کے بعد۔

یوسف۔ تو اب کیوں نہیں جاتیں۔

موت۔ وہ پھول ابھی پژمردہ نہیں ہوا۔

یوسف۔ کونسا پھول؟

موت۔ (صولت کی طرف اشارہ کر کے) یہ پھول۔

خالدہ (مضطربانہ) ابا جان ــــ ابا۔

موت۔ اب تم نے جان لیا میں موت ہوں۔

یوسف۔ موت ــــ یہاں؟

صولت (گھبرا کر) موت (فرطِ ضعف سے گلاس اس کے ہاتھ سے گر پڑتا ہے۔ تمام پانی بہ جاتا ہے)

موت۔ میں زندگی کے جام بھی اسی طرح خالی کر دیتی ہوں۔!

صولت۔ یہاں تم ــــ

موت۔ (اس کے الفاظ کاٹ کر) یہاں میں تمہارے واسطے آئی ہوں ــــ چند لمحوں کے بعد تم ــــ مردہ ہو گے

یوسف۔ مردہ ——؟ تم بوڑھی عورت! میں تمہاری ڈیاں پسیں ڈالوں گا (غضبناک ہو کر موت کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے۔ اور اسے مروڑنا چاہتا ہے۔ موت ایک ہلکے سے جھٹکے کے ساتھ اپنا ہاتھ چھڑا لیتی ہے)

موت۔ (قہقہہ لگا کر) بے عقل نہ بنو لڑکے! دنیا کی کوئی طاقت میرا بڑھتا ہوا ہاتھ نہیں روک سکتی۔ میرا جسم پتھر کا ہے۔ مجھے مار کر اپنے ہاتھ کو چوٹ پہنچاؤ گے!

دولت۔ تم موت ہو —— اور میری جان لینے آئی ہو؟؟

موت۔ ہاں۔

دولت۔ نہیں ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔ میں کمزور ہوں۔ میرے بازوؤں میں طاقت نہیں، مگر میں تمہارے ہاتھ کو مضبوطی سے پکڑ لوں گا۔ تمہاری کلائی کو مروڑ دوں گا۔

یوسف۔ اباجان! آپ مطمئن رہیں۔ یہ بوڑھی کھوسٹ کچھ بھی نہیں کر سکے گی۔

(موت کے سینے پر گھونسہ مارتا ہے۔ اور شدت درد سے اپنا ہاتھ کھینچ لیتا ہے۔)

موت۔ نادان بچے! کیا فائدہ ہوا۔ اپنے ہاتھ کو ناحق تکلیف دی۔

خالدہ۔ میں اباجان کی حفاظت کروں گی۔ (اباجان! پلنگ پر بیٹھ جاتی ہے۔ یوسف موت کو متحیرانہ دیکھتا ہے)

موت۔ فانی انسان کی بیہودہ کوششیں (بلند قہقہہ لگاتی ہے)

یوسف۔ رحیم! آؤ اسے نکال دیں۔

(موت رحیم کو گھور کر دیکھتی ہے۔ وہ بچی کو گود سے اتار دیتا ہے۔ اور موت کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتا ہے موت کے ہاتھ کو ذرہ بھر حرکت نہیں ہوتی۔ وہ حیران و ششدر کھڑا ہو جاتا ہے)

موت۔ تمہاری یہ کوششیں بالکل بیہودہ ہیں —— جو ہونا ہے وہ بہر صورت ہو کر رہے گا —— موت کا ہاتھ کبھی رک نہیں سکتا!

یوسف۔ آج رک جائے گا —— ہم جان پر کھیل کر اباجان کو بچائیں گے۔

خالدہ۔ ہماری موت کے بعد اباجان پر تمہارا قبضہ ہوگا!

موت۔ میں دیکھتی ہوں فانی انسان کی مضحکہ خیز کوششیں میرے راستے میں رکاوٹ پیدا کرتی ہیں (دولت کے سینے کی طرف ہاتھ بڑھاتی ہے۔ دونوں بھائی بہن اس کے ہاتھوں کو پکڑ لیتے ہیں۔ مگر وہ آگے بڑھے جاتے ہیں۔ دولت کے چہرے کا رنگ بالکل زرد ہو گیا ہے۔ آنکھیں بے نور ہوتی جارہی ہیں ننھی صابرہ چیخنے لگتی ہے۔ موت کا ہاتھ تھم جاتا ہے۔ سب حیران و سراسیمہ، خوفزدہ و متعجب کھڑے ہیں)

خالدہ۔ (موت کو ملتجیانہ دیکھتے ہوئے) اباجان کو چھوڑ دے موت! ہمارا ہمارا آخری سہارا نہ چھین۔

موت۔ میں اپنا فرض ادا کرتی ہوں۔

(صابرہ۔ ابا جان! ابا جان کہتی ہوئی مریض باپ کے
پاؤں سے لپٹ جاتی ہے)

یوسف۔ فرض ؟ کونسا فرض ؟ ؟ چلی جاؤ!

موت۔ مجھے تم بیوقوفوں پر ہنسی آتی ہے۔

یوسف۔ جاؤ، ورنہ مجھے اپنی تلوار سے کام لینا ہوگا۔ رحیم
"تلوار لاؤ"

موت۔ (قہقہہ لگاکر) موت کو تلوار سے ڈراتے ہو۔ بے عقل
بچے!

یوسف۔ خبردار اب ابا جان کی طرف ہاتھ نہ بڑھانا۔ رحیم!
جلدی میری تلوار لاؤ۔

(رحیم تلوار لاکر یوسف کے ہاتھ میں دے دیتا ہے)

موت۔ کیا کروگے اب بے سمجھ بچے!

یوسف۔ چلی جاؤ ورنہ میں تم پر وار کرونگا۔

صولت۔ ٹھہرو بیٹا! یہ فضول ہے ــــ فضول ہے۔

یوسف۔ نہیں ابا جان! میں اسے قتل کر ڈالوں گا۔

موت۔ کرو وار۔ تمہاری تلوار کند ہو جاتے گی ــــ تمہارے
ہاتھ پر چوٹ آتے گی۔ بیہودہ انسان کیا کیا حرکتیں
کرتا ہے۔ مجھے ہنسی آتی ہے۔

(یوسف پورے زور سے موت پر وار کرتا ہے۔
تلوار موت کے جسم پر لگتی ہے۔ اور یوسف کے ہاتھ
سے گر پڑتی۔ یوسف کے ہاتھ کو چوٹ آتی ہے)

خالدہ (ڈر کر) بھائی جان!

یوسف۔ میرے ہاتھ کو چوٹ آئی ہے۔

صولت۔ کہاں بیٹا! کہاں ہے تمہارا ہاتھ۔ اپنا ہاتھ میرے
ہاتھ میں دو بیٹا!

یوسف۔ ابا جان! اس کا جسم لوہے کا ہے۔

موت۔ ایک اور وار کرو۔

خالدہ۔ ظالم ڈائن!

یوسف۔ میں تمہیں آگے نہیں بڑھنے دونگا۔

صولت۔ خاموش رہو بیٹا!

موت۔ تم بولتے جاؤ۔ بہرے کان بہرے ہیں۔ میرا دل
پتھر کا ہے!

خالدہ۔ رحم کر موت! ابا جان کے سوا ہمارا دنیا میں اور
کوئی نہیں۔

موت۔ مجھے کیا۔ ان الفاظ سے میرے دل پر کوئی اثر
نہیں ہوتا۔

خالدہ۔ تجھے رحم کرنا آتا ہے ــــ تو رحم کر سکتی ہے!
میں تیری منت کرتی ہوں۔ تیرے آگے ہاتھ جوڑتی
ہوں۔ اگر کہو تو تمہارے پاؤں پر اپنا سر رکھدوں۔

موت۔ ان باتوں سے فائدہ کم عقل لڑکی؟

یوسف۔ اس قدر سنگدل!

موت۔ اس سے ہزار درجہ زیادہ۔

خالدہ۔ میں تیری منت کرتی رہوں گی۔ یہاں تک کہ
تیرے دل میں رحم کا جذبہ پیدا ہو جائے۔

موت۔ رحم! میں نہیں جانتی رحم کیا ہے؟ رحم کی تم ایسے
فانی انسانوں کو حاجت ہے۔ مجھے نہیں۔ میرا کام
ہی بے رحمی ہے۔!

خالدہ۔ ہماری آہ و زاری تیرے دل میں رحم پیدا کر دیگی!

تو رحم کرنے پر مجبور ہو جائے گی!

صولت۔ خاموش رہو پیاری بیٹی! جو ہونا ہے وہ ہو کر رہے گا!

خالدہ۔ آپ زندہ رہیں گے ابا جان! میں موت کی ٹانگوں سے لپٹ جاؤں گی۔ اپنے آنسوؤں سے ۔ ۔ ۔ اس کے پاؤں دھو ڈالوں گی۔

یوسف۔ سنگدل موت! یہ الفاظ سُن کر بھی تیرے دل میں رحم پیدا نہیں ہوتا!

موت۔ کبھی نہیں۔ تمام دنیا بھی آہ و زاری کر کے میرا ہاتھ روکے تو بھی میں اپنا کام کر دوں گی۔

خالدہ۔ تو رحم کرے گی ــــ کرے گی۔ دیکھ میں تیرے پاؤں پر اپنا سر رکھ دیتی ہوں۔

(خالدہ جھک کر اپنا سر موت کے پاؤں پر رکھ دیتی ہے۔ موت ایک حقارت انگیز ہنسی ہنس کر اس کے سر کو ٹھوکر لگاتی ہے۔ یوسف غضبناک ہو کر موت کی طرف بڑھتا ہے۔ مگر خود بخود رک جاتا ہے)

یوسف۔ تمام دنیا کی بے رحمی نے تیری صورت اختیار کر لی ہے۔

موت۔ ہاں، اس لئے کہ میں موت ہوں!

خالدہ۔ نہیں یوسف! یہ نہ کہو یہ رحم کرے گی!

یوسف۔ تمہارے سر کو حقارت سے ٹھکرا دیا۔

خالدہ۔ تم چپ رہو۔ موت! ابا جان نے اس سر پر ہزاروں بار پیار سے ہاتھ پھیرا ہے۔ آج یہ سر دوبارہ تیرے پاؤں پر رکھتی ہوں۔ تو اب بھی ٹھکرا دے لیکن کب تک ٹھکراتی رہے گی تیرے پاؤں ٹھکراتے ٹھکراتے تھک جائیں گے۔ میرے سر کے بال تیری انگلیوں کو جکڑ لیں گے۔

صولت۔ پیاری بچی! ایسا نہ کرنا۔ خالدہ ــ میری خالدہ۔

یوسف۔ اب تو رحم کر موت! میں تمام عمر تیرا احسان مند رہوں گا۔ دیکھ ننھی صابرہ کس طرح بلک رہی ہے۔ یہ ہر وقت ابا جان کی گود میں رہتی ہے۔ دیکھ اس بچی پر رحم کر!

خالدہ۔ تم جو چاہتی ہو مجھ سے لے لو۔ میرے پاس بہت قیمتی ہیرا ہے۔ یہ لے لو۔ یہ ہیرا ہمارے خاندان کی سب سے بڑی وراثت ہے۔

موت۔ ہیرا!

(خالدہ جلدی سے جاتی ہے اور ایک الماری میں سے ہیرا لئے آتی ہے)

خالدہ۔ لو یہ ہیرا۔

(ہیرے کی روشنی ہر طرف پھیل جاتی ہے)

یوسف۔ میرے پاس دو موتی ہیں وہ بھی لے لو۔

موت۔ (ہیرے کو پھینکتے ہوئے) کتنی فضول کوشش!

خالدہ۔ یہ نہ کہو۔ ہمارا دل نہ توڑو۔ آج تک کسی نے بھی سخت بات ہم سے نہیں کہی۔ تمہارے ظلم سے ہمارا دل ٹوٹ جائیگا۔

موت۔ ایسا ہوتا ہی رہتا ہے، یہ کوئی نئی بات نہیں۔

صولت۔ بیٹی مجھے اپنا ہاتھ دو۔ میرا آخری وقت آپہنچا۔

خالدہ۔ یہ نہ کہو ابا جان! موت کے دل میں رحم پیدا

ہوگیا ہے۔ وہ جارہی ہے!

موت۔ کتنی لغو نسلی!

یوسف۔ تو یہ ظلم ضرور کرے گی!

موت۔ ہاں مجھے بہر صورت اپنا فرض ادا کرنا ہے۔

رحیم۔ (جواب تک خاموش رہا ہے) دیکھ ظالم موت! ننھی بچی کس طرح تڑپ رہی ہے۔ اسپر تو رحم کر۔

خالدہ۔ تم نہ بولو رحیم! موت کے دل میں رحم پیدا ہوگیا ہے

موت۔ بولتے جاؤ ـــــ مجھے جو کچھ کرنا ہے وہ کرکے رہونگی!

خالدہ۔ رحم موت رحم۔ میں اپنا سب کچھ تمہیں دینے کے لئے تیار ہوں۔ آنکھیں دنیا کی سب سے بڑی نعمت ہیں۔ میں ایک آنکھ تمہیں دے دونگی ـــــ اباجان کو ایک ہی آنکھ سے دیکھا کروں گی۔

صولت۔ (تڑپ کر) بیٹی خالدہ ـــــ میری خالدہ۔ اپنا ہاتھ دو۔ اپنا ہاتھ۔

(صولت اٹھ کر بیٹھ جاتا ہے خالدہ کا ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگاتا ہے صابرہ کو گود میں اٹھا لیتا ہے)

یوسف۔ یہ منظر بھی تمہیں رحم کرنے پر مجبور نہیں کرتا۔

موت۔ نہیں۔ میں مجبور ہوں!

صولت۔ یوسف تم بھی ہاتھ دو مجھے اپنی پیشانی چومنے دو صابرہ میری ننھی بچی۔ میری صابرہ!

موت۔ میں اب ـــــ زیادہ وقت ضائع نہیں کرسکتی!

ـــــ ـــــ ـــــ ـــــ

خالدہ۔ خدا کے لئے ہم سے اباجان نہ چھینو۔

موت۔ یہ نہیں ہوسکتا۔

خالدہ۔ رحم کر موت۔!

(صولت سے چمٹ جاتی ہے۔ یوسف بھی باپ کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے۔ ننھی صابرہ ڈر کر باپ کے سینے سے چمٹ جاتی ہے۔

کمرے میں شور شیون برپا ہوجاتا ہے)

موت۔ اب وقت آگیا ہے۔

(خالدہ کا ہاتھ زور سے کھینچتی ہے ـ وہ پلنگ سے گر پڑتی ہے۔ اس کے سر سے خون بہنے لگتا ہے۔ موت ننھی صابرہ کو بھی کھینچ لیتی ہے۔ آندھی کے تیز و تند جھونکے زور زور سے روشندانوں کے ساتھ ٹکرا رہے ہیں۔ موت صولت کے سینے کی طرف ہاتھ بڑھاتی ہے وہ مردہ ہوکر گر پڑتا ہے۔ خالدہ چیخ اٹھتی ہے باپ سے لپٹ جاتی ہے۔ یوسف بھی باپ سے لپٹ جاتا ہے۔ موت تیزی کے ساتھ سیڑھیوں سے اتر جاتی ہے۔)

یوسف۔ اباجان۔ اباجان!

خالدہ۔ اباجان۔ تم بولتے نہیں۔ تمہاری آنکھیں بے نور ـــــ بھائی جان ان کو کیا ہوگیا ـــــ موت ـــــ اباجان ـــــ

(بیہوش ہوکر گر پڑتی ہے۔ یوسف اور رحیم اسکے منہ میں پانی ڈالتے ہیں۔ عالم بیہوشی میں وہ آہستہ اباجان! اباجان کہہ رہی ہے۔ ننھی صابرہ باپ کے سینے سے لپٹکر اُسے بلا رہی ہے ـــــ صولت مردہ پڑا ہے)

جناب روشؔ صدیقی

منزلِ خورشید

شکستِ نغمہ روحِ ساز کا پیغام ہو جائے / اجازت ہو، کہ اب سوزِ محبت عام ہو جائے

ہر اک ذرہ جہاں منزل ہے خورشیدِ محبت کی / وہیں اے کاش، صبحِ زندگی کی شام ہو جائے

جو آغازِ محبت کا کوئی انجام ہوتا ہے / تو آغازِ محبت ہی، مرا انجام ہو جائے

اسے اے جذبۂ بے اختیارِ عشق کیا کہئے / کہ وہ ناکام کر دیں، اور کوئی ناکام ہو جائے

وہاں کچھ شکوہ ہائے برملا لیکر چلا ہوں میں / جہاں شکرِ جفا بھی موردِ الزام ہو جائے

وہیں سے ابتدا ہوتی ہے اقلیمِ محبت کی / جہاں مجبور دورِ گردشِ ایام ہو جائے

نہ پرسش ہو کسی سے چاکِ دامانِ محبت کی / وہاں بھی کاش مری وحشتوں کا نام ہو جائے

تصور رہی روشؔ اک بادۂ خوش جام ہی شاید
خوشا وقتے کہ دورِ بادۂ خوش جام ہو جائے

جناب سید اختر احمد صاحب اورینوی ایم۔ اے۔ (چار ایکٹ کا ڈراما)

شہنشاہ حبشہ

افراد ڈراما

۱ شہنشاہ حبش ——
۲ ملکہ حبش ——
۳ شہزادی فلورا (شاہ حبش کی منہ بولی بیٹی)
۴ ڈیڈشا سماپح محمد - ایک فوجی افسر
۵ جرنیل واہب پاشا - ایک ترکی جرنیل -
۶ راس سـیوم - حبشی جرنیل
۷ " دستہ " "
۸ " گاست " "
۹ " عمرو " .
۱۰ " مولوبجتا " "
۱۱ " نصیبو " "
۱۲ ڈاکٹر احمد —— ایک ہندوستانی ڈاکٹر
۱۳ حبشی نرسیں ——
۱۴ " مددگار ——
۱۵ فوجی کپتان ——
۱۶ محافظ دستہ کے سپاہی ——
۱۷ اسٹریچر بردار ——
۱۸ پہرہ دار ——
۱۹ بہت سے راس اور فوجی افسر ——
۲۰ پادری، راہب، عورتیں۔ قبائلی جنگجو وغیرہ
۲۱ صدر مجلس اقوام ——
۲۲ مندوبین اقوام عـ۵ـہ کس
۲۳ اطالوی صحافی عـ۳ـہ کس
۲۴ دوسرے صحافی ——
۲۵ راہ نما ——
۲۶ روموگو۔ افسر لاسلکی (فرانسیسی)
۲۷ فوج کے چند دستے ——
۲۸ سلطان اوسا۔ شہنشاہ حبش کا ایک مسلم باجگذار سلطان
۲۹ زخمی سپاہی - کئی ——
۳۰ خبر رساں۔ ——
۳۱ شہنشاہ کے افراد خاندان دو بیٹے اور تین بیٹیاں ——

ایکٹ نمبر (۱)

منظر اوّل

اگست ۱۹۳۵ء

منظر (ادیس ابابا۔ شاہی محل صبح صادق کا وقت شاہِ حبش کے خاصہ کا محافظ دستہ محل کے احاطہ میں پہرہ دے رہا ہے۔ سارے شہر کو بمبوں کا دھندلکا ملفوف کئے ہوئے ہے۔ دور افق پر منڈلاتے ہوئے ہوائی جہازوں کی گردش کناں پنکھیوں کا شور سکوتِ صباح کو توڑ رہا ہے۔ شہر پر اداسی سی طاری ہے۔ ایک بیرونی محلے میں، جہاں غیر ملکی رہتے ہیں۔ کچھ شور و غل سنائی دیتا ہے۔)

ایک سپاہی۔ جنگ! جنگ!! دیکھو سنو! شہر کے اوپر ہوائی جہاز منڈلا رہے ہیں۔ اطالوی! اطالوی!!

دوسرا سپاہی۔ ایں ۔۔۔! کیا جنگ چھڑ گئی؟ طیارے؟ طیارے؟؟

ایک نوجوان افسر۔ خاموش! یہ پُر امن ممالک کے ہوائی جہاز ہیں، اپنے اپنے ملکوں کی رعایا کو لینے آئے ہیں۔

تیسرا سپاہی۔ تو کیا آخر کار جنگ چھڑ گئی؟ تب ہی تو غیر ملکی شہر چھوڑ رہے ہیں۔

نوجوان افسر۔ قرینہ تو یہی ہے۔

پہلا سپاہی۔ اچھا تو یہ اطالوی طیارے نہیں ہیں۔ شکر خدا!

دوسرا سپاہی۔ جنگ چھڑ گئی اور ساری گفت و شنید بیکار گئی ہے نا؟

نوجوان افسر۔ ہمارے شہنشاہ نے بہت کوشش کی کہ ان کی رعایا جنگ میں ہلاک نہ ہو۔ مگر ان کی سعی لاحاصل رہی۔ مسولینی ایک سر پھرا سانڈ ہے۔ پُر غرور انسان وہ دنیا کو جنگ کے شعلوں میں جلانا چاہتا ہے۔

پہلا سپاہی۔ کیا اطالوی بہت طاقتور ہیں؟

افسر۔ اُن کو اپنی طاقت پر ناز ہے۔ مگر فتح و شکست کو کوئی نہیں کہہ سکتا۔

دوسرا سپاہی۔ کیا تنہا حبش، ساز و سامان والے اطالیہ کا مقابلہ کر سکے گا؟

افسر۔ (چیں بہ جبیں ہو کر) بزدل! سپاہی کا کام صرف حفظِ وطن میں جنگ کرنا ہے۔ فتح و شکست سے اُسے کیا بحث! سپاہی کی فتح اُس کی جان سے پیاری ہے۔ ڈرپوک کی فتح بھی شکست ہے۔ اور بہادر کی شکست حقیقتاً فتح ہے۔

محافظ دستہ کے سب سپاہی۔ بیشک! بیشک!! حبش زندہ باد! ہیلے سلاسی کی فتح!! ۔۔۔۔

(شاہ حبش محل کے وسیع جھروکے میں سامنے ظاہر ہوتا ہے۔ محافظ دستے کے سپاہیوں نے اُسے نہیں دیکھا۔ ہیلے سلاسی بہت متفکر نظر آتا ہے۔ اُس کی بڑی بڑی آنکھیں دور افق پر لگی ہوئی ہیں۔ اس کی بلند پیشانی پر گچھے دار بال پریشان ہیں۔ بشرے سے اضمحلال ٹپکتا ہے مگر اسکی پیشانی

کی تنی ہوئی لکیروں اور اس کے کھڑے ہونے کے پرشوکت انداز سے عزم و ارادہ ظاہر ہوتا ہے)

دوسرا سپاہی۔ (شرمندہ ہوکر) نہیں نہیں! میرا مطلب یہ تھا کہ کیا ہمارا ملک بھی جنگی طیاریاں کر رہا ہے یا نہیں؟

افسر۔ اصل طیاری تو حوصلوں کی بلندی اور جذبۂ ایثار کی فراوانی ہے۔ مگر ہمارے شہنشاہ جنگی طیاریوں سے بھی غافل نہیں وہ دن رات اسی فکر میں غلطاں رہتے ہیں۔ ہمارے پیارے شہنشاہ کی رفیع پیشانی پر فکر زائیدہ قطراتِ عرق بلند آسمان کے ستاروں کی طرح چمکتے رہتے ہیں۔ کیا تم اکثر صبح کو منظر اس جھروکے پر نہیں دیکھتے (جھروکے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے)

(سب سپاہیوں کی نظریں جھروکے کی طرف اُٹھ جاتی ہیں، جہاں شاہِ حبش استادہ ہے۔ اسلحہ آراستہ ہوجاتے ہیں، ہر سپاہی چوکس ہوکر فوجی سلام کرتا ہے اور نعرہ بلند ہوتا ہے)

سب سپاہی اور افسر۔ زندہ باد شہنشاہ! پایندہ باد شہنشاہ!

(شاہ حبش اپنے محافظ دستے کی طرف متوجہ ہوکر محبت و احسان مندی کی نظروں سے دیکھتا ہے)

شاہِ حبش۔ ڈیئر شاسماچ محمد!

نوجوان افسر۔ شہنشاہ زندہ باد! (چبوترے پر سے ہوکر بیرونی دروازے سے جھروکے کی سیڑھیوں پر چڑھ جاتا ہے)

شاہِ حبش۔ شاسماچ محمد!

(افسر فوجی سلام کرتا ہے اور گردن جھکا کر کھڑا ہوجاتا ہے)

شاہِ حبش۔ بہادر اور وفادار شاسماچ! ملک کے تمام افسرانِ فوج اور عمائدین کو اطلاع بھیجو کہ ایک ہفتے کے اندر مجلس شوریٰ میں یہاں جمع ہوں۔ حفاظت ملک و وطن کے لئے ہمارے دماغ و دل کو ایک ہوجانا چاہیئے۔ جاؤ!

(نوجوان افسر سر جھکاتا ہے اور فوجی سلام کرکے رخصت ہوتا ہے)

(زیرین منزل کے ہال سے فلورا شاہ حبش کی بیٹی نمودار ہوتی ہے۔ افسر سیڑھیوں پر سے اتر کر اور شہزادی کو دیکھ کر فوجی سلام کرتا ہے۔ شہزادی محبت پاش نظروں سے افسر کو دیکھتے ہوئے مسکراتی ہے۔ نوجوان افسر فخر و محبت کے نشہ میں جھوم کر نگاہوں سے سلام نیاز پہنچاتا ہے۔ اور زیادہ گرمجوشی، سربلندی اور غرور کے ساتھ اپنے دستے سے جا ملتا ہے ——— پہرے کی تبدیلی کا گھنٹہ بجتا ہے۔ محافظ دستہ رخصت ہوتا ہے۔ دور سے دوسرا دستہ آتا دکھائی دیتا ہے۔ شاہِ حبش جھروکے پر کھڑا ہے اور شہزادی فلورا زیرین منزل میں دونوں رخصت ہونے والے دستے کو دیکھ رہے ہیں۔)

منظر دوم

(شاہ حبش کا دربار۔ راس سیوم، راس کاسا

راس وستہ۔ راس عمرو وغیرہ افسران حاضر ہیں۔ شاہ ہیلے شلاسی۔ ملکہ سبا کے قدیمی تخت پر فوجی لباس میں متمکن ہے۔ تخت ترشے ہوئے سنگ سیاہ سے بنایا گیا ہے۔ پشت پر درمیان میں دائرے کے اندر معبود شمس کا چہرہ ہے اور دائرے کے اوپر صلیب کا نشان ترشا ہوا ہے۔ دائیں اور بائیں لانبے لانبے ایال والے صحرائی شیر ببر کے مجسمے ہیں۔ افسران فوج دامن دراز سفید لبادہ وردی کے اوپر پہنے ہوتے ہیں اور داہنے ہاتھ میں چمکدار وطویل نیزے لئے ہوئے۔ سب کھڑے ہوتے ہیں۔ اور انکے عقب میں مغربی وضع کی اونچے پشت والی کرسیاں دو رویہ ایک مختصر نیم دائرہ بنا کر ترتیب دی گئی ہے۔)

شاہ حبش ۔ معزز سردارو! وفادار سالارو! بیٹھ جاؤ۔ تم جانتے ہو کہ یہاں کیوں بلائے گئے ہو۔ ظالم اور ذلیل اطالیہ کے پرغرور دماغ میں پھر یہ خیال خام پیدا ہوا ہے کہ وہ معزز حبش کے شریف باشندوں کو غلام بنائے آج سے چالیس برس پہلے بزدل اطالیہ نے یہی سوچا تھا۔ مگر بہادر شیر دل منلک اعظم نے ہزاروں اطالویوں کو جہنم واصل کرکے یہ ثابت کر دیا تھا کہ قدیم حبش بزور شمشیر آزاد رہے گا۔ آج ہمارے سامنے بھی ایسا ہی موقعہ ہے۔ ہم ملکہ سباء اور سلیمان اعظم کے وارث ہیں۔ اور ہم پر فرض ہے کہ اس مقدس وراثت کی حفاظت میں اپنی جانیں لڑا دیں۔ (نیزے بلند ہوتے ہیں اور زندہ باد حبش کے نعرے ہال میں گونجتے ہیں) تمہارا شہنشاہ تمہارے سامنے ہے۔ اور قسم ہے تخت سلیمان کی! یہ اپنی جان آزادیٔ وطن کے لئے ہر وقت قربان کرنے کو حاضر ہے (زندہ باد شہنشاہ! شہنشاہ کی عمر دراز کے نعرے لگائے جاتے ہیں۔)

تمہارے شہنشاہ نے ہر شریفانہ کوشش کی کہ اس کی رعایا کا خون نہ بہایا جائے مگر مغرور مسولینی انسانیت کو جنگ کے خونخوار درندے کے سامنے پھینک دینا چاہتا ہے۔ مجلس اقوام کی تنبیہہ کے باوجود وہ بدذات اجیلہ جو معزز وقدیم حبش پر حملہ آور ہونا چاہتا ہے۔ ہم یقین رکھتے ہیں۔ کہ تم اے باوقار سردارو اور سارا ملک اس کمینہ بھیڑئے کے حملے کی مدافعت اپنے نیزوں کی ظاہر نوک سے کرنے کے لئے بے چین ہے (شاہ حبش اپنے نیزے کو زور سے زمین پر پٹکتا ہے اور خاموش ہو جاتا ہے)

سب سردار ۔ تمہاری بے مثال وفاداری سے ہمیں یہی امید ہے!

راس سیوم (کھڑے ہو کر) اے شہنشاہ عالی مرتبت! ہماری تلواریں میانوں میں دشمن کا خون پینے کے لئے مچل رہی ہیں۔ حکم ہو اور ہم دشمن کے حلقوم کو بیل کی گردن کی طرح کاٹ کر رکھ دیں

(بیٹھ جاتے ہیں)

راس وستہ۔ (کھڑے ہوکر) قسم ہے مقدس آگ کی!
ہم شیر نیستاں کی طرح اطالوی گورخروں کی گردن
چباڈالیں گے! (بیٹھ جاتا ہے)

راس عمرو۔ (کھڑے ہوکر) عالیجاہ! ہمارے سورما سرحدوں
پر پہرے جماتے ہوئے ہیں۔ صرف حکم کی دیر ہے!
(بیٹھ جاتا ہے)

راس گٹاسا۔ (کھڑے ہوکر) مقدس ارواح کی سوگند! اے
شہنشاہ عالی تبار! ان بہادر سرداروں نے سارے
حبش کی ترجمانی کی ہے۔ مگر ہمیں مزید کوشش
کرنی چاہئے کہ صلح کی صورت پیدا ہوجائے تاکہ
مردم سوز جنگ کی شعلہ فشانیاں حبش کے دورِ جدید
کی نئی کونپلوں کو جلاکر راکھ نہ کردیں (بیٹھ جاتا ہے)

شاہِ حبش۔ معزز جرنیلو! راس گٹاسا نے صحیح خیال کا اظہار
کیا ہے۔ مگر اب تک واقعات کے دھارے اس
مقام سے آگے بہہ نکلے ہیں۔ ہم نے مجلس اقوام کے
ذریعہ دولِ عظمیٰ کے سفراء کی وساطت سے اور
اپنے نمائندوں کے ہاتھوں سعی پیہم کی کہ سرحدی
تنازع صلح و آشتی سے طے پا جائے۔ مگر مسولینی
کی حرص نے اور ہی کچھ اسے سوجھایا ہے تم واقف
ہو اے وفادار و شریف سردارو کہ اس کے شرائط
صلح کس درجہ ذلت آمیز ہیں۔ قدیم حبش کی آزادی
کسی قیمت پر بھی بیچی نہیں جاسکتی۔ خدائے بزرگ
و برتر نے حبش کی سلطنت مجھے اس لئے دی ہے
کہ میں اس کی حفاظت کروں نہ کہ اس لئے کہ اسے
کسی مغرور و سرکش دشمن کے ذلیل ہاتھوں بیچ
دوں۔ راس تفاری اطالیہ کا غلام بنکر سلطنت نہیں
کرسکتا۔ راس تفاری اپنے محبوب حبش کو تاج و تخت
کے لئے بھی فروخت نہیں کرسکتا۔ معزز و قدیم حبش
کی آزادی مجھے اپنی جان سے زیادہ عزیز ہے۔
مجھے ملکۂ سبا کے تخت کی قسم میں حبش کی عزت
کے لئے سب کچھ قربان کردوں گا۔ (شاہ اپنے نیزے
اور اپنے پاؤں کو زور سے فرش پہ پٹکتا ہے)

سارا دربار۔ (سب کھڑے ہوجاتے ہیں) جنگ! جنگ!!
جنگ!!!

(مختلف آوازیں) ہم اطالیہ کو جہنم واصل کردیں گے۔
ہم مسولینی کو جنگلی سور کی طرح اپنے نیزوں سے پرچ
لیں گے! زندہ باد حبش! شہنشاہ کی عمر دراز!...

شاہِ حبش۔ ہم تمہارے جذبات کی قدر کرتے ہیں۔ اور
اگر مقدس مریم نے اپنے بچوں پر نگاہ رکھی تو ہم
دشمنوں کے خون سے ایک دوسرے (دو ڈاوا)
کا نقشہ کھینچ کر رکھدینگے۔ دلیرو! وطن کے جاں نثارو
بیٹھ جاؤ! (سب پھر بیٹھ جاتے ہیں)

راس سیلوم۔ اے تخت سبا کے وارث ذی جاہ! دشمن
کمینہ اور حیلہ جو دشمن ہماری سرحدوں کے قریب
آگیا ہے۔ اور شہنشاہ کے جاں نثار بھی سرحدوں
کے قریب ڈٹے ہوئے ہیں۔ اے شہنشاہ! اب
ہمیں تاب برداشت نہیں کہ ہم باوقار حبش کی
ہتک ہوتی ہوئی دیکھ کر اپنے نیزوں اور برچھوں

کو بغیر حرکت دیئے ہوئے نہیں رہ سکتے۔ عالیجاہ
اشارہ فرمائیں اور ہم اطالیہ کے غول کو جنگلی گھاسوں
کی طرح کاٹ کر رکھدیں!

سالارِ دربار۔ اے شہنشاہ! حکم! حکم! رخصتِ جنگ!
اذنِ پیکار!!

شاہِ حبش۔ بے شک حبش کی عزت کی حفاظت کیجائیگی!
ذی عزت سردارو! میں ناحق اپنی رعایا کو ہرگز نہیں
کٹوانا، مگر غیرت مند اور شریف خون کو حفظِ ناموس
میں بہہ ہی جانا چاہیئے۔ ہماری ملکہ نے مسلسل روزے
رکھے اور امن و امان اور صلح و آشتی کے لئے دعائیں
کیں۔ ہم نے ان تھک کوشش کی کہ دنیا کا امن
جنگ کی ہیبتناکیوں سے تباہ نہ ہو۔ اور ابھی تک
ہماری کوششیں جاری ہیں ہمیں امید ہے کہ
برطانیہ اور فرانس مسولینی کے سرِ پُر غرور کو جھکا کر
چھوڑینگے۔ برطانیہ تانا جھیل اور نہر سوئز اور مشرقی
مقبوضات کے تحفظ و استحکام کی خاطر ضرور ہماری
مدد کرے گا . . . . .

(لاسلکی کے دفتر کا افسر عجلت سے دربار میں
داخل ہوتا ہے)

مسٹر روموگو کیا خبر ہے؟

روموگو۔ (فرانسیسی) شہنشاہ! شمالی سرحدوں سے ابھی
اطلاع آئی ہے کہ اطالوی پیش قدمی کرنے کے لئے
آمادہ ہو چکے ہیں۔

شاہِ حبش۔ معزز سپہ سالارو! اب وقت آگیا ہے کہ تم
اپنی نجابت و غیرت کا ثبوت دو! راس سیوم!
تم ایک لمحہ کے اندر اوڈوا کی طرف روانہ
ہو جاؤ اور شمالی افواج کی کمان اپنے مضبوط ہاتھوں
میں لے لو۔

(راس سیوم کھڑے ہو کر سینہ پر دونوں ہاتھوں
سے چلیپا بناتے ہوئے گردن اظہارِ قبول
کے لئے جھکاتا ہے)

راس گاسا! تم جنوب کی طرف جاؤ اور کمان لے کر
دشمن کی پیش قدمی کو ادھر روکو! (راس گاسا
راس سیوم کی پیروی کرتا ہے) راس دستہ!
تم راس سیوم کے ماتحت شمال کی جانب پر مامور
ہو جاؤ (راس دستہ راس کاسا کی پیروی کرتا ہے)
اور تم راس عمرو اوڈوا سے تیس میل ادھر ایک لشکر
جرار کی تنظیم و ترتیب کر کے احکامات کے منتظر رہو!
(راس عمرو راس دستہ کی پیروی کرتا ہے) جاؤ اے
بہادر سردارو! برق رفتاری کے ساتھ دشمن کے
سروں پر ٹوٹ پڑو۔ جاؤ! اے وفادار دلیرو! خدا
مسیح تمہاری حفاظت کریں!!

(دربار برخاست ہوتا ہے۔ ایک خاموش جوش
اور ایک پُر از ولولہ سنجیدگی طاری ہے۔ ہتھیاروں
کی ہلکی سی جھنکار اور قدموں کی چاپ سنائی
دیتی ہے۔ شاہِ حبش تنہا رہ جاتا ہے)

شاہِ حبش۔ (تخت سے آہستہ آہستہ اترتا ہے اور
بے چینی سے ہال میں ٹہلتا ہے)

عزت کی موت یا بے عزتی کی زندگی؟ اے دل! اے دل! تو کیوں ڈوبا جاتا ہے؟.... نہیں! نہیں! یہ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ میں پیارے حبش کو ذلیل حیلہ جو مسولینی کے ہاتھوں فروخت کر دوں..... آہ! مگر مقابلہ! غریب حبش! مظلوم حبش!! کاش مجھے چند برس اور مل جاتے تو میں اپنے ملک کی پوشیدہ طاقتوں کو ابھار کر اس وحشی درندے کے سر کو کچل دیتا!.... کیا برطانیہ ہماری مدد نہ کریگا؟ .... کیوں نہ میں ملک کی معدنیات کا ٹھیکہ اُس اینگلو امریکن کمپنی کو دے دوں؟ نہیں...؟ بھیڑیئے کے منہ سے نکل کر شیر کے منہ میں جانا کونسی عقلمندی ہے! یہ یورپ کے فراعنہ! الاماں! یہ رنگدار اقوام کے گلے میں غلامی کی رسی رشتۂ محبت کے پردے میں ڈالتے ہیں — اور پھانس کو آہستہ مگر یقینی طور پر تنگ و مضبوط کرتے جاتے ہیں.... اے خدا! اے خدا! تو کب تک مظلوم رنگ دار اقوام کی مدد کو اپنے جلال و قدرت کے تخت سے اتریگا!.... آہ! لیکن اس کے سوا چارہ کیا ہے؟... جاپان؟ ... بہت دور.... میرے اللہ! راس تفاری جنگ سے نہیں ڈرتا۔ اس نے اپنی زندگی تلوار کے سایہ میں گذاری ہے۔ مگر وہ حبش کی تخریب کے خیال سے بھی کانپ اٹھتا ہے.... کبھی نہیں! قابل صد نفرت مسولینی کی آرزو کبھی نہیں پوری ہوگی۔ اسے حبش کی مسلسل ہتک کی ہے........ مجبوری! مجبوری! برطانیہ فرانس کو تجارتی و معاشی حقوق دیتے ہونگے مظلومی؟ مجبوری!... راس تفاری کو لیگ کے دروازے پر بھیک مانگنی ہوگی! دلگیر، اداس، سر جھکائے ہوئے ہال کے عقبی دروازے سے نکل جاتا ہے۔

جناب شیخ محمد طفیل شملوی

نوائے رنگین

خیالات جب بھٹکے ہوئے طائر کی طرح اپنا آشیانہ تلاش کرلیں تو شعر بن جاتے ہیں۔

تنکوں کو ضائع مت کرشاید کسی کا آشیاں بننے کے کام آئیں۔

جناب میراجی

نظم

خاموشی

موہنی تال کنارے پہ چلی آتی ہے،
نرم قدموں کی صدا، دھیمی، نزاکت سے بھری!
لڑکھڑاتی چلی آتی ہے کوئی جیل کی پری
جھیل کے سینے کو رفتار سے سہلاتی ہے!
سیمگوں سحر، مناجات کی ہموار صدا،
ہنس کی صاف روانی کا سکونِ ابدی!
یا فضاؤں میں ہو طیارے کا منظر، دھندلا،
سطحِ بحر پہ یا کوئی جہاز بحری!
اور یا خواب میں اِندر کی پری کا بوسہ!
اولیں خون میں ملبوس کے جس طرح نہاں،
شرم آلودہ ہو، دوشیزہ، اچھوتا جذبہ!
نئی معبود ستارے پہ چلی آتی ہے،
نرم قدموں کے سکوں زار میں لرزاں لرزاں،
موہنی تال کنارے پہ چلی آتی ہے!

شیخ محمد طفیل۔ ایس پی۔ ایس

ہندوستانی بچوں کی صحت

اگر ہندوستان کے ایک بچے کا چال چلن بگڑ گیا۔ تو سمجھو ایک مایۂ ناز لیڈر وفات پا گیا۔ کیونکہ اچھی تربیت سے وہی بچہ قابلِ قدر لیڈر بن جاتا ہے۔

دوسرے ملکوں کے مقابلے میں ہمارے ملک کے بچے غلیظ سست کمزور اور پڑھائی میں بالکل نکمے ہوتے ہیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ ہندوستان میں بچوں کی صحت کا کوئی لحاظ نہیں رکھا جاتا۔ اور اس طرح سے غریب بچوں کی صحت بالکل برباد ہو جاتی ہے۔

مغربی ممالک کے ہر شہر میں بچوں کے کھیلنے کیلئے اس کثرت سے میدان موجود ہیں کہ آبادی کے بڑھ جانے پر بھی وہ کافی ہوں گے۔ اور جہاں جگہ کی قلت ہے وہاں حکومت نے اور طریقے اختیار کئے ہیں۔ جن سے بچوں کی صحت پر کوئی بُرا اثر نہیں پڑتا۔

چھوٹے چھوٹے بازاروں کو جہاں پہیہ گاڑیوں کی آمد و رفت زیادہ نہیں یا خاص اوقات میں بچوں کے کھیلنے کے لئے بند کر دیا جاتا ہے۔ تاکہ بچے حادثے سے بے خبر ہو کر کھیلیں۔ اور یہ تجویز کافی حد تک کامیاب ثابت ہوئی ہے۔

سلفورڈ نے اس تحریک کو انگلستان میں چلایا۔ اب روز بروز ترقی کرتی جا رہی ہے۔ محکمۂ تعلیم برطانیہ کی طرف سے پچھلی دفعہ جو رپورٹ شائع ہوئی ہے اس میں اس خیال کی منظوری کے متعلق اعلان درج ہے

یہ تجویز چاہے عارضی کیوں نہ ہو لیکن ہم اسے ہندوستان جیسے ملک میں رائج کرنا چاہتے ہیں۔

اوّل۔ ہندوستان کی صحت دوسرے ملکوں کے مقابلے میں گری ہوئی ہے۔

دوم۔ ہندوستان کے شہروں میں یہ تجویز آسانی سے کامیاب ہو سکتی ہے۔ کیونکہ حکومت کو میدان بنوانے کیلئے زر کثیر صرف کرنا پڑے گا۔ جب تک میدان نہیں اس تجویز پر عمل کیا جا سکتا ہے۔ ورنہ ہندوستان کی بڑھتی ہوئی پود کی صحت ہمیشہ کے لئے برباد ہو جائے گی۔ ہماری آئندہ قسمت کا فیصلہ بچوں پر منحصر ہے۔ اگر ہم نے ان کی طرف توجہ نہ دی تو یہ سارے ترقی کے خواب وہم ہو کر رہ جائیں گے

حکومت نے اس سلسلے میں چند اقدام اٹھائے ہیں لیکن وہ ہندوستان کی کثیر التعداد مخلوق کو فائدہ نہیں پہنچا سکتے۔

مشکلات۔ خاص اوقات میں سڑکوں کا بند کر دینا

یک آسان چیز نہیں جب یہ تجویز بمبئی کونسل میں پیش ہوئی تو اس کے لئے کوئی قانون نہ ملا جس کی وجہ سے سڑکوں کو خاص اوقات میں بچوں کے کھیلنے کے لئے بند کر دیا جائے۔

ہمارا یہاں یہ مطلب نہیں کہ اُن سڑکوں کو بھی بند کر دیا جائے جہاں آمد و رفت کثرت سے ہوتی ہے۔ صرف ان سڑکوں اور بازاروں کو پہیہ گاڑیوں کے لئے روک دیا جائے۔ جہاں آمد و رفت کم ہے۔ اور بچوں کی کافی تعداد کھیلنے کے لئے موجود ہے۔ اور نزدیک کوئی میدان نہیں۔ اس اصول پر بمبئی میں کئی غیر طرفہ سڑکیں موجود ہیں۔ یعنی ان کے ایک ہی طرف گاڑیاں چل سکتی ہیں۔

یہ اعتراض کرنا کہ سڑکوں کو خاص اوقات میں بند کرنا موٹر لاری والوں کے لئے تکلیف کا باعث ہوگا۔ صحیح نہیں۔ کیونکہ آج بھی کئی ایسے بازار موجود ہیں۔ جو پہیہ گاڑیوں کے لئے بند ہیں۔ اسی طرح اگر چند سڑکیں بچوں کے لئے بند کر دی جائیں تو کیا حرج ہے۔ ان کی تھوڑی سی تکلیف کے مقابلے میں ہندوستان کی آئندہ ترقی کا دار و مدار ہے۔

یہ ضروری ہے کہ بچوں کے کھیلنے کی جگہ ان کے گھروں کے نزدیک ہو۔ یہ بہت مشکل ہے کہ بچے کسی بڑے میدان میں جاکر کھیلیں۔ اس کے لئے اول تو وہاں تک پہنچنا بذاتِ خود مشکل ہے۔ اور یہ ٹریفک کی مزید مشکلات میں اضافہ کر دے گا۔

نئے کھیل۔ جگہ کی کمی کے باعث ایسے کھیل ایجاد کرنے چاہئیں۔ جن سے تھوڑی سی جگہ میں بچوں کی کافی ورزش ہو جائے۔ بچوں کو کھیل کے قواعد اچھی طرح سمجھائے جائیں۔ ہندوستانی بچے مقابلتاً اس بات میں بالکل نکمے واقع ہوئے ہیں۔ انہیں کپڑے کی میلی سی گیند بنا کر گلیوں میں اچھالنی ہی آتی ہے۔ وہ قواعد سے بالکل لاعلم ہوتے ہیں۔

بچوں کا اصول پر عمل پیرا ہوکر کھیلنا انکی زندگی کو بھی سدھار دیگا۔ اور انہیں اپنی زندگی میں ایک باقاعدہ انسان بنا دیگا مگر اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دی جاتی۔

ہر ایک شہر میں خاص انجمن ایسی قائم ہونی چاہئے۔ جو بچوں کی دیکھ بھال کرے۔ آوارہ گلیوں میں پھرتے ہوئے بچوں کو روک کر اُن کے والدین کو اطلاع دے۔ اور اگر والدین کوئی عملی قدم اُسکے متعلق نہ اٹھائیں تو انہیں جرمانہ کی سزا دی جائے۔ امید ہے کہ اس طرح ہندوستانی بچوں کی صحت پر خوشگوار اثر پڑے گا!

عوام کو چاہئے کہ حکومت سے ایسے قوانین منظور کرائیں۔ جن سے ہندوستان کی تباہ ہوتی ہوئی صحت بچ جائے۔

جناب پروفیسر عبداللطیف تپش ایم۔ اے۔

غزل

ہوا گلچیں کے آگے کیا بندھے بلبل کی گلشن میں
نہ گل اسکے گریباں میں نہ کلیاں اُس کے دامن میں

کرشمہ ساز کیف وکم ہے اک نیرنگِ نظّارہ
طلسم نو بہ نو ہے پردہ پردہ چشم پرفن میں

میری بربادیاں رو رو پڑی ہیں میری حالت پر
تری بیباکیاں آ گئی ہیں دل کی الجھن میں

مجھے ناکامیٔ ارمان جانسوزی کا شکوہ ہے
مری قسمت بنی ہے حد فاصل برق خرمن میں

عناصر ہی کے دم سے کسوتِ ہستی کی رونق ہے
دھرا ہے چار ٹکڑوں کے سوا کیا جامۂ تن میں

نزاکت کو تری روؤں کہ اپنی سخت جانی کو
چلا آتا ہے اک مدت سے جھگڑا تیغ و گردن میں

محبت نے تپش یہ لطف کھویا زندگانی کا
بڑھاپا ہے جوانی میں جوانی تھی لڑکپن میں

جناب راجہ مہدی علی خاں صاحب

نگارستانِ چین

جانشینی

میں اس تنہا پودے کے لئے اداس ہوں۔
جو دریا کے بستر کے ۔۔۔ بہت قریب اگا ہے۔
آم کے بلند درخت پر کوئل نے
"کوکو" کرکے آسمان سر پر اٹھا رکھا ہے۔
دریا میں طغیانی آچکی ہے۔
دور دور تک پانی کے چھینٹوں کی آواز سنائی
دے رہی ہے۔
پن گھٹ کی کشتی آہستہ آہستہ ہچکولے کھا رہی ہے
کیونکہ ملّاح موجود نہیں۔

(توفو)

زندگی

کشتی کی سیر کے بعد میں نے
دریا کے کنارے بیٹھ کر اتنی شراب پی
جتنی کبھی کسی نے نہیں پی
اور اب واپس آرہا ہوں۔
بہت کم لوگوں کی عمر زیادہ ہوتی ہے۔
تتلی پھول پھول پر منڈلا رہی ہے۔

کابلی مکھی پھولوں کے رخساروں کا رس چوس چوس کر
آہستہ سے اڑ جاتی ہے۔
ہر چیز اپنی مختصر سی زندگی میں لطف اندوز ہو رہی ہے
آؤ ہم بھی اپنی مختصر سی عمر میں زندگی سے زیادہ
سے زیادہ لطف اٹھائیں۔

(توفو)

اُمید

گذشتہ شام تم ایک دلہن تھیں۔
اس صبح تمہارا خواب تکمیل کو پہنچ چکا ہے۔۔۔
اپنے شوہر بدکار کو یوں رد نہ کرو۔
وہ ایک بار پھر تمہارا ہوسکتا ہے۔

(چوان تنے یو)

بیزاری

میں اپنی چھوٹی سی ندی کو جانتا ہوں۔
جہاں سر ہلاتے ہوئے نے کے پودے
اور خوشبودار بوٹیاں اُگی ہیں۔
اس کی گہرائیوں میں جل دیو
ایک دوسرے سے لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں۔

آہ مجھے کس قدر تمنّا ہے کہ یہیں بیٹھا رہوں۔
مَیں اب یہاں زیادہ دیر تک
اس خوشنما مقام پر نہیں ٹھیروں گا۔
میں یہاں بیٹھ کر خیالوں میں وقت کیوں کھوؤں۔
مجھے اپنے فرض کا احساس ہو چکا ہے۔
میں اپنے آسمانی آقا کا حکم بجالاؤں گا۔
اس نے انسان کو بہت مختصر زندگی عطا کی ہے۔
اس مختصر سی زندگی کو یوں کاہل بنکر کھو دینا
کہاں کی دانشمندی ہے۔؟

(رہان-یو)

خیمے میں بیٹھکر

سیشیپ کے میدانوں کے آر پار
جنوب کی تیز و تُند ہوائیں
آوارہ پھر رہی ہیں۔
پو پھٹتے وقت ٹھٹھرتا ہوًا چاند چمک رہا ہے۔
میری روح وطن کے خوابوں میں کھو گئی ہے۔
اور یہ اس وقت تک کھوئی رہے گی
جب تک لڑائی کے بگل کی آواز
مجھے چونکا کر بلا نہ لے گی۔

(دہن-یو)

ابدی نیند

صبح کی مصروف مکھی کو گزند نہ پہنچاؤ۔
رات کے مچھروں کی جان نہ لو۔
اگر وہ اپنی مکار تجارت چمکاتے ہیں
تو انہیں اس سے روکو
بالکل مار ہی نہ ڈالو
آخر اُن کی زندگی ہی کتنی ہے۔
وہ ایک دن کی پرواز کے بعد
اور مصروفیت کی چند مختصر گھڑیاں گزار کر
وہ تمہاری ہی طرح
ابدی نیند سو جاتے ہیں۔

وصال

جھلملاتا ہوًا لباس پہنے
ایک دوشیزہ
اپنی خلوت گاہ سے
نیچے اترتی ہے
اور وہ اپنی بدقسمتی کا ماتم کرتی ہے
جو اُسے آوارہ پھرنے کی اجازت نہیں دیتی
وہ صحن میں ہر پھول کے قریب لگی ہوئی
کلیوں کو گننے لگتی ہے۔
اتنے میں یکایک
ایک بڑی سی کابلی مکھی
پر پھڑپھڑا کر
اس کے بالوں میں سجے ہوئے
خوبصورت کلپ کے قریب آبیٹھتی ہے۔

(لیو یوحسی)

قصرِ ویران

اب یہ شاہی محل اجڑ چکا ہے
صرف چند پھول ہی باقی رہ گئے ہیں . . . .
بادشاہ کی آنکھوں کا نور ـــــــ
سفید بالوں والی دوشیزہ
ایک جگہ بیٹھ کر
گذرے ہوئے دنوں کی باتیں
سنانے لگتی ہے۔

ـــــــ (لِو آن چن)

ایک معتوب

بہار کے چمکیلے پھولوں پر
شبنم چمک رہی ہے۔
ہوا ان کی خوشبو
دُور دُور لے جا رہی ہے چنانچہ
چاند کے نیچے
محل سے
گیتوں اور نغموں کی آوازیں
آنے لگتی ہیں
یوں معلوم ہونے لگتا ہے
جیسے پَن گھڑی ہیں
سارے سمندر کا پانی
ڈال دیا گیا ہے
تاکہ یہ طویل رات
مجھے ایک کبھی نہ ختم ہونے والی
رات معلوم ہو

ـــــــ (دُتُو مو)

فرقت

لٹکے ہوئے پردے سے پرے
خزاں کا چاند
سردی سے کانپتے کانپتے
آسمان سے جھانک رہا ہے
میں اپنے ریشمی پنکھے سے
اڑتے [illegible]
اپنے [illegible]
رات اس قدر ٹھنڈی ہو رہی ہے
کہ میرا دل بھی بتدریج سرد پڑ رہا ہے
آسمان کی چرخہ کاتنے والی دوشیزہ[1]
شمع رو چرواہے[2] سے بہت دور ہے۔

ـــــــ (دُتُو مو)

[1] ایک ستارے کا نام۔ [2] ایک ستارے کا نام

جناب رشید بی۔ اے (ادب لطیف کا افسانہ نمبر ایک نقاد کی نظر میں)

ادبِ لطیف کا افسانہ نمبر

"ادبِ لطیف" کی زندگی کا تیسرا سال شروع ہے۔ دو سالنامے شائع ہو چکے ہیں ایک افسانہ نمبر اب دوسرا افسانہ نمبر شائع ہوا ہے۔ اور میں ہکار یو بو ہ نظر ہے۔ ریویو کے محدود حلقے میں تفصیلات میں جانا ناممکن ہے۔ اس لئے میں اسے مختصر سے مختصر کرنے کی کوشش کرونگا۔ مجھے یہ کہنے میں باک نہیں کہ ادیب صاحب نے اپنی تمام مجبوریوں کے باوجود افسانہ نمبر کو نہایت کامیاب بنانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں۔ ہر قسم کا مواد بہم پہنچایا ہے۔ اور ترتیب و تدوین میں کافی محنت سے کام لیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ دو ایک افسانے کمزور بھی ہیں۔ میرزا ادیب "رائیڈر ہیگرڈ زدہ" معلوم ہوتے ہیں۔ انہوں نے خاص نمبروں کے لئے خطوط کا سلسلہ محفوظ کر رکھا ہے۔ یہ خطوط ان کا کوئی مفروضہ "صحرانورد" دوست لکھتا ہے۔ جن میں صحرا کے کچھ رومان بداماں خوفناک واقعات جن میں دلچسپی الف لیلہ سے بھی بڑھ کر پائی جاتی ہے۔ درج ہوتے ہیں۔ مجھے امید ہے جب یہ سلسلہ کتابی صورت میں شائع ہو گا تو بہت دلچسپی سے پڑھا جائیگا۔ میرے خیال میں ایک صحیح قاری ان کے مطالعہ کے وقت اپنے آپ کو کسی صحرا یا کسی پُراسرار غار میں محسوس کرتا ہو گا۔ اشک صاحب نے اپنے تخلص کی رعایت سے ہمیں ایک اشک آور کہانی سنائی ہے ممکن ہے بعض "عشق زدہ" بھائیوں کے لئے آنسوؤں کی یہ لڑی بیکار و لغو ہو لیکن میری نظروں میں تو یہ کافی قیمت اور وقعت کے قابل ہے۔ آپ نے اپنے نفسیاتی مطالعہ کا کافی ثبوت دیا ہے۔ صادق الخیری دہلوی کے قلم سے ایک ایسی چیز نکلی ہے۔ جسے صرف اچھی کہنا صادق صاحب کے ساتھ ناانصافی ہو گی۔ آپ نے "سرزمین بے آئین" کا ایک انتقامی واقعہ بیان کیا ہے۔ یہ واقعہ ہو یا نہ ہو۔ لیکن صادق صاحب نے جیسے پیش کیا ہے، وہ افسانویت سے بھی علیحدہ نہیں۔ اور صرف یہ بات کہ انہوں نے اپنے سے دور۔ بہت دور رہنے والی قوم کی زندگی کا ایک حصہ نہایت کامیابی کے ساتھ صحیح پیش کیا ہے۔ اُن کے افسانہ نگار ہونے کے لئے کافی سند ہے۔ اثر جعفری نے اپنے حسنِ انتخاب اور مترجمانہ قابلیت کا کافی ثبوت دیا ہے۔ افضل جالندھری کا حسنِ انتخاب بھی قابل داد ہے۔ اگرچہ ترجمہ میں وہ اثر نہیں جو اثر جعفری کے ہاں پایا جاتا ہے شبلی صاحب کا ترجمہ اچھا ہے۔ اگرچہ نظم بلند پایہ نہیں۔ یہ نظم اُن نظموں میں سے لی گئی ہے جو ورڈس ورتھ اور کالرج کی مشترکہ کوششوں سے ("Lyrical Ballads") میں شائع ہوئیں اور ان نظموں کی سخت مذمت کی گئی تھی۔

اب وہ مضامین ہیں جن کے ساتھ مجھے گہری دلچسپی ہے۔ اور وہ مضمون فنِ افسانہ نگاری کے کسی نہ کسی حصہ پر روشنی ڈالتے ہیں۔ اس سلسلہ میں سید بادشاہ حسن۔ راحت موالی اور سید اختر احمد اختر قابلِ ذکر ہیں۔ اور ان میں مجھے سید بادشاہ حسن صاحب

پیش نظر آتے ہیں۔ آپ نے نہایت سادہ طریق سے اسلوب بیان کی خوبیوں پر روشنی ڈالی ہے۔ راحت مولائی کا مضمون اچھا ہے۔ لیکن وہ بعض اشخاص کی تعریف میں ضرورت سے زیادہ مبالغہ پر اتر آئے ہیں۔ اور بعض مقامات پر خلط مبحث کا بھی شک پڑتا ہے۔ جس کی وجہ سے مضمون غیر ضروری طور پر طویل ہو گیا ہے۔ سید اختر احمد صاحب نے اپنی علمیت اور حسن ذوق کا کافی ثبوت دیا ہے۔ اور "حقیقت اور مثالیت" پر اچھی بحث کی ہے یہیں تو ایسے موضوعات پر قلم اٹھانے والوں کو بھی قابلِ ستائش سمجھتا ہوں۔ کیونکہ اگر ایک شخص کوئی فضول سی بات لکھے گا تو ایک بہتر آدمی کی توجہ اس طرف منعطف ہو جائے گی۔ اور ادب میں کسی قابلِ قدر چیز کا اضافہ ہو گا۔ اس لحاظ سے اوّل الذکر ایک نیکی کا متحرک ہو گا۔ جو قابلِ ستائش بات ہے۔ مجموعی طور پر پرچہ نہایت کامیاب ہے اور ادیب صاحب کی کاوش و محنت بارور ہوتی ہے

شاعر آگرہ

ادب لطیف لاہور (افسانہ نمبر) پنجاب کے وقیع اور مشہور رسائل میں "ادب لطیف" کو ایک امتیازی درجہ حاصل ہے۔ گو اس کی عمر دوسرے مشہور جرائد سے کم ہے لیکن اس نے اپنے اعلیٰ معیار اور خاص نمبروں کی اشاعت سے اپنے صوبہ کے علاوہ دوسرے صوبوں میں بھی کافی قبولیت حاصل کر لی ہے۔ ادب لطیف کا ہر نیا نمبر پچھلے نمبر سے بلند ہوتا ہے خالص ادبی لٹریچر پیش کرنا اسکا مسلک ہے۔ ماہ جولائی میں معاصر موصوف کا افسانہ نمبر شائع ہوا ہے۔ جو اس سال کے دیگر افسانہ نمبروں سے ہر طرح ممتاز ہے۔ لکھائی چھپائی کی عمدگی کے ساتھ ساتھ اس مرتبہ افسانہ ایڈیشن میں بعض مضامین "فن افسانہ نویسی" پر بھی لکھوائے گئے ہیں۔ جو افسانوں سے زیادہ مفید ہیں۔ افسانہ ایڈیشن کے مضامین کی تعداد ۲۶ ہے۔ بعض افسانوں کو چھوڑ کر باقی تمام افسانے باعتبارِ ندرتِ تخیل و واقعات بہت خوب ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ انہیں پڑھا جائے مرزا ادیب بی۔ اے مدیر "ادب لطیف" کا مسلسل افسانہ بھرا

لو رو نا چوتھا خط بھی خوب ہے۔ یہ افسانہ تین گذشتہ افسانہ نمبروں سے چل رہا ہے۔ چار منظوم افسانے بھی زینتِ رسالہ ہیں۔ افسانہ ایڈیشن بہر صورت قابلِ مطالعہ ہے۔ چار دو رنگی اور سہ رنگی تصویریں بھی رسالہ میں دی گئی ہیں۔

رسالہ معارف اگست نمبر

ادب لطیف افسانہ نمبر۔ ادب لطیف اس سے چند مہینہ پیشتر اپنا سالنامہ نکال چکا ہے۔ اب اس نے افسانہ نمبر نکالا ہے کسی رسالہ کا تمام ادبی دلچسپیوں کو قائم رکھتے ہوئے متواتر خاص نمبر نکالنا بڑی ہمت کا کام ہے ادب لطیف کی یہ ہمت لائق ستائش ہے۔ کہ وہ ہر خاص نمبر میں اپنی روایات کو قائم رکھتا ہے۔ چنانچہ اس نمبر میں بھی اس نے ہر مذاق کے ستھرے اور پڑھنے کے لائق افسانے فراہم کئے ہیں۔ فن افسانہ نگاری پر متعدد مفید مضامین ہیں "صحرا نورد کے خطوط" جن کا سلسلہ عرصہ سے قائم ہے بخصوصیت کے ساتھ زیادہ دلچسپ ہیں۔

جناب نذیر میرزا برلاس بی۔ اے۔ (آنرز)

نظم

جوانی

مرے خیال میں کیفیتیں جھلکتی ہیں — مرے ارادوں سے رنگینیاں ٹپکتی ہیں
ہر اک حسین تمنا میں رنگ بھرتا ہوں — جسے میں حسن کی دیوی کی نذر کرتا ہوں
ہر ایک شے مجھے گرویدگی سکھاتی ہے — مری جوانی محبت میں بدلی جاتی ہے
مجھے فضا میں ترنم سنائی دیتا ہے — مجھے گلوں میں تبسم دکھائی دیتا ہے
ہوائیں جھوم کے نغمے سنا رہی ہیں مجھے — گلوں کی نکہتیں وحشت سکھا رہی ہیں مجھے
ترانے عشق کے سنتا ہوں آبشاروں سے — میں چھینتا ہوں حسیں پھول لالہ زاروں سے
فضاؤں میں نظر آتے ہیں کچھ حسیں جلوے — کہ جیسے خواب کی دنیا کے شرمگیں جلوے
تصورات میں پہروں خوشی مناتا ہوں — کسی کو ساتھ لئے بادلوں میں جاتا ہوں
یہ کون دور سے نغمے سنائے جاتا ہے — کوئی تو چاند میں بیٹھا مجھے بلاتا ہے
یہ چاہتا ہوں کہ مل جاؤں جا کے تاروں میں — جوانی اپنی گزر جائے ماہ پاروں میں

حسیں ارادے ہیں تسکین کامرانی ہے
جہان کیف و مسرت مری جوانی ہے

طاقت کا ایک عجیب و غریب لاثانی تحفہ

ایشور جیون کی

پریم بوٹی!

ادب لطیف کے لئے نادر تحفہ

ناظرین! میں ایک [illegible] بری صحبت کے باعث جوانی میں [illegible] خوفناک امراض میں مبتلا ہو گیا پہلے میں نے ایک دو سال شرم و حیا [illegible] سے [illegible] حال چھپائے رکھا مگر کچھ عرصہ بعد بیماری نے خوفناک صورت اختیار کر لی تب میری آنکھیں کھلیں اور میں نے علاج معالجہ شروع کیا۔ [illegible] اس سلسلے میں بڑے بڑے ڈاکٹروں، وئیدوں، حکیموں اور نامی گرامی دوا خانوں سے دوائیں [illegible] مرض بڑھتا گیا [illegible] یہاں تک آ پہنچی کہ میں اپنی زندگی سے بیزار ہو گیا اور خود کشی کے منصوبے باندھنے لگا۔ ہمارے گاؤں کے پاس ایک میل کے فاصلہ پر [illegible] ایک سادھو [illegible] اس کی شہرت [illegible] ایک فقیر [illegible] لوگ [illegible]

[illegible] لگے۔ رفتہ رفتہ ان کی شہرت سارے علاقہ میں پھیل گئی [illegible] اس قدر شہرت سن کر [illegible] متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا آخر چار و ناچار [illegible] ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ان کی نورانی صورت دیکھ کر [illegible] اپنی طاقت پر پچھتانے لگا مگر جونہی میں نے ان کے چہرے کے جمال کو دیکھا دل باغ باغ ہو گیا لیکن یہ حالت بہت دیر تک قائم نہ رہ سکی جب انہوں نے نظر اٹھا کر میری جانب دیکھا تو میں مارے شرم کے زمین میں گڑنے لگا مگر جہاتما جی میرے دلی جذبات بھانپ گئے۔ اور اس طرح گویا ہوئے کہ بیٹا! تم بہت کمزور اور دکھی معلوم ہوتے ہو طبیعت کیسی ہے۔ یہ الفاظ مجھ پر جادو کی طرح اثر کر گئے۔ یہ سنتے ہی میں بے ساختہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ انہوں نے نہایت شفقت سے دلاسا دیا۔ اور کہا کہ بیٹا! فقیر تمہارے لئے جو کچھ کر سکتا ہے۔ اس سے دریغ نہ کرے گا۔ اس پر میں نے بیماری کا حال بلا تامل کہہ سنایا۔ چنانچہ انہوں نے مجھے تسلی دیتے ہوئے نہایت شفقت سے ایک نسخہ تجویز کر کے دیا جو میں نے بنا کر استعمال کیا۔ اور اب میں بالکل تندرست و توانا ہوں۔

نسخہ [illegible] ۔ اصلی سورج تاپی سلاجیت [illegible] ۔ اصلی [illegible] ۔ اصلی سورج چھاپ کیسر [illegible] ۔ اصلی زعفران [illegible] ۔ اصلی نیپالی کستوری [illegible] سب ادویات کو کوٹ چھان کر کھرل میں ڈال کر [illegible] ۔ [illegible] بیرونی [illegible] ۔ [illegible] صندل آئیل [illegible] کھرل میں ۱۲ گھنٹہ کھرل کر کے [illegible] کے برابر گولیاں بنا کر سایہ میں سکھائیں۔ بس دوائی تیار ہے۔

ترکیب استعمال ایک گولی صبح ایک گولی شام پاؤ بھر دودھ میں شکر یا مصری ڈال کر کھائیں۔ اس دوا کے استعمال سے میں ۲۰ روز میں بالکل تندرست ہو گیا یہاں تک کہ ایک مدت گزر گئی ہے۔ پھر کوئی شکایت نہیں ہوئی۔ اور اس قادر مطلق خداوند کی مہربانی سے اب میرے [illegible] بچے ہیں جو بالکل تندرست و توانا ہیں اس وقت سے میں یہی نسخہ بنا کر دور و نزدیک کے لوگوں کو دام [illegible] کے دام پر دے رہا ہوں۔ جس سے سینکڑوں نا امیدوں کی امیدیں بر آئیں۔ اور کئی نا امید فیضیاب ہوئے۔ [illegible] ان لوگوں نے جن کو اس دوا سے امید سے زیادہ فائدہ ہوا میری آج اس خواہش کی طرف [illegible] کرائی جو اس کامل بزرگ مہاتما نے نسخہ دیتے ہوئے میرے ذمے کیا تھا کہ اگر میں تندرست ہو گیا۔ تو فائدہ عام کے لئے اس کو اخبارات میں مشتہر کر دوں گا تاکہ ہر ایک آدمی اس سے فیضیاب ہو سکے۔ اس لئے میں اعلان کرتا ہوں کہ تمام لوگ اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔ نسخہ اوپر درج کیا گیا ہے۔ ناظرین بنا کر فائدہ اٹھائیں [illegible] امنی کے [illegible] کثیرہ قسم کے جریان۔ احتلام۔ پیشاب کے ہمراہ چونے کی طرح رطوبت کا خارج ہونا۔ پاخانہ کے وقت رطوبت کا گرنا [illegible] میں رطوبت کا [illegible] ۔ سرعت [illegible] ۔ کمزوری۔ ذیابیطس۔ جوانی میں بڑھاپے کی سی حالت۔ اصلی طاقت کی کمی معلوم ہونا۔ سوچنے کی طاقت کا کم ہونا وغیرہ نامردی کو دور کر کے انتہائی طاقت پیدا کرتی ہے۔ اور رگ رگ میں جوانی کا مزہ بجلی کی طرح پیدا کرتی ہے۔ اس نسخہ کو بھائی بنانا چاہیں۔ نسخہ اوپر درج ہے۔ بنا کر فائدہ اٹھائیں۔ مگر جن کو کچھ وقت معلوم ہو۔ یا [illegible] یا اصلی ادویات نہ ملنے کے باعث دقت محسوس کرتے ہوں۔ اور اس کے حیرت انگیز معجزے دیکھنا چاہیں تو ہم سے بنی بنائی منگا کر اس کے معجزے دیکھیں۔ اور ہماری محنت کی داد دیں۔

قیمت چالیس گولی دو روپے علاوہ محصول ڈاک اور اسی گولی کی قیمت چار روپے محصول ڈاک معاف

پتہ۔ بابو شام لال رئیس پریم بوٹی آفس نمبر ۳۴۴۔ بازار کنجوسی ضلع اٹاوہ (یو۔ پی)

اگر آپ اپنے خواب کی سچی اور صحیح تعبیر معلوم کرنا چاہتے ہیں تو

مجموعہ خواب نامہ یوسفی

خواب کی تمام مشہور عربی فارسی اردو کی بیسیوں بڑی نایاب کتابوں کے بعد تالیف کیا گیا ہے۔ مثلاً کرہ علاوہ ازیں موجودہ زمانہ کی ایجادات مثلاً تار ڈاک ہوائی جہاز پوسٹ کارڈ گراموفون بائیسکوپ تھیٹر۔ اسٹیشن موٹر کار بائیسکل وغیرہ وغیرہ جیسی اشیاء کہ جنکے خواب میں دیکھنے کی تعبیر پرانی کتابوں میں نہیں ملتی اس میں انکی تعبیریں درج ہیں غرضیکہ یہ خواب کی کتاب تمام خواب اور تعبیر کی کتابوں سے اعلیٰ اور عمدہ ہے کتاب کے آخر میں خواب دیکھنے کا علم جسے سامرک کہتے ہیں درج ہے۔ اس کے علاوہ قیافہ شناسی کے متعلق ایک ایسا نایاب و بے مثال مضمون درج ہے۔ کہ جو آپنے آج تک نہ دیکھا نہ سنا ہوگا۔ باوجود اسقدر خوبیوں اور صفحات کے قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے مجلد سنہری صرف دو روپے علاوہ محصول ڈاک۔ فہرست مضامین کتاب ہذا مندرجہ ذیل ہے۔

خواب کی حقیقت و ماہیت
علمائے یونان کا خیال
خواب کے متعلق اسلام کا نقطۂ نظر
تعبیر خواب کا علم
خواب پریشان
خواب کی باطنی قوتیں
حس مشترک
قوت خیال و ہمہ حافظہ متصرفہ
بیماری کی حالت میں خواب
کثرت اخلاط کے سبب خواب
جاگتے میں خواب

رویائے صادقہ یا سچے خواب
نفس ناطقہ یا روح
چند اہم سچے خواب
حدیث شریف اور خواب
حکمائے اشراقی کا خیال
صوفیہ کرام کی رائے
دوسرے علماء اسلام کا عقیدہ
شیخ ابن سینا ؒ
علامہ ناصر الدین ؒ
حضرت شاہ ولی اللہ ؒ
علامہ ابن خلدون ؒ

متکلمین کی رائے
سر سید مرحوم کی رائے
تعبیر خواب کے عالم
معبر کے لئے ہدایات
صاحب خواب کے لئے ہدایات
مرتبہ کے لحاظ سے خواب کا فرق
خواب پر وقت کا اثر
" " تعبیروں " "
روزانہ ساعتوں کا نقشہ
خواب کی نیرنگیاں
دوسرے کو حسب منشا خواب دکھانا

خود اپنی حسب منشا خواب دیکھنا
خواب میں کام کرنا
غیر واضح خواب اور اسکی تعبیر
خواب میں خدا کی زیارت
" " فرشتوں کی زیارت
" " پیغمبروں " "
خوابوں کی تعبیر ترتیب حروف تہجی
ا سے ی تک
علم قیافہ یعنی ریکھا
لائنیں ریکھا۔ ریکھا شاستر
خال یعنی تل کا قیافہ
اعضاء کے پھڑکنے کا قیافہ

پاس انفاس
کامیابی کے دن
" " مہینے
کسی چیز کا گم ہو جانا
چور پہچاننے کا طریقہ
مقدمہ کی ہار جیت معلوم کرنا
اچھا اور برا شگون
سمت کے لحاظ سے سفر کے
مبارک دن۔
سفر کیلئے منحوس دن
سفر کا شگون

نیک آغاز
پیدائش پر بچوں کے
اثرات و نتائج
پیدائش پر دن کے اثرات
" بچے پر کے اثرات
بچے کا نام رکھنا
دیوان حافظ سے فال نکالنا
رموز حکمت یعنی علم
قیافہ وغیرہ وغیرہ۔

اگر آپکو منشی فاضل سنہ ۱۹۲۹ء کے کورس کی سیکنڈ ہینڈ کتابیں مطلوب ہیں تو آج ہی فرمائش بھیج دیجئے ورنہ پندرہ یوم کے بعد مندرجہ ذیل کتابیں اس قیمت پر دستیاب نہ ہونگی۔

نام کتاب	[illegible]	[illegible]
جواہر [illegible] بی اے کورس [illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]
شعر العجم حصہ چہارم	[illegible]	[illegible]
" " پنجم	[illegible]	[illegible]
چہار مقالہ	[illegible]	[illegible]
ابوالفضل دفتر اول و دوم	[illegible]	[illegible]
حاجی بابا اصفہانی	[illegible]	[illegible]
سیاحت نامہ ابراہیم حصہ دوم	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]
انتخاب قصائد قاآنی	[illegible]	[illegible]
غزلیات نظیری تا ردیف ی	[illegible]	[illegible]
رباعیات ابو سعید ابوالخیر	[illegible]	[illegible]
رباعیات بابا طاہر	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]

نام کتاب	[illegible]	[illegible]
تاریخ وصاف	[illegible]	[illegible]
سیر المتاخرین	[illegible]	[illegible]
جہانگیر نامہ مع سوالات	[illegible]	[illegible]
دولت ادبی تاریخی	[illegible]	[illegible]
اخلاق جلالی بحث	[illegible]	[illegible]
نثر خارج	[illegible]	[illegible]
کشف المحجوب تا	[illegible]	[illegible]
تذکرہ [illegible]	[illegible]	[illegible]
رموز حکمت	[illegible]	[illegible]
دیوان نظیری پہلا ۱۰۱ صفحے تک	[illegible]	[illegible]
منطق الطیر	[illegible]	[illegible]
ترجمہ اردو سے فارسی	[illegible]	[illegible]
ا۔ جواب مضمون بزبان فارسی۔	[illegible]	[illegible]

نام کتاب	[illegible]	[illegible]
کتب امدادی		
ترجمہ [illegible] حصہ نثر	[illegible]	[illegible]
خلاصہ دبیر عجم	[illegible]	[illegible]
" شعر العجم حصہ چہارم	[illegible]	[illegible]
" " پنجم	[illegible]	[illegible]
کشف المحجوب	[illegible]	[illegible]
ترجمہ ابوالفضل دفتر اول دوم	[illegible]	[illegible]
فرہنگ حاجی بابا	[illegible]	[illegible]
ترجمہ انتخاب قاآنی	[illegible]	[illegible]
ترجمہ رباعیات ابو سعید ابوالخیر	[illegible]	[illegible]
شرح غزلیات نظیری تا ردیف ی	[illegible]	[illegible]
خلاصہ اخلاق جلالی	[illegible]	[illegible]

نام کتاب	[illegible]	[illegible]
ترجمہ تاریخ تاریخ وصاف	[illegible]	[illegible]
" سیر المتاخرین	[illegible]	[illegible]
خلاصہ رموز حکمت	[illegible]	[illegible]
اردو ترجمہ اخلاق جلالی	[illegible]	[illegible]
تحصیل فارسی	[illegible]	[illegible]
مضامین فارسی	[illegible]	[illegible]
ترجمہ منطق الطیر	[illegible]	[illegible]
امتحانی سوالات [illegible]	[illegible]	[illegible]
ترجمہ سیاحت نامہ	[illegible]	[illegible]
حل پرچہ منشی فاضل [illegible]	[illegible]	[illegible]
چارٹ اخلاق جلالی	[illegible]	[illegible]
ترجمہ چہار مقالہ	[illegible]	[illegible]
خلاصہ تاریخ وصاف	[illegible]	[illegible]

مکمل فائدہ ہونے کے بعد قیمت دیجئے

[illegible]

[illegible]عطا یا جیسے عشق فریبی علاج کا وقت نقصان پہنچ رہا ہے۔ لہذا پبلک کے اعتماد اور فن طب کے وقار کو واپس لانے کے لئے [illegible]
[illegible]ملاؤں کو اب قطعی اس میدان میں آنا چاہئے۔ گزشتہ دنوں ہم نے چند مجرب اور بے ضرر ادویات کا اشتہار شائع کیا تھا کہ قیمت بعد حصول صحت
[illegible]جانچ۔ تجربہ کامیاب ثابت ہوا اور بیسیوں زخم خوردہ غریب مریضوں نے بعد صحت خوشی و شکریہ کے ساتھ قیمتیں ادا کر دیں۔ اب سلسلہ کو
[illegible]سلسلہ مندرجہ ذیل ادویات پیش کی جاتی ہیں جو نصف صدی سے ہندوستانی رؤسا اور شوقین مزاجوں میں حیرت انگیز و غیر معمولی مقبولیت حاصل کر
چکی ہیں

معجون خاص

واجد علی شاہی مشہور نسخہ ہے کہ کسی ملازم نے بادشاہ کے پان کا فضلہ کھا لیا تھا تو وہ قوت باہ کی زیادتی کی وجہ سے بے چین ہو گیا تھا۔ جو کچھ ہوا ہو اس میں شبہ [illegible] عجیب و غریب چیز ہے۔ حکیم اجمل خاں کے جد امجد حکیم محمد شریف خاں نے لکھا ہے کہ اس معجون خاص میں اس قدر سختی اور قوت آ جاتی ہے کہ ہر وقت ... رہنے سے شرم محسوس ہوتی ہے۔ یہی نسخہ ہے جس سے ساٹھ برس کے بوڑھوں میں جوانی کا شعلہ چمک اٹھتا ہے۔ غیر شادی شدہ بالضرورت محض شوقیہ طلب فرمائیں۔ جریان، سرعت، ضعف دل و دماغ، قوت حافظہ اور بے پناہ امساک کے لئے جادو کا اثر رکھتا ہے۔ قیمت سے

فولاد

شنجرف، سنکھیا وغیرہ کو پانی کی طرح بہا کر ... طلا تیار کیا جاتا ہے۔ معجون خاص کی ضرورت نہیں رہتی۔ کمزوری [illegible] مردی یا عقیا [illegible] پہیا [illegible] جاتی ہیں۔ چند روز کے بعد ... [illegible] ہے۔ پھر عمر بھر کسی طلاء کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ [illegible] ... آدمی استعمال کر سکتا ہے۔ اس کے سامنے کسی طلاء کی [illegible] ... ہے۔ طبابت پیشہ اصحاب کی رائے ہے کہ معجون خاص کے ... اس سے بہتر زود اثر و دیرپا کوئی طلاء آج تک ... ہوا۔

[illegible] پانچ روپے پانچ آنے (۵؍۵؍)

[illegible]ں کی آبادی بے مزہ غمگین زندگیوں میں صحت اور قوت شباب انگیز ولولوں کے لئے یہ مکمل بکس مخصوص ہے۔ قیمت مکمل بکس ۱۰؎ محصول ڈاک صرف اشتہارات [illegible]
[illegible] ذی مقدرت اصحاب پوری قیمت میں منگوائیں۔ متوسط الحال اشخاص ۵؎ نصف پہلے نصف بعد صحت۔ جو لوگ نصف قیمت [illegible]
[illegible]ادا کرنے سے مجبور ہوں وہ مکمل بکس مندرجہ ذیل حلف نامہ کے ساتھ بلا قیمت پیشگی طلب فرمائیں۔ یہ بات کہ آپ کل قیمت یا نصف قیمت ادا کر سکتے
[illegible] آپ ہی پر چھوڑتا ہوں۔

حلف نامہ

[illegible] خدا کو حاضر ناظر جان کر حلفیہ اقرار کرتا ہوں کہ مکمل فائدہ ہونے کے بعد قیمت مکمل بکس مبلغ ۱۰؎ یکمشت یا دو دو روپیہ کر کے پانچ ماہ [illegible] ادا کر دوں گا۔ اس کی قیمت رکھ لینا مطلقاً حرام ہے۔ نیز میں اقرار کرتا ہوں کہ دوا کا فعل مجھے کتنا ہی بے چین کرے مگر دوران استعمال [illegible] جماع سے پرہیز رکھوں گا۔ بعد صحت یابی اعتدال اور جائز طریقہ پر قائم رہوں گا اور فوراً پہلی قسط مبلغ دو روپے بذریعہ منی آرڈر روانہ کر دوں گا۔ خدا میری مدد کرے۔

[illegible] دفتر ہم ملازمین کا زائد صرفہ ہم اشتہارات و پیکنگ و ڈبے شیشیاں وغیرہ بھی ہم برداشت کریں یہ انصاف سے بعید اور ہمارے لئے [illegible] ممکن ہے۔ کیونکہ بغیر اس کے موجودہ سلسلہ قائم نہیں رہ سکتا۔ لہذا حلف نامہ آنے پر ایک روپیہ دس آنے کا وی پی پارسل روانہ ہوگا۔ غیر ملک [illegible] کو ... پیشگی آنا چاہئے۔ خط و کتابت پوشیدہ رہے گی۔ پارسل پہنچنے پر کوئی یہ نہیں معلوم کر سکتا کہ اس میں کیا ہے۔ اگر خدانخواستہ ایک [illegible] مکمل فائدہ نہ ہو تو ہم دوبارہ سہ بارہ ادویات مفت روانہ کریں گے۔ ہر شخص اس سے اطمینان رکھے کہ یہاں کوئی دھوکہ نہیں ہے۔ [illegible] [illegible] متعلق ہدایات نسخہ جات۔ اقوال علماء، فہرست دوا پارسل کے ہمراہ ہوگی۔ اپنا اور اپنا پتہ صاف اور خوشخط لکھئے۔

[illegible] کا پتہ: مہتمم دواخانہ مہرونڈہ۔ ڈاک خانہ مہرونڈہ۔ الہ آباد۔ لو۔ پی۔



علمی ادبی و تنقیدی
ماہنامہ
مقام اشاعت مکتبہ اردو

سالانہ چندہ دو روپے اگر پسند نہ آئے تو قیمت واپس فی پرچہ ۳ آنے	ماہوار معیاری مجلہ # خضر راہ لاہور	چیف ایڈیٹر حکیم محمد یوسف حسن آف نیرنگ خیال لاہور ایڈیٹر کامریڈ محبوب احسن

ہندوستان بھر میں اپنی وضع کا نرالا میگزین

آرٹ اور جمالیاتی حسن کو اس کے اصلی خط و خال میں نمایاں کرنیوالا - انسانی زندگی اور اس کی کمزوریوں کو اس طرح سے بے نقاب کرنیوالا جس سے انسان سبق حاصل کر سکیں -

جدید علوم و فنون پر پر از معلومات مضامین کی نشر و اشاعت کا حامی

(۱) تحریک عریانی (۲) سیکشول سائنس (۳) فلسفہ گناہ —

سچی آپ بیتیاں

حسن و جمال کی حفاظت اور جسم کی نشو و نما پر قیمتی مضامین

دلچسپ افسانے سبق آموز ڈرامے۔ گنہگار انسانوں کے اقرار نامے۔

سو صفحات

اپنے اپنے بک سٹالوں سے خریدیئے۔ یا براہ راست دفتر سے طلب فرمایئے

ملنے کا پتہ: مینیجر رسالہ خضر راہ بارود خانہ اسٹریٹ لاہور

دنیا کی حور اور دیگر افسانے

یوں اور بیٹیوں کے ساتھ اس سے اچھا سلوک کوئی اور نہیں ہو سکتا کہ ان کے دلوں کو ساس اور نندوں کی زبانوں سے نکلے
ـنے ان تیروں سے گھائل نہ ہونے دیا جائے جو بے سلیقہ، کم شعور اور بے تمیز یا فضول خرچ عورتوں پر ہر وقت برستے
تے ہیں اور زندگی ان کے لئے اجیرن ہو جاتی ہے۔ اس کی اچھی صورت یہ ہے کہ لڑکیوں کی تربیت میں آئی
ندہ زندگی کے متعلق ہر قسم کے نشیب و فراز کو ملحوظ رکھا جائے اور یہ نہ سمجھا جائے کہ ایک امیر باپ کی بیٹی کا شوہر
ی لازمی طور پر امیر ہی ہوگا اور امیر بھی لازمی طور پر امیر ہی ہوگا۔ اور امیر بھی ہوگا تو دولت و ثروت
ہمیشہ اسکا ساتھ دے گی۔ کتابیں بچوں اور بچیوں کا اخلاق سدھارنے میں بہت مفید ہوئی ہیں۔ دنیا کی حور خاص
ر پر لڑکیوں اور عورتوں کے لئے لکھی گئی ہے۔ اسکا پلاٹ بالکل ہماری معاشرت اور تمدن کے مطابق ہے۔ طبیعت خود بخود
اثر کا اثر قبول کرتی ہے۔ اور مصنف غیر محسوس طور پر پڑھنے والے کے دل و دماغ پر پائدار اور حسین نقوش بناتا چلا جاتا
ہے۔ دوسرے افسانے بھی انہیں خصوصیات کے حامل ہیں بچیوں کے نصاب تعلیم میں اسکا شامل رہنا نہایت ضروری ہے
ب میں کوئی لفظ بھی ایسا نہیں جو شریف بہو بیٹیوں اور حیادار بچیوں کی آنکھوں یا کانوں پر بار ہو سکے۔ زبان کی سلاست
ادگی اور مضامین کی اثر آفرینی کے لئے۔۔۔۔ کوثر چاند پوری کے نام مضبوط ضمانت ہے۔ ملک کے مشہور جرائد اور اہل الرائے
حضرات نے اس کی بڑی تعریفیں کی ہیں۔ آج ہی فرمائش بھیج دیجئے۔ قیمت ۱۲ر

عورتوں کے افسانے

ہندوستان کی بے زبان عورتوں کے دکھ درد کو سمجھنے اور انکے دکھے ہوئے دلوں کی آوازیں سننے کے لئے اس کتاب کے
مطالعہ از بس ضروری ہے، یہ کوثر چاند پوری کے چند موثر، دلچسپ، مفید اور سبق آموز افسانوں کا مجموعہ ہے' ہر افسانہ بجائے
خود ایک طویل داستان ہے ان مظالم و مصائب کی جو سنگ دل سماج کے ہاتھوں آئے دن عورتوں پر ہوا کرتے ہیں۔
ہر شخص کو عام اس سے کہ ہندو ہو یا مسلمان یہ کتاب ضرور دیکھنی چاہئے۔ اور اپنے گھر کی عورتوں کو بھی دکھانا چاہئے
جس گھر میں یہ کتاب نہ پہنچے گی وہاں اندھیرا ہی رہیگا۔ سورج کی کرنیں صبح ہوتے ہی پھوٹتی ہیں۔ اور اگر اونچی دیواریں انہیں روک کے
گھروں کو روشنی کا تصور نہیں گھروں میں جالا کرہے تو آج ہی یہ شمع ہدایت منگا لیجئے جس کی روشنی کبھی کم نہیں ہوگی۔ قیمت ؁ ۱ر

بچوں کی دلچسپ سبق آموز کتابیں

سادہ بانی قیمت ۴ر	شیطان کا چرخہ اور دوسری کہانیاں ۴ر	موصل کا بیوڑی ۳ر	کولمبس ھر
چار سہیلیاں قیمت عہ	محنت کا پھل ۴ر	چڑیا گھر ۴ر	چند پند ھر
[illegible] قیمت [illegible]	حقائق اسلام ۴ر	شیر غرناطہ ۳ر	دو رنگی تحفہ عہ
دامن مریم ۸ر	ملک نم نم ۴ر	عزیز مسلمان ۳ر	اخلاقی نظمیں ۴ر
غزال ۱۰ر	حکایات ہشت بہشت ۶ر	سرفروش مسلم ۳ر	شعور ۶ر
کربلا شہزادہ ۳ر	طالب علم کی زندگی ۱۲ر	مرزا پھوئیا ۲ر	عیش دوست ۱۰ر
ہجرت ھر	نسیم پیپی ۲ر	چھوٹا لڑکا ار	ولیم ٹیل ھر
…عرب ۴ر	سنہری گیت ۴ر	بہادر لڑکا ار	نپولین بونا پارٹ ۶ر
…یات عرب ھر	… پرواز ۵ر	سچا لڑکا ار	اچھے گیت ۴ر
…تقام	…شیر ۴ر	مشعل صداقت ار	فن تیغ زنی ۱۰ر
…گھوٹ	[illegible] ۴ر	محمدی توا ۴ر	علمی کہانیاں عہ
…ہلیت	[illegible] ۴ر	سوتیلا بھائی ۳ر	منتخب الحکایات ھر
…نت	…ت ۴ر	دکن کی پری ۴ر	اصغر کی دیانتداری ۴ر
…ین کا گڑیا	[illegible] ۴ر	چہیتا بھائی ھر	فضلا کے کھیل ۴ر
…نا دف	…شہزادہ ۴ر	تب تم اچھی بچی ہو ۴ر	آخری سبق [illegible]

ملنے کا پتہ … اردو ہاؤس سرکلر روڈ لاہور

منظور کردہ ڈائرکٹر صاحب بہادر سررشتۂ تعلیم پنجاب لاہور لیٹر نمبر ۱۱۳۳۱ سی، مورخہ ۱۰ فروری ۱۹۳۶ء۔
منظور کردہ محکمۂ تعلیم حیدرآباد دکن ۲۴۲۰ سنہ ۴۴ف مثل نمبر (۱۸/۱۱۳) ۴۴ف

مکتبۂ اردو لاہور کا
کثیر الاشاعت و ارزاں ترین ماہنامہ

رسالہ ادبِ لطیف لاہور

ماہِ اکتوبر سنہ ۱۹۳۷ء

ادارۂ تحریر
چودھری برکت علی بی۔اے
میرزا ادیب بی۔اے

مقامِ اشاعت
مکتبۂ اردو لاہور
(محمد شریف عباسی کاتب لاہور)

سالانہ چندہ معہ ضخیم سالنامہ وافسانہ نمبر سے

ممالک غیر سے آٹھ شلنگ

فہرس

جلد ۶ بابت ماہ اکتوبر سنہ ۱۹۳۷ء نمبر ۲

اداریہ

نذرِ اولین

سالنامہ ۱۹۳۳ء:-

"ادب لطیف" کا سالنامہ ۳۳ء جملہ صوری و معنوی خصوصیات کے ساتھ نومبر کے اختتام پر شائع ہو رہا ہے۔ ہمارے گذشتہ سالنامے نے ملک کے ادبی حلقوں میں کافی وقعت حاصل کی تھی۔ اور بعض نقادوں کی رائے میں تو اسے پچھلے سال کا بہترین سالنامہ قرار دیا گیا تھا۔ ممکن ہے اسمیں کسی قدر مبالغہ کو دخل ہو مگر یہ پورے یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ سالنامہ ۱۹۳۳ء اپنی بے شمار صوری و معنوی خوبیوں کے باعث نہ صرف ۳۳ء کا بہترین و ممتاز ترین سالنامہ ہوگا۔ بلکہ ہر پہلو سے اس قدر کامیاب "اس درجہ شاندار ہوگا۔ کہ لوگ اردو رسالوں کے تمام مقتدر و ضخیم سالنامے بھول جائیں گے۔ ادارہ "ادب لطیف" پوری سرگرمی کے ساتھ ادبی و لآویزیوں کی فراہمی "نہایت کامیاب مضامین نظم و نثر کے حصول" اور سالنامے کو شاندار سے شاندار دلآویز سے دلآویز صورت میں پیش کرنے کی تجاویز میں منہمک ہے! گذشتہ سالنامے میں، باوجود اتنی خوبیوں کے دو نقائص رہ گئے تھے۔ ایک تو ٹائیٹل پیج (سرورق) اس قدر حسین و جمیل نہیں تھا کہ دوسرے تمام سالناموں کے مقابلے میں ممتاز ہو۔ اور دوسرا نقص تھا کہ تصاویر (جن میں کوئی شک نہیں کہ بہت زیادہ تھیں) مگر بہت زیادہ دلآویز نہیں تھیں۔ یہ نقائص بھی نہیں ہونگے! سرورق بہت حسین ہوگا۔ اور تصاویر کے انتخاب کے معاملے میں توجہ خاص احتیاط سے کام لے رہے ہیں۔ تصاویر کم ہونگی مگر ہر تصویر دوسرے سالناموں کی متعدد تصاویر سے بدرجہا بہتر۔ ہمارے سالناموں کا معنوی پہلو بہت بلند رہا ہے اب کے اس قدر بلند ہوگا کہ آپ اسے حقیقی سالنامے کا معیار قرار دے سکیں!

آئندہ نمبر میں چند مضامین اور تصاویر کا اعلان ملاحظہ فرمائیں۔

مضمون نگار حضرات:-

ہمارے مضمون نگار حضرات عموماً تساہل کیشی سے کام لینے کے عادی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ باوجود انتہائی کوشش کے گذشتہ سالنامہ پورے وقت پر شائع نہ ہوسکا۔ امید ہے محترم مضمون نگار حضرات کرمفرمائیوں میں عجلت سے کام لیں گے!

مضامین بہرصورت ۲۰ اکتوبر سے پیشتر پہنچ جانے چاہئیں۔ یہ بھی نہ ہو کہ ہر محترم مضمون نگار ۲۰ اکتوبر ہی کا انتظار کرنے لگے۔ کیونکہ اس صورت میں مضامین کی ترتیب و تہذیب میں ہمیں متعدد مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔

مکتبۂ اردو کی سرگرمیاں :-

مولانا کوثر چاندپوری کی دونوں کتابیں عورتوں کے افسانے اور دنیا کی حور اور دیگر افسانے۔ ہفتہ عشرہ تک مارکیٹ میں آجائیں گی۔

خواہشمند حضرات فوراً آرڈر بھیجیں۔

چاند کا گناہ اور دیگر افسانے بھی

پریس میں ہیں اور وہ بھی دس بارہ روز تک شائع ہو جائیں گے۔

ہمیں افسوس ہے کہ اس دفعہ آغا حشر کے متعلق کچھ نہ لکھا جا سکا اس کی وجہ قلت گنجائش کے سوا اور کچھ نہیں۔ آئندہ نمبر میں کچھ لکھا جائیگا۔

سالنامہ ۱۹۳۸ء

ادب لطیف کا سالنامہ ۱۹۳۶ء کو آپ نے بہت پسند کیا اور اسے ۱۹۳۶ء کے بہترین سالناموں میں جگہ دی

سالنامہ ۱۹۳۷ء کو آپ نے بے حد پسند کیا اور اسے گذشتہ سال کا بہترین سالنامہ قرار دیا

اور اب

سالنامہ ۱۹۳۸ء شائع ہو رہا ہے

جسے آپ

اس کی بے شمار صوری و معنوی خصوصیات کی بنا پر نہ صرف ۱۹۳۸ء کا بہترین سالنامہ قرار دیں گے۔ بلکہ اردو کے تمام گذشتہ سالناموں سے بھی ممتاز! چند مضامین کا اعلان نومبر میں ملاحظہ فرمائیں یہ سالنامہ مستقل خریداروں کو مفت ملیگا۔ (مینجر)

جناب سیّد اختر احمد اورینوی ایم۔ اے

(سلسلہ کے لئے ستمبر کا پرچہ ملاحظہ فرمائیں)

شہنشاہ حبشہ

ایکٹ نمبر ۲

منظرِ اوّل

(عبہ زادیس ابابا کے محل کا پائیں باغ۔ یوکلپٹس کے نازک لانبے درخت کملائی ہوئی چاندنی میں خاموش کھڑے ہیں۔ دسمبر کے پھیکے آسمان پر ابر پارے آوارہ پھر رہے ہیں۔ ایک سرو کے درخت کے سائے میں گلاب کی جھاڑی کے مقابل سنگِ مرمر کا بنچ بچھا ہوا ہے۔ شہزادی فلورا اس پر ایک حسرت ناک سوگوارانہ وارفتگی کے عالم میں بیٹھی ہوئی ہے)

فلورا۔ (تنہا) وہ نہیں آئیگا! آہ! میرا دل! ....

شاسماچ! شاسماچ! (ایک غیر ارادی سرگوشی میں)

کاش میں یوکلپٹس اور گلاب کی خوشبو بنکر خود اس تک پہنچ سکتی! یا ہوا کا ایک سرد جھونکا بنکر اُسے خوابِ ناز سے جگا سکتی! نہیں میرے محبوب تجھے میں اتنی سی تکلیف بھی نہیں پہنچاؤں گی.... ! میں سردیوں میں ٹھہرنا پسند کروں گی۔ مگر تیری پیاری نیند کو ہوا سے بھی نہیں اچٹاؤں گی...... آہ! اسے تک تو آئے بیدار ہو جانا چاہئے تھا۔ صبح سویرے سے اس کے رستے کا پہرا ہے...... آہ! وہ نہیں آئیگا!

ڈیڈ شاسماچ محمد (سرو کے عقب سے نمودار ہوتے ہوئے)

میری قابلِ صد احترام شہزادی! آپ کا غلام حاضر ہے!

فلورا۔ (چونک کر مگر تبسم) آئیں! آگئے شاسماچ! تم نے تو مجھے بہت انتظار کی راہ دکھلائی۔ کاش تم بھی جانتے کہ خلشِ انتظار کس کیفیت مضطرب کا نام ہے!

شاسماچ۔ میری محبوب شہزادی! مجھے معاف کر دیں اگر میں نے آپ کے دلِ نازک کو صدمہ پہنچایا! لیکن میں نے تو سویرے آنے کی کوشش کی!

فلورا۔ (ایک پیارے طنز کے ساتھ) ہاں بہت سویرے آئے! میری ہی غلطی تھی۔ ایک گھنٹے سے تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔ اب تو تم قائل ہوئے نہ کہ محبت میں عورت مرد سے بہت آگے ہے؟ بیٹھ جاؤ شاسماچ!

شاسماچ۔ (بیٹھتے ہوئے) مرد تو عورت سے ہمیشہ قائل ہو ہی جاتا ہے! رات شہنشاہ سے بہت دیر تک مسائلِ جنگ کے متعلق باتیں ہوتی رہیں۔ آدھی رات گئے سویا تھا۔

فلورا۔ تم ہر بناؤ یار، شاسماچ آخر کیا فیصلہ ہوا؟

شاساماچ - شہنشاہِ معظم کا ارادہ ہے کہ حبرا کے علاقہ میں ایک لشکرِ جرار کی ترتیب و تنظیم کے لیے مجھے مامور کیا جائے

فلورا - پیارے شاساماچ تم بھی محاذِ جنگ کی طرف چلے!

شاساماچ - ہاں میری پیاری شہزادی! مجھے بھی ملک کی خدمت کا ایک زریں موقعہ ملا ہے۔ خدا نے چاہا تو ہم وردہ صفت اطالویوں کو ملک سے باہر نکال دینگے!

فلورا - شاساماچ پیارے! نہ معلوم کیوں میرا دل بہت گھبرا رہا ہے۔ ایک مبہم سی تمنا کی میری روح پر ہر وقت طاری رہتی ہے۔ کیا ہوگا شاساماچ؟ آہ کاش۔ یہ ملعون جنگ نہ چھڑتی!

شاساماچ - (مضطرب ہو کر) نہیں میری پیاری شہزادی ہراساں ہونے کی کوئی بات نہیں۔ جنگ کا رُخ پھر چکا ہے۔ اب اطالویوں کے قدم اکھڑنے لگے ہیں۔ ہماری فوجیں دشمن کو پیچھے دھکیل رہی ہیں خود مسولینی اپنی فوج کی ناکامی سے متاثر ہو کر جرنیل کی تبدیلی پر مجبور ہو گیا۔

فلورا - آہ شاساماچ! میں دل کو لاکھ سمجھاتی ہوں مگر اس کی دھڑکنیں نہیں رکتیں! کچھ ہونے والا ہے شاساماچ! مجھے رات کو بہت ڈراؤنے خواب آتے ہیں! میرے اللہ!

شاساماچ - آپکو تو وہم ہو گیا ہے! ناحق کڑھتی ہیں!

فلورا - محبت میں انسان کا دل بہت رقیق ہو جاتا ہے آرزو اور تکمیلِ آرزو کے درمیان کی گھڑیاں "آہ نہ پوچھو! شاساماچ! دل ڈوبا جاتا ہے۔

شاساماچ - پیاری شہزادی! میں محبت میں دل کو بہت جری پاتا ہوں۔ محبت فرض کو مقدس بنا دیتی ہے۔ محبت شعار عورت کی وفا پاش نظریں طبلِ جنگ اور نغمہائے رجز سے زیادہ جرأت آفریں ہیں۔ شہزادی! میں آپ کے لئے دشمن سے لڑوں گا زیادہ مستقل عزم و ارادہ سے زیادہ قوی بازو کر اور زیادہ سے زیادہ جوش و ولولہ کے ساتھ!

فلورا - (مسرور و محجوب ہو کر) تم بہت بلند اخلاق سپاہی ہو! آہ! مگر عورت کا دل! کاش اپنے دل کے راز سے عورت خود واقف ہوتی! عورت کی محبت ایک رازِ جاوداں ہے۔ محبت عورت اور مرد کو یکساں طور پر بہادر بنا دیتی ہے مگر جب محبت کے نور سے عورت کا دل منور ہوتا ہے۔ تو اس کی نگاہوں میں قدرِ حیات بڑھ جاتی ہے۔ زندگی اُسے پُر معنی اور قیمتی نظر آنے لگتی ہے۔ اپنی زندگی سے زیادہ اسے اپنے محبوب کی زندگی گراں بہا معلوم ہوتی ہے۔ عالمِ عشق میں عورت کے شبہات اور آلام بڑھ جاتے ہیں۔ وہ ایثار کرنے میں دلیر ہے۔ مگر حزن و ملال میں مبتلا رہنے پر مجبور!

شاساماچ - مگر جب حزن و مایوسی کی کوئی وجہ نہ ہو تو اے شہزادی آپ کیوں یاس انگیز باتیں کرتی ہیں۔ ہمارا مستقبل روشن ہے۔ فتح ہمارے شہنشاہ کو ضرور حاصل ہوگی!

فلورا - اے مسیح ایسا ہی کر! پیارے شاساماچ میرا دل بلاوجہ گھبراتا ہے! مضرابِ محبت سے "رباب

دل کے خوابیدہ ترانے جاگ اُٹھتے ہیں؛ مبتلائے عشق ہو کر میں ہر محبت ناک وجود سے پہلے سے بہت بڑھ چڑھ کر محبت کرنے لگی ہوں۔ مجھے ہر آن شہنشاہ کی جان کی فکر لگی رہتی ہے ملک معظم کے لئے میں ہر گھڑی کڑھتی ہوں۔ شاسماچ! میں حبش کے ہر سپاہی کے لئے دل دکھاتی ہوں۔ اُن کی ایک ایک رعایا کے لئے آنسو بہاتی ہوں۔ آہ محبت عورت کے دل کو بہت زیادہ حساس بنا دیتی ہے!

شاسماچ۔ میری حسین، دلربا، شیریں مزاج، لطیف خو شہزادی! آپ اپنے دل نازک کو ناشاد نہ فرمائیں۔ جب تک شاسماچ زندہ ہے شہنشاہ معظم کا کوئی بال بیکا نہیں کر سکتا! آپ مسرت سے اپنی دعاؤں کے ساتھ مجھے اذن رخصت عطا فرمائیے!

فلورا۔ شاسماچ پیارے! میں تم سے علیحدہ زندہ نہیں رہ سکتی میں بھی محاذ جنگ کی طرف جاؤں گی۔ میں بھی اپنے ملک پر قربان ہو جاؤں گی۔ میں نرس بن کر جاؤں گی! تمہارے لشکر کے ساتھ جاؤں گی!

شاسماچ۔ میری شہزادی! آپ کا دل جتنا نازک ہے اتنا بہادر بھی ہے۔ لیکن آپ یہ ارادہ نہ فرمائیں۔ آپ کا غلام لڑنے بھڑنے کے لئے ہے۔ اور آپ اُس کے جذبۂ فدائیت کو ابھارنے کے لئے!

فلورا۔ نہیں پیارے شاسماچ! مجاہد کی دلہن کو بھی مجاہد ہونا چاہئے۔ مجھے تمہاری محبت پکارتی ہے۔ مجھے مادر وطن آواز دیتا ہے۔ عورت صرف آنسو بہانے کے لئے پیدا نہیں ہوتی ہے۔ وہ ہر حال میں مرد کی شریک کار ہے۔ حبش کی لڑکیاں حبش کے فدا کار زخمی نوجوانوں کو کس مپرسی کے عالم میں نہیں چھوڑ سکتیں۔ وہ جانیں دینے پر آمادہ ہیں۔ وہ رزم کی قیادت میں اپنی عزت محسوس کریں گی!

شاسماچ۔ میری بلند ہمت و محبت پرست شہزادی! بیشک حبش کا ہر نوجوان آپ جیسی لڑکیوں کے لئے اپنی جان قربان کر دینا مقصد حیات سمجھے گا۔ مگر ظالم درندہ خو اطالوی زخمیوں کے کیمپ پر بھی بم گرانے میں ذرا شرم محسوس نہیں کرتے۔ آپ اپنی بیش قیمت جان کو ایسے سخت خطرے میں نہ ڈالیں!

فلورا۔ شاسماچ، تم ایسی باتیں کرتے ہو! محبت خطرات میں پڑ کر اور پائندہ ہوتی ہے اور موت سے ہمکنار ہو کر زندگی دوام حاصل کرتی ہے۔ عورت کی زندگی صرف محبت ہے۔

شاسماچ۔ اگر آپ تشریف لے گئیں تو ہر وقت مجھے آپکی جان عزیز کی فکر لاحق رہے گی۔ میں آزادی کے ساتھ لڑ نہ سکوں گا۔ آپ نہ جائیں میری شہزادی!

فلورا۔ تھوڑی دیر قبل تو تم بڑے دلیر بن رہے تھے اور اب خدشات و اوہام کی زنجیروں میں گرفتار ہوئے جاتے ہو۔ ابھی ابھی تمہیں میرے شبہات کو دور کرنے کی سعی کر رہے تھے؟

شاسماچ۔ دیکھو اگر بہادر دل آپ تقاریر کا، لڑکا بھی بہادر ہے!

فلورا۔ (ایک پندار کے ساتھ) ہاں شاسماچ! ایسا ہی ہے!

(پہرے کی تبدیلی کا گھنٹہ بجتا ہے)

شاسماچ۔ اجازت شہزادی! قسم کھانے کی رسم کے بعد فوراً مجھے روانہ ہو جانا ہے۔ (فلورا کا ہاتھ پکڑ کر دو زانو ہو جاتا ہے) پیاری شہزادی! آپ کا غلام زندگی و موت میں ہمیشہ آپ کا ہے۔

فلورا۔ (شاسماچ کا ہاتھ پکڑ کر اٹھاتی ہے۔ اور اُس کے قومی سینہ پر اپنا سر رکھ دیتی ہے) جاؤ میرے سپاہی! (رونے لگتی ہے) جاؤ! خدا و مسیح تمہیں اپنی حفاظت میں رکھیں!

شاسماچ۔ (فلورا کو اپنی آغوش میں لیتے ہوئے) شہزادی! شہزادی!! میری فلورا! میری فلورا!!

فلورا۔ (روتی جاتی ہے) شاسماچ! شاسماچ!!

شاسماچ فلورا سے علیحدہ ہو کر ایک بیتابانہ عجلت کے ساتھ روانہ ہو جاتا ہے

فلورا نڈھال ہو کر بنچ پر گر جاتی ہے

(دور جاتا ہوا دکھائی دیتا ہے)

فلورا۔ (مضطربانہ کھڑی ہو جاتی ہے اور نحیف و مضمحل آواز میں پکارنے لگتی ہے) شاسماچ! شاسماچ!!

(اور پھر نڈھال ہو کر مایوسانہ انداز میں بنچ پر گر پڑتی ہے)

منظر دوم

(محل شاہی کے سامنے وسیع میدان۔ خلقت کا ہجوم۔ وسط میدان میں شعلہ افشاں الاؤ جل رہا ہے۔ الاؤ سے ذرا پرے سبز و زرد رنگ کا حبش کا قومی جھنڈا ہوا میں لہرا رہا ہے۔ جھنڈے سے ملحق ایک آہنوسی صلیب رکھی ہوئی ہے۔ بھانت بھانت کے لوگ جمع ہیں۔ حرا، اور اوگاڈن کے حبشی، ملاگا اور گورا ہائی کے قبائل نیل اصفر کے منبع کے قریب کی پہاڑیوں میں رہنے والی کالا قوم کے جنگجو لوگ وغیرہ۔ راہب اور پادری گھنیری لانبی داڑھیوں، چوبی صلیبوں اور طویل تسبیحوں کے ساتھ ادھر اُدھر نظر آ رہے ہیں۔ رؤسائے قبائل زرق برق و رنگین لبادوں میں لپٹے ہوتے ہیں۔ سونے اور موتی کے ہار گلے میں پڑے ہیں، سر پر شتر مرغ کے پروں کا طرہ تاج کی طرح آراستہ کیا گیا ہے۔ ان سے نیچے درجہ کے سرداروں کے گلوں میں مونگا، سیپ اور کوڑیوں کے ہار ہیں۔ اور سر پر مور کی کلغی اٹکی ہوئی ہے۔ بڑے بڑے نقارے جابجا پڑے ہیں، انہیں بھی شیر کے ناخنوں اور دانتوں اور مور کے قوس قزح رنگ پروں سے سجایا گیا ہے۔ مجمع سے اوپر نکلتے ہوئے دراز و خونخوار برچھے اور نیزے نظر آ رہے ہیں۔ الاؤ کے شعلہ کی کرنیں نیزوں کی انی کو چمکا رہی ہے۔ سپاہیوں کے کاندھوں پر تیر و ترکش آویزاں ہیں۔ ایک جانب منظم فوج کے دستے بھی دکھائی دیتے ہیں۔ مغربی وضع

کی دلآفلوں کے جدید نمونوں کے ساتھ قدیم نمونے بھی نظر آتے ہیں۔ سپاہی کچھ جدید کچھ قدیم وردیوں میں عام قبائلی شتلجوؤں سے ممتاز معلوم ہوتے ہیں جو گویا نیم برہنہ ہیں۔ شہری عورتوں کا ایک گروہ الاؤ سے بہت قریب پرے جمائے ہے۔ لباس زیریں کے علاوہ ایک لبادہ ایران نما چادر انکے گلے سے بندھی ہوئی لٹک رہی ہے سارا مجمع پرجوش انتظار کے عالم میں غرق ہے لوگوں کی گردنیں ادھر ادھر اٹھ رہی ہیں --- اوپین آبابا کے شہری اور گرد و نواح کے لوگ امحارک زبان میں باتیں کر رہے ہیں - اور قبائلی لوگ اپنی قدیم زبان اور مختلف لہجوں میں سرگرم گفتگو ہیں۔ الاؤ میں سیاہ رنگ و توانا غلام ہر جانب سے لکڑیاں ڈال رہے ہیں۔ مجمع کا انتظار بڑھ رہا ہے۔ اس سرے سے اس سرے تک ایک بے چین شور اٹھ رہا ہے۔ یک بیک نقارے پر چوٹ پڑتی ہے۔ اور فوجی باجا بجنے لگتا ہے ہر طرف شہنشاہ حبش زندہ باد کے نعرے گونجتے ہیں۔ ہیلے سلاسی آراستہ و پیراستہ ابلق ترکی گھوڑے پر سوار محافظ دستے کے حلقے میں الاؤ کی جانب بڑھتا ہوا نظر آتا ہے سارے حبشی سر بسجود ہو جاتے ہیں۔ شہنشاہ الاؤ کے قریب پہنچ کر مقدس صلیب کا بوسہ [illegible]

شہنشاہ۔ بہادرو! اٹھو اور سنو!

(سارا مجمع کھڑا ہو جاتا ہے)

شہنشاہ۔ تمہیں مسرت ہے کہ باشندگان حبش نے وطن کی پکار پر ہر طرف سے دوڑے آئے۔ ملک و ملت کے فدائیو! تمہیں مبارک ہو کہ اطالوی درندوں کو ہماری فوجیں شکست پر شکست دے رہی ہیں۔ اصولی جنگ کے مطابق پہلے ہماری فوجیں پسپا ہوتی رہیں بعد ازاں شیرانِ حبش اپنے بھٹوں سے نکلے اور اپنے شکار پر ٹوٹ پڑے حبشی فوجیں مکالے اور سیدامے اور اس کے گرد و نواح میں فاتحانہ حیثیت سے داخل ہو گئی ہیں۔ صرف شمالی محاذ پر چار ہزار سات سو اطالوی ہلاک ہوئے۔ ہمارے بہادروں نے اطالوی عساکر سے ایک ہزار رائفلیں اور چالیس کلدار توپیں چھین لی ہیں۔ آکسم کی جنگ میں متعدد ٹینک ہمارے مجاہدوں کے ہاتھ آئے راس کاسا اور راس دستہ کی فوجیں اطالوی لشکر پر زبردست حملے کر رہی ہیں۔ اطالوی پسپا ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ قدیم حبش کے لشکر جرار نے سمالی لینڈ کا بہت سا علاقہ فتح کر لیا ہے۔ علاقہ ٹمبین میں راس سیوم کی افواج نے اڑھائی ہزار اطالویوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ بہادرو! جاؤ اپنے بھائیوں کے دوش بدوش جنگ آزمائی و فداکاری کے جوہر دکھاؤ۔ جاؤ! اطالوی ٹڈیوں کو اپنے شاداب کھیتوں سے نکال کر ۔۔ مقدس صلیب اور

متبرک آگ کی قسم کھاتا ہوں (الاؤ کی طرف ہاتھ اٹھاکر) کہ میں تختِ سلیمان کی حفاظت میں اپنی جان لڑا دونگا
دلیرو! وطن کے فدائیو! آؤ تم بھی قسم کھاکر میدانِ جنگ کی طرف روانہ ہو جاؤ۔!!

(شہنشاہ کی تخت. تختِ سلیمان پائندہ باد! کے نعرے بلند ہیں. اور سب سے پہلے راس لوغیتا اور راس نصیبونز سے لئے آگے بڑھتے ہیں. الاؤ کے پاس جاکر قسمیں کھاتے ہیں)

راس نصیبو۔ (ہاتھ اٹھاکر) قسم ہے مقدس آگ کی۔ میں تادمِ آخر اپنے نیزے کو حفاظتِ وطن میں دشمنوں کا لہو پلاتا رہونگا! (راس واپس آجاتا ہے)

راس مولوغیتا۔ (ہاتھ اٹھاکر) سوگند ہے آتشِ متبرک کی میں تختِ سلیمان کو اطالوی بھیڑیوں کے ناپاک ہاتھ سے بچاؤں گا! (واپس ہوجاتا ہے)

ڈیڈ شاسمارچ۔ (ہاتھ اٹھاکر) خدائے وحدہٗ لاشریک کی عزت وجلال کی قسم میں ایک سچے مسلمان کی طرح حفاظتِ وطن میں سینہ سپر رہوں گا! (شاسمارچ کی نظر عورتوں کی جماعت کی طرف پڑتی ہے شہزادی فلورا سے نگاہیں چار ہوتی ہیں اور دوبارہ خود ہوکر دوبارہ قسم کھاتا ہے) قسم ہے قلبِ مومن کی وفاشعاری کی میں اپنے ملک وملت کے حفظِ ناموس میں لڑتا ہوا شہید ہوجاؤں گا! (اس کے لہجے میں رعونت نہیں بلکہ ایک جوش اور ایک شانِ تقدس ہے جس سے مجمع متاثر ہوتا ہوا معلوم ہوتا ہے. شاسمارچ عزم واستقلال

کی تصویر اور ایک پیکرِ وفا بنا ہوا واپس ہوجاتا ہے اس کے بعد قبائل کے لوگ بڑھ چڑھ کر قسم کھاتے ہیں اور نقارے پر چوٹ دیتے ہوئے میدانِ جنگ کی طرف روانہ ہوجاتے ہیں. فوج مارچ کرتی ہوئی آتی ہے اور میدانِ جنگ کی گیت گاتی ہوئی عرصۂ کارزار کا رخ کرتی ہے)

شہنشاہ۔ (افسرانِ فوج اور عمائدین کے حلقے میں) معزز سردارو! آج حبش کے ہر شیدائی کا دل مسرت وانبساط سے لبریز ہے۔ محاذ ہائے جنگ پر ہماری فتح اور ملک کا جوش وخروش قابلِ صد اطمینان ہے (شاسمارچ کی طرف مخاطب ہوکر) شاسمارچ! سلطان ... کیوں اب تک تشریف نہیں لائے ہماری ... اطلاع صحیح ہے؟

شاسمارچ۔ اے شہنشاہِ ذی ... سلطان حلف وفاداری کی توثیق ... ہو چکے ہیں۔ اطالیہ کے دروغ گو ... ہیں. سلطان آوسا ایک مسلم جانباز ... سے ملک وملت کی غداری نہیں ... محبت داخلِ ایمان ہے. کل کی اطلاع ... موصوف ادیس ابابا کے اندر داخل ... اب وہ آیا ہی چاہتے ہیں۔

تمام عورتیں. قسم کھانے کو ...

شہزادی فلورا کی قیادت میں ایک ... کھاتی ہیں اور ... زمانہ ...

——— قسم ہے آتش ازلی کی،
سوگند ہے مقدس مریم کی! ہم وطن عزیز کے پیارے سورماؤں کی خدمت کے لئے میدان جنگ میں بلا خوف و خطر جائیں گے بلکہ مقدس ماں تمہاری مدد کر

(عورتیں الاؤ کے پاس سے ہٹ جاتی ہیں۔ باجوں اور نقاروں کی آواز قریب آتی ہوئی سنائی دیتی ہے)

شاسمارچ۔ حضرت شہنشاہ معظم! وہ دیکھئے سلطان اوسا لانبا چوغہ اور عمامہ پہنے ہوئے، عمامہ میں پروں کی کلغی لگائے آتے ہیں! (شہنشاہ حبش کو دیکھ کر عربی گھوڑے سے اتر آتے ہیں اور شہنشاہ کے قریب آکر تعظیم بجا لاتے ہیں)

شہنشاہ۔ (مسرت کے ساتھ سلطان کی پیشانی کا بوسہ لیتا ہے) اے معزز سلطان اوسا! آپ کا اہل وطن کو سخت انتظار تھا مبارک ہو، چلا آنا!

سلطان اوسا۔ اے [illegible] صد تکریم شہنشاہ! [illegible] کمانڈر حبش! ہماری جانیں آپ پر قربان ہوں! میں حضور معظم کی خدمت میں حاضر ہوں۔ حکم ہو تاکہ میں اطالویوں کا جھوٹ اپنے خنجر سے [illegible] کی حلقوں میں واپس لوٹا دوں۔

شہنشاہ۔ اے وفادار حلیف! آپ کی ذات سے ایسی ہی امید ہے

(سلطان اوسا الاؤ کی طرف قسم کھانے بڑھتے [illegible])

(س)

[illegible] ہے خالق عناصر رب المشرقین والمغربین کی میں سلطان اوسا حبش کی حفاظت میں ہر آن تیغ بدست و سر بکف رہوں گا!

شہنشاہ۔ (دروں کے مجمع کی طرف مخاطب ہو کر) ملازم جان بازو! آج میری مسرت نقطۂ کمال پر ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فتح ہماری ہی قسمت میں ہے تمہیں معلوم ہو گا کہ مجلس اقوام نے اطالیہ کے خلاف تعزیرات جاری کر دی ہیں اور مجھے توقع ہے کہ اگر اطالیہ چیرہ دستی سے باز نہ آیا۔ تو فوجی تعزیرات کا اجرا بھی ہو جائے گا۔ مسٹر ایڈن اور موسیو لاول نے ہمارے نمائندے کو بہت امیدیں دلائی ہیں۔ خبر آئی ہے کہ [illegible] جاپان اپنی حکومت حبش کی مدد کے لئے [illegible] کے ساتھ [illegible] کر رہے ہیں اور [illegible] کے بہادر سپوتو! [illegible] بڑھ کر [illegible] ہیں۔ دلیر [illegible] جاؤ اطالیہ کی [illegible] کو [illegible] دو!

سلطان اوسا۔ [illegible] اور دفع [illegible] اپنے وطن دوست [illegible] مومنانہ شان سے لڑیں گے۔!

شہنشاہ۔ ہاں اے سلطان! سارے حبش کو دشمن کے مقابلہ میں دوش بدوش ہو کر سینہ سپر ہو جانا چاہیے! سلطان اوسا! آج آپ میرے مہمان رہیں [illegible]

دشاہ حبش گھوڑے پر سوار ہو کر روانہ ہو جاتا ہے۔ محافظ دستہ آستہ چلتے ہیں۔ لیسلیٹ اور سلطان اور ماں راس نصیبو اور راس لونیتا جلو میں چلتے ہیں۔ نقارے اور بینڈ بجتے ہیں۔ میدان میں کچھ تماشا بین رہ جاتے ہیں)

ایکٹ نمبر (۳)

منظر اوّل

(مارچ ۱۹۳۶ء۔ میدان جنگ سے پرے ایک پہاڑی کے دامن میں جنگی ہسپتال کے چند خیمے خیمے کے اندر اور خیمے کے باہر زخمی سپاہی پڑے ہوئے ہیں۔ حبشی لڑکیاں نرس کا کام انجام دے رہی ہیں۔ ڈاکٹر احمد[1] ایک ہندوستانی جو اس چھوٹے سے ہسپتال کا افسر نگران ہے۔ میدان کارزار سے تازہ وارد زخمی سپاہیوں کی دیکھ بھال اور چیر پھاڑ میں حد درجہ منہمک ہے۔ دور میدان جنگ سے توپ اور مشین گن کی گرج سنائی دیتی ہے۔ پہاڑی کے مقابل افق دھوئیں میں ملفوف ہے۔ اسٹریچر پر آنے والے زخمی سپاہیوں کا تانتا بندھا ہوا ہے

ایک خیمہ کے باہر ڈاکٹر احمد ذرا دم لینے کے لئے آرام کرسی پر لیٹ جاتا ہے۔ شہزادی فلورا نرس کے لباس میں اسی خیمہ کی ایک طناب پکڑے ہوئے مغموم و مضمحل کھڑی ہوئی ہے۔ اس کی ہر گھڑی ہنستی رہنے والی سیاہ آنکھیں حد درجہ سوگوار معلوم ہو رہی ہیں)

ڈاکٹر احمد۔ الٰہی پناہ! جنگ کس درجہ خوفناک و مہلک ہوتی ہے۔ گھمسان کی لڑائی ہے۔ غضب کا رن پڑ رہا ہے۔

نرس فلورا۔ ڈاکٹر! کیا ہوگا؟ اطالوی ہر جگہ فتحیاب ہو رہے ہیں۔

ڈاکٹر احمد۔ خدا رحم کرے! ہمارے جنگی ہسپتال کا سامان ناقابل بیان حد تک کم ہے۔ خیموں کو دیکھتے ہوئے۔ آہ بے چارے زخمی سپاہی۔ کاش ان میں ہر ایک کی پوری مدد کر سکتا۔

نرس فلورا۔ ڈاکٹر مفلوم ہوتا ہے ... حمل و نقل کے ذرائع بھی کتنے ... وقت گذشتہ مورچے کے عقب ... اور تھکے ہوئے سپاہیوں کو دشمن ... چھوڑ دینا پڑا۔ آہ! معبود! ڈاکٹر ... ہوا ہوگا۔

ڈاکٹر احمد۔ آہ! نہ پوچھو نرس فلورا ... چلو ہم کام پھر جاری کریں ... خدا!

نرس فلورا۔ ہاں ڈاکٹر! آپریشن کی میز پر ...

[1] ڈاکٹر احمد ایک پنجابی احمدی نوجوان طبی امداد کے لئے ہند سے حبش گئے تھے۔

مجروح سپاہی لایا گیا ہے!

(دونوں خیمہ کے اندر جاتے ہیں)

ڈاکٹر احمد (مجروح سپاہی کا معائنہ کرتے ہوئے) الامان اُف بیچارے کا چہرہ کیسا جھلسا ہوا ہے۔ ایک ہاتھ کٹ گیا ہے۔ نرس! سکیپل اور فورسپس (چھری اور چونٹا) آرٹری فورسپ زخم سینے کا سامان اور پٹی!

(نرس فلورا مطلوبہ چیزیں لاکر دیتی ہے ڈاکٹر کام میں لگ جاتا ہے۔)

ڈاکٹر احمد۔ (کام ختم کرکے) دوسرا مجروح! (جنگی مددگار میز پر سے سپاہی کو اٹھا کر جنگلی گھاس کے بستر پر لٹا دیتے ہیں۔ اور دوسرے سپاہی کو لاکر میز پر لٹاتے ہیں۔)

ڈاکٹر احمد۔ (معائنہ کرتے ہوئے) اسے زخم تو نہیں آئے مگر دل و دماغ پر زہریلی گیس کا بُری طرح اثر ہوا ہے۔ نرس، کافور کا انجکشن! دوسرا سپاہی!

(نرس کافور کا انجکشن دیدیتی ہے اور میز پر دوسرا سپاہی لاکر رکھا جاتا ہے۔ یک لخت ہوائی جہازوں کی گڑگڑاہٹ بہت قریب سنائی دیتی ہے۔ اور فی الفور بم پھٹنے کی آوازیں پے در پے آتی ہیں۔ سب لوگ سکتے کے عالم میں جہاں کھڑے ہیں وہیں کھڑے رہتے ہیں اور کچھ وقفے کے بعد خیمہ سے باہر بدحواسی میں دوڑ پڑتے ہیں۔ اطالوی ہوائی جہاز سے ہر طرف بم اور شیل گرا رہے ہیں۔)

ڈاکٹر احمد۔ (بدحواسی کے عالم میں) پہاڑی کے دامن میں! پہاڑی کے دامن میں! (خود بھی اس طرف دوڑتا ہے۔ سارا خیمہ علاج و طبی دواؤں کی آگ میں جل جاتا ہے۔ زخمیوں کا ایک گروپ بم سے آتش گیر ہو کر بھک سے جل اٹھتا ہے خیموں میں بے کسی کی آہ و زاری مضطرب کراہیں اور بھاگنے کی سعی لاحاصل کا شور سنائی دیتا ہے۔ خیموں کے باہر سپاہی بھیانک گول گول سیاہ و سپید دیدے نکالے آسمان کی طرف تک رہے ہیں۔ زخموں کے باعث اٹھنے سے بھی مجبور ہیں۔ ایک نیم مردہ یا شدید زخمی پڑا رہتا ہے۔ ایک مجروح سپاہی نکلنے کی کوشش کرتے ہوئے باہر آتے ہی جھٹکے کا دم توڑ دیتا ہے۔ دس منٹ بمباری کے بعد یہ مردہ شکار گدھ کی طرح پرندے منڈلاتے ہوئے واپس لوٹ جاتے ہیں۔ اپنے منٹ کی قبرستان جیسی خاموشی کے بعد ڈاکٹر احمد کے ملنے کی برآمد سے سکوت ٹوٹتا ہے۔ لوگ سب سے پہلے آگ بجھاتے ہوئے خیمے کے قریب جاتے ہیں)

نرس فلورا۔ ہائے میرے اللہ۔ (سر پکڑ کر بیٹھ جاتی ہے)

دوسری نرس۔ سارے سپاہی! آہ سارے سپاہی!

حبشی مددگار۔ اف اسے نہیں! یہ جلتی ہوئی لاشیں! یہ جلے ہوئے ڈھانچے!

ڈاکٹر احمد۔ خدایا! یہ غارت گر تہذیب و تمدن! اے خدا سے دور دنیا! دوزخ! دوزخ!! ۔ اب کیا بچ گیا ہے؟ صرف جلے ہوئے گوشت کے ٹکڑے ۔ بھرکس کئے ہوئے انسانی اعضا۔ خون آلودہ لوتھڑے، خاکستری ہڈیاں، صد پارہ کھوپڑیاں! آہ ۔ کچھ نہیں لا احمل انی لم اطالبہ!

(ڈاکٹر دوسرے خیموں کی طرف رخ کرتا ہے۔ سب اس کی پیروی کرتے ہیں۔ خیموں میں جا کر نرسیں مجروح سپاہیوں کی تسلی و تشفی کرتی ہیں۔ ڈاکٹر احمد ان مریضوں کی دیکھ بھال میں مصروف ہیں جنکے زخموں کے ٹانکے بجائے کی کوشش میں ٹوٹ گئے ہیں۔ میدان جنگ سے مہیب آوازیں آرہی ہیں خوفناک شکل)

نرس فلورا۔ ڈاکٹر! فوج کا کیا حال ہوگا؟ مجھ پر کیوں نہیں بم گر پڑا! میں مرگئی ہوتی!

ڈاکٹر۔ شہزادی فلورا! دعا کیجئے اور صبر! مظلوموں کا خون رنگ لائیگا۔ یورپ کی سرزمین آج نہیں تو کل آگ اور خون میں نہائی جائے گی خدا کا عذاب قریب ہے۔

نرس فلورا۔ ڈاکٹر۔ (ٹنکچر آیوڈین اور بورک گاز دیتے ہوئے) یہ نرس شاساپ کس بےجگری سے لڑ رہا ہے فوج بھی اس پر جان دیتی ہے!

ڈاکٹر احمد۔ بورک کاٹن؟ ۔ ہاں نرس فلورا! شاساپ ایک شیر غراں ہے۔ آہ کاش ہم بھی اس کے پاس ہوتے!

(خیمہ کے دروازے پر کچھ آواز سنائی دیتی ہیں)

نرس فلورا۔ ڈاکٹر! میدان جنگ سے کوئی زخمی آیا ہے۔

ڈاکٹر۔ (ایک سپاہی کو پٹی باندھ کر) چلو آپریشن کے خیمہ میں ۔!

(سب جاتے ہیں۔ فوج کے چار کپتان اسٹریچر اٹھائے ہوئے ہیں۔)

ایک کپتان۔ ڈاکٹر! جلدی کرو! ڈاکٹر!

دوسرا کپتان۔ فوج کے کمانڈنگ جنرل کے بازو میں گولی لگی ہے اور چہرے کو بم کے ٹکڑوں نے مجروح کیا ہے۔

نرس فلورا۔ آہ کون؟ جنرل شاساپ؟

تیسرا کپتان۔ ہاں۔ ہاں! افسوس!

(نرس فلورا بےہوش ہوکر گر پڑتی ہے)

ڈاکٹر احمد۔ (آپریشن ٹیبل پر پہنچتے ہوئے) شاساپ آگیا؟ (میز پر پڑے ہوئے سپاہی کی حرکت غضب آلود سے دیکھتا ہے) خاموش اسے اٹھا لو اور جنرل کو لٹاؤ۔ (لوگ شاساپ کو لٹاتے ہیں) گولی بازو کے پار ہوگئی ہے۔ نرس! ای۔سی لوشن (ٹنکچر آیوڈین) اور ڈریسنگ کا مکمل سامان! (نرس سب چیزیں لا کر دیتی ہے۔ ڈاکٹر شست و شو میں مشغول ہو جاتا ہے) نرس ڈولی! تم نرس فلورا کو دیکھو! خبر

کیتھرین، مشک وکافور کا انجکشن! (زخم
کو دھونے اور جراحتوں پر پٹی باندھ دینے
کے بعد ڈاکٹر شاسماچ کو انجکشن دیتا ہے
اور چار دوں فوجی جرنیل کو آہستگی سے اٹھا کر
گھاس پھوس کے بستر پر لٹا دیتے ہیں
ڈاکٹر احمد حرکتِ قلب کا معائنہ کرتا ہے
سانس کی رفتار کو دیکھتا ہے) سانس اور دل کی حرکت
بے ترتیب ہے۔ زہریلی گیس کا اثر معلوم ہوتا ہے
(ڈاکٹر مریض کے پاس بیٹھ جاتا ہے)

پہلا کپتان۔ ہاں ڈاکٹر! میدانِ جنگ کی فضا زہریلی
گیسوں سے بھری ہوئی ہے۔ ہمارے سپاہی
پٹ پٹ گر رہے ہیں سامنے شل کی بارش
اور مورچوں کے اوپر زہریلے بم! بہادر جرنیل
شاسماچ اپنے ہاتھوں سے چھ گھنٹے مسلسل طیارہ
شکن توپ چلاتے رہے ہیں۔ آخر نہیں ایک گولی
آ لگی، پھر بھی ہمارے جرنیل تو۔۔۔ رہے۔ ایک
بازو جھول رہا تھا۔ اور وہ ایک ہاتھ اور شانوں اور
پاؤں کی مدد سے دشمنوں کو نشانہ بناتے رہے
(کپتان کی آنکھوں میں آنسو امڈ آتے ہیں)

دوسرا کپتان۔ آہ ہمارے جرنیل بم کی چوٹ اور
زہریلی گیس کے اثر سے بے ہوش ہو کر گر پڑے!

تیسرا کپتان۔ چلو مورچے کو سنبھالیں۔

چوتھا کپتان۔ اس مورچے کی خیر نہیں! ہم دو دو
۔۔۔۔۔۔۔

ہیں! چلو۔
(دو کپتان چلے جاتے ہیں۔ شہزادی فلورا
کو ہوش آ جاتا ہے)

فلورا۔ شاسماچ! ڈاکٹر! شاسماچ؟

ڈاکٹر احمد۔ خاموش! آہستہ!

فلورا۔ (بدحال، بدحواس، بے ہوشی سے بدتر ہونے کے
عالم میں جرنیل شاسماچ کے قریب جا کر بیٹھ جاتی ہے)
ڈاکٹر! اچھے ہو جائیں گے جرنیل؟

ڈاکٹر احمد۔ آہ کون کہہ سکتا ہے؟
(شاسماچ انجکشن کے اثر سے قدرے ہوش
کے عالم میں آتا ہے)

فلورا۔ ڈاکٹر! بولو! جرنیل بالکل اچھے ہیں ہیں نہ ڈاکٹر؟

شاسماچ۔ (بڑبڑا رہا ہے۔ آواز الفاظ کی شکل نہیں اختیار
کرتی) غرغر۔۔۔ آ۔۔۔ شا۔۔۔ حا۔۔۔۔
ں۔۔۔ غ غ۔۔

فلورا۔ شاسماچ بولو۔ پیارے شاسماچ! شاسماچ!

ڈاکٹر احمد۔ نرس فلورا! صبر! شہزادی صبر!
(خاموشی! کچھ دیر کے بعد شاسماچ آنکھیں
کھولتا ہے اور پھر بولنے کی کوشش کرتا ہے۔
پتھرائی ہوئی آنکھ، یاس انگیز حالت۔ اب کچھ
الفاظ سنائی دیتے ہیں)

شاسماچ۔ کپتان داہنے مورچے کی خبر لو۔۔۔ طیارہ۔۔۔ وہ گرا!
(ایک خبر رساں داخل ہوتا ہے)
۔۔۔۔۔۔

کو ہو گیا ہے۔ اطالوی زہر اور آگ برسا رہے ہیں۔ تین گھنٹہ سے زیادہ فوج نہیں ٹھہر سکے گی۔ اپنے کیمپ کو یہاں سے ہٹائیے!

ڈاکٹر۔ (گھبرا کر، مایوسی کے عالم میں) ـ ہ

غضب ہے آدمی کیواسطے مجبور رہو جانا
زمیں کا سخت ہو جانا افلاک کا دور ہو جانا!

(شاسماچ کو قے آتی ہے۔ فلورا جرنیل کا سر اپنے زانو پر لیکر بیٹھ جاتی ہے۔ اور دھیرے دھیرے آنسو بہا رہی ہے)

شاسماچ۔ (بحران کے عالم میں) شہنشاہ!... حبش!... فلورا!! (ایک ہچکی کے بعد دم توڑ دیتا ہے)

ڈاکٹر۔ (آلہ سے حرکتِ قلب دیکھ کر) خاموش، خاموش! خاموش!!

(سارے کیمپ میں بھاگڑ پڑی ہوئی ہے شہزادی فلورا نیم بے ہوشی کے عالم میں شاسماچ کا سر زانو پر لئے غیر شعوری طور پر بڑبڑا رہی ہے)

فلورا۔ مرگیا! مرگیا!! شاسماچ!! شاسماچ!! موت! موت! نہیں غیر فانی!... آہ! آہ!۔ محبت۔ زندگی!! ارمان!... شاسماچ! آؤ، اٹھو، مجھے گلے سے لگا لو! جنگ! جنگ! ظالم، انسانیت سوز! شاسماچ! شاس... ماچ شاس....!

(بیہوش ہو کر گر پڑتی ہے)

[illegible]

منظرِ دوم

ترالہ دربدکا شکست کے بعد

(ساسا بانا اوس اباباست... میل کے فاصلے پر محاذ جنگ سے تین میل ادھر ایک خیمے میں رات کے وقت مجلس جنگ بیٹھی ہے۔ ہوئی ناخت کے خوف سے خیمہ کے اندر روشنی بہت مدھم رکھی گئی ہے۔ شہنشاہ حبش، راس سیوم، راس مونو بختا، راس ممدو، راس دستا۔ اور جرنیل واہب[1] پاشا فرشِ زمین پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ سب کے چہرے اداس ہیں)

راس سیوم۔ شہنشاہِ معظم! امیدیں منقطع ہو چکی ہیں۔ دارالسلطنت کی تباہی یقینی ہے۔ اے ملک معظم! ہماری جانیں آپ پر قربان ہوں حضور کی جان کو خطرہ ہے۔

(شہنشاہ متفکر، خاموش بیٹھا ہوا ہے)

راس دستا۔ عالیجاہ! ادیس ابابا کو صرف یہ سامنے والی پہاڑیاں محفوظ رکھے ہوئے ہیں ورنہ اب تک ظالم اطالوی وہاں تک پہنچ چکے ہوتے!

(شہنشاہ اب بھی خاموش ہے)

راس سیوم۔ جہاں پناہ! حضور کے غلام بے جگری

---

[1] واہب پاشا، ایک ترکی جرنیل انسانی ہمدردی کے [illegible]

سے لڑے ہیں۔ دنیا ہمیں بزدلی کا الزام نہیں دیسکتی اے شہنشاہ! آپ نے محاذاتِ جنگ کا خود معائنہ فرمایا ہے۔ اکثر مقام ایسے آئے ہیں۔ کہ نہتے سپاہی عریاں سینوں پر دشمن کی گولی، اور کھلے سروں پر بم کی چوٹ کھا کھا کر مر گئے۔ مگر ان کے پائے استقامت میں جنبش۔ آئی!

شہنشاہ۔ (سر ہلاتے ہوئے) اے جانباز راس! حبش بزدل نہیں۔ غریب ہے! آہ ہمیں دھوکا دیا گیا! . . . . . اے بہادرو! تمہارے شاداب کھیتوں، تمہاری پُرامن آبادیوں پر آگ برسائی گئی ـــــ تم بھوکے اور نہتے لڑے، مگر آفریں ہے تم پر کہ تم نے مدعیانِ تہذیب پر ایسے کٹھن وقت میں اپنی شرافت و نجابت اور اپنی حب الوطنی و شجاعت کا ثبوت دیا! (شہنشاہ خاموش و مغموم ہو جاتا ہے)

راس مولوگیتا۔ عالیجاہ! یہ بالکل غیر مساویانہ لڑائی تھی جنگ نہ تھی قتل تھا! ظالم اطالویوں نے مجلس اقوام کی دفعات کا بھی پاس نہ کیا! ہم پر زہریلی گیسیں اور آتش خونیں کی بارشیں کی گئیں۔!

شہنشاہ۔ (جوش میں آکر) مجلس اقوام! مجلس اقوام! فریب کار! جھوٹی! کمزوروں کا خون چوسنے والی!

بہر تقسیم قبور انجمنے ساختہ اند!

راس سیوم۔ شاہا! یہ سب رنگ دار اقوام کی خوابِ غفلت کا نتیجہ ہے۔ حضور والا صدیوں کے سوتے ہوئے حبش کو جگا رہے تھے، بیشک ... وقت ... نے اسکا مال و متاع لوٹ لیا! ہاں ہم لڑتے لڑتے مر جائینگے مگر دشمنوں کی اطاعت قبول نہ کریں گے!

راس دستہ۔ آقا! جسم کا ذرہ ذرہ خدمتِ وطن میں مٹ چکا! اب صرف مادرِ وطن کی حرمت کے تحفظ کے لئے جان دیدینی باقی ہے۔

شہنشاہ۔ راس تقاری بھی تمہارا ساتھ دے گا حبش! حبش!!

(شاہ نیوں کو کاٹتا ہے۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبا جاتی ہیں)

جرنیل واہب پاشا۔ اے شہنشاہِ والا تبار! میرے ذہن میں ایک تدبیر ہے۔ ارشاد ہو تو عرض کروں۔

شہنشاہ۔ بتلاؤ اے معزز جرنیل!

واہب پاشا۔ لیگ کی تعزیرات کا خاطر خواہ اثر اس سبب سے نہ ہو سکا کہ بہت سے ممالک تعزیرات کے خلاف رہے۔ اور فوجی تعزیرات کا اجراء برطانیہ اور فرانس کی خودغرضیوں کے سبب نہ ہو سکا پھر بھی میرا خیال ہے کہ لیگ کے اثر و اقتدار سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ مصر، سوڈان اور مشرقی مقبوضات کے تحفظ کے لئے برطانیہ ضرور کوئی کارروائی کریگا۔ برطانوی مدبرین شک و انتظار کے عالم میں پڑے رہے اور مسولینی نے اتنی فتوحات حاصل کر لیں۔ وہ سمجھتے تھے کہ حبش کچھ علاقہ اطالیہ کے سپرد کر دیگا اور بات رفت و گذشت ہو جائیگی مگر اب ... کی آنکھیں کھلیں ... مسولینی بیٹھتا ...

پرمی اپنی نظر جمائے ہوئے ہے۔ بحر متوسط کو وہ خالص اطالوی جھیل بنانا چاہتا ہے۔ ادھر فرانس والے اب تاڑ گئے ہیں کہ اطالیہ در پردہ جرمنی سے ساز باز کر چکا ہے۔ لہٰذا فرانس برطانیہ کی ضرور مدد کرے گا۔ فرانس و برطانیہ کی متحدہ قوت مسولینی کے سر پُر غرور کو نیچا کر دکھائے گی۔!

راس عمرو ۔ مگر ابھی کیا کیا جائے؟ ادیس ابابا ہفتہ عشرہ میں معاذ جنگ بن جائے گا۔ شہنشاہ کی جان کو سخت خطرہ ہے!

واہب پاشا ۔ ہاں شہنشاہ کو اپنی جان کی حفاظت کرنی لازم ہے اور فی الفور!

شہنشاہ ۔ نہیں اے بہادرو! میں بے عزتی کی زندگی قبول نہیں کر سکتا! میں اپنے پیارے وطن کیلئے ایک معمولی سپاہی کی طرح لڑتا ہوا مر جاؤں گا۔

جرنیل واہب ۔ اے شہنشاہ! ابھی وقت نہیں آیا۔ آپ حبش کی خاطر اپنی جان کی حفاظت کیجئے۔ حبش کو آپ کی سخت ضرورت ہے۔ سارے ملک کو متحد رکھنا صرف آپ کی ذات سے ہو سکتا ہے

راس سیوم ۔ بالکل صحیح! جرنیل سچ فرماتے ہیں!

راس مولوغیتا ۔ ہاں اے وارث تخت سلیمان! آپ کی جان بہت عزیز ہے!

جرنیل واہب پاشا ۔ ادیس ابابا تو مفتوح ہو ہی جائیگا مگر ملک کا مغربی کوہستانی علاقہ حبشی فوجوں کیلئے

[illegible]

آچکی ہے۔ جولائی کا مہینہ اطالویوں پر حملہ کرنے کے لئے بہت موزوں ہوگا۔ مگر سب سے پہلے مجلس اقوام کو اطالیہ کے خلاف طیار کرنا ضروری ہے۔ اور موجودہ صورت حال حضور کے حق میں ہے۔ میری رائے ہے کہ آپ دیجبوتی ریلوے کے ذریعہ یورپ تشریف لے جائیں اور مدبرین برطانیہ و فرانس پر اثر ڈالیں۔

شہنشاہ ۔ میں اپنے پیارے حبش کو دشمنوں کے رحم وکرم پر چھوڑ کر چلا جاؤں؟ نہیں، نہیں! اگر مجلس اقوام کو متوجہ کرنا ہے۔ تو وہ یہیں سے ہو سکتا ہے۔

راس سیوم ۔ حضور والا! جس وقت تک مجلس کا اجلاس منعقد ہوگا، قرائن یہ کہتے ہیں کہ ادیس ابابا فتح ہو چکا ہوگا اور اگر حضور یہیں رہے تو پھر حبش کے لئے آخری امید بھی منقطع ہو جائے گی۔!

راس دستہ ۔ اے شہنشاہ! وقت بہت ہی کم ہے دشمن نے ادیس ابابا کی ناکہ بندی کر رکھی ہے مغربی صوبہ کی طرف ہمارا پسپا ہونا بھی سردست ناممکن ہے۔ اور وہاں کوئی منظم فوج بھی نہیں

راس عمرو ۔ حضور والا۔ آپ اپنی جان کی حفاظت فرمائیں۔ آپ کے غلام لڑ بھڑ کر سرحد مغرب کی طرف نکل جائینگے۔ اور وہاں حضور کے احکامات کا انتظار کرینگے!

شہنشاہ ۔ [illegible]

فراری! معزز سردارو! مجھے اپنے دوش بدوش لڑکر مر جانے دو۔

جرنیل واہب۔ سیاستِ جنگ کے لئے پسپا ہونا بزدلی نہیں! حضور ضرور فی الفور یورپ تشریف لے جائیں۔ حالات اس کے متقاضی ہیں

راس مولوغیتا۔ شہنشاہ! حبش کی خاطر!

راس سیوم۔ عالیجاہا! ہم لوگ آخر دم تک سپر انداز نہ ہونگے۔

راس دستہ۔ جب تک دم میں دم ہے۔ اطالوی ملک پر تسلط حاصل نہیں کر سکتے!

راس عمرو۔ جرنیل واہب کی رائے بہت صائب ہے سب سے پہلے شہنشاہ کی جان کی سلامتی کی ضرورت ہے اب وقت بہت کم رہ گیا ہے۔

شہنشاہ۔ میرے وفادار سردارو! میں تمہیں چھوڑ کر چلا جاؤں؟ میں اپنے پیارے وطن کو چھوڑ کر چلا جاؤں؟ مجھے پھر کوشش کرنے دو! مجھے پھر کوشش کرنے دو! بس نہیں! واہب! تم نئے سر سے عساکر کی تنظیم کرو۔ راس عمرو اور راس دستہ تم تازہ دم فوج بھرتی کرنے کی سعی کرو۔ اور تم راس سیوم اور راس مولوغیتا دشمن کے قدم روکے رکھو میں اودیس ابابا سے اسلحہ ہائے جنگ و رسد کا بندوبست کرکے تمہیں بھیجتا ہوں۔ کچھ سامان جنگ بندرگاہ تک پہنچ گیا ہے۔ میں یورپ اور امریکہ کی چند کمپنیوں سے جنگی طیاروں کی خرید کی بھی بات چیت کر رہا ہوں۔ بہادر! ہمت نہ ہارو۔ اسی دم سے کام شروع کردو۔

(شہنشاہ خیمہ سے باہر نکل کر اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر تاریکی میں غائب ہو جاتا ہے)

رباعیات

دھندلی ہے نظر نباہ کرتے کرتے
تاریک ہے رو سیاہ کرتے کرتے
یارب مجھے اب دامن رحمت میں چھپا
میں تھک گیا ہوں گناہ کرتے کرتے

ہم مرد ہیں اب روپ بدل ڈالیں گے
اس قید علائق کو کچل ڈالیں گے
کیا موت کا ڈر موت کی سختی کیسی؟
میلی ہے یہ پوشاک بدل ڈالیں گے

انیس الشعراء آغا شاعر

صاحبزادہ احمد ندیم قاسمی بی۔ اے

خیالِ خام

میری بربادیوں کے نوحہ گر! — مفلسی کا مجھے نہ دے الزام
میں تو در اصل اس زمانے میں — چاہتا تھا رہوں بلند مقام
وقت میرا غلام بن کے رہے — میرے قابو میں ہو حیاتِ دوام
میری زد میں ہوں چاند اور تارے — میرے بس میں ہو گردشِ ایام
موت کی فکر سے رہوں آزاد — زندگی کو بناؤں اپنا غلام
آسماں کو پلک جھپکنے میں — قطع کرتی ہو میری تیزیٔ گام
مفلسوں کو پلائے جاؤں میں — ظالموں کے لہو سے بھر کر جام
ایک پُرخوف احترام کے ساتھ — یاد کرتے ہوں لوگ میرا نام
سربلندوں کو روند دے میرا — توسنِ بے لگام، تیز خرام
میرے در پر جھکیں سکندر و جم — میرے خنجر کو چومیں رستم و سام
دیکھ کر میری رفعتِ تخئیل — تھرتھراتا ہو چرخِ نیلی فام
اور مجھے روحِ میرزا غالب — شاعری کا بنائے ماہِ تمام
میری پرواز کو نہ روک سکے — یہ نظامِ لیالی و ایام
بجلیوں کے بھی دل لرز جائیں — جب اُٹھے میری تیغِ خوں آشام
میرے پرچم تلے اکٹھے ہوں — دہلی و لزبن و عراق و شام
میری بربادیوں کے نوحہ گر! — یہ مری روح کے تھے وہم تمام
جانتے ہو کس مصیبت سے — ایک تنکے کو توڑتا ہے غلام

آہ ان رفعتوں کا ذکر نہ چھیڑ
حسب ہوئی، جارہی ہے زیست حرام

افسانہ

میرزا ادیب

بدنصیب

شیخ احمد اسمٰعیل کا اکلوتا لڑکا یوسف اسمٰعیل اپنے شاندار کمرے میں ایک صوفے پر بیٹھا ہوا اخبار کا مطالعہ کر رہا تھا۔ کہ ایک خادم اندر آیا۔ اور کہنے لگا۔ "حضور! آپ سے ایک شخص ملنا چاہتا ہے"

"کون ہے وہ؟"

اس نے مجھے نام نہیں بتایا کہتا ہے: وہ مجھے جانتے نہیں۔ اس لئے نام بتانا بیکار ہے"

"بلالو ـــــ"

خادم چلا گیا۔ چند لمحوں کے بعد ایک کریہہ المنظر شخص دروازے میں سے اندر جھانکا۔ "مسٹر یوسف آپ ہی ہیں" اس نے پوچھا۔

"ہاں! اندر تشریف لے آیئے"

وہ شخص اندر آ گیا اور جیب سے ایک سبز رنگ کا لفافہ نکال کر یوسف کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہنے لگا۔

"فیروز آپکا خادم کل فوت ہو گیا ہے۔ یہ خط اس نے آپکے نام بھیجا ہے"

"فیروز فوت ہو گیا ہے!" یوسف نے قدرے رنگین لہجے میں کہا۔

"جی ہاں! کل صبح اس نے دم دیا۔ موت سے چند دن پیشتر اس نے یہ لفافہ مجھے دیا تھا۔ اور کہہ رکھا تھا جب میں مر جاؤں تو یہ شیخ احمد اسمٰعیل کے لڑکے یوسف اسمٰعیل کو دیدینا۔

یوسف نے لفافہ ہاتھ میں لے لیا۔

"آپ کون ہیں؟"

"میں جیلخانے میں ملازم ہوں۔ مرحوم کے میرے ساتھ بڑے اچھے تعلقات تھے۔ بڑا نیک انسان تھا"

"بہت نیک انسان ـــــ" یوسف اس کے الفاظ دہرانے لگا:

"چند دن کے بعد اس کی قید کی میعاد پوری ہونیوالی تھی۔ مگر خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا"

اس کے بعد اس شخص نے یوسف سے مرحوم کے متعلق دو چار اور باتیں کیں۔ اور چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد یوسف نے لفافہ کھولا۔ اور پڑھنے لگا۔ عبارت کی سطریں ٹیڑھی میڑھی تھیں جس سے معلوم ہوتا تھا کہ دم تحریر لکھنے والے کے ہاتھ لرز رہے تھے۔ تحریر یہ تھی:۔

میرے یوسف!

امید ہے تم مجھے بھولے نہیں ہو گے۔ اور میری تحریر دیکھ کر فوراً تم مجھے پہچان لو گے۔ [illegible]

اپنی زندگی کا سب سے بڑا راز جو تمہاری زندگی کا بھی ایک بہت بڑا راز ہے منکشف کر رہا ہوں۔ یہ راز ــــ اب تک راز بنکر ہی میرے دل میں رہتا۔ اور میرے مرنے کے ساتھ ہی میرے سینے میں دفن ہو جاتا۔ مگر ایک خاص ضرورت ــــ ایک خاص وجہ مجھے مجبور کر رہی ہے۔ کہ تمہیں حقیقت سے آگاہ کردوں میرے اچھے یوسف! اب میں اپنی زندگی کی دردانگیز داستان بیان کرتا ہوں۔!۔

لاہور کے ایک معزز خاندان میں میں پیدا ہوا۔ بچپن میں والدین دنیا سے رخصت ہو گئے۔ والد مرحوم نے تجارت میں لاکھوں روپے کمائے تھے۔ اس لئے جب میں سن بلوغ کو پہنچا۔ تو اپنے آپ کو ایک بہت بڑی جائداد کا تنہا وارث پایا۔ تنہا میں نے اس لئے کہا ہے۔ کیونکہ میں والدین کا اکلوتا بیٹا تھا۔ دولت توقع سے بڑھ کر تھی۔ اور اس پر مستزاد یہ کہ سب میرے قبضہ میں تھی۔ اس لئے میں نے زندگی عیش میں گذارنی شروع کر دی۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ کہ دولت بذات خود دنیا کی بہت بڑی نعمت ہے۔ مگر بعض اوقات انسان اسے اپنے لئے ایک ہولناک لعنت بنا لیتا ہے۔ مجھے دنیا کی یہ بہت بڑی نعمت ملی۔ مگر بدقسمتی سے میں نے اسے ہولناک لعنت بنا لیا۔ افسوس میں نے سمجھا کہ زندگی عبارت ہے عیش و عشرت سے مجموعہ ہے طرح طرح کی مسرتوں کا اور نام ہے۔ حظائظ نفسانیہ کے حصول کا۔ عیش پرست دوستوں نے اس خیال کو تقویت دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں نے باپ کی محنت سے کمائی ہوئی جائداد کو فضول خرچیوں کی نذر کرنا شروع کر دیا۔ میری بیوی جو ایک شریف اور دولتمند گھرانے کی چشم چراغ تھی۔ مجھے ان تباہ کن فضول خرچیوں بربادی لانے والی تلوّن اور ذلت خیز اطوار سے باز رکھنے کی انتہائی کوشش کرتی۔ مگر میرے یوسف! انسان جب ایک دفعہ گناہ آلود راستے پر چلنا شروع کر دیتا ہے۔ تو مشکل ہی سے چھوڑتا ہے۔ آنکھیں ہونے کے باوجود میں اندھا تھا۔ اپنی فضول خرچیوں میں میں نے ذرہ بھر کمی نہ کی۔ یہاں تک کہ دولت نے سسکیاں لینی شروع کر دیں۔ اس وقت بھی مجھے ہوش نہ آیا۔ دولت بے وفائی کر چکی تھی۔ دوست منہ موڑ چکے تھے۔ رشتہ دار تمام تعلقات منقطع کر چکے تھے مگر دنیا میں ابھی ایک ہستی تھی جو اب بھی میری تھی۔ جو اب بھی میری بربادیوں کو دیکھ دیکھ کر خون کے آنسو بہا رہی تھی۔ جو اب بھی پہلے کی طرح مجھ سے محبت کرتی تھی۔ اور جو ابتک دل میری ہمدرد تھی۔ وہ تمہاری والدہ تھی۔ میری بیوی تھی۔ عائشہ! آہ یہ محترم و مقدس نام لیتے ہوئے میرے دل پر چوٹ لگتی ہے ــــ مگر میرے یوسف! دل ایک ایک حرف پر رک کے تو رک گر قلم نہیں رکیگا مجھے جو کچھ لکھنا ہے وہ ضرور لکھوں گا۔

میرے پاس دولت تو نہیں تھی: تاہم دل میں ہوس تو زندہ تھی۔ اس ہوس کو پورا کرنے کے لئے ذلیل و قابل نفرین ذرائع سے دولت حاصل کرنے کا خیال میرے دل میں پیدا ہوا۔ اور بہت جلد یہ خیال عملی صورت اختیار کر گیا۔ آہ! مجھے وہ رات ابھی تک نہیں بھولی۔ جب میری بیکس بیوی اپنے ننھے سے بچے کو گود میں اٹھائے میرے آگے ہاتھ جوڑ کر، مجھے بدی سے روکنے کے لئے آہ و زاری کر رہی تھی۔ [illegible] میرا دامن پکڑنا چاہتی تھی۔ ــــــ

——— اس معصوم کو بھی شاید معلوم تھا۔ کہ میں ذلیل مقصد کے لئے گھر سے نکل رہا ہوں۔ اس وقت جبکہ میں یہ سطریں لکھ رہا ہوں۔ وہ حسرت انگیز منظر میری نظروں کے سامنے پھر رہا ہے۔ افسوس۔ اس وقت مجھے بدی اور گناہ کے سوا کچھ بھی نہیں سوجھتا تھا۔

——— میں نے اپنا ناپاک ارادہ پورا کیا ———

ایک نہایت ذلیل ذریعے سے دولت حاصل کی ———

میں ذلت کی گہرائیوں میں پہنچ چکا تھا۔ پھر اپنی حالت کا خیال، نیکی کا احساس میرے ذہن میں کیونکر آسکتا تھا۔ اپنی بیوی کی مسلسل گریہ آلود التجاؤں کے باوجود میں نے ———

اس ذلیل انسان نے ہزاروں ذلیل ارادے پورے کئے نیکی کے راستے میں ہزاروں رکاوٹیں ہیں۔ مگر بدی کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں ایک دن میں گھر میں بیٹھا ہوا تھا۔ کہ میرے ایک دوست نے آواز دی میں جلدی سے اس کے پاس پہنچا۔

"چلو گے ——— ؟" اس نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا۔

اس "چلو گے" کا مطلب میں کیونکر نہ سمجھتا میری باچھیں کھل گئیں۔ فوراً تیار ہو گیا۔

"تمہارا بچہ کہاں ہے"؟ اس نے خلاف توقع پوچھا

"اندر ہے!"

"ذرا لاؤ نا اُسے!"

"کیوں؟ کیا بات ہے؟" میں نے حیران ہو کر کہا۔

"[illegible]"

میں تیزی کے ساتھ اندر گیا معصوم بچہ ڈیوڑھی میں ایک ٹوٹی چھوٹی کھٹولی پر سو رہا تھا۔ ماں اندر کوئی کام کر رہی تھی۔ میں نے بچے کو اٹھایا اور باہر آگیا میرے دوست نے بچہ اپنی گود میں لے لیا۔ اور چلنے لگا ——— "ایک زریں موقعہ ہاتھ آیا ہے" کچھ دیر چل کر میرے دوست نے کہا۔

"کونسا موقعہ؟"

"ایک بہت بڑا رئیس ایک خوبصورت بچے کی تلاش میں ہے۔"

"ہوں" میں نے استفسار کیا۔

"کیونکہ رئیس کے ہاں اپنا کوئی بچہ نہیں۔ اور وہ کسی خوبصورت بچے کو متبنےٰ بنانا چاہتا ہے۔ بچے کے لئے اس نے بہت بڑی رقم پیش کی ہے۔ میری تجویز یہ ہے کہ فی الحال اس ننھی جان کو رئیس کے حوالے کر دیں۔ اور اس سے رقم اینٹھ لیں ——— چند دن بعد موقعہ پا کر اسے لے آئیں۔ کیوں کیا خیال ہے تمہارا ——— ؟"

میں نے حیرت سے اس کے چہرے کو دیکھا۔

"خاموش ہو گئے۔ بھئی سچی بات یہ ہے۔ کہ آج کل ہمیں روپے کی سخت ضرورت ہے۔ اور یہ روپیہ پیدا کرنے کا نادر ترین ذریعہ ہے بچے کا میں ذمہ دار ہوں۔ دس دن کے اندر اندر بچہ نہ لے آیا تو تم جو چاہو سزا دینا۔"

"لیکن یہ کیونکر ہو سکتا ہے۔"

"سب کچھ ہو سکتا ہے۔"

"چند دن کے اندر اندر بچہ لے آؤ گے؟"

"[illegible]"

جھوٹا وعدہ ہی کیا ہے ؟"

اتنے میں شراب کی دکان آگئی۔ ہم دونوں اس کے اندر گھس گئے۔ شراب کی بوتلیں ہمارے سامنے آگئیں۔ اس ذلیل انسان نے کچھ نقدی میرے ہاتھ میں دی۔ اور یہ کہتے ہوئے اٹھ کر چلا "مقصد پورا کر کے ابھی آیا" میں نے شراب کا گلاس منہ سے لگایا ـــــ اور ـــــ!

میرے یوسف! تم یہ سطور پڑھ کر مجھے لعنت ملامت کر رہے ہو گے۔ خوب کر و مگر ـــــ میں ابھی کچھ نہیں کہتا تمہیں جلد ہی سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔

جب میرا خمار اترا۔ تو وہاں نہ میرا دوست تھا۔ اور نہ میرا بچہ۔ تمام نقدی بھی ختم ہو چکی تھی میں فوراً دوست کے گھر پہنچا وہاں تالا لگا ہوا تھا میں بہت پچھتایا۔ ایک شناسا آشنا وہاں مل گیا۔ اس نے مجھے بتایا۔ کہ وہ شیطان یہ گھر چھوڑ چکا ہے۔ اور اب معلوم نہیں کہاں ہے۔ میں اسے تلاش کرتا رہا۔ مگر بے سود۔ آخر میں گھر کی طرف چلا۔ ابھی دروازے پر ہی پہنچا تھا کہ پولیس کے سپاہیوں نے ایک چوری کے الزام میں جو میں نے دو مہینے پیشتر کی تھی۔ گرفتار کیا ـــــ اس کے بعد میں جیلخانے میں تھا۔

جب میری بیوی کو اس واقعہ کی خبر ملی تو وہ مجھ سے ملنے آئی۔ رو رو کر اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ پچکے ہوئے رخساروں پر جا بجا آنسوؤں کے دھبے نظر آ رہے تھے اس نے صرف چند الفاظ کہے۔ مگر یہ چند الفاظ نشتر بنکر میرے دل میں چبھ گئے۔ آہ اس وقت اس کی حالت کتنی قابل رحم تھی۔ حسرت و افسوس سے تر ہوئی آہنی سلاخوں کو دونوں ہاتھوں سے تھامے اپنا مغموم و غمناک چہرہ ایک سلاخ سے لگائے دھوپ میں کھڑی ہوئی رحم طلب نگاہوں سے مجھے دیکھ دیکھ کر نہایت درد انگیز لہجے میں کہہ رہی تھی "میرا بیٹا کہاں ہے ؟"

یہ الفاظ سنتے ہی میرا سینہ پھٹ گیا۔ میں نے چاہا کہ اسے تسلی دوں۔ اسے کہوں کہ تمہارا بیٹا صحیح سلامت موجود ہے مگر میری زبان رک گئی۔ اس نے یہ نشتر بدامن الفاظ میرا سے میں پھر خاموش رہا۔ اپنی تمنا اپنی آرزو کے خلاف خاموش !۔ وہ چلی گئی۔ اس کے الفاظ آتشیں شعلے بنکر میرے دل کو جلانے لگے۔ روح کی گہرائیوں میں ہیجان برپا ہو گیا۔ اپنے گذشتہ مظالم ایک ایک کر کے مجھے یاد آنے لگے ـــــ یاد آ آ کر تڑپانے لگے۔ میری طبیعت سخت بیقرار رہنے لگی۔ رات کو جب میں لیٹتا تو سوتے میں وہ بدنصیب عورت مجھ سے اپنا بیٹا مانگتی میں چیخ مار کر ـــــ گھبرا کر بیدار ہو جاتا۔ جیل کی تنگ و تاریک کوٹھڑی میں ادھر ادھر ہاتھ مارتا۔ مگر میرا ہاتھ ظالم سلاخوں کو چھو کر رہ جاتا۔ بھیانک تاریکی میں کوئی صورت دکھائی نہ دیتی۔ خوفناک خاموشی میں کوئی آواز کان میں نہ آتی اس ذہنی کوفت دماغی بیزاری و روحانی اذیت نے میرا برا حال کر دیا۔ چند دن کے بعد میری بیوی پھر آئی۔ بدقسمت عورت نے آتے ہی وہی الفاظ کہے۔ جنہوں نے میری زندگی کا چین و آرام چھین لیا تھا۔ اس وقت میں نے اتنا چاہتا تھا کہ اسے تمام واقعہ سنا دوں میں واقعہ سنانے لگا۔ وہ چپ چاپ ایک زخمی پرندے کی طرح جو بیرحم صیاد کے پنجرے میں پھنسکر حسرت اندوز نظروں سے ادھر دیکھتا ہے۔ مجھے دیکھتی رہی میں ـــــ اس کا شوہر

اس کے معصوم بچے کا شکاری بولتا رہا۔ یہاں تک کہ جیل کے سپرنٹنڈنٹ نے بدنصیب عورت کو چلے جانے کا حکم دے دیا۔ اس کی آخری رحم طلب نگاہیں تیر بنکر میرے دل پر لگیں مجھے اتنی بھی خبر نہیں تھی کہ میرا بیٹا زندہ ہے یا وہ ——— اب بدنصیب ماں سے زیادہ بدنصیب باپ اپنے بیٹے کے لئے تڑپ رہا تھا جب قید کی میعاد پوری ہوگئی تو میں نے قسم کھائی کہ سب سے پہلے اپنے بیٹے کی تلاش کرونگا اور اس مقصد کے حصول میں اگر جان بھی چلی جائے تو دریغ نہیں کرونگا میں نے اپنے گھر کی طرف قدم اٹھائے۔ اور یہ دیکھ کر میں سخت حیران ہوگیا کہ میرے ٹوٹے پھوٹے مکان کی بجائے ایک عالیشان مکان کھڑا ہے۔ ہمسایوں نے مجھے بتایا کہ یہ مکان ایک سیٹھ کا ہے جسکا میں قرضدار تھا قرضے میں اُس نے میرا مکان قرق کروالیا تھا۔ اور میری بیوی ——— ؟ کسی کو بھی معلوم نہیں تھا۔ کہ وہ کہاں ہے ؟

میں شہر میں گھومنے لگا ——— میرے پیش نظر دو مقصد تھے۔ ایک تو اپنی بدنصیب بیوی کی تلاش۔ اور دوسرے اپنے بیٹے کو دیکھنا ——— ان مقاصد کے لئے میں نے شہر کا کونہ کونہ چھان مارا۔ مگر دونوں میں سے کوئی بھی نہ ملا۔ آخر میں تمہارے شہر میں آیا۔ تھک کر ایک باغ میں بیٹھا تھا۔ کہ مجھے اپنے قریب ہی اپنا بیٹا ——— اپنا یوسف نظر آیا۔"

یوسف کے ہاتھ سے کاغذ چھوٹ کر گر پڑا۔ "اپنا بیٹا یوسف"! اس نے آہستہ سے کہا۔ اُسے زمین گھومتی ہوئی

سے ملازم کا بیٹا ——— ؟ کتنا تعجب انگیز واقعہ ؟ ؟

اس نے آگے پڑھنا شروع کیا۔

"یہ الفاظ پڑھ کر تمہیں بڑی حیرت ہوتی ہوگی۔ مجھے اس کا سخت افسوس ہے کہ میں نے تمہیں ایک نہایت تلخ حقیقت سے آگاہ کیا۔ مگر کیا کروں میرے بیٹے! افشائے راز پر مجبور ہوں۔

خیر! میرا ایک مقصد تو پورا ہوگیا تھا ——— میرا بیٹا تو مجھے نظر آگیا تھا۔ میں نے سوچا کہ جس رئیس نے تمہیں بیٹا بنایا ہوا ہے۔ اس کے ہاں نوکری کرلوں۔ اس طرح تمہارے پاس بھی رہونگا۔ اور اپنی بیوی ——— تمہاری ماں کو بھی ڈھونڈھتا رہوں گا۔ دوسرے دن میں شیخ احمد اسمٰعیل کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور نوکری کے لئے درخواست کی۔ انہوں نے تمہاری خدمت کے لئے مجھے نوکر رکھ لیا۔ حقیقی باپ اپنے بیٹے کا نوکر مقرر ہوا۔

یوسف کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ کر گرنے لگے۔

"اب میرے سپرد دو کام تھے۔ ایک تمہاری خدمت اور دوسرا تمہاری ماں کی تلاش۔ ہر روز وقت ملنے پر میں اِدھر اُدھر پھرتا۔ لوگوں سے پتہ پوچھتا ——— الغرض تمہاری ماں کی تلاش میں انتہائی کوشش کرتا۔ مگر بے سود۔ کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ وہ بدنصیب کائنات کے کس گوشے میں زندگی کے دن پورے کر رہی ہے۔

میرے بیٹے! میں نے تمہاری ماں کی تلاش جاری رکھی۔ آٹھ سال تک میں اسی کوشش میں سرگرداں رہا۔ آخر ایک دن مجھے پتہ مل گیا کہ وہ زندہ ہے۔ اور جالندھر کے محلہ

[illegible] میں فوراً وہاں پہنچا۔ آہ! دیکھا ری

عورت کو غموں نے بہت جلد بوڑھا کر دیا تھا۔ جب میں وہاں پہنچا وہ سو رہی تھی میں نے اُسے جگایا اور کہا۔

"عائشہ! تمہارا بیٹا مل گیا ہے۔ وہ تم سے ملنے آئیگا"

"تم ــــــ؟" اس نے حیرت زدہ نظروں سے مجھے دیکھا۔ پھر کہا۔

"میرا بیٹا آئیگا! کب؟"

"ابھی تم سے ملنے آئیگا۔ اب تو وہ بہت امیر ہے!"

"میرا بیٹا! اس سے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکی۔ فرطِ ضعف سے اس کی آواز نہیں نکلتی تھی۔ اس کی افسردہ آنکھیں کہہ رہی تھیں جلد میرے بیٹے کو لاؤ۔ اس کے بعد میں واپس آیا۔"

یوسف کا دل دھڑکنے لگا ــــ

"میں نے تمہیں کہا۔ جالندھر میں میرے ایک رشتہ دار کی شادی ہے تم بھی میرے ساتھ چلو۔ میرے اچھے یوسف! تم چلنے پر تیار ہو گئے۔ اس وقت میرا دل بے اختیار چاہتا تھا کہ ہم دونوں پر لگا کر تمہاری ماں کے پاس پہنچ جائیں۔

جب ہم ٹرین میں بیٹھے۔ تو میرا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ ہم محلہ چاہ لالے والا میں داخل ہوئے۔ ایک شخص کفن ہاتھ میں لئے ہمارے آگے آگے جا رہا تھا۔ میرے دل پر ایک چرکہ سا لگا۔ آگے بڑھے تو دیکھا ایک شخص تھال ہاتھ میں اٹھائے لوگوں سے پیسے مانگ رہا ہے۔ اُس نے تھال ہمارے آگے بھی بڑھایا اور کہا۔

"ایک غریب عورت فوت ہو گئی ہے۔ تجہیز و تکفین میں آپ بھی مدد دیں"

"کون غریب عورت [illegible] منہ سے نکلا

اُس مکان میں رہتی تھی بیچاری ــــ اُس شخص نے اُسی مکان کی طرف اشارہ کیا جس میں میں نے تمہاری ماں کو دیکھا تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا۔ کہ میرا سینہ ٹکڑے ٹکڑے ہوا جاتا ہے۔ میرے یوسف! میرے بیٹے! مجھ سے میری اپنی بیوی تمہاری ماں کے جنازے کے لئے کچھ خیرات مانگ جا رہی تھی"

یوسف کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں کاغذ پر اسے کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اس نے رومال سے آنسو پونچھے۔ ٹھنڈی آہ بھری۔

"میں نے تمہیں وہیں ٹھہرایا۔ اور مرحومہ کے پاس پہنچا۔ تمہاری ماں کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ گویا وہ تمہارا انتظار کر رہی ہے۔ اس وقت مجھ سے ضبط کرنا محال تھا۔ ــــ تم باہر کھڑے تھے میں چاہتا تھا۔ اس اندوہناک واقعہ کی تمہیں خبر نہ ہو۔ تیر کمان سے نکل چکا ہے۔ اب کچھ کہنے سے کیا فائدہ؟ ــــ میں نے دل میں کہا۔ بڑی کوشش سے میں نے آنسو روکے۔ باہر آیا۔ اور تمہیں یہ کہہ کر واپس بھیجدیا کہ میری ایک دور کی رشتہ دار فوت ہو گئی ہے۔ تم چلے گئے ــــ پھر میں بدنصیب عورت کی نعش سے لپٹ کر خوب رویا۔ اور معلوم نہیں۔ میری یہ حالت کب تک رہتی۔ مگر لوگوں نے مجھے علیحدہ کر دیا۔

میرے یوسف! آٹھ سال تک میں تمہارے ہاں نوکر تھا۔ پندرہ روپے مجھے تنخواہ کے طور پر ملتے تھے۔ جن میں سے میں زیادہ سے زیادہ دو تین خرچ کرتا تھا۔ باقی جمع کرتا

[illegible]

تمام جمع شدہ رقم میری جیب میں تھی۔ میں نے اس میں سے کچھ مرحومہ کے تجہیز و تکفین پر خرچ کی اور باقی روپے میری جیب میں رہے ـــــ میری بدنصیبی کی انتہا ہو چکی تھی۔ تاہم میں چاہتا تھا۔ کہ ایک دفعہ تم سے مل لوں۔ اور پھر کہیں دُور چلا جاؤں۔ جب میں سٹیشن پر پہنچا۔ تو تمہارے نوکروں نے مجھے پکڑ لیا۔ تمہارے ہاں میری عدم موجودگی میں جو چوری ہوئی تھی۔ اس کا مرتکب مجھ بدنصیب کو سمجھا گیا تھا۔ ستم پر ستم یہ کہ میری نقدی نے ان کے شبہ کو یقین کی صورت دیدی ـــــ میرے بیٹے! جب تم نے میرے ہاتھوں کو ہتھکڑیوں میں جکڑے ہوئے دیکھا تو تمہیں بہت افسوس ہُوا تمہیں کبھی خیال بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ کہ میں چور ہوں۔ میرے پیارے بیٹے اب حقیقت تم پر ظاہر ہو گئی ہے۔ میں جیل پہنچا دیا گیا۔ اب میری زندگی کی داستان ختم ہو گئی ہے۔ جو کچھ میں تمہیں بتانا چاہتا تھا۔ وہ بتا دیا۔ شاید میں دو تین دن اور زندہ رہوں ایک آرزو ہے میرے بیٹے! اپنے باپ کی بدنصیبی پر افسوس نہ کرو۔ جو ہونا تھا۔ ہو چکا اب جبکہ میں موت کے کنارے پہنچ چکا ہوں میں محسوس کرتا ہوں کہ تمہاری ماں نے مجھے معاف کر دیا ہے۔ میرے لختِ جگر تم بھی مجھے معاف کر دو۔ اپنے بدنصیب باپ کو معاف کر دو۔ دعا کرو خدا بھی مجھے معاف کر دے۔ خدا تمہیں ہمیشہ خوش رکھے اچھا بیٹا! اب الوداع! ـــــ تمہارا بدنصیب باپ

فیروز

حضرت طالب انصاری

غزل

آنکھ مخمورِ مئے حُسن ہے اور دل مدہوش
یہ وہ عالم ہے کہ جس میں غمِ فردا ہے نہ دوش

کس قدر اوج پہ ہے آج ترا کوکبِ حُسن
دیکھتا ہوں مہ و پرویں سے تجھے دوش بدوش

دیکھ کر آج مرا حالِ پریشاں اُس نے
کھول دی میرے لئے اپنی ہلالی آغوش

بن گئی ہے اثرِ جامِ مئے گلگوں سے
مستیٔ بزمِ دو عالم نگہِ بادہ فروش

ہے یہ طالبؔ اثرِ گرمیٔ عشقِ ساقی
میرے ساغر میں ہے ہر موجِ رواں شعلہ بدوش

سید بادشاہ حسین صاحب (حیدرآبادی)

ترغیبِ خودکشی

ایک مصری اور اس کی روح کے درمیان کئی ہزار سال قبلِ مسیح ایک فلسفیانہ مکالمہ

کچھ عرصہ قبل ایک گراں قدر مخطوطہ جرمن اکیڈمی کے ہاتھ لگا۔ اس کی شروع کی عبارت کرم خوردہ ہے۔ اس لئے اس کے طریقہ آغاز پر روشنی نہیں ڈالی جا سکی مگر اتنا ضرور پتہ چلتا ہے کہ کوئی مصری اپنی روح سے گفتگو کر رہا ہے۔ اس مکالمہ کو جرمن نے ترجمہ کیا اور یہ خیال ظاہر کیا کہ یہ کئی ہزار سال قبل مسیح کا ہے

اُن دنوں مصریوں کے عقائد کے موافق انسان کے جسم میں ایک روح نہیں بلکہ متعدد روحیں بستی تھیں۔ ایک تو وہ تھی جو جسم کے بے جان ہوتے ہی عالمِ بالا کی طرف پرواز کر جاتی تھی۔ دوسری جسم کے ساتھ قبر کے تاریک و تنگ گوشہ میں جسم کی رفیق ہوتی تھی۔ اور تیسری دنیا میں رہ کر غلط راستہ پر چلنے والوں کی رہنمائی کرتی تھی۔

ذیل کا مکالمہ ایک مصری اور اس کی ان متذکرہ بالا روحوں میں سے دوسری قسم کی روح کے درمیان معلوم ہوتا ہے اس مکالمہ کا غائر نظروں سے مطالعہ کرنے سے دو خیال ذہن میں آتے ہیں۔ ایک یہ کہ انسان اپنی آئندہ زندگی سے بالکل بے خبر ہونے کی وجہ سے پریشان اور مضطر ہو کر روح سے اپنی تکالیف بیان کرتا ہے۔ اور روح موجودہ اور آئندہ زندگی کے درمیان جو خلیج حائل ہے۔ اس سے متعلق معلومات بہم پہنچاتی ہے۔ اور دوسرا خیال وہی ہے جو جرمن کے ذہن میں آیا اور وہ یہ کہ انسان دنیاوی مصائب و آلام سے پریشان ہو کر اور آئندہ زندگی سے ناامید ہو کر موت کی آرزو کرتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ دنیاوی مصیبتوں سے چھٹکارا حاصل کرنے کا واحد ذریعہ خودکشی ہے۔

مکالمہ کا ابتدائی حصہ جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں — کرم خوردہ ہونے کی وجہ سے پڑھا نہیں جا سکا۔ مگر دو چار لفظ جو سمجھ میں آسکے اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ روح انسان سے شکایت کرتی ہے اور مصری اس کے جواب میں کہتا ہے۔

" . . . . . . تیری شکایتوں میں حقیقت کی جھلک بہت کم ہے اور تیرا گلہ غیر ضروری ہے۔ تو نے آڑے وقت میں کبھی میرا ہاتھ نہیں بٹایا، میری مصیبتوں میں غمخواری نہیں کی —— شاید اس وجہ سے کہ میں نے تیرے اُس بتائے ہوئے راستہ پر چلنے سے انکار کر دیا تھا۔ جو مجھے سیدھا موت کے منہ میں لے جاتا تھا —— میں سچ کہتا ہوں تیرا

کام یہ تھا کہ تو میری پریشان حالیوں کے وقت سہارا دیتی ناشائیتوں کے گروہ سے نکل کر میرے قریب آتی، میرے آنسو پونچھتی اور تسکین اور دلاسہ دیتی مگر تو نے ایسا نہیں کیا مجھے موت کے لپکتے ہوئے شعلوں میں زبردستی نہ دھکیل میں بودا نہیں ہوں۔ سوچ کہ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ زندگی دوبارہ حاصل نہیں کی جا سکتی —— زندگی، اس دنیا کی زندگی! تجھے کیا بتاؤں کہ زندگی میں کتنی لذت ہے کس طرح سمجھاؤں کہ اس لذت میں کس درجہ کشش ہے؟ موت! اف رونگٹے کھڑے ہونے لگے، جسم میں لرزہ پیدا ہونے لگا۔ اور دل کانپنے لگا۔ موت کے بعد پرسش گناہ، پھر عذاب! الامان والحفیظ۔"

روح سے ضبط نہ ہو سکا اور اس نے طیش میں آکر کہا

"تو شیطانی خصائل والے انسان! اے لذت دنیا کا مزہ چکھ کر عاقبت کو بھول جانے والے غافل! گناہ کرتے وقت عذاب سے نڈر کر لذت نفسی پر انسانیت کو قربان کر دینے والے مجرم! تو اپنی ہوسناکی، رندی و مستی سے اجتناب نہیں کرتا اور عاقبت کے عذاب کے خیال سے کانوں پر ہاتھ دھرتا ہے!

مصری نے دخل دیا:۔

"دیکھ! اس طرح پند و نصائح کا خشک گلدستہ میرے آگے پیش کرنے سے کچھ فائدہ نہیں میرے عمل پر تنقید کر کے عاقبت کے عذاب سے ڈرانے سے تیرا مدعا حاصل نہیں ہوگا۔ سن لے! میں بہانگ دہل کہتا ہوں کہ کبھی اپنے پاؤں پر آپ کلہاڑی نہ ماروں گا۔ اور کبھی تیری۔ بہری میں موت کا لقمہ نہ بنوں گا! یہ میرا فیصلہ اٹل ہے کیونکہ میں زندگی سے ابھی ہاتھ دھونا نہیں چاہتا۔

روح نے اس قطعی لہجہ کی کوئی پروا نہ کی بلکہ وہ پہلے سے زیادہ متین انداز میں کہنے لگی:۔

"اس سرزمین رنگ و بو کو گلستاں سمجھا ہے تو
آہ اے ناداں قفس کو آشیاں سمجھا ہے تو

اے ناداں! تو نے اس دنیا کو دائمی عیش سمجھ رکھا ہے۔ خبردار ہو جا کہ تو میدان خار زار میں ہے اور یہاں کا ہر خشک کانٹا تیری آبلہ پائی سے پیاس بجھانے کے لئے بے چین ہے مصیبتوں کا جال بچھائے صیاد گھات میں ہے . . . .

"کسان اپنے خون جگر سے کھیتی کو سینچتا ہے اور فصل تیار ہونے پر اسے کشتی پر لاد کر دریا کا سینہ چاک کرتا گھر کی طرف لوٹتا ہے۔ اس پیداوار کو جمع کرنے کی خوشی سے باغ باغ ہوتا ہے۔ مگر دفعتاً وہ دیکھتا ہے کہ طوفان کے آثار رونما ہو رہے ہیں۔ غریب کسان اپنی جان پر کھیل کر اناج کو بچاتا ہے اور ساحل پر پہنچکر اطمینان کا سانس لینا چاہتا ہے کہ یہ خبر دہشت اثر سنتا ہے کہ اس کی بیوی اور بچے جو اس سے ملنے اور اسکا ہاتھ بٹانے آ رہے تھے۔ طوفان کی نذر ہو گئے۔

ایک مشکل سے تو بچ بچ کے ہوا تھا جینا
پڑ گئی اللہ سے کیا اور نئی

اس مثال سے مصری کا دل موم ہو جاتا ہے۔ اور اس پر یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ

قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

اور وہ کشاکشِ حیات سے رہائی کی فکر کرتا ہے کیونکہ

نے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں
گوشہ میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

پھر وہ اپنی گذشتہ زندگی کو یاد کر کے کہتا ہے:۔

"دیکھو! مجھے ان چیلوں سے بھی زیادہ بدنام کر دیا گیا ہے۔ جو چلچلاتی دھوپ میں مردہ جسموں کی تلاش میں چکر لگاتی ہیں ــــــ مجھے اس طرح ذلیل کیا گیا جس طرح کہ رشک وحسد کی آگ میں جلنے والا ہمسایہ بیوی پر تہمت لگا کر خواہ مخواہ شوہر کے سامنے اس کو ذلیل کرتا ہے ــــــ مجھے اس طرح رسوا کیا گیا جس طرح کہ ایک بہادر لڑکے کے متعلق کمینے لوگ جھوٹے واقعات سے والدین کے کان بھر کر ان کو بدظن کر دیتے ہیں"

"انسان ان تمام باتوں کا مردانہ وار مقابلہ کیونکر کرے جبکہ دنیا والے ظالم اور بودے ہیں۔ میں ان سب باتوں کو کس سے بیان کروں کہ بھائیوں کا خون سفید ہو گیا ہے۔ دوستوں میں محبت عنقا ہو گئی ہے، دل سخت ہو گئے ہیں اور ہر شخص اپنے ہمسایہ کا حق غصب کرنے کے لئے سب سے پہلے آمادہ ہو جاتا ہے، کمزور موت کے گھاٹ اتر رہے ہیں اور طاقتور کا قبضہ روز بروز مضبوط ہوتا جاتا ہے۔ انصاف دنیا سے اٹھ گیا۔ اور بدکاری کا بازار گرم ہو گیا ہے"

"موت ہی اسے پناہ دے سکتی ہے جو دنیا کی دشمنوں اور مصیبتوں سے گھبرا گیا ہو، موت ہی ایک ایسی دوا ہے جو دنیا سے بیزاری کے مرض کو رفع کر سکتی ہے، موت ہی دنیا کی بے پناہ دوڑ دھوپ کے بعد صحیح معنوں میں تسکین دے سکتی ہے۔ موت ہی ایک ایسا تنگ وتاریک گوشہ ہے۔ جہاں امن وسکون کا متلاشی دل بلا شرکت غیرے اطمینان پا سکتا ہے۔

موت اس بوئے پریدہ کا نام ہے جو کنول کی پنکھڑی سے نکل کر پانی کی سطح پر پھسل رہی ہو، موت اس میٹھی نیند کا نام ہے۔ جو کسی مدہوش کی پتلیوں میں گردش کر رہی ہو، موت اس خمار کا نام ہے جس کی کیفیت متوالا کر دے۔

"موت سپاہی کے لئے بازگشت ہے، موت ملاح کے گھر لوٹانے والا جہاز ہے۔ موت وہی خوشی ہے جو ایک قیدی کو قید سے چھوٹ کر گھر جانے کے بعد بیوی اور بچوں کو اپنا منتظر دیکھ کر ہوتی ہے۔"

روح مصری کے اس اعتراف شکست کو اپنی کامیابی سمجھ کر جامہ سے باہر ہو جاتی ہے۔ انسان کو مبارک باد دیتی ہے کہ بالآخر اس نے اپنی عقل سے کام لیکر صحیح راستہ ڈھونڈھ نکالا اور اپنی پچھلی ہٹ دھرمیوں پر نادم ہے۔ اسکے معاوضہ میں وہ اس سے وعدہ کرتی ہے:۔

"اے انسان! تو یہ نہ سمجھ کہ قبر میں تو اکیلا رہیگا۔ اور تجھے تنہا ساری منزلیں طے کرنی ہوں گی، نہیں ایسا نہیں ہوگا۔ بلکہ میں تیرے ساتھ رہوں گی، تیری دلداری کروں گی اور تجھے تنہائی محسوس نہ ہونے دوں گی۔"

روح کا خودکشی کے لئے ترغیب دینا آج تعجب خیز ضرور ہے۔ لیکن عہد عتیق میں مصری فلسفہ اور روحانیت کا یہ ایک اہم جزو تھا فقط۔

جناب روشؔ صدیقی

حیرانِ جمال

لب خاموش ہی جب مجرمِ رسوائی ہو — آہ! کس طرح محبت میں شکیبائی ہو
اس کے اندازِ نوازش کو کہے کیا کوئی — جس کی بیداد بھی اک عالمِ رعنائی ہو
چشمِ احساس کو جو کچھ نظر آئے کم ہے — جب کوئی خود ہی حجابِ شبِ تنہائی ہو
دل کسی اور ہی عالم میں ہے "حیرانِ جمال" — طور ہی نازکشِ انجمن آرائی ہو!
صاحبِ ہوش وہاں بھی ترا دیوانہ رہا — کہ جہاں ہوش بھی دامن کشِ رسوائی ہو
منزلِ شوق ہی ہو جائے خود آوارۂ شوق — یوں بھی اے عشق کبھی بادیہ پیمائی ہو

دل میں اک درد کی دنیا لئے حاضر ہے روشؔ
کاش! یہ نذر بھی شایانِ پذیرائی ہو

جناب کسریٰ منہاس

کارل مارکس

کارل مارکس بتاریخ ۵ مئی ۱۸۱۸ء کو جرمنی کے شہر ٹریو میں ایک نامور یہودی النسل وکیل کے ہاں پیدا ہوا۔ یہ اپنے والد کی آنکھوں کا تارا اور اس کی امیدوں کا مرکز تھا کیونکہ تمام لڑکوں میں سب سے زیادہ ہونہار تھا۔ مدرسے سے فارغ ہو کر کارل مارکس بون اور برلن کی یونیورسٹیوں میں داخل کیا گیا۔ تاکہ فلسفہ اور قانون کی تعلیم حاصل کرے۔ مگر نوجوان مارکس نے شاعری کی مشق کرنی شروع کی اور فوراً ہی اُسے معلوم ہو گیا۔ کہ وہ فطری شاعر نہیں۔ پھر وہ ہیگل کی سرپرستی میں فلسفہ کی تکمیل میں منہمک ہو گیا۔ مگر اس میں بھی وہ اپنی پوری توجہ صرف نہ کر سکا۔ اور اس کی طبیعت جلد ہی اکتا گئی اور وہ ایک عرصہ عقلی اور روحانی بے چینی کا شکار رہا۔ اس کا باپ بیٹے کی آشفتہ مزاجی سے بہت رنجیدہ رہتا تھا۔ اس نے اپنے فلسفیانہ مزاج رکھنے والے بیٹے کو ہمیشہ ملامت کی۔ لیکن والد کی زجر و توبیخ سے کارل مارکس کے پائے استقلال میں ذرا بھی لغزش نہ آئی۔ اور وہ دنیاوی سود و بہبود کی فکر سے ہمیشہ آزاد رہا۔ کیونکہ قدرت نے حصولِ زر سے بھی کہیں زیادہ اہم کام کے لئے اُسے پیدا کیا تھا۔

کارل مارکس نے اپنی تمام عمر فلسفہ افلاس کے حل [illegible]

دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ سمجھتا تھا۔ کہ یہی وہ بلا ہے۔ جو انسان کی روحانی اور اخلاقی ترقی میں سدِ راہ ہے۔ اور اسی سے غلامی کی بنیادیں مضبوط ہوتی ہیں۔ اس نے محسوس کیا کہ عوام کی حالت سخت خستہ ہے۔ یہ کیا راز ہے؟ کہ کسان جس کی مشقت پر شاہنشاہی کا دار و مدار ہے۔ پیٹ بھر کر کھانا بھی حاصل نہیں کر سکتا اور مزدور جس کے گاڑھے پسینے کی کمائی سے سرمایہ کے عالی شان محلات تعمیر ہوتے ہیں مفلس نادار اور ذلیل ہے کاشتکار جس کی طاقت کا لوہا مان کر زمین سونا اگلتی ہے ہمیشہ تنگ دست رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عیش پرست امرا تو زر و جواہر میں کھیلیں۔ لیکن محنت و مشقت کرنے والے لوگ نانِ شبینہ کو بھی محتاج رہیں۔ یہ سوالات جوان مارکس کو پہروں سوچنے پر مجبور کرتے۔ اس نے انہی سوالات کے حل کے لئے اپنی زندگی وقف کر دی۔ اور اپنے آرام و آرائش کو خاک میں ملا دیا۔ وہ سوچتا تھا کہ پیشہ ور جماعتوں کو اخلاق۔ صحت اور روح کو ہلاک کر دینے والی مفلسی سے کیونکر نجات دی جا سکتی ہے؟

کارل مارکس نے خلوت اور جلوت میں اپنے خیالات کا اظہار کرنا شروع کر دیا۔ اس کی والدہ نے انتہائی رنج [illegible]

کے خارزار میدانوں میں چلا گیا ہے۔ کیونکہ اُسے اپنے بیٹے سے بہت امیدیں تھیں۔ اسے یقین تھا کہ اسکا بیٹا علمی قابلیت سے ایک بے انتہا دولت اور شہرت کا مالک ہوگا۔ لیکن اُس بے چاری کو کیا علم تھا۔ کہ اس کا جگر گوشہ اپنی تمام عمر جلا وطنی. عسرت اور ناداری میں بسر کریگا۔ نہ صرف یہ بلکہ اس کی قبر بھی اپنے وطن سے بہت دور سمندر پار بنے گی۔

۱۸۴۳ء میں کارل مارکس کی شادی ایک حسین بنکدل اور معزز خاتون سے ہوگئی تھی جو تنگدستی اور جلا وطنی کی زندگی میں بھی اس کے شریک حال رہی۔ اور جس نے مصائب اور آلام کا ہمیشہ خندہ پیشانی سے مقابلہ کیا۔ جس طرح مزدور پیشہ جماعتوں کی حالت بہتر بنانے کا خیال مارکس کو تھا۔ اس سے بڑھکر جبتنی ان کو اچھی حالت میں دیکھنے کی آرزومند تھی۔ اس شوہر پرست خاتون نے اپنے دو بچوں کی زندگیاں بھی اس جد وجہد میں نثار کردیں۔

۱۸۴۲ء میں کارل مارکس نے اخبار نویسی شروع کی۔ تاکہ کچھ نہ کچھ ذریعہ معاش کی بھی صورت پیدا ہو جائے۔ اور عوام میں وہ اپنے خیالات کا اظہار بھی کرسکے۔ ان دنوں جب جرمنی میں مطلق العنان حکومت اپنے پورے زوروں پر تھی۔ عوام آزادی ایسی نعمت سے محروم تھے۔ سر برآوردہ اور ذکی بہترین قوم دور ملوکیت کے خلاف جدوجہد میں معروف تھے۔ کارل بھی ان مددگار بن گیا۔ اور اخبار رینش گزٹ میں اس کی زبردست تحریروں نے دھوم مچادی۔ اور وہ ایک قلیل عرصہ کے بعد اس کا چیف ایڈیٹر بنگیا۔ اس نے بڑی قابلیت سے اخبار کی ذمہ داریوں کو اپنے کاندھے پر اٹھانے رکھا اور

حکومت کے خلاف اس کی تحریروں نے عوام سے خراج تحسین حاصل کیا۔ یہاں تک کہ ایک کثیر جماعت اس کی ہمخیال ہوگئی۔ آخر حکومت اُس کی بے پناہ تحریری ضربات کو برداشت نہ کرسکی۔ اور یہ اخبار اپریل ۱۸۴۳ء میں حکماً بند کر دیا گیا۔

اب مارکس نے سوچا کہ جرمنی میں رہ کر وہ کوئی مفید کام نہیں کرسکتا۔ اُس زمانے میں فرانس کے اخبارات یورپ کے افلاس کو دور کرنے کے لئے مسئلہ اشتراکیت کی حمایت میں زبردست مضامین لکھ رہے تھے۔ نیز وہ سیاسی اعتدال پرستی پر اب قانع بھی نہیں رہا تھا۔ کیونکہ اس میں کسانوں اور مزدوروں کی امداد کا کوئی علاج شامل نہ تھا۔ اس لئے اُسنے فرانسیسی "اشتراکیوں" کے خیالات کے مطالعہ کا عزم بالجزم کرلیا اور جرمنی سے فرانس چلا گیا۔ جو اس وقت تمام محبان آزادی کا واحد مرکز تھا۔

پیرس پہنچتے ہی وہ ایک آزاد خیال اخبار "ویورٹس" کا ایڈیٹر بن گیا۔ جس کے اجرا کا مقصد جرمن سیاسی تحریک کو ترقی دینا تھا۔ جرمن حکومت کو اس سے اندیشہ پیدا ہوگیا۔ اور اس نے فرانس گورنمنٹ سے "ویورٹس" کے بند کرنے کی درخواست کی۔ ۱۸۴۵ء میں فرانس کے وزیر موسیو گوئزوٹ نے مذکورہ اخبار کو خلاف قانون قرار دیا۔ اور اس کے تمام مضمون نگاروں کو ملک بدر کردیا۔ مارکس اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ برسیلز چلا گیا۔ وہاں تین سال تک رہا۔ اور سیاسی جلاوطن جرمنوں سے ملاقاتیں کیں۔ وہاں ایک اخبار "ڈوئشی بروسیلر زیٹنگ" جو جرمنی جلاوطنوں کا اخبار تھا۔ اور جسمیں مزدوروں کے لئے

پولیٹیکل اکولومی پر مضامین شائع ہوا کرتے تھے) کی ادارت اپنے ذمہ لی ۔۔۔ وہاں مختلف اشتراکی سوسائیٹیوں کی ایک لیگ قائم کرکے ایک اعلان ۲۴ فروری ۱۸۴۸ء کو شائع کیا۔ اور اسی روز دنیا نے سنا کہ پیرس میں انقلابِ عظیم برپا ہوگیا شاہِ فرانس بھیس بدل کر بھیس روپوش ہوگیا۔ اور وزیر فرانس جس نے مارکس کو ملک بدر کیا تھا کسی غیر ملک میں جاکر پناہ گزین ہوا۔ فرانس میں عارضی حکومت کے قیام کے فوراً بعد جمہوریت کا اعلان کر دیا گیا۔ ایک عرصہ سے جرمن گورنمنٹ بلجیم کے ارکینِ سلطنت کو درپردہ مارکس کو بلجیم سے نکال دینے پر زور دے رہی تھی۔ مگر وہ کامیاب نہ ہوسکی۔ آخر فروری ۱۸۴۸ء میں مزدور پیشہ جماعتیں اشتراکیت کی بہت حد تک حامی ہوگئیں جس سے بلجیم گورنمنٹ کے حواس باختہ ہوگئے۔ اور آخر مارکس کو بلجیم کے چھوڑ دینے کے لئے فوری احکام صادر کر دیئے گئے۔

انقلابِ فرانس نے اب اس کے لئے پیرس کا راستہ بالکل صاف کر دیا۔ اور گورنمنٹ فرانس نے بھی مارکس کو فرانس آنے کی دعوت دی۔ چنانچہ مارکس پھر پیرس واپس آگیا لیکن چند ماہ کے قیام کے بعد ایک اخبار "نیو رنش زیٹنگ" جس میں جمہوریت۔ مساوات۔ حریت اور اخوت کا پرچار ہونا تھا نکالنے کی غرض سے جرمنی چلا گیا اور یکم جون ۱۸۴۸ء کو اس کا پہلا پرچہ شائع ہوا۔ لیکن اس اخبار کی پالیسی بھی گورنمنٹ برداشت نہ کر سکی۔ اسی سال ایک "ڈیموکریٹک کانگرس" کولون میں منعقد ہوئی جس میں مارکس نے بڑی سرگرمی سے حصہ لیا۔ البرٹ بریسبین ایک امریکن سوشلسٹ جو اس جلسہ میں شامل تھا۔ مارکس کے متعلق رقم طراز ہے۔

"میں نے مارکس کو دیکھا۔ جو تحریکِ آزادی کا علمبردار ہے۔ اس نے مزدوری اور سرمایہ داری پر جو کچھ لکھا اور جو اصول سوشلزم کے اس نے وضع کئے اس سے یورپ کی سوشلسٹ تحریک کو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بہت تقویت اور عروج حاصل ہوا اس کی عمر تیس سال کے قریب ہوگی۔ پستہ قد۔ گٹھیلا جسم۔ خوبصورت چہرہ اور سر پر گھونگریلے بال۔ اس کی تقریر سے مترشح ہوتا تھا۔ کہ اس کے اندر بے پناہ قوت ہے۔ وہ اس کی پاکیزگیٔ اخلاق کے پسِ پشت ایک عزمِ صمیم اور اعلےٰ جذبات کی آگ روشن ہے۔ وہ سرمایہ کی طاقت سے سخت متنفر ہے۔ کیونکہ یہ طاقت ظلم اور خود غرضی پر مبنی ہوتی ہے۔ اور اس نے مزدور پیشہ اقوام کو غلام بنایا ہوا ہے۔ اس نوجوان کی زبان سے ہمارے موجودہ اقتصادی لائحۂ عمل کی مخالفت میں جو الفاظ پہلے پہل میں نے سنے وہ اب تک میرے کانوں میں گونج رہے ہیں!!

جرمن گورنمنٹ کارل مارکس کی آزادانہ تحریروں سے بہت غضبناک ہوگئی۔ اور آخر ۷ فروری ۱۸۴۹ء کو مارکس اور اس کے ہم جلیسوں پر چند ارکینِ سلطنت اور سرکاری وکیلوں کے خلاف توہین آمیز الفاظ استعمال کرنے کا الزام لگایا گیا۔ مارکس نے اپنی صفائی کی شہادت خود ہی پیش کی۔ اور جیوری کے روبرو متواتر ایک گھنٹہ تک تقریر کی اسکی تقریر کے آخری الفاظ یہ تھے: "نہ صرف جرمنی کی عام حالات بلکہ ہر دیگر کی صورت معاملات ہم اخبار نویسوں پر یہ فرض عائد کرتی ہے کہ گورنمنٹ کی ہر ایک کارروائی کو مشکوک نگاہوں سے دیکھیں

اور پبلک کے سامنے موجودہ نظامِ حکومت کے خفیف سے خفیف ظلم کی علانیہ مذمت کریں۔ حدیث جولائی کے مہینے میں ہمیں خلافِ قانون گرفتاریوں کے متعلق صدائے احتجاج بلند کرنی پڑی تھی۔ اخبارات کا یہ فرضِ اولیں ہے کہ مظلوموں کی حمایت کریں۔ اور ان کی جد وجہد میں مدد کریں۔ محض عام حالت اور اعلیٰ طاقتوں ہی سے جنگ کرنا مقصود نہیں۔ بلکہ اخبارات کو عزم بالجزم کر لینا چاہیے۔ کہ وہ سرکاری وکیلوں، کونسلوں اور کانسٹیبلوں تک کی خبر لیں گے۔ مارچ کے انقلاب نے صرف اعلیٰ سیاسی جماعت کی اصلاح کی ہے۔ لیکن بہ ترتیب کا بدستور وہی رویہ ہے۔ وہی پرانی ملازمتِ شاہی۔ وہی پرانی فوج۔ وہی پرانی عدالتیں اور وہی پراسیکیوٹر جو سب مطلق العنانی کے دور میں پیدا ہوئے۔ اسی عہد میں تعلیم پائی ابھی تک موجود ہیں۔ پس اس وقت اخبارات کا اولیں فرض یہ ہے کہ وہ موجودہ سیاسی مصلحین کی اعانت کریں۔"

جیوری نے جب یہ اثر میں ڈوبے ہوئے الفاظ سنے تو وہ حیران رہ گئی اور اس نے مارکس اور اس کے ساتھیوں کو عزت سے رہا کر دیا۔ لیکن دو روز ہی کے بعد یعنی ۹ فروری ۱۸۴۹ء کو مارکس اور اس کے رفیقوں پر ایک اور الزام لگایا گیا کہ وہ بادشاہ کے خلاف مسلح بغاوت کرنے پر آمادہ ہیں۔ اور لوگوں کو اکسا رہے ہیں۔ مارکس نے اس کی صفائی میں بھی ایک زبردست تقریر کی اور آخر وہ اس سنگین جرم سے بھی رہا کر دیا گیا۔ بلکہ ممبرانِ جیوری نے اس کی دلچسپ نتیجہ خیز اور سبق آموز تقریر کا اپنے ایک ممبر کے ذریعے شکریہ بھی ادا کیا۔

مئی ۱۸۴۹ء میں ڈریسڈن اور صوبجات رائن کے بیشتر مقامات میں بغاوت ہو گئی جس سے گورنمنٹ پروشیا نے مارکس کو ملک بدر کرنے کے احکام جاری کر دیئے۔ اس کے اخبار کا آخری پرچہ ۹ مئی کو سرخ سیاہی سے چھاپا گیا۔

مارکس نے پھر پیرس کا رخ کیا۔ اور وہاں سے تھوڑے دنوں کے بعد لنڈن چلا گیا۔ افلاس کے ہاتھوں طرح طرح کے مصائب اٹھائے۔ لنڈن میں قیام کے دوران میں سخت مصائب و نوائب برداشت کئے۔ خشک روٹی کے سوا اس کی کوئی خوراک نہ ہوتی تھی بعض اوقات بچوں کی گرسنگی کا خوف آستانہ فاقہ پر مجبور کرتا۔ وہ خالی پیٹ برٹش میوزیم میں مطالعہ کے لئے چلا جاتا۔ رسالوں اور اخباروں کے لئے مضمون لکھتا۔ اور گزر اوقات کرتا۔ ایک دفعہ عسرت نے یہاں تک مجبور کیا۔ کہ اس نے ریلوے کے ایک دفتر میں کلرکی کی درخواست کی۔ لیکن وہ اس وجہ سے نامنظور ہو گئی کہ اس کا خط اچھا نہ تھا۔ دنیا کی تاریخ اس عبرت اثر واقعہ کو کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ کہ جرمنی کے ایک شہرۂ آفاق ذی رتبہ اور جلیل القدر ادیب اور انشا پرداز کو ریلوے کی کلرکی بھی نہ مل سکی۔ بعد ازاں کارل مارکس نیویارک کے اخبار "ٹریبیون" کا لنڈنی نامہ نگار مقرر ہو گیا جس سے ایک پونڈ فی ہفتہ معاوضہ ملنے لگا۔ اس قلیل رقم پر تمام کنبہ کا گزارہ تھا لیکن یہ آمدنی بھی کچھ عرصہ کے بعد نصف رہ گئی۔

عسرت اور ناداری کے اس عالم میں بھی لنڈن کے کاریگروں کو پولیٹیکل اکونومی پر جو لیکچر دیا کرتا تھا۔ اس کا معاوضہ کبھی اس نے منظور نہ کیا تھا کیونکہ اس کی زیست کا اہم ترین مقصد

غربا اور مزدوروں کی اعانت کرنا تھا۔ اس فلاکت کے دوران میں جرمنی کے وزیر اعظم بسمارک نے ایک کثیر رقم بطور رشوت دینے کی کوشش کی کہ وہ مزدوروں میں روح آزادی پھونکنے سے باز رہے۔ مگر وہ اس میں کامیاب نہ ہوسکا۔

انہیں دنوں بسمارک کی تحریک سے اس کے ایک قدیمی دوست بوچر نے اُسے ایک سرکاری اخبار کی نامہ نگاری کے لئے لکھا۔ مگر مارکس نے صاف انکار کر دیا۔ اپنے دامن پر سرکار پرستی کا ناپاک دھبہ نہ لگنے دیا اور اپنی ذاتی ضروریات پر اصول کو ترجیح دی۔ اور بسمارک کی یہ کوشش بھی ناکام رہی۔

۱۸۶۴ء میں مارکس نے اپنے چند ایک ہم خیال دوستوں کے ساتھ ملکر ایک بین الاقوامی انجمن کی بنیاد ڈالی جس نے یورپ کی سیاسیات میں ایک ہل چل مچا دی۔ میزینی نے بھی اٹلی کے کاریگروں کی طرف سے اس انجمن میں شرکت کی۔ مگر اُسے انجمن کے تمام قوانین سے اتفاق نہ تھا۔ اس لئے تھوڑے عرصے کے بعد ہی وہ علیحدہ ہو گیا۔ اس انجمن کے سالانہ اجلاس بڑے تزک و احتشام سے مختلف شہروں میں بڑی کامیابی سے ہوتے۔ پروگرام مرتب ہوتے اور ریزولیوشن پاس ہوتے تھے۔ اس انجمن کا سب سے بڑا فائدہ یہ تھا کہ مختلف ممالک کی مزدوری پیشہ جماعتوں میں اتفاق اور اتحاد کا رشتہ مستحکم ہو گیا۔ مارکس کا نعرۂ جنگ "سب ملکوں کے مزدورو! متحد ہو جاؤ" تمام یورپ میں گونج اٹھا۔ اس انجمن کے اراکین کو گورنمنٹ نے قسم قسم کی اذیتیں پہنچائیں۔ مگر اس کی طاقت میں ہر سال نمایاں اضافہ ہوتا گیا۔

آخر ۱۸۶۳ء میں فرانس، جرمنی اور پیرس کے اشتراکیوں کے جھگڑوں سے تحریک کو بہت نقصان پہنچا۔ اس کے بہت سے سرگرم اراکین کام آگئے۔ اور دوسرے حامی خوفزدہ ہو گئے۔ ممبروں میں پھوٹ پڑ گئی۔ ایک جماعت کا لیڈر مارکس تھا۔ جو امن پسندانہ آئینی طریقوں پر کاربند تھا۔ دوسری جماعت کا رہنما روسی فلاسفر مائیکل بکونن تھا۔ جو انقلاب پسند تھا۔ اس اتفاق سے انجمن مذکورہ ۱۸۷۲ء میں ٹوٹ گئی۔

۱۸۸۱ء میں مارکس کی وفادار اور چہیتی بیوی کا انتقال ہو گیا۔ اور ۱۴ مارچ ۱۸۸۳ء کو وہ خود بھی راہی ملک بقا ہو گیا۔ تیرہ سال سے اس کی صحت اچھی نہ تھی۔ کثرت افکار نے اس کی صحت پر بہت اثر ڈالا تھا۔ دماغی تکان اور خراب خوراک نے اس کے جسم کے تمام نظام کو درہم برہم کر دیا تھا۔

مارکس ہائی گیٹ کے قبرستان میں مدفون ہوا۔ جہاں اس کی بیوی دائمی نیند سو رہی تھی۔ چند سال ہوئے یہ تجویز کی گئی تھی کہ اس کی قبر پر ایک عظیم الشان یادگار قائم کی جائے۔ مگر اس کے ایک معتقد نے [illegible] کہ اس کی یادگار تو بنی نوع انسان کے دلوں میں کب کی قائم ہو چکی۔ اگرچہ وہ ڈھلے ہوئے پیتل کی شکل میں نہیں۔ تمام جہاں [illegible] تحریکیں اسی کی یاد ہیں۔ اور سوشلسٹ طاقتوں کی ہر فتح اس کی یادگار کو بلند کرتی ہیں۔

مارکس اپنے دل میں بنی نوع انسان کے لئے [illegible] ہمدردی محسوس کرتا تھا۔ یورپ میں یہ پہلا فلاسفر تھا جس [illegible] وارثوں کے خلاف مزدوروں کی حمایت میں جنگ کی۔ وہ عوام [illegible] خیرخواہ، مربی اور فیض رساں تھا۔ اس کی تحریر میں چھپی ہوئی تقریر [illegible] بے پناہ طاقت پنہاں ہوتی تھی جب بھی وہ کوئی بات کہتا [illegible] دلوں پر نقش ہو جاتی اور وہ طاقتیں جو ایک عرصے [illegible]

پروفیسر عبداللطیف صاحب تپش۔ ایم۔ اے ایم او ایل

ہم بھی چپ رہے

تم نے جو قدرِ آہ نہ کی ہم بھی چپ رہے
پروائے رسم و راہ نہ کی ہم بھی چپ رہے

ذکرِ وفا پہ جب وہ ہوئے بدگماں سے کچھ
پھر زندگی تباہ نہ کی ہم بھی چپ رہے

خونِ جگر کا رنگ بدلتا رہا مگر
"بیدید" نے نگاہ نہ کی ہم بھی چپ رہے

کچھ سوچ کر ہی شکوۂ اغیار پی گئے
تائیدِ خواہ مخواہ نہ کی ہم بھی چپ رہے

واعظ نے بتکدے میں کیا وعظِ خامشی
تعریفِ خانقاہ نہ کی ہم بھی چپ رہے

توبہ کے ساتھ ساغرِ ہستی چھلک گیا
پھر جراتِ گناہ نہ کی ہم بھی چپ رہے

افشائے رازِ عشق کا اللہ رے خیال
دل نے بھی ڈر کے آہ نہ کی ہم بھی چپ رہے

آخر کو دل کی دل میں رہی حسرتِ فغاں
تیرِ نظر نے راہ نہ کی ہم بھی چپ رہے

راہِ وفا میں ٹھوکریں کھایا کئے تپش
پروائے عزّ و جاہ نہ کی ہم بھی چپ رہے

نوشتہ فرانسیسی افسانہ نگار موپاساں — مترجمہ حضرت علی احمد صاحب — (افسانہ)

عورت کی لاش

میں اُس سے محبت کرتا تھا۔ ہاں میں اُسے اپنی جان سے زیادہ چاہتا تھا۔ ہم محبت کیوں کرتے ہیں؟ یہ ایک عجیب بات معلوم ہوتی ہے کہ ایک شخص دنیا کی تمام چیزوں کو چھوڑ کر صرف ایک ہی ہستی کو اپنے دل میں جگہ دے۔ ایک ہی خیال اور ایک ہی آرزو رکھے۔ صرف ایک ہی نام کا ورد کرے . . . . وہ نام جو طوفان خیز دریا کی طرح دل کی گہرائیوں میں سے نکلتا ہے۔

محبت کے تمام افسانوں کا میں ذکر نہیں کروں گا اسلئے کہ محبت صرف ایک ہی داستان رکھتی ہے اور اُس کا انجام وہی ہوتا ہے۔ جو ہمیشہ سے ہوتا چلا آیا ہے۔ میں نے اُس سے محبت کی۔ اُس کو اپنا شریکِ زندگی بنایا۔ اس کی محبت بھری آغوش میں رہا۔ اُس کی محبت پاش نظروں میں گم رہا۔ اُس کی سحر آفریں باتوں میں بے خود رہا۔ یہاں تک کہ میں اپنے آپ کو بھول گیا۔

پھر وہ مر گئی۔ کس طرح؟ میں نہیں جانتا۔ اور اب بھی میں کچھ نہیں جانتا۔ برسات کی ایک سرد شام کو وہ بھیگی ہوئی آئی۔ دوسری صبح وہ بیمار تھی۔ کھانسی آ رہی تھی۔ ایک ہفتہ تک وہ بستر پر پڑے پڑے کھانستی رہی۔ اُس کو کیا ہو گیا تھا۔ میں نہیں جانتا۔ ڈاکٹر آئے۔ نسخے لکھے اور چلے گئے۔ لیکن بے سود اس کے ہاتھ گرم تھے۔ ابرو نم آلود تھے۔ آنکھوں میں چمک تھی۔ لیکن اس سے ناامیدی ٹپکتی تھی۔ میں نے اُس سے گفتگو کی اس نے مجھے جواب دیا۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے سے کیا کہا ——— میں نہیں جانتا ——— مجھے اب کچھ یاد نہیں۔ میں سب کچھ بھول گیا ہوں وہ مر گئی۔ مجھے یاد ہے۔ اچھی طرح یاد جب اس نے آخری کمزور سانس لی تھی۔ تو میں نے آہ کی اور میں سمجھ گیا۔

میں کچھ نہیں سمجھا۔ اب تک کچھ بھی نہیں۔ ہاں ایک منظر مجھے اب تک یاد ہے۔ جب اُس کو میری نظروں کے سامنے سپردِ خاک کیا گیا۔

اُس کو دفن کر دیا گیا۔ لوگ اس کی نیکیوں کا ذکر کرتے تھے۔ مجھ میں سننے کی طاقت نہ تھی۔ میں نکل گیا۔ دور بہت دور۔ کئی گھنٹے میں چلتا رہا۔ پھر گھر واپس آیا۔ یہاں میں نے دیکھا وہ پلنگ جس پر وہ سوتی تھی وہ کرسی جس پر وہ بیٹھتی تھی گھر کی تمام چیزیں اسی قرینے سے رکھی ہوئی تھیں جس قرینے سے اس نے رکھا تھا۔ ہر چیز اُس کی یاد دلا رہی تھی۔ مجھ سے ٹھہرا نہ گیا۔ میں گھبرا کر باہر دوڑا۔ دفعتہً اُس قدِ آدم آئینہ پر نظر پڑی جس کو اُس نے دروازے کے قریب رکھا ہوا تھا۔ تاکہ وہ گھر سے نکلتے وقت سر سے پاؤں تک اپنی آرائش کا جائزہ لے سکے۔ میرے قدم اُس آئینہ کے سامنے رُک گئے۔ گئے

وہی آئینہ جس نے ہزاروں بار اُس کی صورت دیکھی تھی۔ میرے سامنے تھا۔ میں ایک سکتہ کے عالم میں آئینہ کے سامنے کھڑا تھا۔ میرے پاؤں لغزش کر رہے تھے۔ میری آنکھیں آئینہ پر جمی ہوئی تھیں۔ شفاف اور چمکتی گہرائیوں پر جو خالی — بالکل خالی تھیں۔ اور کبھی اپنے اندر اس کی حسین تصویر رکھتی تھیں۔ ایسا معلوم ہوا کہ مجھے آئینہ سے کچھ اُنس سا ہو گیا ہے۔ میں نے ہاتھوں سے اُسے مس کیا۔ وہ ٹھنڈا تھا۔ میں گھر سے باہر آ گیا اور بغیر کسی قوت ارادی کے یہ جانتے ہوئے کہ میں کیا کر رہا ہوں۔ بغیر کسی خواہش کے میں قبرستان کی طرف جا رہا تھا —— میں نے اُس کی قبر دیکھی بہت سادہ تھی۔ اور ایک سنگ مرمر کا پتھر اُس کے قبر پر قائم تھا جس پر یہ الفاظ کندہ تھے۔

"اس نے محبت کی۔ محبت کی گئی۔ اور مر گئی!"

وہ وہاں تھی زمین کے اندر۔ ایک خاک کا تودہ۔ مجھ پر رقت طاری ہوئی۔ اور میں اپنی پیشانی کو قبر پر رکھ کر بے ساختہ سسکیاں لے لے کر رونے لگا ——۔ میں وہاں دیر تک رہا۔ بہت دیر تک یہاں تک کہ میں نے دیکھا رات آ رہی ہے اور تاریکی بڑھتی جا رہی ہے۔ اُس وقت میرے دل میں ایک عجیب خواہش پیدا ہوئی۔ وہ غیر فطری جذبہ جو ایک مایوس عاشق کے دل میں پیدا ہوتا ہے —— میں نے چاہا کہ رات اُس کے قریب بسر کروں۔ آخری رات اُس کی قبر پر رونے میں۔ لیکن اس خیال سے کہ لوگوں کو کچھ شبہ نہ ہو میں اُس کی قبر پر سے اُٹھ کر اس چھوٹی سی مردوں کی بستی میں پھرنے لگا۔ یہ چھوٹی سی خاموش اور سنسان بستی [illegible] سے بہت ہی مختصر تھی، جس میں زندہ لوگ بستے ہیں۔ میں اس قبرستان کے آخری حصہ میں پہنچا جہاں تمام قبریں ویران حالت میں اپنی ویرانی کی داستان دہرا رہی تھیں۔ ان تربتوں کی دیواریں شق ہو گئی تھیں اور کوئی کتبہ موجود نہ تھا۔ غالباً طویل مدت نے انہیں خاک میں ملا دیا تھا۔ خودرو گھاس بسیار بیلیں جنگلی گلاب اور خاردار درخت اس سرزمین میں انسانی گوشت کی کھاد سے نہایت تر و تازہ معلوم ہو رہے تھے —— میں تنہا اور بالکل تنہا تھا۔ میں نے ایک گنجان درخت کے پیچھے اپنے آپ کو چھپا لیا۔ درخت کی گھنی شاخوں کی وجہ سے مجھے کوئی دیکھ نہ سکتا تھا۔ میں درخت کے مضبوط تنے سے لپٹا ہوا رات کا بےچینی سے انتظار کر رہا تھا۔

جب تاریکی بڑھ گئی اور رات بھیگ چکی تو میں اپنی جگہ چھوڑ کر آہستہ آہستہ لاشوں سے پٹی ہوئی زمین پر چلنے لگا۔ دیر تک۔ بہت دیر تک گھومتا رہا۔ لیکن اُس کی قبر کا نشان مجھے نہ مل سکا۔ میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر تاریکی میں سے قبروں کو گھورا کیا۔ پتھروں اور قبروں سے ٹھوکر کھا کر کئی مرتبہ گرا اور پھر اُٹھا اُس اندھے کی طرح جو اپنی راہ کی تلاش میں مصروف ہو میں نے ہاتھوں سے ایک ایک قبر کو چھوا اور کانپتی ہوئی انگلیوں کو کندہ الفاظ پر پھیرتے ہوئے ہر ایک کا نام پڑھا۔ وہ رات بھی کس قدر تاریک تھی میں بیان نہیں کر سکتا۔ میں اُسے تلاش نہ کر سکا۔ سیاہ آسمان پر چاند کا پتہ نہ تھا۔ کچھ تارے تاریک ابر کے پردوں سے جھانک رہے تھے —— مجھ پر خوف طاری ہو گیا ہر طرف قبریں ہی قبریں۔ میرے پاؤں لڑکھڑانے لگے۔ اور میں ایک قبر پر بیٹھ گیا اور [illegible] تھا۔

خاموشی — موت کی سی خاموشی تھی۔ دل کے دھڑکنے کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ دفعتہً عجیب قسم کی آواز دل سے ساری فضا گونج اٹھی۔ میں چونک پڑا اور ادھر اُدھر دیوانوں کی طرح دیکھنے لگا۔ یہ آوازیں قبروں میں سے آ رہی تھیں —— میں اس حالت میں وہاں کب تک بیٹھا رہا میں نہیں جانتا۔ مجھ پر خوف سے سکتہ سا طاری ہو گیا۔ اور میں قبر پر گر پڑا —— یکایک مجھے ایسا معلوم ہوا کہ قبر کا وہ پتھر جس پر میں پڑا ہوا تھا حرکت کر رہا ہے —— اور درحقیقت اُس میں حرکت ہو رہی تھی جیسے اندر سے کوئی باہر کی طرف دھکیل رہا ہے —— ایک چیخ کے ساتھ میں اُچھل کر دوسری قبر کے قریب آ گیا اور اب میں نے دیکھا —— میں نے دیکھا کہ وہ قبر جس پر میں بیٹھا ہوا تھا کھل گئی اور اس میں سے ایک برہنہ مرد جو صرف ہڈیوں کا ڈھانچہ تھا باہر نکلا۔

رات اگرچہ کافی تاریک تھی لیکن اس وقت میں اس کی قبر کے کتبے کو صاف پڑھ سکتا تھا۔ اُس پر کندہ تھا۔

"اس نے ۵۱ سال کی عمر میں انتقال کیا۔ یہ ایک
نیک اور ایماندار شخص تھا۔ جو اپنے خاندان سے
محبت کرتا تھا۔ اور خدا کی عبادت کرتا ہوا دنیا
سے رخصت ہوا۔"

اب وہ مردہ خود اپنی قبر کے کتبہ کو غور سے پڑھ رہا تھا اور جب وہ پڑھ چکا تو اس نے ایک چھوٹا سا پتھر اٹھایا۔ اور کتبہ کے کندہ الفاظ کو نہایت ہوشیاری کے ساتھ اُس پتھر سے کھرچ کر مٹانے لگا۔ رفتہ رفتہ اُس نے اپنی آنکھوں کے خالی حلقوں سے گھورتے ہوئے تمام تحریر کو مٹا کر ۵۱ ح

پتھر پر کندہ تھی۔ پھر اُس نے اپنی انگلیوں کی ہڈی سے پتھر پر حسب ذیل تحریر صاف طور پر لکھی۔

"اس نے ۵۱ سال کی عمر میں انتقال کیا۔ اپنی سختی کی وجہ
سے اپنے باپ کی موت کا باعث ہوا اس لئے کہ یہ اس کی
ملکیت پر جلد قابض ہونا چاہتا تھا۔ اس نے اپنی بیوی
اور اپنی اولاد کو طرح طرح کی اذیتیں دیں اور عذاب میں
رکھا۔ ہمسایوں کو دھوکا دیا اور ایک ذلیل موت مرا۔"

اُس ہڈیوں کے ڈھانچہ نے اپنا لکھنا ختم کیا اور پھر اپنے لکھے ہوئے کو پڑھنے لگا۔ میں دفعتہً مڑا۔ اور اپنے گرد و پیش نظر دوڑائی —— میں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ میں نے دیکھا کہ تمام قبریں کھلی ہوئی ہیں اور ہر ایک مردہ اپنی قبر کی اُس جھوٹی کندہ عبارت کو مٹا رہا ہے۔ جو اس کے رشتہ داروں نے لکھی تھی اور اپنی ہڈی سے صحیح واقعات لکھ رہا ہے۔ میں نے پڑھا کہ ان میں سے ہر ایک بد باطن۔ ریاکار، مکار، چور، جھوٹا اور دھوکہ باز تھا اور کسی نہ کسی جرم کا مرتکب تھا۔ اور ان کے رشتہ داروں نے ان کی قبروں پر جو لکھا تھا اُس میں سے ایک لفظ بھی درست نہ تھا — غرض تمام اپنی قبروں پر بیٹھے ہوئے اس سچائی کا اظہار کر رہے تھے جو دنیا ناواقف ہے یا ناواقف ہونے کا بہانہ کرتی ہے۔

یکایک مجھے خیال آیا کہ وہ بھی اپنی قبر پر بیٹھی لکھ رہی ہوگی۔ اس خیال کے آتے ہی میں بے خوف ہو کر — دیوانہ وار قبروں اور زندہ لاشوں کے درمیان بھاگنے لگا۔ لیکن جلد ہی میں اس کی قبر کے پاس پہنچ گیا۔ میں نے اُسے پہچان لیا۔ لیکن صورت نہ دیکھ سکا کیونکہ وہ کفن میں خود کو لپیٹے ہوئے تھی —— میں نے دیکھا کتبہ جو رکھا ہوا تھا اس پر پہلے یہ کندہ تھا :۔

جناب حفیظ ہوشیارپوری۔ ایم۔ اے

گیت

کیسے کٹے گی رات

پیا بن
کیسے کٹے گی رات

(۱)
جب سے پی کے بس میں جی ہے!
اُس دن سے لب پر پی پی ہے!
نینن سے برسات لگی ہے!
نینن سے برسات!

پیا بن
کیسے کٹے گی رات!

(۲)
یاد آئے وہ پل پل چھن چھن[1]! !
نیند اچاٹ ہوئی ہے اُس بن!
تھک گئیں آنکھیں تارے گن گن!
ہووت نا پربھات[2]!

پیا بن
کیسے کٹے گی رات!

(۳)
کب آئے گا پیارا ساجن؟
میرا راج دلارا ساجن!
میری آنکھ کا تارا ساجن!
کوئی نہ پوچھے بات!

پیا بن
کیسے کٹے گی رات!

[1] لمحہ [2] صبح

محترمہ شکیلہ اختر

شاید

ستمبر کا مہینہ تھا۔ بارش نہایت زور شور سے ہو رہی تھی۔ لوگوں کی نظریں حسرت سے کبھی آسمان کی طرف اُٹھتیں اور کبھی زمین کی طرف۔ مگر سوائے پانی کے اور کوئی چیز دکھائی نہ دیتی تھی ۲۷ ستمبر کو اتنی بارش ہوئی کہ اس کے خیال سے اب بھی دل کانپ جاتا ہے کچی سڑکوں کا کیا پوچھنا۔ پختہ سڑکوں کا میلوں تک پتہ نہ چلتا تھا ڈاک کی آمد و رفت تو مدت ہوئی بند ہو چکی تھی۔ ہر طرف سے مکانوں کے گرنے کی ہیبتناک صدائیں بلند ہو رہی تھیں بارش کے ساتھ ہی یہ غضب ہو گیا کہ دریا نے بھی بڑے زور و شور سے بڑھنا شروع کر دیا۔ اور ستمبر کی رات کو غضب ناک شیرنی کی طرح جھلگو ندی اُبل پڑی غریبوں کی جھونپڑیوں کا کیا کہنا بڑی بڑی کوٹھیوں کی مستحکم بنیادیں ڈگمگانے لگیں۔ ایسی بارش اور ایسی طغیانی تھی کہ ریلوے لائن بھی اس کی متحمل نہ ہو سکی! آخر خدا خدا کر کے پانی تھما مگر کب؟ آہ جب سینکڑوں مکانات پیوند زمیں ہو چکے تھے۔ آبادیاں ویرانوں میں منتقل ہو چکی تھیں۔ اور جب خوشحال گھرانے مٹھی بھر چاول اور چنے کی طرف بھوکے کتوں کی طرح دوڑ رہے تھے۔

اب بارش ختم ہو چکی تھی اور ندی بھی تھم گئی تھی مصیبت زدہ غریبوں کے سوا دنیا پھر اپنی جگہ پر بدستور تھی۔ شام کا وقت تھا میں خطوط لکھنے میں بے طرح مشغول تھی کہ ایک آواز — ایک دلدوز آواز نے مجھے چونکا دیا — "بیٹی! .... پانچ دن سے — مسلسل پانچ روز سے ہم بھوکے ہیں۔ آہ! میرے چھوٹے چھوٹے معصوم بچے بھی پانچ دن سے ایک ایک دانہ کے لئے تڑپ رہے ہیں۔

میں نے گھبرا کر دیکھا تو میرے سامنے ہی ایک شریف صورت ادھیڑ عمر کی عورت ایک میلی چادر میں لپٹی کھڑی تھی میں نے حیران ہو کر پوچھا "آپ کہاں سے آتی ہیں؟"

میرے اِس سوال سے وہ پھوٹ پڑی اور بولی "میرا گھر؟ — آہ آب کہاں — اسب کچھ تو ہوا۔ مگر آہ! میرا بچہ! میرا آٹھ سال کا پیارا بچہ وہ کہاں رہ گیا؟" اُس نے اشک آلود نظروں سے مجھے دیوانہ وار گھورتے ہوئے کہا۔ "بیٹی! میں سُونی کی رہنے والی ہوں! مجھے کسی چیز کی پروا نہیں تھی سبھی کچھ میسر تھا۔ مگر اب کچھ بھی نہیں۔ ظالم طغیانی نے مجھ سے میرا سب کچھ چھین لیا۔ آہ! — میرا گھر! — میرا معصوم بچہ! میرا منور! ہائے اُس کو مجھ سے کیوں لے لیا؟ منور! میرا بچہ! آہ! میرا لال —"

وہ پھُوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میرا دل بھی بھر آیا اور آنکھیں بھی ڈبڈبا آئیں۔

وہ کہنے لگی ۱۱ستمبر کی رات کو ہم لوگ اپنے گھر میں آرام سے تھے۔ بارش ہو رہی تھی۔ میرا دل دھڑک رہا تھا۔ مگر اتنا بے چین نہ تھا جتنا آج ہے! میرے بچے ایک کمرے میں سوئے ہوئے تھے۔ میری بہو گھر کے انتظام میں لگی ہوئی تھی اور میں نماز پڑھ رہی تھی۔ سویرے ہی سنا تھا کہ پھلگو ندی بڑے زور سے بڑھ رہی ہے۔ میں نماز میں مشغول تھی مگر بادل کی گرج سے دل دہل رہا تھا۔ دفعتاً بڑے زور کا ایک دھماکا ہوا اور میرے صحن کی دیوار چور چور ہو کر صحن کے پانی میں گھل مل گئی۔ میں نے نماز ختم کر کے جیسے ہی سلام پھیرا کہ میری نظر مکان میں رینگتے ہوئے پانی پر گئی۔ میں حیران تھی کہ یا اللہ یہ کیسا پانی ہے بارش کا یا ندی کا؟ پانی تیزی کے ساتھ پھیلتا جا رہا تھا۔ ہم اس میں بہنے لگے۔ اب ہم ایک دوسرے سے بے خبر بہتے ہوئے ایک نامعلوم اور لامحدود منزل کی طرف چلے جا رہے تھے ــــ! اس کے بعد میری بچی! مجھے کچھ خبر نہیں نہ جانے کتنی دیر بعد آنکھیں کھولیں تو دیکھا کہ اپنے گاؤں کے رئیس بنگالی بابو کے بنگلے میں پڑے ہیں۔ جیسے ہی میری آنکھیں کھلیں بے چین ہو ہو کر اپنے پیاروں کو ڈھونڈھنے لگی سب ہی تھے۔ مگر آہ! میرا منور میرا آٹھ سال کا پیارا بچہ میری نظروں سے اوجھل تھا۔ میں نے چیخ چیخ کر اپنے بچے کو آوازیں دیں دیوانہ وار ہر طرف ڈھونڈھنے دوڑی۔ مگر آہ! منور! میرا پیارا بچہ نہ ملا۔"

اتنا کہہ کر وہ پھر تڑپ تڑپ کر رونے لگی۔ اس نے بولنے کی غرض سے منہ کھولا مگر بھوک اور غم کی شدت سے اس کی آواز [illegible]

رنگون گیا ہے۔ میری اک سال کی بیاہی ہوئی بہو امید سے ہے اور میرے چھوٹے چھوٹے بچوں کا نہ کوئی گھر ہے نہ در۔ آج اپنی بستی سے چلے ہوئے پانچ روز ہو گئے ہیں اس دن ان بچوں کی غذا صرف وہی دو مٹھی چنے تھی۔ دو مٹھی چنے اور میرے تین بچے پانچ روز کا سفر میرے اللہ میرے بچے کیسے تڑپ رہے ہیں۔ کاش میرا منور ہوتا اور آج یہ غم دیکھنے کے لئے میں نہ ہوتی" وہ اتنا کہہ کر گردن جھکا کر بیٹھ گئی اس کے لب کانپ رہے تھے اور آنکھوں سے اشکوں کی جھڑیاں لگی ہوئی تھیں اس نے حسرت بھری نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا: "سفر کرتے ہوئے آج پانچ روز ہو گئے اور ابھی ہماری منزل بہت دور ہے میں پٹنہ باقر گنج اپنے میکے لئی ہوئی جا رہی ہوں۔ وہاں جا کر اپنے بیٹے اور شوہر کو اپنی بربادی کی خبر بھیجوں گی! کیا تم بتا سکتی ہو کہ پٹنہ یہاں سے کتنی دور ہے؟"

میں نے کہا: "یہاں سے پٹنہ کافی دور ہے قریب ۴۰ میل! مگر آپ اسٹیمر سے کیوں نہیں جاتیں۔ آج اسکے آنے کا بھی دن ہے! میری باتوں کو سنکر وہ تڑپ کر بولی۔ اسٹیمر سے جاؤں؟ مگر کرایہ کہاں سے لاؤں؟ میرے پاس تو اتنا بھی نہیں کہ اپنے بچوں کا پیٹ بھر سکوں! ۴۰ میل میرے بچے کیسے چل سکیں گے؟ یہاں تک تو آتے ہوئے انکے نازک پیروں میں آبلے پڑ گئے ہیں۔ پھر بھی میں انہیں بہلا پھسلا کر لے ہی آئی۔ اب انہیں کیسے سفر پر آمادہ کروں جبکہ بھوک کی شدت پر بھی وہ سفر کے اختتام کے خیال خام پر خوش ہو کر [illegible]

راستہ میں کوئی خرید کر دیجئے گا۔ اور یہ کھانا ہے۔ کھانا آپ خود کھا لیں۔ وہ ممنون نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی "بیٹی کیا تم سمجھ سکتی ہو کہ ایک ماں اپنے ننھے ننھے بچوں کو بھوک میں تڑپتا چھوڑ کر پہلے اپنا پیٹ بھر سکتی ہے؟ تم ماں کی ممتا کو کیا جانو۔ آہ یہ دل جو اپنے آٹھ سال کے بچے کے غم میں ماتم کر رہا ہے۔ وہی دل آج تمہارے در پر اپنے دوسرے بچوں کے واسطے بھیک لینے کے لئے مجھے گھسیٹ کر لایا ہے۔ لاؤ میں یہ کھانا پہلے اپنے بچوں کو کھلاؤنگی اس کے بعد اگر کچھ بچ رہے گا تو میں بھی کھا لوں گی۔ دیکھو سردی کس بلا کی پڑ رہی ہے۔ اور اس ٹھنڈک میں میرے بچے درخت کے نیچے ٹھٹھرے ہوئے پڑے ہیں" میں نے اُسے ایک چادر دیتے ہوئے کہا "شائد یہ آپ کی کچھ مدد کر سکے" اس نے مجھ سے دریافت کیا کہ کیا کوئی اور مکان ہے جہاں سے وہ کچھ اور مدد حاصل کر سکے۔ میں نے اپنی ملازمہ کے ساتھ اُسے ایک مکان میں بھجوا دیا

جب وہ وہاں سے آئی تو معلوم ہوا کہ سوجھے ہوئے پیروں اور اشک آلود آنکھوں کو دیکھ کر لوگوں نے قہقہے لگائے ہیں اُس نے اپنی دردناک کہانی مختصر پیرائے میں بیان کی۔ جسے سنتے ہی لوگ کہنے لگے: ہم نے یہ سب ڈھکوسلے بہت سنی ہیں۔ تم ایک کہنہ مشق فریبی ہو۔ کیونکہ واقعی تمہارے لب و لہجہ سے بہت کم آدمی تمہیں پہچان سکتے ہیں۔ اور یہ آنسوؤں کی جھڑی تو تمہاری اچھی خاصی مددگار ہے۔ جاؤ وہاں جاؤ جہاں آنسوؤں کے پردے معصوم عقلوں پر پڑ کر تمہارے فریب کو کارآمد بنا سکیں" اُس نے حسرت بھری نظروں سے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا" ہاں آج یہ وقت آیا کہ میں دوسروں کی محتاج ہوں مگر مجھے آپ سے شکایت نہیں گلہ ہے تو اس خدا سے جس نے دنیا کو فریبی بنا کر سچے حقداروں کے حقوق کیوں چھین لئے" اُس کی یہ باتیں سنکر وہ اور زور سے ہنس پڑے۔ غریب عورت غمگین لہجے میں مجھ سے بولی "آہ اب لوگ مجھے فریبی کہتے ہیں۔"

وہ جھکی اور میرے دئے ہوئے کھانے کو اُٹھا کر لنگڑاتی ہوئی چلی گئی۔ اس کے جاتے ہی ایک خیال میرے دل میں پیدا ہوا۔ شاید یہ ایک پُرفریب کھیل ہو؟

جناب اختر انصاری

غزل

دُکھ محبت میں وہ پائے ہیں کہ جی جانتا ہے
اس قدر صدمے اٹھائے ہیں کہ جی جانتا ہے

یوں تو وہ ایک اُچٹتی سی نظر تھی، لیکن
زخم اس طرح کے آتے ہیں کہ جی جانتا ہے

اب تو خاموش ہیں لیکن انہی آنکھوں نے کبھی
ایسے طوفان اٹھائے ہیں کہ جی جانتا ہے

کیا کہوں حسن کے پندار کو، اس ظالم نے
وہ وہ ارمان مٹائے ہیں کہ جی جانتا ہے

اختر اس چرخ کی گردش نے تمناؤں کے
وہ وہ ایوان گرائے ہیں کہ جی جانتا ہے

دیگر

صاف ظاہر ہے نگاہوں سے کہ ہم مرتے ہیں
منہ سے کہتے ہوئے یہ بات مگر ڈرتے ہیں

ایک تصویرِ محبت ہے جوانی گویا
جس میں رنگوں کے عوض خونِ جگر بھرتے ہیں

عشرتِ رفتہ نے جا کر نہ کیا یاد ہمیں
عشرتِ رفتہ کو ہم یاد کیا کرتے ہیں

آسماں سے کبھی دیکھی نہ گئی اپنی خوشی
اب یہ حالت ہے کہ ہم ہنستے ہوئے ڈرتے ہیں

شعر کہتے ہو بہت خوب تم اختر لیکن
اچھے شاعر یہ سنا ہے کہ جواں مرتے ہیں

نوشتہ خلیل جبران　　　مترجمہ سید بشیر ہندی ایڈیٹر فلمستان لاہور

شکست

شکست ——— میری شکست ——— میری تنہائی اور
میری گوشہ نشینی۔ تم مجھے ہزاروں فتوحات سے عزیز ترین ہو۔
اور میرے دل کے لئے دنیا کی تمام مسرتوں سے پیاری ہو

شکست ——— میری شکست ——— میرا ذاتی
علم اور میری جرأت مقابلہ تمہارے ذریعے میں جانتا ہوں۔
کہ میں ابھی نوجوان ہوں اور تیز گام بھی۔
اور میں مرجھائے ہوئے پھولوں کے فریب میں نہیں آسکتا
اور میں نے تم میں یکتائی کا راز پالیا ہے'
اور ذلت اور تحقیر کی مسرت کا مجھے احساس ہوگیا۔

شکست ——— میری شکست ——— میری کھچی
ہوئی تلوار اور ڈھال'
تمہاری آنکھوں سے میں نے یہ معلوم کیا ہے۔
کہ تاج غلامی کا نشان ہے
اور آشنائی پستی کی علامت ہے۔
. . . .

اور مقید ہونا کامرانی کا عروج ہے۔
اور پکے ہوئے میوے کی طرح گرنا اور وسعت
میں سما جانا ہے'

شکست ——— میری شکست ——— میری بہادر
رفیقہ' تم میری خاموشی' میری چیخیں اور میرے نغمے سنوگی
اور تم اپنے پروں کی جنبش سے میرے ساتھ گفتگو کروگی۔
اور سمندر کے مدوجزر
اور ان پہاڑوں کے متعلق جو رات کو روشن ہوتے
ہیں'
اور صرف تمہارا ہی میری روح کی بلندی اور پستی
پر قبضہ ہوگیا۔

شکست — میری شکست — میری اور لافانی جرأت
ہم طوفان کے ساتھ قہقہے لگائینگے۔ اور ہم تمام مردہ جذبات
مرقد کھودینگے۔ اور بختہ عزم کیساتھ دنیا کا سامنا کرسکیں۔
اس وقت ہم خطرناک ہونگے ——— بہت خطرناک ؛

جناب مظفر صاحب

اردو ہندوستانی

ادب لطیف میں علامہ سید سلیمان ندوی کا گراں قدر مضمون "ہماری زبان کا نام" نظر سے گذرا۔ فاضل موصوف نے زبان سے متعلق جو کچھ فرمایا ہے وہ اب راز نہیں رہا۔ ہمارا یہ دوران جاتا ہے۔ فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں جب اردو کی تعلیم دی جاتی تھی اور گلکرائسٹ صاحب کے ایما سے نثر کی چند کتابیں اس میں تالیف ہوئیں اس وقت اس کا نام "ہندوستانی" ہی تھا۔ انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا میں بھی اکثر مقامات پر جہاں اردو کا تذکرہ کیا گیا ہے لفظ "ہندوستانی" ہی آیا ہے۔ ڈنکن فاربس نے اردو قواعد کا نام بھی "ہندوستانی گرامر" رکھا ہے۔ اور اسی گرامر میں ایک مقام پر "ہندوستانی یا اردو یا ریختہ" لکھا ہے یعنی ہندوستانی اردو اور ریختہ مترادف الفاظ ہیں۔ یہ تو دور کی بات ہے۔ چند روز ہوئے مجھے ایک ضروری کام سے سرکل انسپکٹر مدارس کے دفتر میں جانے کا اتفاق ہوا۔ کوئی بیس یا پچیس سال کے پرانے فائل دیکھ رہا تھا کہ ان میں لڑکوں کے اردو مدرسہ کو "ہندوستانی مدرسۂ طفلاں" لڑکیوں کے مدرسہ کو "ہندوستانی مدرسۂ نسواں" اور ڈپٹی انسپکٹر اردو مدارس کو "ہندوستانی ڈپٹی انسپکٹر" لکھا ہوا تھا۔ اور سرکاری طور پر بھی لکھا جاتا تھا میں نے موجودہ تبدیلی کی وجہ دریافت کی۔ مگر کوئی معقول جواب نہ ملا۔ ضرورت اب اس امر کی ہے۔ کہ بہی خواہان زبان بہت جلد علامہ سید سلیمان ندوی کی تحریک پر توجہ فرمائیں۔ اور اسے اس کا اصلی نام "ہندوستانی" جو اس کا پیدائشی حق ہے دیدیں۔

ہندی اور ہندوستانی زبان کا جھگڑا کوئی علمی بحث نہیں بلکہ عصبیت اس کی محرک ہے۔ ایسی صورت میں اس مسئلہ پر بحث کرنا ہوا کو ناپنا ہے۔ ہم کو یہ کہنے کا حق کیا ہے کہ ہمارے ملکی بھائی (حامیان ہندی) اپنے محدود حلقہ کی زبان کو پورے طور) دعرض ملک میں پھیلانے کے لئے یہ کچھ کر رہے ہیں اور یہ ذرائع اختیار کر رہے ہیں کہ یہ بالکل بیہودہ ہے۔ وہ جو کچھ کر رہے ہیں اپنے اجتماعی نقطۂ خیال سے کر رہے ہیں جو "متمدن اقوام" کا خاصہ ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ بالمقابل ہم کیا کر رہے ہیں۔ اخباروں، ماہناموں اور رسالوں میں تجویزیں ادبی مجلسوں میں تقریریں اور تنقیدیں مشاعروں میں شاعری ؟ یہ کعبہ تک پہنچنے کا سیدھا راستہ ہے یا ترکستان کا پہاڑی اور دشوار گزار راستہ ! کہتے سب ہیں مگر کرتا کوئی نہیں۔

ہمارے خیال میں اس وقت سخت ضرورت اس امر کی ہے کہ ہندوستان کے تمام تعلیمی ادارے علمی مجلسیں اور ملک کے ہندوستانی مصنفین اور مؤلفین، اخبار اور ماہناموں کے ایڈیٹر سب اردو کو "ہندوستانی" لکھیں اور دوسروں کو لکھنے کے لئے مجبور کریں۔ نیز اس کی نشر و اشاعت اور ترقی کے لئے عملی کارروائیاں شروع کر دیں کہ یہی وقت کا تقاضا ہے۔"

دو آتشہ

لالۂ طور

(علامہ اقبال مدظلہ)

(۱)

دلِ من روشن از سوزِ درون است
جہاں بیں چشمِ من از اشکِ خون است
ز رمزِ زندگی بیگانہ تر باد
کسے کو عشق را گوید جنون است

(۲)

دریں گلشن پریشاں مثلِ بویم
نمی دانم چہ میخواہم چہ جویم
بر آید آرزو یا بر نہ آید
شہیدِ سوز و سازِ آرزویم

(۳)

ز مرغانِ چمن نا آشنایم
بشاخِ آشیاں تنہا سرایم
اگر نازک دلی از من کراں گیر
کہ خونم مے تراود از نوایم

لالۂ صحرا

نذیر میرزا برلاس بی۔ اے (آنرز)

(۱)

ہے دل روشن مرا سوزِ دروں سے
جہاں بیں آنکھ میری اشکِ خوں سے
نہ سمجھے کاش رمزِ زندگی وہ
جو نسبت دے محبت کو جنوں سے

(۲)

پریشاں اس چمن میں مثلِ بو ہوں
نجانے کیوں اسیرِ جستجو ہوں
بر آئے آرزو یا بر نہ آئے
شہیدِ سوز و سازِ آرزو ہوں

(۳)

چمن والوں سے میں نا آشنا ہوں
کہ تنہا شاخ پر نغمہ سرا ہوں
نہ پاس آنا اگر نازک سا دل ہے
حقیقت یہ ہے میں خونیں نوا ہوں

نوشتہ ٹیگور　　مترجمہ سید شریف حسین انور گیلانی بی۔ اے۔ بی۔ ٹی

قربانی

رائے چرن کی عمر ابھی بارہ سال کی تھی۔ جب وہ کسی امیر کے ہاں ملازم ہوا۔ اس کے سپرد آقا کے بچہ کی نگہداشت کا کام تھا۔ جب لڑکا جوان ہوا تو اُسے سکول میں داخل کرا دیا گیا اور ابتدائی تعلیم سے فارغ ہو کر اُسے کالج میں بھیجا گیا پھر وہ ڈگری کے امتحان میں کامیاب ہو کر ایک سرکاری محکمہ میں کسی ممتاز عہدہ پر سرفراز ہو گیا۔ شادی ہونے تک رائے چرن اُس کی خدمت کرتا رہا لیکن جب چھوٹے آقا کی شادی ہو گئی۔ تو وہ آقا کی بیوی کی خدمت کرنے لگا۔ سال کے بعد انوکل کے گھر لڑکا پیدا ہوا۔ رائے چرن اب بچہ کی دیکھ بھال میں مصروف ہوا۔ وہ بچہ کو گود میں رکھتا۔ پیار کرتا اسکو دیکھ دیکھ کر مسکراتا بچوں کی طرح اس سے باتیں کرتا۔ کچھ عرصہ کے بعد بچہ نے توانائی حاصل کی۔ اور چلنے پھرنے لگا۔ اکثر مکان سے باہر چلا جایا کرتا۔ جب رائے چرن پکڑنے جاتا تو وہ بھاگتا اور مسکراتا۔ رائے چرن کے لئے وہ ایک کھلونا تھا۔ وہ بچہ کی بہت تعریف کرتا۔ اور اس کے متعلق اپنے آقا سے کہتا "یہ بچہ کسی دن جج مقرر ہوگا" بچہ جوان ہوتا گیا۔ اور بات چیت کرنے لگا۔ اُس کی باتیں بہت بھلی معلوم ہوتیں۔ وہ اپنی والدہ کو "ماں" اور رائے چرن کو "چنا" کہہ کر پکارتا۔ رائے چرن بچہ کو خوش رکھنے کے لئے گھوڑا بنتا اس کو پشت پر بٹھا کر دوڑتا۔ بچہ اس کے منہ میں رسی ڈالتا۔ اور اُس کی پشت پر چھڑی مارتا۔ مگر رائے چرن اسے بُرا محسوس نہ کرتا۔ اس اثنا میں انوکل کی تبدیلی دریائے پدما کے قریب ایک قصبہ میں ہو گئی۔ اب رائے چرن اور اس کے آقا اس نئے قصبہ میں رہنے لگے۔ انوکل نے اپنے بچہ کے لئے ایک گاڑی خریدی۔ جس میں رائے چرن بچہ کو بٹھا کر سیر کراتا۔

برسات کا موسم شروع ہوا۔ اور دریا میں طغیانی آگئی فصلیں خراب ہو گئیں۔ کئی دیہات تباہ ہو گئے۔ اور کئی جانیں تلف ہو گئیں۔ ایک روز پچھلے پہر جب بارش تھمی۔ رائے چرن بچہ کو گاڑی میں بٹھا کر دریا کی طرف لے گیا کیونکہ بچہ جانے پر مصر تھا۔ رائے چرن چاولوں کے کھیت میں پہنچا۔ کھیت میں اُس وقت کوئی نہ تھا۔ اور نہ ہی دریا میں کوئی کشتی تھی۔ کنارے سے کچھ فاصلہ پر دریا میں ایک درخت گرا ہوا تھا۔ جس پر پھول تھے۔ بچہ نے رائے چرن کو کہا کہ مجھے ایک پھول لا دو۔ رائے چرن پہلے تو ٹالتا رہا۔ لیکن بچہ کی ضد نے اُسے مجبور کیا۔ چنانچہ جانے سے پہلے وہ بچہ کو تاکید کر گیا کہ گاڑی سے نہ اُترنا۔

رائے چرن پانی میں اُچھلا اور تیر ..... [illegible]

تک پہنچ گیا۔ اس کی عدم موجودگی میں بچہ دریا کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اور اس کی لہروں کے منظر سے لطف اُٹھا رہا تھا۔

جلد ہی اُسے خیال پیدا ہوا کہ وہ اتر کر دریا تک پہنچے۔ چنانچہ وہ اُترا۔ راستہ میں اُس نے ایک چھڑی دیکھی جسکو اُس نے اُٹھالیا۔ جب وہ کنارے پر پہنچا تو چھڑی کو پانی میں ڈبونے لگا۔ کبھی چھڑی کو پانی میں ڈالتا اور کبھی اُسے باہر نکال لیتا۔ جس طرح ماہیگیر مچھلیاں پکڑتے ہیں۔ اس اثنا میں پانی کی لہر اُس کی طرف بڑھی اور اُسے بہا کر لے گئی۔

رائے چرن جب پھول توڑ کر فارغ ہوا۔ تو وہ واپس کنارے کی طرف لوٹا۔ اور گاڑی کا رُخ کیا۔ لیکن جب بچہ کو وہاں نہ پایا تو بے حد متعجب ہوا۔ وہ پریشانی میں اِدھر اُدھر بھاگا۔ اور ننھے! ننھے!! کہکر بچہ کو پکارنے لگا۔ یہاں تک کہ عالم مایوسی میں گر پڑا۔ اور کچھ دیر تک بے ہوش رہا۔ آخر وہ اٹھا اُس کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گر رہے تھے۔ وہ چلتا تھا لیکن ہر قدم اُس کو ایک ایک من کا معلوم ہوتا تھا۔ وہ حیران تھا کہ آقا کو کیا جواب دیگا۔ دنیا اُس کو تیرہ و تاریک معلوم ہوتی تھی۔ ہر چیز اُسے کاٹنے کو دوڑتی تھی۔ اُس کو معلوم نہ تھا۔ کہ اُس کا چھوٹا آقا دریا کی موجوں کا لقمہ بن گیا ہے۔ وہ چاہتا تھا کہ دریا میں ڈوب کر مرجائے۔ مگر پھر خیال آیا کہ یہ مناسب نہ ہوگا۔ آخر وہ مجسمہ غم آقا کے گھر کی طرف لوٹا۔ وہ گاڑی کو دھکیلتا آتا تھا لیکن اُس کو خالی دیکھ کر اُس کے دل کو چوکے لگ رہے تھے گھر پہنچ کر وہ آقا کے قدموں پر گر پڑا۔ اور تمام واقعہ سنا دیا۔ اگرچہ عوام کا یہ خیال تھا کہ بچہ دریا میں ڈوب کر مرگیا ہے لیکن بچہ کا کہیں پتہ نہ لگا۔ الغرض اُس نے اس صدمہ کو بڑے صبر و استقلال سے برداشت کیا تاہم یہ زخم کاری تھا۔ جو مندمل نہ ہوسکا۔ بچہ کی والدہ تو نہایت نڈھال ہوگئی۔ اور اکثر روتی رہتی۔

رائے چرن کے لئے اب اس گھر میں کوئی تسکین نہ تھی۔ آقا کا اب اُس سے اچھا سلوک نہ رہا۔ اُس کی موجودگی اُن کے غم کو بڑھا رہی ہے۔ لہٰذا اُس نے ایک دن وہ گھر چھوڑ دیا۔ اور اپنے وطن کو واپس لوٹ گیا۔ رائے چرن ادھیڑ عمر کا تھا۔ اس کی بیوی بھی عالم شباب گذار چکی تھی اُن کے اولاد نہ تھی۔ اور نہ اب امید ہوسکتی تھی۔ کہ اُن کے گھر کبھی بچہ پیدا ہوگا۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ سال کے بعد ان کے گھر ایک لڑکا پیدا ہوا۔ اگرچہ رائے چرن کو گاؤں کے لوگوں نے مبارک باد دی لیکن اُسے کوئی خوشی نہ تھی۔ آقا کے بچہ کا خیال ہر لحظہ اُس کے دل کو اندوہگیں رکھتا تھا۔

بچہ جوان ہوتا گیا۔ خدا کی قدرت دیکھئے اس کی شکل وصورت اپنے آقا کے بچے کی طرح ہوتی گئی۔ اب رائے چرن بہت خوش تھا۔ وہ بچہ کی بہت نگہداشت کرنے لگا۔ اور اسکی خوراک اور لباس کا زیادہ خیال رکھنے لگا۔ وہ اُسے اچھا کھلاتا اور اچھا پہناتا۔ جب لڑکا پانچ سال کا ہوا تو رائے چرن نے اُسے سکول میں داخل کرا دیا۔ گاؤں میں ایک مڈل سکول تھا۔ لڑکے نے مڈل تک تعلیم حاصل کرلی۔ اس اثنا میں رائے چرن کے دل میں طرح طرح کے خیالات گذر رہے تھے۔ وہ خیال کرتا تھا کہ پرمیشور نے اس کو بچہ اس واسطے عطا کیا ہے کہ وہ اپنے آقا کی نذر کرسکے۔ ورنہ یہ ناممکن تھا

کہ اس ادھیڑ عمر میں اُس پر خدا کی رحمت ہوئی۔ نیز بچہ کی شکل وصورت آقا کے بچہ سے بہت ملتی جلتی ہے۔ اور یہ اس لئے ہے کہ اُس کا آقا اُس بچہ کو اپنا ہی تصور کرے۔ وہ اپنی غلطی پر نادم تھا۔ اُس سے ایک بڑا قصور سرزد ہو چکا تھا۔ جس کی تلافی وہ ضرور کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اپنے بچہ "فیلنا" کی پرورش ایک رئیس زادہ کی طرح کی۔ اُس کی سیروتفریح کے لئے ایک گھوڑا اور ایک گاڑی خرید دی۔ گاؤں کے بچوں کے ساتھ وہ اُسے بہت کم میل جول کی اجازت دیتا تھا۔ اگرچہ گاؤں کے لوگ اس پر ہنستے تھے۔ کیونکہ اس کے ذرائع اتنے وسیع نہیں تھے۔ وہ بھی ان کی طرح ایک غریب آدمی تھا۔ لیکن وہ ان کے استہزا کی پروا نہ کرتا تھا اور اپنے فرض کو ادا کئے جاتا تھا۔ وہ آقا اور غلام کی طرح رہتے تھے۔ رائے چرن ایک خادم معلوم ہوتا تھا۔ رائے چرن نے لڑکے پر یہ ظاہر نہ ہونے دیا کہ وہ اُسکا باپ ہے۔ گاؤں کے تمام لڑکے رائے چرن سے مذاق کرتے تھے۔ اور فیلنا بھی اُن کے ساتھ رائے چرن کی عدم موجودگی میں شامل ہو جاتا۔ مگر دل سے تمام لڑکے اُسے چاہتے تھے۔ اور فیلنا کو بھی ان کے ساتھ ایک گونہ محبت تھی۔ رائے چرن بارہ سال کے عرصہ میں بہت کمزور ہو گیا تھا۔ اب وہ تن دہی سے کام نہ کر سکتا تھا۔ اس لئے اب وہ زیادہ اُجرت نہ حاصل کر سکتا تھا کہ لڑکے کی ضروریات پوری کر سکے۔ فیلنا اسوقت پریشان ہوتا جب اس کی خواہشات کی تکمیل میں رکاوٹ واقع ہوتی۔ آخر رائے چرن ایک دن فیلنا سے دو دن کی اجازت لیکر گاؤں سے باہر گیا۔ وہ سیدھا "برت" پہنچا۔ جہاں اُس کا آقا انوکل مجسٹریٹ تھا۔ اس طویل عرصہ میں انوکل کے کوئی اولاد نہ ہوئی تھی۔ اس کی بیوی بہت غمزدہ رہتی تھی۔ رائے چرن اپنے آقا کے گھر پہنچا۔ اُس وقت وہ گھر پر ہی موجود تھے۔ اس نے سلام کیا۔ اور معافی کا خواستگار ہوا۔ اس کے آقا کو اُس کی کمزور حالت پر رحم آیا۔ اُس نے اُسے دوبارہ ملازم رکھنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ اسی اثنا میں انوکل کی بیوی بھی پہنچ گئی۔ اُس کا غصہ اب فرو ہو چکا تھا۔ وہ بھی چاہتی تھی کہ رائے چرن اُن کی خدمت کرے۔ تاکہ وہ اُن کو غم میں ڈھارس دے۔ رائے چرن اُن کی باتیں سُنکر خوش ہوا۔ لیکن اُس نے نہایت ادب سے کہا۔ "آقا! میں صرف آپکا کا نیاز حاصل کرنے آیا ہوں۔ نیز اِس جرم کا اقرار کرنے آیا ہوں کہ آپکے بچہ کو میں چرا کر لے گیا تھا۔ اور وہ میرے پاس زندہ ہے۔" انوکل نے سنکر بے ساختہ کہا۔ "خدایا! کیا میرا بچہ زندہ ہے؟" وہ رائے چرن کی طرف مخاطب ہوا۔ اور اُسے کہا "کیا تم سچ کہتے ہو؟"

رائے چرن نے کہا۔ "ہاں" زندہ ہے اور میں اُسے پرسوں اپنے ساتھ لاؤں گا۔" رائے چرن پھر سلام کہکر چلا گیا۔ تیسرے روز انوکل اور اُس کی بیوی بچہ کا انتظار کرنے لگے۔ آخر رائے چرن آ پہنچا۔ اور اس کے ہمراہ ایک بارہ سال کا لڑکا تھا۔ جو امیر زادہ معلوم ہوتا ہے۔ انوکل کی بیوی نے اُسے چھاتی سے لگایا۔ پیار کیا۔ چُوما۔ اور خوشی میں آنسو اُس کی آنکھوں سے گرنے لگے۔ لڑکا نہایت شکیل تھا۔ انوکل کا دل بھی لڑکے کو دیکھ کر بھر آیا۔ اور محبت کی نظر سے اُس کی طرف دیکھنے لگا۔ انوکل نے رائے چرن

سے پوچھا۔ "رائے چرن کیا تمہارے پاس کوئی ثبوت ہے کہ یہ میرا بیٹا ہے؟" رائے چرن نے جواب دیا۔ "آقا اس کے لئے ثبوت کی ضرورت نہیں۔ خدا بہتر جانتا ہے۔ کہ اس کو میں نے ہی چرایا تھا۔" جب انوکل نے دیکھا کہ اس کی بیوی لڑکے سے بہت محبت سے پیش آرہی ہے۔ تو اس نے مزید سوالات کرنے مناسب نہ سمجھے۔ وہ خیال کرتا تھا کہ رائے چرن بوڑھا آدمی ہے۔ اس کے اولاد نہیں ہو سکتی۔ یہ ضرور اسی کا بچہ ہے نیز وہ اس کا پرانا خادم ہے اس کو کبھی دھوکا نہیں دے سکتا۔ اس دھوکہ سے اسے کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ لیکن پھر اس کے دل میں رائے چرن کے خلاف نفرت کا جذبہ پیدا ہوا۔ اور اس نے ارادہ کیا۔ چونکہ رائے چرن دغا باز اور نمک حرام ہے۔ وہ اسکا خادم نہیں رہ سکتا۔ اس جذبہ کے ماتحت اس نے کہا۔ "رائے چرن تم یہاں سے چلے جاؤ۔ میں تمہیں ملازم رکھنا نہیں چاہتا۔" رائے چرن نے درد بھری آواز میں جواب دیا۔ "آقا میں کہاں جاؤں۔ میں بوڑھا ہوں۔ مجھے کون ملازم رکھے گا۔" لیکن انوکل اپنے ارادہ کو بدلنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے درشتی سے کہا۔ "رائے چرن میں نے جو تمہیں کہا ہے۔ تمہیں اس پر عمل کرنا ہوگا۔"

رائے چرن قدموں پر گر پڑا۔ اور نہایت عاجزی سے کہا۔ "آقا۔ مجھ پر رحم کیجئے۔ مجھے یہاں رہنے دیجئے اپنی خدمت کا دوبارہ موقع دیجئے۔ میں سچ کہتا ہوں یہ قصور میں نے نہیں کیا۔ اس میں خدا کا ہاتھ ہے۔" انوکل اب زیادہ برافروختہ ہوا کیونکہ اس نے رائے چرن کی زبان سے خدا کے خلاف الفاظ سنے۔ اس نے گرجتے ہوئے کہا۔ "نہیں تم یہاں نہیں ٹھہر سکتے۔ میں اب تم پر اعتبار نہیں کر سکتا۔ تم نے بے وفائی کی ہے" انوکل پر اس کی التجاؤں کا کچھ اثر نہ ہوا۔

جب فیلنا کو معلوم ہوا کہ وہ مجسٹریٹ کا لڑکا ہے اور ابھی تک اس کو اس کے والدین سے بے خبر رکھا گیا تو وہ بہت غضبناک ہوا لیکن جلد ہی رائے چرن کی بیچارگی نے اس پر اثر کیا۔ اس نے اپنے باپ سے درخواست کی "ابا جی! اسکی خطا معاف کیجئے۔ اگر آپ اس کو ملازم نہیں رکھنا چاہتے تو نہ رکھیں لیکن اس کے اخراجات کے کفیل ہوں اور اس کو ماہوار کچھ رقم دے دیا کریں۔"

رائے چرن یہ سنکر حیران ہوا۔ اس نے بیٹے کی طرف آخری بار دیکھا۔ پھر آقا کو سلام کیا۔ اور گھر سے چلا گیا۔ اور اس وسیع دنیا میں نہ معلوم اس پر کیا گذری لیکن قیاس کیا جاتا ہے۔ کہ وہ چند روز جیتا اور مر گیا۔

جب ایک ماہ گذر چکا تو انوکل نے رائے چرن کے پتہ پر اس کے اخراجات کے لئے کچھ روپے بھیجے لیکن وہ رقم واپس آگئی۔ چونکہ اس نام کا کوئی باشندہ اس گاؤں میں نہ تھا +

ادب لطیف میں اشتہار دینا کامیابی کی ولیل ہے۔

اعتبار الملک حضرت دلؔ شاہجہانپوری

غزل

سوز و گدازِ شمع کو بیکار دیکھکر — تڑپا ہوں صبح تک یہی آثار دیکھ کر
مٹ مٹ گیا ہوں شوخیٔ رفتار دیکھکر — دیکھیں کیا متیں نگہِ یار دیکھ کر
حشر آفریں ہے کوئے محبت میں ہر قدم — ہم تو بڑھے تھے راہ کو ہموار دیکھ کر
میرے کمالِ شوق و تمنا پر اک نظر — آئینہ بن گیا ہوں رخِ یار دیکھ کر
تصویرِ خلد کھچ گئی ساقی کی بزم میں — زاہد سے پاکباز کو سرشار دیکھ کر
پہنچا وہی جو خاک ہوا راہِ عشق میں — دل مطمئن ہے منزلِ دشوار دیکھ کر
گرتی رہیں تبسم پنہاں کی بجلیاں — ہم کو مشاہدہ کا طلب گار دیکھ کر
اے شوقِ دید کیا یہی حدِ نگاہ ہے — حیرت زدہ ہوں سنگِ دربار دیکھ کر
مجھ کو یہ دیکھنا تھا جو ہوتے وہ نقاب — کس وہم میں ہیں کافر و دیندار دیکھ کر
اے حسن جو سزائے تمنا ہو وہ قبول — لیکن مری نظر کو پھر اک بار دیکھ کر
تقویٰ بھی آج ہو گیا قربانِ میکدہ — ہر جام میں بہار کے آثار دیکھ کر
وقفِ امید و یاس محبت میں ہم رہے — آسان جان کر کبھی دشوار دیکھ کر
تم تو سکونِ خاطرِ ناشاد بن گئے — سمجھا تھا میں کچھ اور یہ رفتار دیکھ کر
قصرِ عروجِ قوم کی روداد کچھ نہ پوچھ — چپ ہوں خموشیٔ در و دیوار دیکھ کر

اب بارگاہِ حسن میں اے دلؔ خموش ہوں
ہر التجائے عشق کو بیکار دیکھ

جناب عطاء اللہ پالوی

ادبِ لطیف کا افسانہ نمبر میری اور دوسروں کی نظر میں

ابھی حال میں ہندوستان جنت نشان کے دو صوبوں (جنہیں واقعی خادم اردو یا فدائے ادب کے دعووں کا بجا حق حاصل ہے) کے دو بلند پایہ جرائد ساقی (دہلی) اور ادبِ لطیف (لاہور) نے اپنا اپنا "افسانہ نمبر" شائع کر کے اردو زبان کے افسانوی ذخیرہ میں ایک گرانقدر اضافہ کیا ہے۔ مجھے ان افسانہ نمبروں کا مقابلہ یا موازنہ منظور نہیں کیونکہ ہر افسانہ نمبر اپنی اپنی جگہ نہایت خوب ہے اور نہ اس کی ضرورت سمجھتا ہوں کہ کسی کی خواہ مخواہ ثنا خوانی کر کے اس کی نظر میں قربت و تقرب خاص حاصل کرنے کی کوشش کروں۔ لیکن دیکھ رہا ہوں کہ "ادبِ لطیف" کے افسانہ نمبر کے متعلق مختلف قسم کے خیالات مسلسل شائع کئے جا رہے ہیں۔ اور بعض معتقدانہ و غیر معتقدانہ تنقیدیں (اردو زبان کی اس کشمکش کے دور میں) نہ صرف باہمی آویزش و شکر رنجی کا باعث بننا چاہتی ہیں بلکہ ڈر ہے کہ اردو ادب کو بھی اس سے نقصان نہ پہنچے۔ لہٰذا میں بھی چاہتا ہوں کہ چند مقتدر جرائد و رسائل کے ریویو پر ایک سرسری نظر ڈالتے ہوئے اپنے خیالات ظاہر کر دوں۔ ممکن ہے کچھ فائدہ ہو۔

"ادبِ لطیف" کا "افسانہ نمبر" جون اور جولائی کا مشترکہ نمبر اور اس کے کل منظوم و منثور مطبوعہ مضامین کی تعداد پچیس ہے "نذرِ اولین" کا شمار مضمون میں کسی صورت سے نہیں ہو سکتا، جس میں پانچ مضامین "فنِ افسانہ نگاری" سے متعلق ہیں۔ باقی بیس مضامین "افسانے" ہیں جن میں چھ منظوم، چھ منثور، چھ ترجمے اور دو خط کی شکل میں ہیں۔ اور سب سے قبل "نذرِ اولین" ہے جس میں مدیرِ رسالہ نے تقریباً ہر مضمون کے متعلق اپنے خیالات ظاہر فرمائے ہیں اور بتایا ہے کہ کس میں کیا چیز قابلِ ذکر ہے۔

"افسانہ نمبر" کی اشاعت کے بعد حسبِ قاعدہ ملک کے بلند پایہ رسائل نے اس پر ریویو کیا ہے۔ مگر مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بعضوں نے غایتِ عقیدتمندی سے عدیم المثال افسانہ نمبر ثابت کرنے کی کوشش کی۔ اکثروں نے اسے بالکل معمولی درجے کا ظاہر کیا ہے۔ اور کچھ ایسے بھی ہیں جنہوں نے درمیانی درجہ حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔ اب ضرورت ہے کہ ان سب کا جائزہ لے کر دیکھا جائے کہ ہر تنقید، تبصرہ اور ریویو کا پایہ کیا ہے۔

شاہکار (لاہور) شاہکار نے سب رسالوں سے زیادہ طویل ریویو کیا ہے اور بڑی فیاضی سے داد دی ہے۔ سب سے پہلے لکھا ہے کہ "ادبِ لطیف اردو کے مقتدر ادبی رسائل میں شمار ہوتا ہے"۔ بلاشبہ یہ صحیح ہے

آگے چلکر لکھتا ہے:۔

"ہر ایک مضمون معلومات سے لبریز مقالہ۔ ہر ایک
افسانہ افسانہ نگار کی کامیاب کوشش کا مظہر اور
اور ہر ایک نظم ایک دلکش افسانہ ہے۔"

میری گذارش ہے کہ حضرت یزدانی نے اس جگہ جو کچھ فرمایا ہے وہ داد صریح نہیں بلکہ ہجو ملیح ہے۔ اگر احسن صاحب، مقبول احمد صاحب اور مقدم صاحب کی نظمیں "دلکش افسانہ" ہیں تو میں نہیں سمجھ سکتا کہ اُن نظموں کے متعلق کیا کہا جائیگا جو واقعی دلکش ہیں۔ محنت کی داد دینے کے یہ معنی کہاں ہیں کہ مبالغہ سے بھی کام لیا جائے؟

حضرت یزدانی، میرزا ادیب صاحب کے افسانہ کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:۔

"میرزا ادیب بی۔اے کا افسانہ "صحرا نورد کا چوتھا
خط" عجیب کیفیات کا حامل اور تمام افسانوں
سے بہترین ہے۔ یہ افسانہ اُن کا شاہکار کہا
جاسکتا ہے۔"

جہاں تک افسانہ کی خوبیوں کا تعلق ہے، بیشک حضرت یزدانی کا قول قابلِ تسلیم ہے لیکن اسے حضرت ادیب کا "شاہکار" کہنا ان کی تعریف نہیں ہجو کرنا ہے۔ گویا وہ اب اس سے بہتر افسانہ نہ لکھ سکیں گے کسی زمانہ کے متعلق شاہکار کا حکم صرف اُسی وقت لگایا جاسکتا ہے جبکہ ممدوح کے تمام کارنامے موجود ہوں اور آئندہ اضافہ کا سلسلہ ختم ہوگیا ہو مگر میں تو دیکھ رہا ہوں کہ میرزا ادیب کا ہر نیا افسانہ پرانے افسانوں پر فوقیت لے جاتا ہے۔ ایسی صورت میں یہ کیونکر امید کی جاسکتی ہے کہ اب وہ اس سے بہتر افسانہ نہ لکھ سکیں گے؟

معارف (اعظم گڑھ)، معارف کا ریویو عجیب و غریب ہے ایک جگہ وہ لکھتا ہے کہ:۔

چنانچہ اس نمبر میں بھی اس نے ہر مذاق کے ستھرے
اور پڑھنے کے لائق افسانے فراہم کئے ہیں۔

لیکن دوسری جگہ لکھتا ہے:۔

"اس کے ساتھ بعض افسانے ایسے بھی نظر آتے ہیں
جنکا منشا "لکھنے" کے علاوہ اور کچھ معلوم نہیں ہوتا
مثلاً دل ابھی بھولا نہیں آغازِ الفت کے مزے۔"

لیکن یہاں اس بحث کا موقع نہیں۔ اس لئے نظرانداز کرتا ہوں یہ سمجھ میں نہ آیا کہ اگر کسی افسانے کا منشا محض "لکھنے" کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ اور اس لحاظ سے وہ فرسودہ ہے تو پھر اُوپر ان ہی افسانوں کے متعلق یہ کیونکر فرمایا گیا کہ "ہر مذاق کے" ستھرے اور پڑھنے کے لائق افسانے فراہم کئے ہیں"؟ افسانے اس لئے "لکھے" گئے تھے کہ پڑھے جائیں سو معارف خود معترف ہے کہ "پڑھنے کے لائق" ہیں۔ اب اور کیا چاہیئے

ل معارف کے اس نمبر میں بجز "ساقی" کے افسانہ نمبر کے اور کل خاص نمبروں پر ریویو کیا گیا ہے۔ یہ سمجھ میں نہ آیا کیا ساقی اور معارف کا اتحاد (ناقص) ایک ہی چھیڑ چھاڑ کے بعد بند ہوگیا ہے؟ اگر ایسا ہے تو میں دونوں سے التماس کرونگا کہ یہ "ادبی دور" ذاتی عناد کے لیے موزوں نہیں۔ اس طرح اگر ہمارے ادبا ہی آویزش کے مرتکب ہونگے تو پھر ہماری زبان کا کیا حشر ہوگا؟ اور اگر میرا یہ خیال غلط ہے تو پھر ساقی پر ریویو نگاری کی وجہ کیا ہے وہ کچھ معلوم نہیں۔ (عطاء اللہ)

تھا؟ ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے:-

"افسانہ نگاری پر متعدد مفید مضامین ہیں گو ان میں سے بعض علمی ہیں تاہم نومشقوں کیلئے مفید ہیں"

سبحان اللہ اگر "افسانہ نگاری" سے متعلق مضامین جو واقعی صرف نومشقوں ہی کے لئے لکھے جاتے ہیں "مفید" ہی ہیں تو پھر انہیں "سطحی" کیوں کہا گیا؟ بہرکیف اس کے علاوہ جو کچھ "معارف" نے لکھا ہے درست ہے۔ اور صحرانورد کے خطوط کا سلسلہ بھی واقعی دلچسپ ہے۔

شاعر (آگرہ) "شاعر" (آگرہ) نے "ادبِ لطیف" کی کمسنی عمر کے باوجود انتہائی مقبولیت پر یا اس کے معیار کے متعلق جو کچھ فرمایا ہے بلاشبہ بجا ہے آگے چلکر لکھتا ہے:-

"معاصر موصوف کا افسانہ نمبر شائع ہوا ہے جو اس سال کے دیگر افسانہ نمبروں سے ہر طرح ممتاز ہے۔ لکھائی چھپائی کی عمدگی کے ساتھ ساتھ اس مرتبہ افسانہ ایڈیشن میں بعض مضامین فن نویسی پر بھی لکھوائے گئے ہیں جو افسانوں سے زیادہ مفید ہیں"

بیشک مجھے بھی اعتراف ہے کہ ادبِ لطیف کا "افسانہ نمبر" بہت بہتر ہے۔ مگر میری عقیدتمندی اس حد تک نہیں پہنچی کہ میں اُسے "اس سال کے دیگر افسانہ نمبروں سے ہر طرح ممتاز" سمجھوں۔ ایسا کہنا یا تو غائت عقیدتمندی ہے یا فضول "مبالغہ"۔ کسی چیز کی تعریف میں اسے "سبھوں سے ممتاز" کہنا سب سے عمدہ تعریف نہیں بلکہ اسکی خوبیوں کو بیان کرکے اس کی قدر کرنا۔ اچھی تعریف ہے نیز البتہ سے زیادہ "تعریف" "تعریف" نہیں "ہجو" ہے۔ آگے چلکر فرمایا ہے:-

"بعض افسانوں کو چھوڑ کر باقی تمام افسانے باعتبار ندرتِ تخیل و واقعات بہت خوب ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ انہیں پڑھا جائے"

خوب! گویا اب تک جو کچھ کہا گیا ہے۔ وہ بغیر پڑھے ہوتے؟ نیز جب یہ تسلیم ہے کہ اسمیں کچھ افسانے ایسے بھی ہیں۔ جو پڑھنے کے قابل نہیں ہیں تو پھر اسے تمام دیگر نمبروں سے "ممتاز" کہنا دوسرے افسانہ نمبروں پر ظلم کرنا نہیں تو اور کیا ہے؟

"فن افسانہ نگاری" سے متعلق مضامین کیلئے" اس مرتبہ کی قید لگائی گئی ہے۔ یہ صحیح نہیں ادبِ لطیف کا "ہر افسانہ نمبر" ایسے مضامین سے مزین ہے۔ منظوم افسانے صرف چار بتائے گئے ہیں یہ بھی درست نہیں چھ ہیں۔

ساقی (دہلی) "ساقی" اردو زبان کا بڑا بلند پایہ رسالہ ہے۔ لائق مدیر حضرت شاہد احمد مدیر ساقی نے "ادبِ لطیف" کے افسانہ نمبر پر ریویو کرنے میں بہ نسبت اوروں کے آزادیٔ رائے کو زیادہ موقعہ دیا ہے اور بلاشبہ یہ درست ہے۔ کہ انہوں نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے اس کا ایک گرانقدر حصہ قابل تسلیم ہے مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ آپ نے سچی تعریف کرنے میں کسی قدر بخل سے کام لیا ہے۔ میرے خیال میں اچھے افسانوں کی فراہمی کی داد نہ دینا یہ نا انصافی اس سے بہت بڑھکر ہے۔ سب سے زیادہ یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ حضرت شاہد احمد اس ریویو میں اسی فعل کے مرتکب ہوئے ہیں جس پر ایک سال قبل وہ معترض۔ آپ نے فرمایا ہے کہ:-

"ادب لطیف لاہور کے اچھے رسائل میں شمار ہوتا ہے۔"

حالانکہ جب معارف (اعظم گڑھ) نے "ساقی" کے "افسانہ نمبر" پر ریویو کرتے ہوئے لکھا تھا کہ :-

"ساقی دہلی کے اچھے رسائل میں ہے۔"

تو حضرت شاہد احمد نے "ساقی" بابت ماہ اکتوبر (ڈانٹے کا جہنم) کے "نگاہِ اولین" میں فرمایا تھا کہ :-

"تنگ ظرفی کا اس سے زیادہ اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ ساقی کو صرف "دہلی" میں محدود کر دیا۔ دہلی کے بجائے اردو لکھنا انہیں گوارا نہیں ایسی ذہنیت کے لوگوں نے پنجاب، یو پی اور دہلی کا سوال پیدا کیا ہے اور یہ وہ ذہنیت ہے جو صرف تعصب ہی سے پیدا ہو سکتی ہے یہ حضرت نہیں سمجھتے اور نہیں سمجھ سکتے کہ اردو کو اس صوبجاتی تعصب سے کس قدر نقصان پہنچ رہا ہے۔ ہم سر جوڑ کر کام کرنا چاہتے ہیں اور یہ ہمارے دلوں میں کدورت و دوری پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ ؎

من از بیگانگاں ہرگز نہ نالم
کہ با من ہر چہ کرد آں آشنا کرد

شاہد صاحب کے متعلق (جہاں تک مجھے پتہ چلا ہے) میں یہ جانتا ہوں کہ وہ آدمی جھگڑالو نہیں نیز وہ ایک غیر متعصب اور اردو دوست انسان ہیں پھر ایسی صورت میں انہوں نے "ادب لطیف" کو "لاہور" ہی تک کیوں محدود کر دیا تعجب ہے۔

نیرنگ خیال لاہور۔ نیرنگ خیال کے مدیر اعلیٰ حضرت یوسف حسن صاحب جہاں اردو زبان کے خادم کی حیثیت سے ایک قابلِ قدر انسان ہیں۔ وہاں بعض ذاتی چھیڑ چھاڑ کی وجہ سے قابلِ افسوس بھی۔ ایک زمانے میں آپ نے ساقی کو تختۂ مشق بنا لیا تھا مگر شکر ہے کہ شاہد صاحب اور حکیم صاحب کی باہمی ملاقات بادعدہ وعید نے اس فتنہ کو بہت جلد ختم کر دیا۔ صحافتی میدان میں آپ کا یہ دعویٰ کہ

"نیرنگ خیال ہندوستان بھر کے علمی۔ ادبی رسائل میں سب سے زیادہ چھپتا ہے۔"

درآنحالیکہ اس بات کا کوئی ثبوت نہیں کہ واقعی یہ دعویٰ صحیح بھی ہے یا نہیں۔ نیز یہ نہیں معلوم کہ صرف سب سے زیادہ "چھپتا" ہی ہے یا سب سے زیادہ "بکتا" بھی ہے؟ بہرحال "ادب لطیف" کے "افسانہ نمبر" کے متعلق جو کچھ نیرنگ خیال نے لکھا ہے۔ وہ میری نظر سے بھی گذرا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ریویو میں تخریبی پہلو مضمر ہے۔ اور حکیم صاحب نے اپنی "عادت" کے مطابق نہ صرف ہجو ملیح کی ہے بلکہ ایسے مشورے بھی دیئے ہیں جن سے انکا اپنا نمبر جس میں یہ ریویو شائع ہوا ہے خالی نظر آتا ہے۔ مثلاً آپ نے مشورہ دیا ہے کہ "زیادہ توجہ کار آمد علمی مضامین کے حصول پر دینی چاہئے" (اس جگہ یہ خیال کرنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ یہ مشورہ "افسانہ نمبر" پر ریویو کرتے ہوئے دیا جا رہا ہے) مگر جو "... نمبر" میں بعض "ہندوستانی ادہام" فرماتے ہیں۔ جس کا شمار نہ تو علمی مضامین میں ہے اور نہ اسے "کار آمد" کہا جا سکتا ہے۔

متذکرہ بالا مقتدر رسالوں کے ریویو کو دیکھتے ہوئے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ادب لطیف کا افسانہ جہاں محاسن کا حامل ہے

وہاں اسمیں معائب بھی ہیں ۔ جہاں اسمیں اچھے اور بلند پایہ افسانے ہیں وہاں کمزور اور کسی حد تک پست بھی ۔ بلاشبہ یہ تقیہ درست ہے مگر سوال یہ ہے کہ کیا موقر جرائد و رسائل کا ہر خاص نمبر ہر لحاظ سے اعلیٰ ترین ہوتا ہے ؟ کیا ہر افسانہ نمبر کے تمام افسانے کامیاب ہی ہوتے ہیں ؟ کیا ہر شاعر، مضمون نگار، اور افسانہ نویس ہر مرتبہ عدیم المثال کامیابی حاصل کرتا ہے ؟ اگر نہیں تو پھر ادب لطیف کے افسانہ نمبر میں کونسا نیا عیب ہے ؟ ایسی صورت میں کیا حرج ہے اگر ادب لطیف کے بعض افسانے پست یا پھسپھسے ہیں ۔ نیز ہر چیز کی پسند کا انحصار تمامتر اپنے اپنے "ذوق" پر ہے ۔ ہو سکتا ہے کہ ایک ہی چیز ایک کو بہت پسند ہو اور دوسرے کو نہ ہو ۔ خود میرزا ادیب صاحب نے "نذرِ اولین" میں ہر مضمون کی تعریف بمقتضائے ذوقِ خود کی ہے مگر میں خود یہ کہہ سکتا ہوں کہ مجھے ان سے اختلاف ہے ۔

"افسانہ نمبر کا سب سے بڑا منشور افسانہ خود مدیر ادب لطیف کی جنبشِ قلم کا مرہونِ منت ہے ۔ اس کی تعریف سبھوں نے کی ہے ۔ مگر دو تحریریں بڑی زبردست ہیں ۔ حضرت اختر اورینوی افسانہ نگار کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں ۔

"غالباً فطرت آپ کو اُردو کا "ایڈگر ایلن پو" بنانا چاہتی ہے ۔"

حضرت رشید اپنے تنقیدی مضمون میں فرماتے ہیں کہ "میرزا ادیب لائیڈ یہ بیگر دزدہ معلوم ہوتے ہیں" خوب جب ہر شخص اپنے اپنے عقیدہ کے مطابق کسی نہ کسی مغربی اہل قلم کا میرزا صاحب کو ہمپایہ بنا رہا ہے ۔ تو سائنٹیفک اور جاسوسی عناصر کی وجہ سے کیوں نہیں بھی یہ کہدوں کہ میرزا ادیب صاحب میں "سر آرتھر کانن ڈائل" کی خوبیاں موجود ہیں ؟ مجھے اعتراف ہے کہ میرزا صاحب کا یہ افسانہ واقعی بہت بہتر ہے اور اس میں جہاں پُراسرار و حیرت انگیز واقعات بیان کئے گئے ہیں وہاں رومانی و ولولہ انگیز بھی ۔ جہاں سنگدلی و سحرکاری کے نمونے پیش کئے گئے ہیں وہاں الفت و محبت کے کرشمے بھی ۔ جسکے باعث افسانہ حد درجہ طویل ہوتے ہوئے بھی دلچسپ ہے ۔ مگر اسکی تعریف کیلئے کیا ضرورت ہے کہ انہیں کسی نہ کسی مغربی اہل قلم کا مدمقابل یا مغرب زدہ نظر رکھا جائے ؟ ہماری زبان میں یہ بڑی خرابی ہے کہ ہم کسی شخص کی اسوقت تک تعریف نہیں کر سکتے جبتک اُسکی مثال بخشنے مغربی ستون کا سہارا نہ لے لیں ۔ مغرب مغرب ہے اور مشرق مشرق ۔ ہمیں اپنی چیزیں اپنی ہی آنکھوں سے دیکھنی چاہئیں ۔ بہرکیف میری نظر میں ادب لطیف کا افسانہ نمبر ۱۹۳۵ء اجمالی حیثیت سے کامیاب ہے ۔ اسمیں کوئی عیب ایسا نہیں جو انوکھا ہو یا جب سے موجودہ دور کے متعدد رسائل کے خاص نمبر منزہ اور پاک ہوں ۔

جناب ضیا فتح آبادی ایم۔ اے

ایک ننھے یتیم کا سوال

اماں! مجھے بتا مرے ابا کا نام تو
میں پوچھ کر رہونگا نہ مانوں گا ایک بات
للہ اب فضول بہانوں کو چھوڑ دے
ہاں ہاں میں جانتا ہوں کہ ابا ہے نامور
دشت و جبل لرزتے ہیں اسکے وقار سے
معلوم ہے مجھے کہ وہ یکتائے دہر ہے
سب کچھ ہے میرے علم میں اماں! مگر فضول
لڑکے ہمیشہ میری اڑاتے ہیں پھبتیاں
"ہرگز نہ اپنے ساتھ تجھے ہم کھلائیں گے"
اماں! تو ہی بتا کہ انہیں کیا جواب دوں
کہتا ہوں سچ کہ ضبط سے لونگا نہ اب میں کام

بس بس نہ اب چھپا مرے ابا کا نام تو
میں اب نہیں سنونگا "تو سو جا تو آگئی رات"
خواب آفریں حسین فسانوں کو چھوڑ دے
ثانی نہیں ہے اسکا جہاں میں کوئی بشر
خورشید بھی ہے ماند نظر کے شرار سے
اسکا جلال سلطنت آرائے دہر ہے
اس غم کے سبب ہی رہتا ہوں میں ملول
"ماں سے جا کے پوچھ ترا باپ ہے کہاں"
جب تک نہ تیرے باپ کو پہچان جائینگے"
ہر ایک سے لڑوں کہ خموشی سے سب سہوں؟
یہ کیا کہ اپنے باپ کا میں لے سکوں نہ نام؟

اماں! نہ اب چھپا مرے ابا کا نام تو
چپکے سے مجھے بتا مرے ابا کا نام تو

"بلو طارق"

گائے

عورت کی سحرکاری پر بحث ہو رہی تھی۔ انور خود اس کا شیدا تھا وہ بڑھ چڑھ کر اس کی تائید کر رہا تھا۔ افضل کو اس صنف سے کچھ نفرت ہو چکی تھی وہ مردوں کو سراہ رہا تھا۔ ایک اس کی اعجاز آفرینی کی تعریف کر رہا تھا۔ تو دوسرا اس کی خلقی بد اخلاقی اور مرد کی عالی حوصلگی کی لمبی لمبی مثالیں دے رہا تھا۔ مجھے کوئی ذاتی تجربہ نہ تھا۔ اس لئے چپ رہا مگر سوچتا رہا کہ ابھی دست و گریباں تک نوبت پہنچ جائے گی۔ انور غصے سے لال پیلا ہو رہا تھا۔ وہ یقیناً ثالث کی رائے دریافت کرتا لیکن افضل نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔ اور کہنے لگا "بھئی تم خموش تماشہ دیکھ رہے ہو، ہمارا فیصلہ کرو مگر یہ یاد رہے کہ کسی کی رو رعایت نہ ہو۔"

"اجی اس نے کیا فیصلہ کرنا ہے جسے خود پتہ نہیں بھلا عملی دنیا میں بھی فلسفی کی رائے کی کوئی وقعت ہو سکتی ہے؟ ان کے نزدیک تو عورت ناگن ہے اور دنیا میں انسان کی سب سے بڑی مصیبت۔ یہ تو افلاطون کے خوشہ چین ہیں۔ جو اپنی خیالی دنیا ہی میں خوش و خرم رہتے ہیں۔ عورت ایک حقیقت ہے۔ اس کا وجود ایک خوشگوار وادی کی طرح شیریں اور فرحت بخش، صبح کے سہاوَنے میں بلبل کا ترانہ، ہنگام شام کوئل کی کوک، اس کا وجود پھولوں کی خوشبوؤں میں گندھا ہوا، بادۂ ناب کا چھلکتا ہوا پیمانہ، دلکش، دلنشیں، دلآرام۔ یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے۔ اس کے لئے رائے کی کیا ضرورت ہے۔ طلوع آفتاب خود آفتاب کے وجود کی دلیل ہے؟"

افضل سنتا رہا کئی بار بولنے کی کوشش کی۔ مگر وہ کہاں رکنے والا تھا۔ آخر کہنے لگا۔

"دیکھو انور یہ مسئلہ اہم ہے اس میں شاعری کو دخل نہ ہونا چاہئے۔ جذبات کی اپیل کیوں؟ تم عورت کی ظاہری شان و شوکت اور دلکشی پہ مرمٹے ہو۔ ملمع کو سونا سمجھے بیٹھے ہو۔ اگر عورت کو صحیح معنوں میں جاننا چاہتے ہو تو اس کی فطرت کا مطالعہ کرو۔ اس کے قلب و جگر کو بے پردہ دیکھو تو تمہیں معلوم ہو کہ عورت اصل میں ایک خوبصورت اور دلکش ناگن ہے جس کے درخشندہ جسم کی رگ رگ میں مہلک زہر ہے تمہارے مرغ تخیل کے پر اس کی موجودگی میں جھڑ جائینگے تمہاری شاعری مفقود اور یہ سب لطیف جذبے خاک میں مل جائیں گے۔ تم سراب اور عورت کا دور ہی سے لطف لے سکتے ہو۔ ان کی قربت میں تمہیں تلخکامیوں سے دوچار ہونا پڑیگا عشق اور محبت میں اس حد تک جاذبیت موجود ہے۔ جہاں تک وہ اپنے مآل سے وابستہ نہیں ہوتے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ عورت حسین ہے، دلکش ہے، سحرکار اور معجز نما بھی ہے مگر یہ سبھی خاصیتیں ایک پہاڑی میں بھی موجود ہیں۔ جس کی چوٹی پر ایک بار پہنچکر تمہیں لازماً نیچے اترنا پڑتا ہے معراج ہوئی

"کیا اس کے ساتھ زوال بھی تو ہے اور کتنا دردناک؟"

"مگر ۔۔۔ مگر ۔۔۔"

"ٹھہر جاؤ نا۔ مجھے اپنی کہہ لینے دو تم ابھی اسے سمجھ ہی نہیں سکتے۔ ابھی تو تم اس کے ہاتھ کا ایک کھلونا ہو جب تمہیں زمین پر پٹک دے گی تو پوچھونگا۔

تلون اس کی فطرت میں دخل ہے تم سمندر کی طوفانی سطح کو تیل چھڑک کر پُرسکون بنا سکتے ہو۔ مگر تمہاری چکنی چپڑی باتوں سے اس کی تلون مزاجی اور بھی بھڑک اٹھے گی۔"

انور کرسی سے اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ میں نے افضل کو اشارے سے چپ کرا دیا۔ دونوں ہی جوش میں تھے۔ ــــــــــ

ــــــ انور نے سگرٹ سلگایا اور بیٹھ کر لمبے لمبے کش لینے لگا۔ میں نے کہا۔

"میں نہیں کہہ سکتا تم دونوں میں کون زیادہ سچا ہے مگر اس بات کا احساس ہو گیا ہے کہ تم دونوں ہی عورت سے بے حد متاثر ہوئے ہو۔ اس سے اس کی تاثراتی قوت کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے میں تمہیں ایک قصہ سناتا ہوں جس نے خود مجھے بھی حیران کر دیا ہے۔"

دونوں کے سکون کا جائزہ لیکر میں نے کہا۔

"اس مقابل والے مکان میں ایک لڑکا اور اس کی بڑھیا ماں رہتے تھے۔ لڑکے کا نام شاذ مراد تھا۔ اور تھرڈ ائیر کا طالبعلم میں اس کی شکل کا پہلے ہی شناسا سا تھا۔ بے حد خاموش، سرد مہر اور خلوت پسند کسی کو سامنے آتا دیکھ کر یا واپس ہو جاتا یا راہ تبدیل کر لیتا۔ کچھ ہونہار بھی معلوم نہ ہوتا تھا۔ ذہانت کی کوئی جھلک نہ تھی۔ عادات و اطوار بالکل بیہودہ دلفریبیں

اس کی ماں اکثر کہا کرتی تھی "میرا مراد تو بالکل گئو ہے۔ گئو سیدھا سادہ"

مجھ سے وہ ایک بار ملا تو ذرا گھبرا کر کسی چیز کی ضرورت پڑ گئی تھی۔ اس کے مکان کا دروازہ اور کھڑکیاں عموماً بند رہتی تھیں اور روشنی بہت کم ہوتی تھی۔ ماں بیٹے کی زندگی کتنی کٹھن تھی - تنہائی میں سکوت میں اور چار دیواری میں بند پڑے رہتے تھے قیدیوں کی طرح اسکی ماں کو کبھی گھر سے باہر قدم رکھتے نہ دیکھا تھا۔ البتہ وہ کسی ہم جنس سے باتیں کرنے کی بڑی متمنی رہتی۔ میری والدہ یا ہمشیرہ کو ذرا بھی دیکھ پاتی تو جھٹ کھڑکی کھول کر ان سے گفتگو میں مشغول ہو جاتی۔ یہی اس کی بیرونی زندگی تھی۔

اس دوران میں ان کے سامنے والے مکان میں کرایہ دار آ بسے بہت شریف الطبع انسان تھے۔ جہاں صرف چند ایک گھر ہوں وہاں رسم و راہ پیدا کرنے کی آرزو پیدا ہوتی ہے شام کا وقت تھا میں کمرے میں بیٹھا کچھ لکھ رہا تھا۔ ان کا نوکر آیا کہنے لگا "میاں صاحب کہتے ہیں ہمیں اجازت ہو تو ذرا آ جائیں۔ میں نے خود ہی وہاں جانا مناسب خیال کیا۔ اور اس کے ساتھ ہو لیا۔ وہاں باتیں ہوتی رہیں اور میں کافی رات گئے واپس لوٹا۔ ان کے ایک لڑکی بھی تھی حسین تو نہیں۔ مگر اچھی تھی۔ اور اس پر شستہ۔

ان کے آنے کے دو تین دن بعد میں نے دیکھا تو مراد کے ڈھنگ ہی نرالے تھے۔ پہلے شیو کئے تین تین چار چار دن گذر جاتے تھے۔ لیکن اب روزانہ مونچھوں کا بھی صفایا ہونے لگا۔ کوٹھے پہ اسے کم دیکھا تھا۔ اب راتوں کو پڑھائی بھی وہیں

ہونے لگی۔ کھڑکیاں دروازے صرف بغیر حاضری میں بند ہونے لگے اور سب سے بڑھ کر یہ بات کہ وہ پریم کے گیت الاپنے لگا۔

اقبال کا یہ شعر تو گویا اس کا وردِ زبان تھا ؎

محبت ہی وہ منزل ہے کہ منزل بھی ہے صحرا بھی
جرس بھی کارواں بھی راہبر بھی راہزن بھی ہے

ایک روز ہمشیرہ آئیں اور کہنے لگیں "اُس گاتے کو دیکھا، سمجھتے ہو اسکا باعث؟" میں ہنس پڑا۔ میں خود اس تبدیلی کا مشاہدہ کر رہا تھا۔ ہمشیرہ کی فراست اور تیز نگاہی نے مجھے حیرت میں ڈالدیا۔ میرے خیال میں افضل تم غلط کہتے ہو کہ عورت کا قرب شاعرانہ تخیلات کو نابود کر دیتا ہے۔ یہاں تو اس نے ایک ایسے انسان میں جس کے دماغی قوا میرے نزدیک "مشکوک" تھے۔ ان تخیلات کو نہ صرف جلا دی ہے بلکہ خلق بھی کیا ہے۔ اس کی خوابیدہ فطرت اگر بیدار ہوئی تو محض عورت کی وجہ سے۔ یہ اور بات ہے کہ اس فطرت میں زیادہ عنصر بوالہوسی کا ہے۔ بے لوث اور معصوم محبت کا نہیں"

کچھ دیر کے سکوت کے بعد انور بولا۔

"اس سے تو میری بات کی تائید ہوتی ہے میں بھی تو یہی کہتا تھا کہ عورت میں خلاقیت کی بڑی قوت ہے۔"

"تم نے بھی اسے نہیں سمجھا" افضل نے کہا۔ اس سے تو میری باتوں کی صداقت ہوتی ہے تم نے دیکھ لیا کہ اچھے بھلے لڑکے میں عورت کی موجودگی نے ہوس کے زہر آلود بیج بو دیئے ہیں۔ جو اس کی کشتِ حیات کو بدی گناہ اور شرمناک موت میں تبدیل کر دینگے۔"

انور ہم پر ایک قہر آلود نظر ڈال کر چلا گیا۔

محترمہ آنسہ نسیمہ سوز۔ ارول

اے دوست

فلک پہ تاروں کی فرحت اثر ضیا ہو تم — مہِ تمام کی تنویرِ کیف زا ہو تم!
فتورِ دردِ غمِ ہجر کی دوا ہو تم — ہجومِ یاس میں اُمید کی ضیا ہو تم!
سکونِ قلب ملے جس سے تم وہ نغمہ ہو — ربابِ عشق کی حُسن آفریں صدا ہو تم!
نہ آیا رحم تمہیں میری گریہ زاری پہ — ستم نواز و جفا کیش و بے وفا ہو تم!
تمام عیش و مسرت ہے تم سے وابستہ — ہماری زیست کا بس ایک آسرا ہو تم!

نقد و نظر

معاہدہ عمرانی } (ترجمہ ڈاکٹر محمود حسین خانصاحب ایم۔ اے، پی، ایچ، ڈی۔ ضخامت دو سو چونسٹھ صفحات کتابت و طباعت اعلیٰ قیمت عہ مع خوبصورت جلد کے۔ ملنے کا پتہ مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی)

ژان ژاک روسو فرانس کا وہ بطلِ حریت وہ شعلہ طراز مصنف اور وہ عدیم النظیر مفکر ہے جس کے کارنامے وقت کے ساتھ ساتھ دنیائے انسانیت کی نگاہوں میں زیادہ احترام، زیادہ عظمت اور زیادہ شہرت حاصل کرتے جاتے ہیں۔ معاہدہ عمرانی انقلابِ فرانس کے اس زندہ جاوید ہیرو کی تصنیف Social Contract کا کامیاب اور رواں ترجمہ ہے۔ ڈاکٹر محمود حسین خانصاحب نے ترجمے میں اصل کتاب کی خوبیاں برقرار رکھنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ آغاز کتاب میں فاضل مترجم نے ایک بسیط مقدمہ میں روسو کے حالاتِ زندگی، اس کی ذہنی کاوشوں اور اس کے سیاسی افکار پر کافی روشنی ڈالی ہے۔ تحریر سادہ اور دلچسپ ہے۔ قاری صرف مقدمہ ہی پڑھکر روسو کے افکار سے بہت حد تک روشناس ہو جاتا ہے۔ کتاب کا مضمون چار حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں نو، دوسرے میں بارہ، تیسرے میں اٹھارہ اور چوتھے میں ۹ ابواب ہیں۔ آخر میں فرہنگِ اصطلاحات بھی درج ہے۔ معاہدہ عمرانی اردو کی ان کتابوں میں سے ہے جس کا پڑھنا ہر اردو دان پر فرض ہے۔

کارپردازان جامعہ ملیہ ہمارے ہدیہ شکریہ کے مستحق ہیں کہ ان کی قابلِ قدر کوششوں سے ایسی کتاب اردو میں منتقل ہوئی۔

مشاہیر ہند } (مولفہ سید بادشاہ حسین صاحب حیدرآبادی کتابت و طباعت اعلیٰ ضخامت ۱۳۱ قیمت ایک روپیہ۔ ملنے کا پتہ۔ سید عبدالقادر اینڈ سنز پرنٹرز پبلشرز چار مینار حیدرآباد دکن۔)

سوانحی ادب جہاں دلچسپ ہوتا ہے وہاں کارآمد بھی۔ مشاہیر کے قابلِ احترام سوانح حیات بہترین رہنما ثابت ہوتے رہے ہیں اور ہوتے رہینگے۔ اس لئے اس نوع کے لٹریچر کی بے حد ضرورت ہے۔ سید بادشاہ حسین صاحب ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں کہ انہوں نے کافی محنت و تلاش سے کام لیتے ہوئے موجودہ ہندوستان کے مشاہیر کے سوانح حیات کو ملک کے سامنے پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اس وقت مشاہیر ہند کی پہلی جلد ہمارے پیش نظر ہے جس میں چھ جلیل القدر انسانوں کے حالاتِ زندگی دلآویز پیرائے میں بیان کئے گئے ہیں۔ جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے۔ یہ اس سلسلہ کی پہلی کڑی ہے۔ اور اس میں سر آغا خاں، ڈاکٹر اقبال، سر اکبر حیدری، مسز بوس، ڈاکٹر ٹیگور، پنڈت جواہر لال نہرو کے اہم حالات ہیں۔

سید بادشاہ حسین صاحب کی یہ کوشش بہت مستحسن ہے۔ امید ہے پبلک اس سے پورا پورا فائدہ اٹھائے گی۔

جدید دستور کا خاکہ

(از جناب ڈاکٹر زین العابدین صاحب بی اے، سی پی ایچ، ڈی، کتابت وطباعت اچھی صفحات قیمت ۲ر ملنے کا پتہ مکتبہ جامعہ دہلی)

اس کتاب میں دستورِ جدید" (New Constitution) کی آسان پیرائے میں وضاحت کی ہے۔ اور ہر پہلو پر تنقیدی نظر ڈالی ہے۔ جو حضرات "دستورِ جدید" کو پوری طرح سمجھنا چاہتے ہیں۔ اور اُسکے محاسن و معائب معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ انہیں یہ کتاب ضرور پڑھنی چاہیئے

کائنات

(از محمود علی خانصاحب (جامعی)، کتابت وطباعت دیدہ زیب صفحات ۸۰، قیمت ۸ر ملنے کا پتہ مکتبہ جامعہ دہلی۔

یہ پُر از معلومات کتاب دس ابواب پر مشتمل ہے۔ اور ہر ایک باب اجرامِ فلکی کے متعلق دلچسپ اور کار آمد معلومات کا ذخیرہ لئے ہوئے ہے۔ پہلے باب میں اجرامِ فلکی سے "تعارف" کرایا گیا ہے۔ دوسرے باب میں دنیا کے گول ہونے کے سلسلے میں دلائل دیئے ہیں۔ تیسرے میں سورج کے فرائض و فوائد پر روشنی ڈالی ہے۔ الغرض ہر باب معلومات کا خزانہ ہے۔ کتاب کا پیرایہ بیان نہایت سلیس و دلچسپ ہے طلباء کے لئے یہ کتاب بے حد مفید ہے۔

دیوانِ غالب طاہر ایڈیشن

(بحسن سعی جناب آغا طاہر صاحب قیمت عہ ملنے کا پتہ۔ آزاد بک ڈپو کوچہ چیلاں دہلی)

دیوان غالب مختلف اداروں کی کوششوں سے مختلف صورتوں میں شائع ہو چکا ہے اور ہو رہا ہے اب جناب آغا طاہر صاحب نبیرہ آزاد مرحوم نے میرزا کا کلام بذریعہ بلاک شائع کیا ہے۔ اور ایک مستند و مکمل قلمی نسخہ سے اُسے درست کیا ہے۔ جیسا کہ دیباچہ میں خود فرماتے ہیں۔

"خوش قسمتی دیکھیے کہ اپنے ہی گھر میں ایک مستند قلمی نسخہ نکل آیا۔ یعنی میرے پرنانا جناب حسین میرزا صاحب جو صاحب ذوق اور میرزا کے عاشق زار تھے۔ انہوں نے منتخب کلام کا ایک صحیح نسخہ اپنے قلم سے لکھ کر میرزا کو دیا۔ میرزا نے پڑھکر دستخط اور مہر سے مزین کر کے بطور یادگار واپس کر دیا۔ میں نے یہ دیوان اسی قلمی نسخہ سے درست کیا ہے"!

حقیقت یہ ہے کہ آغا صاحب کی مساعی جمیلہ ہمارے صمیمانہ شکریے کی مستحق ہیں۔ کہ انکے طفیل ہمیں دیوانِ غالب کا ایسا شاندار دلآویز اور جاذبِ دل و نظر ایڈیشن نصیب ہوا!

(م - ل)

لیٹسٹ ڈیزائن

چوڑیٹ پیشن

طلسمی گھڑی

سوئیں کی بنی ہوئی انتہا سے زیادہ پائیدار لیور گھڑی ہے۔ نہ کبھی بند ہوتی ہے اور نہ کبھی مرمت کی ضرورت پڑتی ہے۔ رنگ اتنا پختہ ہے کہ برسوں کے استعمال کے بعد بھی رنگ نہیں بدلتا اور گول شیپ اس قدر خوبصورت ہے کہ مرد عورت دونوں اس پر فریفتہ ہیں اور مشینری کمال کی ہے کہ بار بار گرائیے لیکن کیا مجال کہ ذرا بھی صدمہ پہنچے۔ اسی رفتار سے برابر چلتی رہیگی۔ سائنس کے اصولوں پر اس طرح بنائی گئی کہ نہ کبھی بند ہوتی ہے اور نہ کبھی صاف کرانی پڑتی ہے۔ شیشہ اس قدر مضبوط کہ زور سے پھینک دینے پر بھی نہیں ٹوٹتا۔ وقت کی اتنی سچی ہے کہ ہزاروں یورپین اس کو خرید چکے ہیں۔ اور اتنی شاندار ہے۔ کہ سو روپے کی دوسری گھڑی اس کے سامنے ہیچ ہے۔ طلسمی ہونیکے سبب بہت تیزی سے بک رہی ہے۔ اسلئے جلد منگوایئے ورنہ ختم ہو جانے پر کسی قیمت پر بھی نہ مل سکے گی۔ قیمت اتنی خوبیوں پر بھی چھ روپے چار آنہ۔ اور پھر اس کے ساتھ تسمہ اور بکس مفت دیئے جاتے ہیں۔ ۱۲ گھڑیاں منگوانے والے دکانداروں کو [illegible] کمیشن دی جائے گی۔ اس سے زیادہ کے لئے خط و کتابت فضول ہے۔

منگوانیکا پتہ، ساورن امپورٹ کمپنی پوسٹ بکس ۱۴۵ دھلی

عالم شباب میں موت

ماہواری ایام کی خرابیاں عورتوں کے حسن و خوبصورتی کو برباد کر کے ان کی رنگت کو ہلدی کی طرح زرد بنا دیتی ہیں اگر ایام صحیح وقت پر نہیں [illegible] کبھی زیادہ اور کبھی کم مقدار میں ہوتے ہیں یا ہوتے ہوتے بند ہو جاتے ہیں۔ ریڑھ اور ناف میں درد رہتا ہے۔ اور گھٹنوں اور جوڑوں میں [illegible] کی شکایت رہتی ہے۔ اور یہ مرض بڑھتے بڑھتے بستر یا تپ تک پہنچ جاتا ہے۔ بستر پر ایسے دوسرے پڑتے ہیں کہ [illegible] رہتا اور معصوم عورتیں اسے بیماری کی بجائے جن بھوت کا اثر سمجھتی ہیں اور اس کا صحیح علاج نہ جاننے کے سبب [illegible] جاتی ہیں کیونکہ ماہواری ایام کی کوئی بھی خرابی ہو بکس ریعہ کو آزمائش لیجیئے [illegible] عورتوں کے [illegible] [illegible] تمام بیماریوں میں ہر جگہ کامیاب ثابت ہوئی ہے [illegible] کی قیمت [illegible]

[illegible]

ادیب شہیر ایم اسلم صاحب کے دو (۲) جدید شاہکار

شائقین ادب کیلئے

نفسیات، اخلاقیات، اقتصادیات کے دلچسپ تخیلات

تفسیر حیات

چالیس افسانوں کا مجموعہ

جن اصحاب نے ایم اسلم کے افسانے پڑھے ہیں۔ ان کو معلوم ہے کہ زندگی کے وہ معمولی واقعات جو انسان کی نگاہ میں کچھ وقعت نہیں رکھتے ایم اسلم صاحب اس میں ایسا رنگ بھر دیتے ہیں کہ پڑھنے والا اُس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ لہٰذا یہ افسانے کیا ہیں زندگی کے وہ واقعات ہیں جو ہر مرد اور عورت کو کسی نہ کسی وقت ضرور پیش آتے ہیں۔ ایم اسلم کے افسانوں کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ایک معمولی واقعہ سے متاثر ہو کر ایک ایسا رومان خیز افسانہ لکھتے ہیں کہ سو بار پڑھ کر بھی طبیعت سیر نہیں ہوتی۔ پھر اُس پر آپ کا طرز تحریر اس قدر دلکش اور اتنا خوبصورت ہوتا ہے کہ ہر ایک افسانہ ایک مکمل ڈرامہ معلوم ہوتا ہے۔ نہایت میٹھے اور سادہ الفاظ میں زندگی کی ایک مکمل اور دلفریب تصویر کھینچکر پیش کرتے ہیں۔ مبدا فیاض سے جو کمال اسلم صاحب کو عطا ہوا ہے۔ وہ دور حاضر کے افسانہ نگاروں میں بہت کم ہے۔ تفسیر حیات قابل مصنف کے ۱۴۰ افسانوں کا مجموعہ ہے جس کا حجم سوا سات سو صفحات ہے۔ اور نہایت خوشخط کتابت۔ گلیز کاغذ اور عمدہ چھپائی اور خوبصورت جلد بندی ہمارا دعویٰ ہے۔ اس دور میں افسانوں کی اتنی ضخیم کتاب آج تک شائع نہیں ہوئی۔ قیمت صرف دو روپیہ آٹھ آنے **مجلد**

آشوب سامانی یہ بھی ایم اسلم صاحب کی جدید تصنیف ہے جس کا ماخذ کسی کشتۂ محبت کا وہ خط ہے جو اتفاقاً یا عمداً دریائے راوی کی نذر ہوا۔ اور راوی کی تیز رو لہروں نے اُسے ساحل تک پہنچایا۔ ساحل سے پنجاب کے مشہور و معروف مصنف میاں ایم اسلم صاحب نے حاصل کیا جس کی تحریر سے متاثر ہو کر قابل مصنف کا تخیل گلشن نازکی باہمی خط و کتابت کے متعدد خطوط میں تبدیل ہو کر صفحہ قرطاس پر جلوہ ریز ہوتا ہے۔ ان خطوط میں قابل مصنف نے اپنی وسعت مشاہدہ، عمق نظری، معلومات نفسیات انسانی کے مطابق نہ صرف مرد و عورت کے باہمی ربط ضبط و جذبات محبت کا فلسفہ بیان کیا ہے۔ بلکہ اخلاق، ادب، تمدن و معاشرت پر بھی بحث و تمحیص کی ہے۔ کئی ایک خطوط نے تو دلچسپ افسانے کی شکل اختیار کر لی ہے۔ آخری صفحات پر "نالۂ فراق" کے نام سے قابل مصنف نے ایک امید و ار محبت کا ایسا ماتم کیا ہے کہ پڑھ کر پتھر دل انسان بھی آنسو بہائے بغیر نہیں رہ سکتا۔ قیمت صرف دو روپیہ آٹھ آنے **مجلد**

منگوانے کا پتہ: ملک دین محمد اینڈ سنز تاجران کتب پبلشرز بل روڈ لاہور

مکمل فائدہ ہونے کے بعد قیمت دیجئے

نمونہ حاصل کیجئے

غلط اشتہار بازی سے مشرقی طریقہ علاج کو سخت نقصان پہنچ رہا ہے۔ لہٰذا پبلک کے اعتماد اور فن طب کے وقار کو [illegible]
ادویہ کا فی روہ خاکوں کو اب غلطی اس میدان میں آنا چاہئے۔ گزشتہ دنوں ہم نے چند مجرب اور بے مثال ادویات کا اشتہار [illegible]
کی اصل کی۔ چنانچہ یہ تجربہ کامیاب ثابت ہوا اور سینکڑوں آزمودہ اور غریب مریضوں نے صحت حاصل کی اور شکریہ کے ساتھ [illegible]
دیا گیا کرنے کے لئے منصوبہ ذیل ادویات پیش کی جاتی ہیں جو نصف صدی سے ہندوستانی [illegible] حیرت انگیز [illegible]
دکھا رہی ہیں

طلائی فولاد

شنجرف سنکھیا وغیرہ کو پانی کی طرح بہا کر طلا تیار کیا جاتا ہے۔ عضو خاص کی رگیں سستی۔ کمزوری [illegible] ہو کر ناسور یقینا عضو کے اوپر باقی رہتی ہیں چند دن کے بعد ہی حقیقت معلوم ہو جاتی ہے۔ پھر بھی کسی طلا کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ آپ نہیں جانتے ہیں ہر عمر کا آدمی استعمال کر سکتا ہے۔ اس کے ساتھ کسی طلا کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ طبابت پیشہ احباب کی رائے ہے کہ عضو خاص کے امراض کے لئے اس سے بہتر نہ دوا ثابت [illegible] کوئی طلا آج تک ثابت نہیں ہوا۔

قیمت پانچ روپے پانچ آنے (۵/۵)

معجون خاص

[illegible] بادی کی زیادتی کی وجہ سے بے چین ہو گیا تھا [illegible] عجیب و غریب چیز ہے۔ حکیم اجمل خاں کے [illegible] لکھا ہے کہ اس سے عضو خاص میں اس قدر سختی اور قوت [illegible] ... بہت سے شرم محسوس ہوتی ہے۔ یہی نسخہ جس سے [illegible] بوڑھوں میں جوانی کا شعلہ بھڑک اٹھتا ہے۔ غیر شادی شدہ [illegible] خوفی۔ سیلان الرحم۔ جریان۔ سرعت۔ ضعف دل و دماغ [illegible] کے لئے جادو کا اثر رکھتا ہے۔ قیمت [illegible]

وہ امراض [illegible] بادشاہ کے [illegible]

تھکے ہوئے گھروں کی آبادی بے رونق زندگیوں میں مسرت طاقت شباب انگیز دلوں کے لئے مکمل کورس مخصوص ہے قیمت مکمل کورس [illegible]
وغیرہ کل [illegible] بحضرت احباب پوری قیمت میں [illegible] متوسط الحال [illegible] نصف پہلے نصف بعد صحت۔ جو لوگ [illegible]
ہی پہلے ادا کرنے سے مجبور ہوں وہ مکمل کورس منسلکہ ذیل اقرار نامہ کے ساتھ بلا قیمت بذریعہ وی پی طلب فرمائیں۔ یہ بات کہ آپ کل قیمت [illegible]
ہیں یا نہیں۔ آپ ہی پر چھوڑتا ہوں۔

حلف نامہ

میں خدا کو حاضر ناظر جان کر حلفیہ اقرار کرتا ہوں کہ مکمل فائدہ ہونے کے بعد قیمت مکمل کورس مبلغ [illegible] یا [illegible] روپیہ [illegible]
میں ادا کر دوں گا۔ اس کی قیمت رکھ لینا مطلقاً حرام ہے نیز میں اقرار کرتا ہوں کہ دوا کا فعل مجھے [illegible]
میں [illegible] بھیج دوں گا۔ بعد صحت یابی [illegible] اور فوراً پہلی قسط مبلغ [illegible] روپے بذریعہ [illegible]
روانہ کر دوں گا خدا میری مدد کرے

[illegible]

REGD. No. L 3521



دُنیا کی حُور اور دیگر افسانے

لڑکیوں اور بیٹیوں کے ساتھ اس سے اچھا سلوک کوئی اور نہیں ہو سکتا کہ ان کے دلوں کو ساس اور نندوں کی زبانوں سے نکلے ہوئے اُن تیروں سے گھائل نہ ہونے دیا جائے جو بے سلیقہ کم شعور اور بے تمیز یا فضول خرچ عورتوں پر ہر وقت برستے رہتے ہیں اور زندگی ان کے لئے اجیرن ہو جاتی ہے۔ اس کی اچھی صورت یہ ہے کہ لڑکیوں کی تربیت میں اُنکی آئندہ زندگی کے متعلق ہر قسم کے نشیب و فراز کو ملحوظ رکھا جائے اور یہ نہ سمجھا جائے کہ ایک امیر کی بیٹی کا شوہر بھی لازمی طور پر امیر ہی ہوگا اور امیر بھی لازمی طور پر امیر ہی ہوگا۔ اور امیر بھی ہوگا تو دولت و ثروت ہمیشہ اس کا ساتھ دیگی۔ کتابیں بچوں اور بچیوں کا اخلاق سدھارنے میں بہت مفید ہوتی ہیں۔ دنیا کی حور خاص طور پر لڑکیوں اور عورتوں کیلئے لکھی گئی ہے۔ اسکا پلاٹ بالکل ہماری معاشرت اور تمدن کے مطابق ہے۔ طبیعت خود بخود الفاظ کا اثر قبول کرتی ہے۔ اور مصنف غیر محسوس طور پر پڑھنے والے کے دل و دماغ پر پائدار اور حسین نقوش بناتا چلا جاتا ہے دوسرے افسانے بھی انہیں خصوصیات کے حامل ہیں بچیوں کے نصاب تعلیم میں اسکا شامل رہنا نہایت ضروری ہے۔ کتاب میں کوئی لفظ بھی ایسا نہیں جو شریف بہو بیٹیوں اور حیادار بچیوں کی آنکھوں یا کانوں پر بار ہو سکے۔ زبان کی سلاست سادگی اور مضامین کی اثر آفرینی کے لئے . . . کوثر چاندپوری کے نام مضبوط ضمانت ہے۔ ملک کے مشہور جرائد اور اہل الرائے حضرات نے اسکی بڑی تعریفیں کی ہیں۔ آج ہی فرمائش بھیجدیجئے۔ قیمت مجلد . . . . . ایک روپیہ

عورتوں کے افسانے

ہندوستان کی بے زبان عورتوں کے دُکھ درد کو سمجھنے اور انکے دُکھے ہوئے دلوں کی آوازیں سننے کے لئے اس کتاب کا مطالعہ ازبس ضروری ہے۔ یہ کوثر چاندپوری کے چند موثر دلچسپ مفید اور سبق آموز افسانوں کا مجموعہ ہے ہر افسانہ بجائے خود ایک طویل داستان ہے ان مظالم و مصائب کی جو سنگدل سماج کے ہاتھوں آئے دن عورتوں پر ہوا کرتے ہیں۔ ہر شخص کو عام اس سے کہ ہندو یا مسلمان یہ کتاب ضرور دیکھنی چاہئے۔ اور اپنے گھر کی عورتوں کو بھی دکھانا چاہئے جس گھر میں یہ کتاب نہ پہنچے گی وہاں اندھیرا ہی رہے گا سورج کی کرنیں صبح ہوتے ہی پھوٹتی ہیں۔ اور اگر اونچی دیواریں انہیں روک لیں تو روشنی کا قصور نہیں گھروں میں اجالا کرنا ہے تو آج ہی یہ "شمع ہدایت" منگا لیجئے جس کی روشنی کبھی نہیں ہوگی۔ قیمت . . . عہر

ملنے کا پتہ: **مکتبہ اردو۔ لاہور**

بیسیوں بیماریوں کا

پہلا طبی مجموعہ

طبع یازدہم

مخزنِ حکمت
گھر کا ڈاکٹر و حکیم

مصوّر ایڈیشن

مؤلفہ خانصاحب ڈاکٹر غلام جیلانی شمس الاطبا

مخزن حکمت کی قبولیت اور شہرت کے پیش نظر یہ کہنا پڑتا ہے کہ یہ کتاب اپنی نوعیت اور لازوال شہرت کے اعتبار سے کسی تعریف کی محتاج نہیں

اس موجودہ ایڈیشن میں دیگر اضافات کے علاوہ تقریباً چار صد رنگین یا بلاکس تصاویر یا دو صد کے قریب دستی تصاویر کا اضافہ کیا گیا ہے جو آرٹ پیپر کے تقریباً تین صفحات پر پھیلی ہوئی ہیں۔ ان صوری محاسن کے علاوہ معنوی حیثیت سے موجودہ ایڈیشن میں اکثر امراض کے لئے نئے و مجرب ریونانی ڈاکٹری معالجات اور کارآمد نسخہ جات کا بیش بہا اضافہ ہو گیا ہے۔ جس سے کتاب ہذا ہر پہلو سے سابقہ ایڈیشنوں کی نسبت زیادہ مفید اور زمانہ حال کی ضرورت کے عین مطابق بن گئی ہے جیسے ہر مرض کی تعریف یا ماہیت۔ کیفیت، اسباب، علامات۔ اقسام تشخیص۔ انجام عوارض و اصول علاج کے بیان کے بعد ڈاکٹری علاج میں دل حفظ ما تقدم پھر علاج شافی ڈاکٹری اور بہترین نسخہ جات لکھنے کے بعد یورپ و امریکہ کی بہترین و مفید ترین پیٹنٹ ادویہ بھی تحریر کر دی گئی ہیں۔ علاوہ محصول ڈاک۔ علاوہ ازیں علاج بذریعہ انجکشن۔ جلدی پچکاری کا جدید اضافہ کیا گیا ہے۔ اسی طرح طبی علاج میں بہترین طبی مجربات کے علاوہ مفید ترین ادویہ کے استعمال کا طریقہ بھی لکھ دیا ہے۔ اور ساتھ ہر مرض کے آخر میں غذا و پرہیز کا تذکرہ بھی بڑھا دیا گیا ہے۔ ان عظیم الشان اضافات اور بلند ترین خوبیوں کے باوجود قیمت میں خاص اضافہ نہیں کیا گیا۔

قیمت ہر دو جلد مکمل بلا جلد عہ مجلد ہ؎ فی جلد بغیر جلد ؎ مجلد ؎ علاوہ محصول ڈاک۔

کتابوں کا بہترین مجموعہ

انجکشن بک یا کتاب التلقیح بالتصویر

جس میں انجکشن کے مخصوص فوائد اور طریق عمل ٹیکہ کے مقام کا انتخاب انجکشن میں بے احتیاطی سے نقصانات انجکشن کے اقسام اور ان میں مستعمل ادویات کا مفصل بیان درج ہے۔ اسکے علاوہ جلدی پچکاری (ہپوڈرمک انجکشن) عضلی پچکاری (انٹرا مسکولر انجکشن) وریدی پچکاری (انٹرا وینس انجکشن) نخاعی پچکاری (انٹرا اسپائنل انجکشن) بے حسی پیدا کرنے والا ٹیکہ (لوکل انیس تھیٹک انجکشن) ویکسینز اور سیرم کے ٹیکے (ویکسینز اینڈ سیرم انجکشن) وغیرہ کا مفصل تذکرہ اور آسان طریق پر ہر ایک کا بیان درج ہے۔ علاوہ ازیں قوت مناعت وغیرہ اور جس قدر انفیکشن وغیرہ بھی مشہور انگریزی دواساز کمپنیوں کی ادویات انجکشن کو جو آجکل مروج ہیں۔ ردیف وار نہایت وضاحت کے ساتھ درج کر دیا ہے۔ ہر دوا کی مقدار خوراک طاقت و تاثیر و فارماکالوجی صفات کیمیاوی و تھراپیوٹکس، استعمال یعنی کن کن مرضوں میں مستعمل ہے۔ وغیرہ کے متعلق مفصل بیان درج ہے۔ انکے علاوہ علاج جراحی میں جو انجکشن مستعمل ہیں ان کو بھی تفصیل وار درج کر دیا ہے۔ غرض بیشمار ایسی خوبیاں موجود ہیں جو کتاب دیکھنے اور مطالعہ کرنے پر معلوم ہو سکتی ہیں۔ مزید آسانی پیدا کرنے کے لئے جا بجا رنگین تصویریں لگا دی گئی ہیں قیمت تین روپے بلا مجلد ؎ علاوہ محصول ڈاک

منگانے کا پتہ۔ طبی کتب خانہ جناب شمس الاطباء رجسٹرڈ بھاٹی گیٹ لاہور

منظور کردہ ڈائرکٹر صاحب بہادر سررشتۂ تعلیم پنجاب لاہور لیٹر نمبر ۱۱۳۲۳ سی مورخہ ۱۰ر فروری ۱۹۳۶ء
منظور کردہ محکمۂ تعلیم حیدرآباد دکن ۲۴۲۰ سنہ ۱۳۴۴ف مثل نمبر ۳(۱۰) ۴۴ف

مکتبۂ اردو لاہور کا

کثیر الاشاعت و ارزاں ترین ماہنامہ

ادبِ لطیف

رسالہ ماہوار

ماہ جنوری ۱۹۳۸ء

ادارۂ تحریر

چودھری برکت علی بی۔اے

میرزا ادیب بی۔اے

مقامِ اشاعت

مکتبۂ اردو لاہور

پرنٹر پبلشر چودھری نذیر احمد

سالانہ چندہ مع ضخیم سالنامہ و افسانہ نمبر
پانچ روپے علاوہ محصول ڈاک

ممالک غیر سے
آٹھ شلنگ

مندرجات

جلد ۶ | بابت ماہ جنوری ۱۹۳۸ء | نمبر ۵

ادارہ

نذرِ اولین

سالنامے کی مقبولیت۔ کسی کتاب یا رسالے کی مقبولیت و کامیابی کا اندازہ یا تو اہلِ قلم حضرات کے تنقیدی مقالات اور رسائل و جرائد کے تبصرات کی روشنی میں لگایا جا سکتا ہے یا اس کی مانگ سے۔ سالنامہ "ادبِ لطیف" کی کامیابی بھی انہی دو طریقوں سے جانچی جا سکتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ابھی متعدد رسائل و جرائد ایسے موجود ہیں جن میں سالنامے پر تبصرہ نہیں ہوا مگر جو چند تبصرات ہماری نگاہوں سے گذرے ہیں۔ وہ بیحد امید افزا ہیں اس کے علاوہ اہلِ قلم کے بے شمار خطوط سالنامے کی تعریف و توصیف میں موصول ہو چکے ہیں۔ اب رہ گیا دوسرا طریقہ وہ ہے رسالے کی مانگ۔ اس کا اندازہ اس امر سے لگائیے کہ سالنامے کو شائع ہوئے ابھی چند دن گذرے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود سالنامے کی صرف چند کاپیاں دفتر میں رہ گئی ہیں اور وہ بھی فائل کے لئے۔ ایجنٹوں کے پُر اصرار تقاضے ہو رہے ہیں۔ مگر دفتر میں اتنی کاپیاں کہاں کہ ان کے ارشاد کی تعمیل ہو سکے۔ بہرحال ہمیں مسرت ہے کہ ہماری کوششوں نے توقع سے بڑھ کر کامیابی حاصل کی — ادبی حلقوں نے ہماری مساعی کو نوازتے ہوئے ہمارے حوصلوں کو بڑھایا۔ خریدار حضرات نے سالنامے کی ذمہ دارانہ سرپرستی فرما کر ہماری ہمت افزائی کی۔

سالنامے کے متعلق کئی رائیں آچکی ہیں۔ جنوری نمبر میں ہم چند ایک کے اقتباسات شائع کر رہے ہیں۔

جنوری کے مضامین۔ روحانیات ایک پُرمغز مقالہ ہے ہمارے محترم دوست رشید طارق ایم۔ اے کے قلم سے۔ رشید صاحب وسیع المطالعہ صاحبِ قلم ہیں اور جو کچھ لکھتے ہیں بہت سوچ سمجھ کر لکھتے ہیں۔ لاہور کی ادبی انجمنوں میں آپ کئی ادبی مقالات پڑھ چکے ہیں۔ ان میں سے ایک ہمارے سالنامے میں "فلسفۂ خندہ" کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔

وطن فروش۔ ڈرامہ ہے پیڈرک کولم کا جسے مشہور نوجوان صاحبِ قلم اثر چکوالی بی۔ اے نے اردو میں منتقل کیا ہے۔ یہ ڈراما سالنامے میں شائع ہونے کے لئے موصول ہوا تھا۔ مگر عدمِ گنجائش کے باعث نہ جا سکا۔ اور ہمیں اس امر پر افسوس ہے۔ اثر صاحب نے اصل خوبیوں کو برقرار رکھا ہے اور یہ ہے مترجمانہ صلاحیت ———!

شاہکار۔ محترمہ زبیدہ سلطانہ کافی عرصے کے بعد ادبِ لطیف کی بزم میں تشریف لائی ہیں۔ آپ کا یہ افسانہ امید ہے بہت دلچسپی کے ساتھ پڑھا جائے گا۔ محترمہ کے افسانوں کا ایک مجموعہ "لمحاتِ رنگیں" کے نام سے شائع ہو کر کافی مقبول ہو چکا ہے۔ شائقینِ افسانہ اس خبر کو مسرت سے سنیں گے کہ آپ کے افسانوں کا دوسرا مجموعہ "شبستانِ الم" کے نام سے مکتبہ اردو کی طرف سے عنقریب شائع ہوگا۔

جہیز۔ احمد ندیم قاسمی فطرتاً شاعر ہیں۔ ایک ایسے شاعر جس پر شاعری کو بھی ناز ہے۔ آپ کی بے شمار نظمیں ملک میں بے حد مقبول ہو چکی ہیں۔ جہیز ندیم صاحب کا غالباً بہترین افسانہ ہے

آپریشن۔ مولانا کوثر چاندپوری کا یہ مزاحیہ مضمون سالنامے کے لئے موصول ہوا تھا مگر عدم گنجائش کی وجہ سالنامے میں نکل نہ سکا۔ واقعی یہ افسوسناک امر ہے کہ بعض مضامین ایسے ہوتے ہیں جنہیں ہم خاص نمبروں میں ضرور شائع کرنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ خاص نمبروں ہی کے لئے موصول ہوتے ہیں مگر عدم گنجائش کے باعث ہماری آرزو کامیاب نہیں ہو سکتی۔ آپریشن بھی انہیں مضامین میں سے ہے۔ اور بحیثیت مزاحیہ مضمون کے خوب ہے۔

ادب لطیف میں نئی دلچسپیاں۔ اردو کے ممتاز ادیب حضرت لطف الرحمن ایم اے کا ڈراما "شہنشاہ حبشہ" ادب لطیف کی تین اشاعتوں میں شائع ہو کر بے حد مقبولیت حاصل کر چکا ہے۔ اب دو اور دلچسپ چیزیں "ادب لطیف" میں بالاقساط شائع ہونا شروع ہو جائینگی۔ ایک تو حضرت عطاء اللہ پالوی کا نہایت بلند پایہ تنقیدی مقالہ ہے۔ جو رسالے کی تین اقساط کو محیط ہوگا۔ عطاء اللہ صاحب کامل الفن نقاد ہیں۔ اور آپکے تنقیدی مقالات کو جو شہرت حاصل ہوئی ہے وہ ظاہر ہے۔ دوسری چیز ہے "عمر خیام"۔ یہ ایک رومانی ناول ہے۔ مشہور مستشرق ہیرلڈ لیمب کے قلم سے جسمیں مصنف نے مشرق کے سب سے بڑے رومانی شاعر کا رومان زندگی پیش کیا ہے۔ ناول کے مترجم اردو کے بلند پایہ ادیب حضرت رحمن مذنب ہیں۔ رحمن صاحب نے ترجمے میں بڑی محنت سے کام لیا ہے۔ اور اسے اتنا دلچسپ اور اتنا دلآویز بنا دیا ہے کہ زبان سے بے اختیار صدائے تحسین نکلتی ہے۔

مکتبہ اردو کی ادبی سرگرمیاں۔ دسمبر میں چونکہ سالنامہ شائع ہو رہا تھا۔ اسلئے کارپردازان مکتبہ کی تمام توجہات کا مرکز "سالنامہ" ہی تھا۔ اب چونکہ یہ فرض ادا ہو چکا ہے۔ اس لئے پھر بڑی دلچسپی و سرگرمی کے ساتھ کتابوں کی اشاعت کے انتظامات بروئے کار آ رہے ہیں۔ جناب مختار انبالوی کی زیر تصنیف "آہنگ رزم" اشتراکی ادیب باری علیگ کا تاریخی کارنامہ "ہندوستان میں کمپنی کی حکومت" جناب جعفری علی خاں کے افسانے "چاند گاگناہ" اور دیگر افسانے "مولانا کوثر چاندپوری کے افسانوں کے دو مجموعے "عورتوں کے افسانے" اور "دنیا کی حور" اور دیگر افسانے مارکیٹ میں آ گئے ہیں۔ ان کے بعد مشہور و مقبول ڈراما "شہنشاہ حبشہ" اور محترمہ زبیدہ سلطانہ کے افسانوں کا مجموعہ "شبستان الم" اور جناب قیسی رامپوری کا دلچسپ ناول "آخری فیصلہ" ملک کے مشہور مزاح نگار حاجی لق لق کے مزاحیہ مضامین کا بہترین مجموعہ جس کے پڑھنے سے آپکا دل کشت زعفران بن بن جائیگا وغیرہ کتابیں شائع ہو رہی ہیں۔

دو آتشہ و سہ آتشہ۔ سالنامے میں "دو آتشہ" کے تحت میں رباعیات اور ان کی منظوم تشریح شائع ہوئی ہے مگر پہلی رباعی کے ترجمے کے پہلے مصرعے میں "ہم" کی جگہ "ہیں" لکھا گیا ہے۔ ناظرین تصحیح فرمالیں۔ یعنی جیسے پریم میں "ہیں" متوالے کی بجائے جیسے پریم میں "ہم" متوالے چاہئے۔ اسی طرح "سہ آتشہ" میں فارسی ترجمے کے آخری مصرعے میں "بیم" کے بعد "ہم" بھی چاہئے۔ یعنی کہ بیم ۔ ۔ ۔ بنودایں گھر مہرو وفا کی بجائے چاہئے۔ ع

کہ بیم ہم ۔ بنود ایں گھر مہرو وفا

محترمہ انور سلطانہ مہ رخ۔ مہ رخ صاحبہ اردو کی مشہور ادیبہ ہیں۔ آپکے مضامین نسوانی رسائل و جرائد میں شائع ہو کر کافی وقعت حاصل کر چکے ہیں۔ ایڈیٹر ادب لطیف کی گذارش پر "نسوانی صحافت کے انتقادی فرائض" آپ نے بکمال مہربانی اپنے سپرد لے لئے ہیں۔ اس نمبر میں بھی آپکا ایک تبصرہ درج ہے۔

خریدار حضرات توجہ فرمائیں۔ خریدار حضرات کی خدمت میں متعدد بار گذارش کی جا چکی ہیں کہ خط و کتابت کرتے وقت چٹ نمبر کا حوالہ ضرور دیا کریں۔ کیونکہ ایک نام کے کئی حضرات خریداروں میں شامل ہیں۔ اس صورت میں خاص خریدار کا پتہ لگانا وقت دہ چیز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خریداروں کی شکایات پر توجہ نہیں دی جا سکتی۔

نوشتہ پیڈرک کولم　　مترجمہ اثر چکوالی ۔ بی ۔ اے

وطن فروش

ایک ایکٹ کا ڈراما

افراد

گڈن لفرے ـــــــــــ سرائے کا مالک
مارگن لفرے ـــــــــــ اس کا بھائی ـــ ایک مجسٹریٹ
منادی ـــــــــــ
پیگ ـــــــــــ مطربہ

منظر

(اٹھارھویں صدی کا زمانہ، شام کا وقت، آئرلینڈ کے گاؤں کی ایک سرائے کا کمرہ جس کی دیواریں خستہ وخراب اور جگہ جگہ سے پھٹی پڑی ہیں۔ کمرے میں بازار کی جانب ایک وسیع دو پہلو کھڑکی کھلی ہوتی ہے۔ جس میں سے بازار کی تمام کیفیت بخوبی دکھائی دے رہی ہے۔ اسی طرح بازار کے لوگ، کمرے کی تمام حالت کو آسانی سے دیکھ سکتے ہیں۔ کمرے کا تمام سامان گرد وغبار سے اٹا ہوا ہے۔ پردوں کا نیلگوں رنگ، گرد وغبار کی فراوانی کے باعث خاکی ہو چکا ہے۔ بڑی کھڑکی کے پٹ بھی ٹوٹ چکے ہیں۔ کمرے کی فضا گرد آلود ہے۔ کمرے کا داخلی دروازہ کھڑکی کے بائیں طرف ہے کھڑکی کے ساتھ ایک بڑا میز پڑا ہوا ہے۔ مارگن لفرے مضبوط قوی ہیکل اور ادھیڑ عمر کا آدمی ہے۔ مگر گڈن اس سے قدرے کمزور اور دراز قد ہے۔ وہ ایک دوسرے کو اس انداز سے دیکھ رہے ہیں، جیسے ان کے درمیان ابھی ابھی کوئی جھگڑا یا فساد رونما ہو چکا ہے)

مارگن ۔ بہرکیف میں کھانا یہاں ہی کھاؤں گا۔

گڈن ۔ مگر تم کھاؤ گے کیا؟

مارگن ۔ کونسی چیز تمہارے ہاں پکی ہے؟

گڈن ۔ مچھلی۔

مارگن ۔ مچھلی! میں نے تو کل ہی پادری کے ہاں کھائی ہے، اور پرسوں شریف کے ہاں بھی تو مچھلی ہی پکی تھی کیا اس ملک میں مچھلی کے سوا اور کوئی چیز کھانے کے لئے نہیں؟

گڈن ۔ لیکن میرے ہاں مچھلی کے سوا اور کچھ نہیں پکا!

مارگن۔ بہتر، تو پھر نیچے مچھلی لا دو۔

(وہ ایک کرسی پر بیٹھ جاتا ہے۔ اور تاش کے پتوں کو اپنے سامنے میز پر بکھیر دیتا ہے)

گڈن۔ میرے ساتھ تاش کھیلو گے نا مارگن؟

مارگن۔ کیوں نہیں؟

گڈن۔ مگر اس وقت ----

(باہر سے منادی کی آواز آتی ہے۔ اور گھڑیال بجنا ہوا سنائی دیتا ہے)

منادی۔ پانچ سو پونڈ انعام .... پانچ سو پونڈ انعام... اس شخص کو دیا جائیگا۔ جو اس بات کی اطلاع دے گا۔ کہ کس شخص یا کن اشخاص نے آنرک ہیک مین سارجنٹ شاہی ذریعہ کو قتل کیا ہے۔

مارگن۔ پانچ سو پونڈ انعام .... کتنا معقول انعام ہے گڈن مگر اس کو حاصل کرنے کا کوئی طریقہ .... افسوس

گڈن۔ اور تمہارے ہاتھ یہ انعام آجائے تو؟

مارگن۔ میں جانتا ہوں کہ تمہاری انگلیاں اس انعام کو حاصل کرنے کے لئے درد محسوس کر رہی ہیں۔

گڈن۔ مگر تم سے زیادہ نہیں۔

مارگن۔ افسوس ہم اس کو حاصل نہیں کر سکتے۔

(منادی کے قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے۔ وہ داخلی دروازے کے نزدیک گھڑیال بجاتے ہوئے نظر آتا ہے پھر کمرے کے اندر داخل ہو جاتا ہے۔ اس نے سپاہی کا سا ٹھپا ہوا لال رنگ کا کوٹ پہنا ہوا ہے۔)

منادی۔ پانچ سو پونڈ انعام اس شخص یا ان اشخاص کو دیا جائے گا جو آنرک ہیک مین کے قاتل کی خبر لائیں گے۔

مارگن۔ ارے۔ اس خبر کو بازار میں شہر کو دو۔ ایسی باتوں کی جگہ یہاں نہیں ہے۔

منادی۔ بہت بہتر حضور! مگر میرے پاس ایک مچھلی ہے۔ جو میں نہایت حفاظت سے گڈن کے لئے لایا ہوں۔

(وہ مچھلی کو کپڑے سے نکالتا ہے)

گڈن۔ اس کو یہاں رکھ دو (منادی مچھلی رکھ دیتا ہے) مگر کس نے بھیجی ہے؟

منادی۔ یہیں کوئی تھا۔ میں اس کو نہیں جانتا۔

مارگن۔ شائد اس نے مجھ کو یہاں دیکھ کر آنا پسند نہ کیا ہو

منادی۔ آپ کا خیال بالکل درست ہے حضور۔

مارگن۔ (منادی سے) اب یہاں سے چلے جاؤ کہیں لوگ یہ خیال نہ کریں کہ تم ان کے خفیہ راز کو افشا کر رہے ہو۔

منادی۔ (دروازے پر کھڑے ہو کر) آپ ایسی خیالی باتیں کر سکتے ہیں۔ مگر آپ کو معلوم نہیں کہ اس مصیبت کا باعث وہ شخص ہوگا۔ جو خود مصیبت میں مبتلا ہے۔

مارگن۔ کیا کہہ رہے ہو تم ذرا ٹھہرو تو۔

منادی۔ میں اپنا فرض ادا کر چکا لیجئے رخصت۔

(وہ چلا جاتا ہے)

مارگن۔ "اس مصیبت کا باعث وہ شخص ہوگا جو خود مصیبت میں مبتلا ہے" گڈن! اس سے منادی کا کیا مطلب ہے؟

گڈن۔ مطلب کیا خاک ہونا ہے۔ یہ جاہل لوگ اکثر ایسی ہی مہمل اور غیر مبہم باتیں کیا کرتے ہیں۔

مارگن۔ مجھے افسوس تو اس بات کا ہے۔ کہ اس شہر میں کوئی

بھی ایسا آدمی نظر نہیں آتا۔ جو ہم کو آرنلڈ ہیک بین کے قاتل کا نام بتانے کے لئے تیار ہو۔ اس راز کو پانچ سو پونڈ تو کیا پانچ سو لاکھ پونڈ بھی افشا نہیں کرا سکتے۔

گڈن۔ یہ حقیقت ہے کہ کوئی بھی اس راز کو افشا نہ کرے گا۔ کیونکہ ان لوگوں کا یہ مذہب ہے کہ وہ ایسی باتوں سے کسی سرکار پرست کو آگاہ نہ کریں۔

مارگن۔ تو اس لحاظ سے نہ میں اور نہ تم اس انعام کو حاصل کریں گے کیا ہی اچھا ہو اگر ہم انعام کا نصف ہی حاصل کریں

گڈن۔ (حیرت اور مسرت کے ملے جلے آثار کے ساتھ) مگر ایک طریقہ سے ہم اس کو حاصل کر سکتے ہیں۔

مارگن۔ کوئی ایسا طریقہ بھی ہو سکتا ہے؟ لیکن کونسی چیز پانے کا؟

گڈن۔ پانچ سو پونڈ انعام حاصل کرنے کا۔

مارگن۔ گڈن۔ مجھے وہ طریقہ۔ . . . . . وہ تجویز خدارا جلد بتاؤ۔ آہ! پانچ سو پونڈ انعام . . . . کیا تمہارے اس چھوٹے سے دماغ میں بھی کوئی ایسی معقول تجویز آگئی ہے؟

گڈن۔ سنو۔ مارگن! فرض کرو۔ کہ ہم بازار سے کسی شخص کو یہاں اپنے اس کمرے میں بلا لیتے ہیں۔ اور ہم میں سے ایک اس ہنگامی اجتماع کے روبرو اس سے گفتگو کا سلسلہ جاری رکھتا ہے مگر اس وقت اس اجتماع کو آتشیں جذبات کو نصف انداز کرتا ہوا . . . . مگر افسوس کہ یہ امر محال ہے۔

مارگن۔ ہاں! ہاں!! گڈن آگے چلو!

گڈن۔ کیا یہ کیفیت دیکھ کر لوگوں کے اس عظیم اجتماع کو یہ وہم لاحق نہ ہوگا۔ کہ وہ آدمی کہیں ہم کو آرنلڈ ہیک بین کے قاتل کا نام نہ بتا رہا ہو؟ اور کیا وہ اس کو جان سے مار ڈالنے کے لئے تیار نہ ہو نگے۔ آہ جب وہ ہم سے رخصت ہو کر بازار میں قدم رکھے گا۔ اور کیا اس آدمی کو بھی یہ خیال نہ آئے گا کہ لوگ اس کو جان سے مار ڈالنا چاہتے ہیں اور اس وقت . . . .

مارگن۔ (پھر)

گڈن۔ اس وقت وہ آرنلڈ ہیک بین کے قاتل کا نام طوعاً وکرہاً ہم کو نہ بتا دیگا۔ اور کیا ہم اس کو بچانے کی ہر ممکن کوشش نہ کریں گے؟

مارگن۔ یقیناً ہم لوگوں کے اس اجتماع کو اس بات کا پورا موقع دینگے کہ وہ ہماری باہم گفتگو کو بغور سننے کی کوشش کرے میرے خیال میں تمہیں یہ تجویز کل کے میلے کی نمائش سے سوجھی ہے جب تم اس کھڑکی میں کھڑے بازار کی چہل پہل دیکھ رہے تھے

گڈن۔ نہیں۔ تجویز مجھے یوں نہیں سوجھی۔ بلکہ بات یوں ہوئی ہے کہ کل میں اس میز کے ساتھ لگا بیٹھا تھا۔ اور کھڑکی کا پردہ اٹھا ہوا تھا۔ کہ ایک بدمست کسان میرے ساتھ ایک کاروباری مشورہ کرنے کے لئے آیا۔ دیر تک میری اس کے ساتھ گفتگو ہوتی رہی۔ یکایک اس کا چہرہ موت کی مانند سفید ہو گیا۔ "وہ ہمیں دیکھ رہے ہیں" اس نے کہا۔ میں نے دیکھا۔ تو لوہار کی دوکان پر لوگوں کا اجتماع عظیم تھا۔ اور وہ نہایت متجسسانہ نگاہوں سے ہماری جانب دیکھ رہے تھے۔ اس وقت لوگوں کے دماغوں میں کونسے شبہات پرورش پا رہے تھے۔ میں ان سے بخوبی باخبر تھا۔

مارگن۔ ان کے شبہات اور اوہام اس کے ماسوا اور کیا ہو سکتے

تھے۔ کہ وہ بدمست کسان جو تمہارے ساتھ گفتگو کر رہا تھا۔ شاید آرنگ ہیک مین کے قاتل یا قاتلوں کے نام نہ بتا رہا ہو۔

گڈن۔ بالکل یہی خیالات تھے ان لوگوں کے۔ اُس بدمست کسان نے مجھ سے کہا: "مجھے ڈر ہے کہ کہیں یہ لوگ میری جان کے دشمن نہ بن جائیں۔ اگر اس وقت یہاں مارگن کھڑے ہوتے تو وہ میرے لئے بہت کچھ کر سکتے تھے۔ کیونکہ لوگوں کی یہ متجسسانہ نگاہیں مجھے صاف بتا رہی ہیں۔ کہ میرا اب شہر میں رہنا خطرے سے خالی نہیں۔ بس اتنی سی بات تھی جو میرے ذہن میں اس تجویز کی محرک ہوئی۔

مارگن۔ یقیناً یہ ایک نہایت کامیاب تجویز ہے۔ یہ کمرہ اس بڑی کھڑکی کی وجہ سے اس مقصد کی تکمیل کے لئے کتنا موزوں ہے۔ ہر شخص جو اس کمرے میں موجود ہو۔ اس کھڑکی کے بالمقابل کھڑا ہونے سے بازار کی تمام کیفیت کو بخوبی دیکھ سکتا ہے۔ اور اسی طرح بازار کے لوگ بھی اُس آدمی کو بخوبی پہچان سکتے ہیں۔

گڈن۔ اگر ہم اس مقصد میں کامیاب ہو جائیں۔ تو کتنا اچھا ہو، کاش ہمارے اس فریب میں کوئی آ جائے پانچ سو پونڈ انعام مارگن کتنا معقول انعام ہے۔

مارگن۔ اگر ہم اس مقصد میں کامیاب ہو گئے تو گڈن پھر کیا ہو؟

گڈن۔ ہونا کیا ہے۔ عوام کے دماغوں میں ایک قسم کا فتور آ جائے گا۔ وہ دیوانے کتے کی طرح ہم کو کاٹنے کے لئے دوڑیں گے۔ اُن میں ہر شخص یہ خیال کریگا کہ اس کا بھائی، بیٹا یا رشتہ دار وطن فروشی کر رہا ہے۔ اجس وقت وہ ہم سے رخصت ہو کر بازار میں قدم رکھے گا۔ اُس وقت اُس کی حفاظت کی ذمہ داری خ... بھی اٹھانے سے گھبرائیگا!

مارگن۔ مگر پیشتے سرکار پرستوں کی حفاظت پولیس کے ذمے ہو... ہے۔

گڈن۔ یہ درست ہے لیکن ہم کو اُس شخص کی حفاظت کی ذمہ... اس شرط پر اٹھانی چاہئے۔ کہ وہ ہم کو آرنگ ہیک مین کے قاتلوں کے نام بتا دے۔

مارگن۔ یقیناً ایسا ہی ہونا چاہئے گڈن! تمہاری تجویز بہت خو... ہے۔

گڈن۔ (فخریہ انداز سے) اگر میں کبھی خفیہ پولیس کے محکمے میں ہ... مجھے اس تجویز کے عوض کونسا عہدہ عطا ہوتا۔

مارگن۔ ایک شاندار عہدہ۔

گڈن۔ اسکے علاوہ یہ تجویز کس قدر میری شہرت کا باعث ہو...

مارگن۔ یقیناً میں اگر اس تجویز کو پایہ تکمیل تک پہنچا دوں، تو کیا ملے گا؟

گڈن۔ پانچ سو پونڈ کا آدھا۔

مارگن۔ لیکن میں تو تمہیں کمیشن کے سوا کچھ زیادہ دینے کے لئے تیار نہیں ہوں۔

گڈن۔ تم کو ایسا ہرگز نہیں کرنا چاہئے۔ اتنی حقیر سی رقم میر... لئے کافی نہ ہوگی۔ تجویز میرے ذہن میں آئی ہے۔ نہ کہ تم... ذہن میں۔

مارگن۔ مگر گڈن تم نہیں جانتے کہ اس تجویز کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لئے کتنی لیاقت کی ضرورت ہے میر... لیاقتدار آدمی کے بغیر یہ تجویز عملی صورت میں ہرگز نہیں...

ہوسکتی ہیں تمہارے ساتھ اس بات کا فیصلہ تاش کے ذریعے
کرنا چاہتا ہوں، اگر تم جیت گئے۔ تو آدھا انعام تمہارا۔

گڈن، اگر میں ایسا کرنے کے لئے ہرگز تیار نہیں ہوں۔ میں تاش کے
ذریعے فیصلہ نہیں چاہتا۔

مارگن۔ میں تمہیں پھر یہ کہے دیتا ہوں۔ کہ اس تجویز کو تم جیسے معمولی
آدمی بروئے کار نہیں لا سکتے۔ ایسی تجاویز کو با اقتدار آدمی
ہی عملی جامہ پہنا سکتے ہیں۔ ایسے ہی ایک موقع پر مجھے ڈبلن
میں تاش کے ذریعے فیصلہ کرنا پڑا تھا جس کی یاد ابھی تک
میرے دل میں موجود ہے۔

گڈن۔ مگر تمہاری جیت اس موقع پر تمہیں ہر دلعزیز بنا سکے گی۔
تم اپنی قمار بازی کی مہارت پر فخر تو ہر کس و ناکس کے سامنے کرتے
رہتے ہو، مگر کیا تم نے کبھی کوئی چیز کسی سے جیتی بھی ہے؟
ینگ شر کے آج صبح میرے ہاں آیا تھا۔ ہاں یاد آیا۔ وہ میرے
پاس ایک ایسی چیز چھوڑ گیا ہے جس کو جیتنے کے لئے تم
مدت سے کوشاں ہو۔

(گڈن ایک میز کی جانب جاتا ہے۔ اور اس کی نچلی دراز
سے ایک تلوار نما چھرا نکال لاتا ہے۔ وہ مارگن کو دکھاتا ہے
مارگن چھرا ہاتھ میں لے لیتا ہے۔ اور نہایت حریصانہ
نگاہوں سے اُسے دیکھتا ہے)

مارگن۔ واقعی یہ چھرا نہایت نفیس اور قیمتی لوہے کا بنا ہوا ہے۔
اور اس کی دھار تو تلوار سے بھی زیادہ تیز ہے، اہلِ ہسپانیہ کی
صنعت کا بہترین نمونہ ہے (وہ چھرے کو میز پر رکھ دیتا ہے)

(جیسے ہی مارگن تاش کے پتوں کو میز پر رکھتا ہے
گڈن حالتِ وارفتگی میں اُن کو اٹھا دیتا ہے)

مارگن۔ (خوشامدانہ لہجے میں) گڈن! تمہارا یہ خیال بالکل درست
ہے۔ کہ یہ تجویز۔۔۔۔۔ انعام حاصل کرنے کا یہ طریقہ تمہارے
لئے نہ صرف عالمگیر شہرت کا باعث ہوتا بلکہ ایک ممتاز عہدے
کے حصول کا ذریعہ بھی بنتا۔ مگر افسوس کہ تم کسی خفیہ محکمے میں
ملازم نہیں، تاش کھیلو گے گڈن؟

گڈن۔ کیوں نہیں۔ یہ رہے پتے۔

(گڈن پہلی دفعہ جیت جاتا ہے۔ وہ دوبارہ کھیلتے ہیں)

مارگن۔ لو اس دفعہ جیت میرے ہاتھ رہی۔

گڈن۔ (پتوں کو سمیٹتے ہوئے) ہاں تم جیتے۔

مارگن۔ (اُٹھتے ہوئے) تو لاؤ شراب۔

(گڈن میز کی جانب جاتا ہے اور شراب کی بوتل اور
گلاس اٹھا لاتا ہے، مارگن بوتل سے گلاس میں شراب
ڈالتا ہے)

مارگن۔ شہنشاہ کے نام۔

(وہ شراب پیتا ہے)

گڈن۔ کہو مارگن۔ میرا حصہ اب کیا رہا۔

مارگن۔ میں نے تم کو کمیشن دینے کا وعدہ کیا ہے۔

گڈن۔ مگر وہ کمیشن کتنی ہوگی؟

مارگن۔ پچاس پونڈ۔

گڈن۔ مگر میرے لئے پچاس پونڈ کافی نہ ہوں گے۔ میری تجویز اس
خفیہ رقم سے کہیں زیادہ قیمتی ہے۔

مارگن۔ خاموش رہو گڈن تمہیں کسی قسم کی تکلیف اور مصیبت کا
سامنا نہ کرنا پڑے گا ۔۔۔۔ جانتے ہو اس تجویز کو عملی جامہ
پہنانے کے لئے تم کو کتنی تکلیفوں اور مصیبتوں کا سامنا کرنا

پڑتا۔ !!

گڈن۔ کیا تم مجھے پچاس پونڈ سے زائد دینے کیلئے تیار نہیں؟

مارگن۔ خاموش رہو گڈن۔ بک بک مت کرو۔

گڈن۔ تم میری اس تجویز کو پچاس پونڈ میں خرید سکتے ہو۔ مگر تم کو میری کسی اور چیز کے استعمال کرنے کا کوئی حق حاصل نہ ہوگا

مارگن۔ تمہارے پاس ایسی چیزیں ہی کونسی ہیں۔ جن کو استعمال کرنا میرے لئے ناواجب ہو؟

گڈن۔ اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کے لئے تم اس کمرے کو استعمال میں نہیں لا سکتے۔

مارگن۔ نہیں ان اوہام میں مبتلا نہیں ہونا چاہیئے گڈن!

گڈن۔ اور تم کو بھی غرور سے پیش نہ آنا چاہیئے۔ مارگن تم جانتے ہو۔ کہ یہ لوگ میری آمدنی کا باعث ہیں۔ اور ان کی وجہ سے ہی میری سرائے چل رہی ہے۔ اگرچہ یہ لوگ دل سے میرے دوست نہیں بلکہ دشمن ہیں لیکن مجھے مجبوراً ان سے تعلقات رکھنے پڑتے ہیں۔ اور تم ان لوگوں کے خلاف کوئی کارروائی میرے اس کمرے میں کرو گے تو میرے لئے یہ سرائے ایک دوزخ ہو جائے گی دوزخ۔

مارگن۔ گڈن۔ تم بکواس کر رہے ہو۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیئے۔ کہ میں مجسٹریٹ ہوں۔ اور میرے حکم سے پولیس کا ایک دستہ تمہاری ہڈی ہڈی اور پسلی پسلی جدا کر دے گا۔

گڈن۔ مگر میرے جیسے سرکار پرست کے لئے یہ ممکن ہے؟

مارگن۔ یہ ممکن ہو سکتا ہے میں اپنے اختیاراتِ خصوصی سے ایسا کرا سکتا ہوں گڈن۔

گڈن۔ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا مارگن۔ جو کچھ تمہارے جی میں آئے میرے خلاف کرو۔ مگر مارگن کیا تمہارا موضوعِ گفتگو یہی ہوگا؟ تمہاری موجودگی میں بازار سے یہاں ایک شخص بھی آنا پسند نہ کرے گا اور تم اپنے مقصد میں ہرگز ہرگز کامیاب نہ ہو سکو گے

مارگن۔ لیکن تمہیں معلوم نہیں کہ میری قسمت کتنی تیز ہے۔ میں اپنے مقصد میں یقیناً کامیاب ہو جاؤں گا۔ گڈن۔ میری قسمت پر رشک کرو۔

(دروازے پر کوئی دستک دیتا ہے)

گڈن۔ یقیناً کوئی بازار سے آیا ہوگا۔ ورنہ اور کون دروازہ کھٹکھٹا سکتا ہے؟

مارگن۔ گڈن دروازہ کھولو۔

گڈن۔ تمہاری قسمت آج سو رہی ہے مارگن۔

مارگن۔ گڈن دروازہ کھولو!

(گڈن دروازہ کھولتا ہے ایک ساٹھ سالہ عورت دروازے پر کھڑی دکھائی دیتی ہے۔ وہ ننگے پاؤں ہے اور ایک لمبا چغہ پہنے ہوئے ہے۔ اس کے چہرے پر اضطراب و ہیجان کے آثار نمایاں ہیں۔)

گڈن۔ تم کون ہو؟

پیگ۔ میں ایک مطربہ ہوں اور لوگ مجھے پیگ کہتے ہیں۔

گڈن۔ تم یہاں کس لئے آئی ہو؟

پیگ۔ میں جناب مارگن الفرے کی خدمت میں کچھ عرض کرنے آئی ہوں۔

مارگن۔ کہو پیگ، مجھ سے کیا کہنا چاہتی ہو؟

پیگ۔ آپ کو یاد ہوگا۔ کہ جب آپ ایک انجمن میں شمولیت کیلئے تشریف لے جا رہے تھے۔ تو میں نے آپ سے ایک عرض کی

تھی، اور آپ نے اُس وقت وعدہ بھی کیا تھا۔

مارگن۔ میں نے کیا وعدہ کیا تھا؟

پیگ۔ جناب نے وعدہ کیا تھا کہ آپ مجھے آج کے دن ملاقات کا شرف بخشیں گے۔

مارگن۔ کیا واقعی؟ مجھے تو کچھ یاد نہیں پڑتا، اچھا تو کہو، مجھ سے کیا کہنا چاہتی ہو؟

(مارگن ایک عجیب انداز سے اپنے آپ کو جنبش دیتا ہے
جس سے کمرے میں ایک طرز کیفیت پیدا ہو جاتی ہے)

پیگ۔ آپ کی اس غریب نوازی کی میں بے حد شکر گزار ہوں۔

مارگن۔ سنتے ہو گڈن۔ وہ کیا رہی ہے؟

گڈن۔ (میز کے ساتھ لگ کر) مارگن۔ تم نقصان اٹھاؤ گے۔ تم کو رنجیدہ خاطر ہونا پڑے گا۔

(گڈن بوتل سے گلاس میں شراب ڈالتا ہے۔ اور پھر
بوتل کو میز پر رکھ دیتا ہے)

مارگن۔ اپنی زبان سنبھالو گڈن۔ تمہارا رویہ سخت قابلِ اعتراض ہے تمہیں میری عزت کرنا چاہیئے۔ اگر تم نے میری عزت نہ کی تو تمہیں کبیدہ خاطر ہونا پڑے گا۔ جاؤ، بازار میں جو لوگوں کا اجتماع ہے، اُس سے کہو، کہ مارگن اُس سے کچھ کہنا چاہتا ہے۔

(گڈن اور شراب پیتا ہے اور کمرے سے باہر نکل جاتا ہے
اُس کی آواز سنائی دیتی ہے۔ مارگن کھڑکی کھولتا ہے اور
لوگوں کے سامنے کھڑا ہو جاتا ہے)

گڈن کی آواز۔ سامعین حضرات یہ ہیں۔ اور انہوں نے مجھ سے کہا ہے کہ وہ تو بر کے رہنے والوں کو اس بات سے آگاہ کریں کہ وہ (مارگن) ایک نئی عمارت کی بنیاد رکھنے والے ہیں۔ اس لئے تو بر کے باشندوں کا یہ فرض ہے کہ وہ اُس عمارت کی تکمیل کے لئے گھوڑے اور مزدور بھیجیں۔

مارگن۔ (دل میں) یہ بوڑھی عورت غضب کی چالاک اور ہوشیار ہے میں اس کو اچھی طرح سے جانتا ہوں۔ یہ ہمیشہ یہی کہتی رہتی ہے کہ میں نے اُس کے بیٹے کو قید خانے بھجوا دیا ہے۔

(جونہی پیگ داخل ہوتی ہے۔ مارگن اپنے رویئے
کو یکایک تبدیل کر لیتا ہے۔ اور اپنے غصے پر قابو
پا لیتا ہے)

مارگن۔ کہو پیگ مجھ سے کیا کہنا چاہتی ہو؟

پیگ۔ بیٹا۔ میں آپ کے پاس اپنے فرزند کی رہائی کے لئے حاضر ہوئی ہوں۔

مارگن۔ کیا تم اپنے بیٹے کو رہا کرانا چاہتی ہو؟

پیگ۔ حضور میرا بیٹا قید میں ہے۔ اور اگر جناب اُس پر نظرِ عنایت نہ کریں گے۔ تو وہ کل یا پرسوں یقیناً گولی سے اڑا دیا جائیگا۔

مارگن۔ تمہارے بیٹے کو گولی سے اڑا دیا جائیگا۔ مگر کیوں؟

پیگ۔ جیسا کہ حضور کو معلوم ہے۔ وہ شاہی فوج میں سپاہی تھا، مگر بھاگ نکلا۔

مارگن۔ بھاگ نکلا؟ شاہی فوج سے بھاگ نکلا؟ اُس نے یہی کیا ہے نا؟

پیگ۔ جناب بالکل ایسا ہی ہوا ہے۔

مارگن۔ تو پھر تم مجھ سے کیا کہنا چاہتی ہو؟

پیگ۔ میری جناب سے یہ گذارش ہے۔ کہ آپ میرے بیٹے کی رہائی کے لئے کرنل کی جانب ایک خط تحریر کر دیں میں

جناب سے بس یہی چاہتی ہوں۔

مارگن۔ مگر یہاں کوئی ایسا شخص بھی ہے۔ جو اُس کی ضمانت دینے کے لئے تیار ہو ؟

پیگ۔ جناب کی ذات کے سوا اور کون ہو سکتا ہے ؟

مارگن۔ میں ؟

(پیگ کھڑکی کی جانب جاتی ہے)

پیگ۔ لو اِسکی وہ کان پر لوگوں کا جو عظیم اجتماع ہے۔ اس میں سے ہر ایک میرے اور میرے بیٹے کے لئے ضمانت دینے کے واسطے تیار ہے۔

مارگن۔ ان کے نام کیا ہیں ؟

پیگ۔ کیا ان لوگوں کے نام جو باہر کھڑے ہیں ؟ کیا آپ اُن لوگوں کے نام جاننا چاہتے ہیں ؟

مارگن۔ ہاں مجھے ان کے نام بتاؤ۔ تاکہ میں اُن ناموں کو لکھتا جاؤں جو مجھے کرنل ماڈر کو خط لکھنے کے لئے درکار ہوں گے۔

پیگ۔ مینی کیلی۔ کورمک مزریگر۔ شون گورمن۔ میو کیف

(وہ ایک طرف مڑتی ہے اور مارگن کی نظر کو بھانپ لیتی ہے کیونکہ گہری نظر سے وہ پیگ کو دیکھ رہا ہے)

مارگن۔ نہیں نہیں۔ بالکل نہیں میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ مجھے ان لوگوں کے نام دوبارہ لکھواؤ تاکہ میں انکو لکھتا جاؤں۔ ورنہ کرنل کے پاس خط لے جانے کا متعلق کوئی فائدہ نہ ہوگا۔

پیگ۔ مینی کیلی۔ کورمک مزریگر۔ شون اور گورمن۔ وہ دیکھئے ایک عورت سجدہ میں جا رہی ہے۔ یہ میری سیلون ہے۔ وہ دعا کر رہی ہے۔ کہ میں اپنے بیٹے کو موت کے منہ سے بچا لوں۔

مارگن۔ اُسے اسی حالت میں رہنے دو۔ اور اپنے کام کی طرف متوجہ ہو جو نام تم نے مجھے لکھوائے ہیں۔ وہ میں نے تحریر کر لئے ہیں۔ اب میں تم سے ایک اور بات دریافت کرنا چاہتا ہوں۔

پیگ۔ جناب وہ کونسی بات ہے ؟

مارگن۔ کیا تم اُن باتوں سے آشنا ہو۔ جن باتوں کی خبر اس اجتماع کے لوگوں کو ہے ؟

پیگ۔ بلکہ اُن سے کہیں زیادہ۔

مارگن۔ مگر وہ کونسی باتیں ہیں۔ جو تم اُن سے کہیں زیادہ جانتی ؟

پیگ۔ یہ وہ باتیں ہیں۔ جو مجھے باپ دادا سے وراثت میں ملی ہیں۔

مارگن۔ مگر وہ ہیں کیا ؟

پیگ۔ یہ وہ علوم ہیں۔ جو کبھی نوتریمیں پڑھائے اور سکھائے جاتے تھے۔ اور جن پر ناز و فخر کیا جاتا تھا۔

مارگن۔ تمہارے باپ دادا نے ایسے علوم تم کو پڑھا کر ایک سخت غلطی کا ارتکاب کیا ہے۔

پیگ۔ افسوس ہے۔ کہ آپ ان علوم سے بے بہرہ ہیں۔ میرے باپ دادا نے ان علوم کو حاصل کرنے کے لئے نہایت جانفشانی سے کام لیا تھا۔ اور مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ان علوم پر لاتعداد کتابیں میرے باپ کے پاس تھیں۔ مگر جب وہ کتابیں ایک ایک کر کے ضائع ہونی شروع ہوئیں تو میرے باپ نے مجھے یہ علوم پڑھانے شروع کئے ... اور وہ چیز جو میرے باپ نے مجھے نہایت شوق سے پڑھائی تھی۔ ایک نظم تھی۔ جو ایک ملکہ نے لکھی تھی۔

مارگن۔ کیا وہ نظم تم کو یاد ہے؟

پیگ۔ ہاں یہ نظم میں نے یاد کر رکھی ہے۔ محض اس بات کو ثابت کرنے کے لئے کہ کبھی تو بر بھی علوم و فنون کا مرکز تھا۔

مارگن۔ اچھا تو وہ نظم مجھے سناؤ۔

(مارگن پیگ کو ایک ایسی جگہ پر بیٹھنے کا اشارہ کرتا ہے۔ جہاں سے بازار کے لوگ اس کو بخوبی دیکھ سکتے ہیں۔ پہلا شعر پیگ ذرا اٹک کر گاتی ہے لیکن پھر سنبھل جاتی ہے۔ اور اپنی گھبراہٹ پر قابو پا لیتی ہے)

بس اتنے ہی شعر مجھے یاد ہیں۔ باقی بھول گیا ہوں۔

اچھا اب ہمیں پر مطلب آنا چاہئے۔ کیا بازار کے لوگ تمہارے حق میں کچھ کہنے کے لئے تیار ہیں۔ تمہارے واسطے اور تمہارے بیٹے کے لئے؟

پیگ۔ ہاں وہ ایسا کرنے کے لئے تیار ہیں۔ بلکہ وہ تو خوش ہونگے کہ آپ اُن کی باتوں پر بھروسہ کرتے ہیں۔

مارگن۔ (کھڑکی سے باہر کی جانب دیکھتا ہے) مگر وہ تو تمہاری طرف وحشت بھری نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں۔!!

پیگ۔ کیا ان کے لئے یہ چیز باعث حیرت ہے کہ ایک عورت بیٹے کی رہائی کے لئے التجا کر رہی ہے؟

مارگن۔ دیکھو، وہ عورت تمہیں کوس رہی ہے۔ تمہارے حق میں دعائیں نہیں کر رہی، وہ دیکھو ایک اور عورت تم کو بُرا بھلا کہہ رہی ہے۔

پیگ۔ خدا کرے۔ کہ میرے بیٹے کی زندگی دراز ہو۔ اور وہ ایسے شخص کے دام سے رہائی حاصل کرے۔ جس کو تمام لوگ کوس رہے ہیں۔

مارگن۔ تو کیا اس سے تمہارا یہ مطلب ہے کہ لوگ مجھے کوس رہے ہیں؟ پیگ تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ لوگ تم کو بد دعا دے رہے ہیں۔

پیگ۔ مجھے بد دعا دے رہے ہیں؟ مگر یہ کیونکر ہو سکتا ہے؟

مارگن۔ میں نہیں جانتا کہ اصل وجہ کیا ہے۔ لیکن مجھے محسوس ہوتا ہے۔ کہ تمہارا اُن کے درمیان جانا خطرے سے خالی نہیں ہے۔

پیگ۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میرے اور ان کے درمیان کوئی ایسی بات نہیں ہوئی میں حیران ہوں کہ وہ مجھے ان وحشت بھری نگاہوں سے کیوں دیکھ رہے ہیں۔

مارگن۔ پیگ مجھ سے پوچھو۔ اس کی وجہ میں جانتا ہوں۔

پیگ۔ بتائیے۔ مجھے جلد بتلائیے۔

مارگن۔ سنو جب لوگوں نے تم کو میرے ساتھ اس انداز میں گفتگو کرتے ہوئے دیکھا۔ تو اُن کو یہ شک ہونے لگا — کہ قتل ... کیا تم نہیں جانتی ہو۔ کہ ان کو ن سا شک لاحق ہو رہا ہے؟

پیگ۔ نہیں! نہیں! بالکل نہیں۔ مجھے جلد بتائیے!!!

مارگن۔ ان کو یہ شبہ ہے۔ اور ان کے لئے یہ شک کرنا کتنا آسان ہے، وہ خیال کر رہے ہیں۔ کہ تم نے اُن شخصوں کے نام بتا دیئے ہیں۔ جنہوں نے آئزک ہیک مین کو قتل کیا ہے۔

پیگ۔ او خدا! او خدا!!

(پیگ کھڑکی کی جانب جاتی ہے، تاکہ بازار کے لوگوں کو حقیقت حال سے آگاہ کرے۔ مگر باہر کے لوگوں کا ہیجان اس کے منہ پر مہر لگا دیتا ہے)

گنشن بائیں جانب کی کھڑکی کو کھولتا ہے۔ اور مینکی جانب

روانہ ہوتا ہے۔ جہاں مارگن کھڑا ہے۔

گڈن۔ مارگن۔

مارگن۔ تم یہاں کس لئے آئے ہو گڈن؟

گڈن۔ تمہارے بدترین سلوک کی داد خواہی کے لئے۔

مارگن۔ سمجھا۔ تم اپنی اس ناپاک و خشک کھال کو نیکی کی شراب سے دھونا چاہتے ہو!

گڈن۔ میں جانتا ہوں کہ تمہاری شرارت موسم سرما کی راتوں کی طرح سیاہ اور خطرناک ہے۔ اور سچ ہے۔ کہ تم شرارت کے پتلے ہو۔ مگر تمہاری یہ شرارت پیتل کی مانند ہے۔ جو بھٹی میں پڑا پگھل رہا ہو۔ مارگن تم یقیناً پیتل ہو تم ضرور پگھل جاؤ گے۔ اور تمہارا وجود اس دنیا سے ہمیشہ کے لئے نیست و نابود ہو جائے گا میں تم کو صرف اتنا ہی بتانے آیا ہوں۔

مارگن۔ چلے جاؤ یہاں سے۔

گڈن۔ یہ منہ جو گالیوں سے بھرا ہوا ہے، خود بخود خاموش ہو جائیگا

مارگن۔ تمہارا اس سے کیا مطلب ہے گڈن؟

گڈن۔ کیا تم اپنے آپ کو شریف خیال کر سکتے ہو؟

مارگن۔ میں تم سے کہیں زیادہ شریف ہوں، او مکار کتے۔

(مارگن تلوار اٹھاتا ہے، تاکہ گڈن کا کام تمام کر دے)

مارگن۔ میں جانتا ہوں، کہ تم نے شرارت اور بدنیتی کا ڈنڈا ہاتھ میں اٹھایا ہوا ہے۔ یہ وہی تلوار ہے نا جس پر تم بے جا طور پر فخر کر رہے تھے، جانتے ہو یہ کہاں سے لائی گئی ہے؟ تم دیکھ نہیں رہے تھے، کہ تم نے اس کو قمار بازی میں جیتا ہے، یہ منہ اور مسور کی دال۔

مارگن۔ بکواس مت کرو ورنہ اس تلوار سے تمہارا کام تمام کر دیا جائیگا خدا کی قسم تمہیں جان سے مار ڈالوں گا۔

گڈن۔ مجھے مار دو ہلاک کر دو۔ تم ایسا کر سکتے ہو مگر ذرا یہ کہتے ہو جس کو میں پالتا رہا اور تم جیسے کتے کی کے معاوضہ میں مجھے کوئی شخص ایک پیسہ بھی دینے لئے تیار نہیں۔ اور جس کو تم خود بھی ادا کرنے سے قاصر

(گڈن یکایک اپنا ہاتھ تلوار پر جما دیتا ہے۔ اور تلوار مارگن سے چھین لیتا ہے۔ اور اس کو اس انداز سے پکڑتا ہے جس سے وہ خطرناک صورت اختیار کر جاتی ہے۔)

مارگن۔ تم میری جان کے لاگو ہو رہے ہو۔ میں خوب جانتا مگر آہ تم کتنے نادان ہو گڈن، تمہیں معلوم نہیں کہ یہ زندگی میرے ہاتھ میں ہے۔

(مارگن جلدی سے ایک چھرا کوٹ کے اندر سے نکالتا ہے)

گڈن۔ انعام کا نصف لونگا نصف، ہنستے ہو مارگن۔ میں تم نہیں کھا سکتا۔ ہرگز نہیں، ہرگز نہیں!! انعام کا نصف لونگا اور ضرور لونگا،

(گڈن دروازے کی جانب روانہ ہوتا ہے، مارگن اسکے پیچھے جاتا ہے۔ دروازہ مارگن کے منہ پر لگتا ہے۔ وہ تھوڑے سے وقفہ کے بعد میز کی جانب آتا ہے، وہ اپنے ہاتھ میں چھرا پکڑے ہوتے ہے اور چھرے کو بار بار دیکھ رہا ہے پھر چھرے کو بائیں ہاتھ میں پکڑ لیتا ہے مگر پھر یکایک اس کو میز پر رکھ دیتا ہے۔ اور گڈن کا پیچھا کرتا ہے۔ چھرے کو میز پر رکھ کر دروازے کی طرف لپک کر جاتا ہے، پیگ کھڑکی میں کھڑی ہے

اور لوگوں کی توجہ کی منتظر ہے)

پیگ (دل میں) کیا میں ان لوگوں کے ہاتھوں تباہ ہو جاؤں گی اور ان کے طعنوں کا آلہ بنوں گی۔ آہ وہ کتنی وحشت بھری نگاہوں سے اس کمرے کی جانب دیکھ رہے ہیں۔

(مارگن کے قریب آتی ہے، جب وہ دروازے سے داخل ہوتا ہے، وہ مارگن اور پیز کے درمیان کھڑی ہو جاتی ہے)

پیگ۔ حضور مجھے بچائیے۔ آہ ان لوگوں سے بچائیے جو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر میری جانب دیکھ رہے ہیں۔

مارگن۔ ہاں ہاں میں تمہیں بچانے کی ضرور کوشش کرونگا میں ابھی سپاہیوں کو منگائے دیتا ہوں۔

پیگ۔ تو کیا آپ ان سپاہیوں کی مدد سے مجھے بچا سکتے ہیں؟

مارگن۔ میں یقیناً ایسا کر سکتا ہوں میں تمہیں ایک دوسرے مجسٹریٹ کے مکان پر بھجوا دونگا۔ جہاں تم ہر طرح سے محفوظ ہو گی....

پیگ۔ حضور ایسا ہی کیجئے۔ میں تمام عمر آپ کی دعاگو رہوں گی۔

مارگن۔ اور اس کے بعد تم کو ایک جہاز پر سوار کر دیا جائیگا، ایک ایسے حصے میں جہاں تم کو کوئی جاننے والا نہ ہوگا۔

پیگ۔ کیا مجھے ایسی جگہ نصیب ہو سکتی ہے؟

مارگن۔ ہاں تم ایسی جگہ بھجوا دی جاؤ گی۔ اور ایسا ہو سکتا ہے!

پیگ۔ مگر میرا بیٹا؟ آہ اس کے ساتھ کیا ہوگا؟

مارگن۔ تمہارے بیٹے کو بھی بچانے کی کوشش کی جائے گی میں اس کو ہمیشہ کے لئے رہائی دلوا دونگا، اور وہ بھی ملک کے ایسے حصے میں تمہارے ساتھ بھجوا دیا جائیگا جہاں تم دونوں کا کوئی واقف اور آشنا نہ ہوگا۔ جہاں تم دونوں ایک شریف گھرانے کی حیثیت سے زندگی بسر کر سکو گے، اور ہر قسم کی تکلیف اور مصیبت سے محفوظ رہو گے۔

پیگ۔ لوگوں کا یہ خیال کتنا غلط ہے، کہ تم سنگ دل اور ظالم ہو۔ میں اس بات کو کیسے درست مان سکتی ہوں، آپ کی اس عنایت کا بہت بہت بہت شکریہ۔

مارگن۔ میں نے جو کچھ تم کو کہا ہے، تمہارے لئے کرنے کو تیار ہوں۔

پیگ۔ یقیناً آپ غریبوں کے ملجا و ماوےٰ ہیں ...... مگر وہ .... وہ خیال کرینگے کہ میں نے اُن کو دھوکا دیا ہے ۔۔ وطن فروشی کی ہے۔

مارگن۔ یہ امر مجبوری ہے، تم کو اُن کے نام بتانے ہونگے۔

پیگ۔ کن کے نام؟ کیا میں لوگوں کو دھوکا دوں .... اپنے ہموطنوں کے ساتھ وطن فروشی کروں۔ اور اُن کے طعنوں کا شکار بنوں؟

مارگن۔ مگر ایسا ہوگا، پیگ تمہیں اُن لوگوں کے نام بتانے ہونگے۔ جو تم پر طعنہ زنی کرینگے۔

پیگ۔ میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی!

مارگن۔ میرا مطلب یہ ہے، کہ تم مجھے اُن لوگوں کے نام بتاؤ۔ جو یہ خیال کرتے ہیں، کہ تم نے اُن کو فریب دیا ہے، اور اُن کے جرم کو بھی .... تم سے باہر کے لوگ بدظن ہو چکے ہیں۔ اسلئے مجھے بتاؤ، کہ ہنرنگ ہیک مین کے قاتل کون ہیں۔

پیگ۔ میرا ہرگز خیال نہیں ہے میری زبان سے ایک حرف بھی اس خیال کی ترجمانی کرتے ہوئے نہیں نکلا۔

مارگن۔ تمہاری زبان سے عوام کے خلاف کئی باتیں نکل چکی ہیں۔ اگر نہیں تو وہ کون ہے جس نے یہ باتیں کہی ہیں۔

پیگ۔ میں نہیں بتا سکتی۔ میں ہرگز نہیں بتا سکتی، میں اُن شخصوں کے نام ہرگز نہیں بتا سکتی۔

مارگن۔ لوگ یہ خیال کئے ہوئے ہیں، کہ تم اس راز کا انکشاف کر چکی ہو۔ اسی لئے تمہاری اس حرکت پر طعنہ زن ہیں اور وہ تمہاری اس حرکت کے باعث تم کو جان سے مار ڈالنا چاہتے ہیں۔ اُن کا ایک پتھر تمہارا سر پھوڑ دے گا۔ تو دوسرا تمہاری گردن دوہری کر دے گا۔ اور ازاں بعد تم کو ایک گڑھے میں پھینک دیا جائیگا۔ اگر تم کو میری ان باتوں کا یقین نہیں تو جاؤ اس مجمع میں جاؤ، تاکہ تم پر یہ بات ظاہر ہو جائے کہ تم پر فردِ جرم لگ چکا ہے اب اس راز کو چھپانے سے کیا حاصل ہے۔ پیگ مجھے بتاؤ، وہ کون تھا جس نے آئزک کو قتل کیا ہے؟

پیگ۔ میں نہیں بتا سکتی۔ میں ہرگز نہیں بتا سکتی۔ اگر میری جان چلی جائے، تو بھی میں ان کے نام بتانے کے لئے تیار نہ ہونگی۔

مارگن۔ میں کہہ چکا ہوں، کہ میں تمہاری ہر قسم کی مدد کرنے کے لئے تیار ہوں، تمہاری حفاظت کے لئے سپاہیوں کی ایک رجمنٹ بلا لونگا۔ میں تم کو ایک مجسٹریٹ کے مکان پر بھجوا دونگا۔ جہاں تم ہر طرح سے محفوظ ہوگی، اور اس کے بعد تم کو ایک جہاز پر سوار کرا دیا جائیگا، جو تم کو ملک کے ایک ایسے حصے میں لے جائیگا، جہاں تمہارا کوئی شناسا نہ ہوگا۔ کیا تم میری باتوں کو سن رہی ہو؟ بتاؤ اس کے علاوہ تم اور کیا چاہتی ہو؟ میں ہر ممکن طریقہ سے تمہاری حفاظت کرونگا، تاکہ تم مجھے بےخوف و خطر آئزک ہیکسین کے قاتلوں کے نام بتا سکو، اس جرم کی مرتکب تم پہلے سے ہی ہو چکی ہو،

پیگ۔ میں کسی جرم کی مرتکب نہیں ہوں!

مارگن۔ تو کیا تم ان لوگوں میں جانے کے لئے رضامند ہو؟

پیگ۔ آہ وہ مجھے تباہ کر دینگے! وہ مجھے برباد کر ڈالیں گے بچاؤ، مارگن خدا کے لئے مجھے اُن سے بچاؤ،

مارگن۔ لیکن تم اپنے آپ کو بچا کر کیا کرو گی؟

پیگ۔ کچھ نہ کچھ تو کر لوں گی . . . . . .

مارگن۔ تو پھر مجھے اُن لوگوں کے نام بتاؤ، جن کا تعلق آئزک کے قتل سے ہے۔

پیگ۔ (پیچھے ہٹتے ہوئے) اُن کے نام میرے ان ہونٹوں پر نہ آسکتے۔

مارگن۔ مجھے اُن کے نام بتاؤ، پیگ، ورنہ میں بازار کے ان لوگوں کے درمیان تم کو پھینک دونگا۔ جو تمہاری تکا بوٹی کر دینگے (پیگ میز کے ساتھ لگی کھڑی ہے۔ اور مارگن اس پر مسلسل رعب ڈال رہا ہے۔ وہ میز کے ساتھ آہستہ آہستہ اپنی کمر لگا دیتی ہے۔ اور اپنا کانپتا ہوا ہاتھ میز پر مدد کے لئے پھیلاتی ہے)

پیگ۔ آپ جو چاہیں مجھ کو کہہ سکتے ہیں، مگر آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ میں اُن لوگوں کے نام ہرگز بتانے کے لئے آمادہ نہیں ہوں۔ آہ میں کتنی بے وقوف تھی، کہ تم کو اپنے بیٹے کا محسن خیال کرتی رہی۔ بھلا تمہارا رویہ عوام کی روش سے بہتر کیونکر ہو سکتا ہے! اور یہ سچ ہے۔ کہ اُن لوگوں کے اور تمہارے درمیان نفرت اور حقارت کی ایک وسیع خلیج حائل ہے! آہ! مجھے یہاں ہرگز نہیں آنا چاہئے تھا، اب میں سمجھی۔ کہ تم نے یہ جال میرے پھنسانے کے لئے بچھایا!

ہے تاکہ مجھے یہاں لاکر لوگوں پر یہ بات ظاہر کی جائے کہ میں اُن کو دھوکہ دے رہی ہوں۔ اور اس راز کا انکشاف کر رہی ہوں۔ جو ہمارا ایمان ہے۔ تمہاری یہ تجویز محض دھوکا ہے۔ محض فریب۔۔۔۔ تم نے مجھے ایک پرندے کی طرح قفس میں قید کر رکھا ہے۔

مارگن۔ ہاں۔ تم ایک پرندے کی مانند قفس میں مقید ہو جس سے خلاصی پانا ناممکن ہے تم کچھ نہیں کر سکتی!

پیگ۔ "تم کچھ نہیں کر سکتی"!

(وہ میز پر مدد کے لئے اپنا ہاتھ دوبارہ پھیلاتی ہے اسکا کانپتا ہوا ہاتھ چہرے سے ٹکراتا ہے)

مارگن۔ پیگ۔ سنو! وہ کس زور سے نعرے لگا رہے ہیں، تم جانتی ہو۔ یہ سب کچھ کس لئے ہو رہا ہے؟

(وہ کھڑکی کی طرف جاتا ہے پیگ چہرا اُٹھا لیتی ہے۔۔۔۔۔ اس عجیب کیفیت سے اُٹھاتی ہے جیسے اُسے بے بہا چیز مل گئی ہے۔ وہ بائیں جانب جاتی ہے)

پیگ۔ مارگن مجھ سے کیا چاہتے ہیں آپ؟

مارگن۔ آئرنگ کے قاتلوں کے نام، وہ بہت جلد گرفتار کر لئے جائینگے۔ تم یا کسی اور پر اس انکشاف راز کا الزام ہرگز عائد نہ ہونے پائیگا۔ تم اس وقت صرف اپنی حفاظت اور سلامتی کی فکر کرو۔ اور یہ سلامتی تم مجھ سے اور صرف مجھ سے حاصل کر سکتی ہو۔ مجھے اُن لوگوں کے نام بتاؤ جنہوں نے آئرنگ کو قتل کیا ہے! کیا وہ میری سیلون کا لڑکا تھا؟ کیا وہ ہریرہ گودن کا بھائی تھا؟

(پیگ خاموش رہتی ہے)

یا نادیں کوئی واقعہ ہو گیا ہے۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ کیا ہے؟

پیگ مجھے بتاؤ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔

(وہ دوبارہ کھڑکی کی طرف جاتا ہے)

پیگ۔ مارو! مارو! مارو!!! یہی ہے جو وہ کہہ رہے ہیں! وہ دیکھو لوہار کی دوکان سے کیا آوازیں آ رہی ہیں ہڑتال ہڑتال ہڑتال کیا یہ تمام چیزیں میرے مصائب کی ابتدا نہیں ہیں! ہڑتال ہڑتال ہڑتال! کیا یہ تمام شور و غوغا میرے لئے نہیں ہے؟

(وہ مارگن کی طرف بڑھتی ہے۔ جو پیٹھ پھیرے کھڑا ہے۔ چھرے کو ہاتھوں میں لئے ہوئے آہستہ جاتی ہے! جیسا کہ وہ پیچھے مڑتا ہے۔ اس کی گردن پر چھرا مار دیتی ہے مارگن گر پڑتا ہے)

لیجئے، یہ پڑا ہے! وہ شخص جو ہم تمام کو فریب کے دام میں پھنسا رہا تھا۔ اب میں لوگوں کے درمیان بغیر کسی خطرے کے جا سکتی ہوں، کیونکہ میں نے اُن کو بچا لیا ہے اور اگر میرے بیٹے کو پھانسی ہو گئی تو اُس کی موت عزت و توقیر کی موت ہوگی۔ کہ اس خاندان میں سے کسی نے بھی وطن فروشی نہیں کی۔

(باہر سے کسی کے آنے کی آواز سنائی دیتی ہے! منادی کھڑکی کے بالمقابل کھڑا ہو جاتا ہے)

منادی۔ لعنت ہو تم پر! اور تمہاری نسل پر۔

پیگ۔ میں نے لوگوں کو بچا لیا ہے۔

منادی۔ تم سخت غلطی پر ہو تمہارے بیٹے نے اپنے سینے کو گولی سے بچانے کے لئے آئرنگ مہگین کے قاتلوں کے نام بتا دیئے ہیں۔ اُو۔ تمہارا بیٹا وطن فروش نکلا۔

پیگ۔ افسوس۔ صد ہزار افسوس۔

جناب سراج الدین ظفر بی اے

آوارۂ ہستی

مرے ہاتھوں میں سازِ بیقرارِ آرزو دے کر
دیا اذنِ سفر اُس نے حریمِ ناز سے مجھکو

مشیت نے مجھے دنیائے آب و گِل میں پہنچایا
ہوائے نو اُڑا لائی جہانِ راز سے مجھکو

جلایا میری آہوں نے چراغِ خانۂ ہستی
ملا ذوقِ نواسنجی نئے انداز سے مجھکو

بلایا حُسن نے مجھ کو نگاہوں کے اشارے سے
پکارا عشق نے حسرت بھری آواز سے مجھکو

خراب و پائمالِ دردِ پنہانی ہوں برسوں سے
میں اپنے ساز پر محوِ غزلخوانی ہوں برسوں سے

مری نَے زلزلہ انداز ہوتی ہے گلستاں میں
نوائے آتشیں فطرت کے ایوانوں میں پھرتی ہے

مری نَے سے بہک جاتی ہے بوئے لالہ و ریحاں
ہوائے صبح آوارہ گلستانوں میں پھرتی ہے

مری نَے وحشتوں کا درس دیتی ہے زمانے کو
محبت آبدیدہ ہو کے ویرانوں میں پھرتی ہے

مری نَے آگ بھڑکاتی ہے سودائے جوانی کی
برہنہ سر جوانی آئینہ خانوں میں پھرتی ہے

یہ حسرت ہے کہ خوش ہو کر نوائے شعلہ ساماں سے
وہ پھر آواز دے مجھ کو حقیقت زارِ عرفاں سے

محترمہ زبیدہ سلطانہ صاحبہ

شاہکار

دونوں دوست سنگِ خارا کے لمبے ستون کے سامنے کھڑے تھے۔ دونوں کے چہرے اداس اور پژمردہ تھے۔ ستون پر موٹے حروف میں یہ مصرعہ کندہ تھا ؎

"بقا کا ذکر کہاں اس جہانِ فانی میں"

آج سے ڈیڑھ برس پیشتر سب دوست سلیم کے کمرے میں جمع تھے۔ سلیم نے گہرے سکوت کو توڑتے ہوئے کہا۔

"چھ مہینے ایک خاصی طویل مدت ہے!" اور کہتے کہتے وہ اپنی آرام کرسی میں نرم نرم گدوں کے انبار پر جھک گیا۔۔۔ دسمبر کا مہینہ تھا اور رائل اکاڈیمی کے مہتمم نے اُسے مئی کے آخر تک مہلت دی تھی۔۔۔۔

"ہاں۔۔۔ ہے تو کافی طویل مدت" صدیقی نے کچھ سوچتے ہوئے مدہم آواز میں تائید کی۔۔۔ وہ سب بڑی رد و کد کے بعد مانے تھے۔ کہ سلیم مقابلہ میں شریک ہو۔ کیونکہ وہ دائم المرض لڑکا بہت نحیف و زار ہو چکا تھا اور اس میں کام کی ہمت مطلق نہ تھی۔ مگر ساتھ ہی اس کے جنون کا کیا علاج۔ کہ وہ تصویر بنانے کا مصمم ارادہ کر چکا تھا۔۔۔۔ ہریش نے اپنا پائپ آتشدان کے قریب جھاڑتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔۔۔ حمید بدستور دیوار پر منڈھے ہوئے کاغذ کے نقش و نگار کے مطالعہ میں مصروف تھا۔۔۔ ظفر کچھ بیکل سا ہو کر اٹھا اور کمرے کے دوسرے سرے پر پہنچکر ایک گلدان کو تپائی پر درست کر کے رکھنے لگا۔۔۔ "تمہیں تھوڑا تھوڑا کام کرنا چاہیئے" پریم نے فکر مند لہجہ میں آہستہ سے کہا۔

"تھوڑا تھوڑا سا؟ مگر اس کے لئے تو وقت نہیں پریم!" اس نے گھبرا کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "میں تو ایک نہایت اعلےٰ تصویر بنانا چاہتا ہوں"

اس پر سب نے حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھا۔۔۔ سلیم اپنے دوستوں میں ہر لحاظ سے افضل سمجھا جاتا تھا۔ مگر مصوری کا شوق رکھتے ہوئے بھی تصویر کشی میں ماہر نہ تھا۔

"بیشک!" صدیقی نے کچھ توقف کے بعد حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا۔ ظفر نے مڑ کر اس کی طرف خشمگیں نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"واہ۔۔۔! خوب ہو تم بھی! مارنا چاہتے ہو اُسے۔۔۔؟ دیکھتے نہیں اُس میں ہمت بھی ہے کام کرنے کی؟"

سلیم مسکرایا۔۔۔۔۔

"ظفر! میرے دوست! بس یہ میرا آخری موقعہ ہے۔ اور مجھے یقین ہے۔۔۔۔۔ کہ کم از کم اِس مصروفیت میں میرے باقی دن اچھی طرح کٹ جائینگے۔۔۔ بیکار پڑے پڑے تو یاس انگیز خیالات مجھے گھیرے رہتے ہیں۔ اس طرح کم از کم اِس نا اُمیدی میں ایک خوشگوار احساس تو شامل ہو جائیگا۔۔۔ میرا دل اس امید سے ہی بہلا رہیگا۔ کہ ممکن ہے میرا بھی کام میرے بعد میرے نام کو

زندہ رکھے!"

ظفر کے لئے یہ موضوع نہایت تکلیف دہ تھا۔ وہ پھر تیزی سے چلتا ہوا چمنی کے پاس پہنچا اور ایک ٹکڑے کو الٹ پلٹ کرنے لگا۔ حمید نے آتشدان میں آگ تیز کی... ہریش کہنے لگا:-

"تم کہتے ہو کہ چھ مہینے طویل مدت ہے...؟ مگر تمہاری موجودہ صحت کو دیکھتے ہوئے میں کہونگا کہ یہ مدت کچھ بھی زیادہ نہیں۔ پریم نے ٹھیک کہا تھا تمہیں تھوڑا اور بہت تھوڑا کام کرنا چاہیئے.... کوشش کرو کہ چند ماہ کی اور مہلت مل جاتے۔" "مگر زندگی... انسانی زندگی مہینوں پر مشتمل نہیں ہوتی... میرا نقطۂ نظر کچھ اور ہے.... مانا کہ ایک تصویر کچھ حقیقت نہیں رکھتی مگر میری زندگی کا حاصل تو لے دیکے یہی تصویر ہوگی... میری ساری زندگی اس پر صرف ہوجائیگی یہاں تک کہ میری روح بھی اس میں جذب ہوکر رہ جاتے...!! اور تم کہتے ہو کہ یہ مدت کچھ بھی نہیں...؟ تم سے چھ مہینے نہ سمجھو۔ بلکہ میری تمام عمر... میرا تمام سرمایہ حیات.....!! اکیاڈیمی سے زیادہ مہلت لیکر کیا کرونگا۔ میرے پاس تو شاید اتنا وقت بھی باقی نہیں..." سلیم کا سانس پھول گیا تھا مگر اس نے اسی جوش سے سلسلۂ کلام جاری رکھا۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔

"اور جب میں نے سنا کہ وہ "اکیاڈیمی" کے نگارخانہ کی زینت بن گئی ہے۔ تو.... اگرچہ میں جاکر اسے دیکھنے کے قابل نہ ہونگا۔ تاہم اس دنیا سے خوش اور مطمئن جاؤں گا..."

"لیکن فرض کرو..." ہریش نے کچھ کہنا چاہا مگر خاموش ہوگیا۔ پریم نے اس کے مطلب کو واضح کرتے ہوئے کہا۔

"ہریش کا مطلب ہے کہ اگر وہ... حالت... بخلاف توقع [illegible]

پیدا نہ ہوسکا تو خواہ مخواہ کی زحمت سے فائدہ؟"

"میں کیوں نہیں کر سکتا۔ دیکھو گے کہ کرونگا.. میں ہمیشہ پورے اعتماد کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ یہ فن مجھ میں ودیعت کیا گیا ہے۔ اگرچہ میں نے آج تک کوئی نمایاں کام نہیں کیا۔ تاہم میرے مرقع میں چند ایک تصاویر ایسی ہیں جو کچھ اتنی بری بھی نہیں مثلاً "گداگر" کا سر کسی طرح بھی "پریم" سے برا نہیں۔" اور اس نے دادطلب نگاہوں سے پریم کی طرف دیکھا (اپنے مصور دوستوں کے گروہ میں پریم انسانی سر کا چربہ اتارنے میں سب پر فوقیت رکھتا تھا)

"بیشک "گداگر" تمہاری معمولی تصویروں سے بہت بہتر ہے" پریم نے سنجیدگی سے کہا۔ وہ جانتا تھا کہ سلیم کی معمولی تصویریں معمولی ہی ہیں اور "گداگر" ان میں "اندھوں میں کانا راجہ" کے مصداق قدرے بہتر.......

"اور "سمندری پری"...؟ تمہیں یاد ہوگا اسکا سبز لباس تم نے کتنا پسند کیا تھا...!" اس کا روئے سخن ہریش کی طرف تھا۔

"بے شک لباس تم نے بہت خوبی سے پینٹ کیا تھا:" اس نے جواب دیا۔

حمید بولا۔ "ہاں سچ سلیم تمہارا وہ "ننھا سا غنچہ"! اُسے تم نے کس شوق سے پینٹ کیا اور جب تیار کر چکے تو یاد ہے اسکی نسبت تمہاری کیا رائے تھی...؟ مجھے خوب یاد ہے... افسوس یہ تو ایک ٹکے والے روزانہ اخبار میں چھپنے کے قابل بھی نہیں!.. تم نے نہایت مایوسی سے کہا تھا۔

"لیکن ایک اور اچھی تصویر بھی تو تھی...... "سپاہی کا [illegible]

[illegible]

آمیزش بھی خاصی دلکش تھی۔ خصوصاً سیاہی کا خود، جس میں ڈوبتے ہوتے سورج کی زرد شعاعیں منعکس ہو رہی تھیں۔

سلیم کے چہرے پر خوشی کی سُرخی جھلکنے لگی۔ وہ جانتا تھا کہ صدیقی کے منہ سے تعریف کے کلمات شاذ و نادر ہی سنے جاتے ہیں۔ ظفر نے دوبارہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"مگر میرے خیال میں تو سلیم کا "ساٹن کا ناچ" بہترین ہے"

اب تو سلیم کی مسرت کی انتہا نہ تھی۔ کیونکہ ظفر تو تحسین کے معاملے میں بہت زیادہ بخل سے کام لیتا تھا۔ مگر اس وقت اسکی تعریف کر رہا تھا۔

"چلو شکر ہے۔۔۔ میری چند تصاویر کے بعض پہلو تو تمہاری نگاہوں میں قابلِ تعریف ہیں نا؟"

"بیشک! بیشک!" سب نے یک زبان ہو کر کہا۔

"لیکن اب۔۔۔؟ اب میں ایک ایسی تصویر بنانا چاہتا ہوں جو ہر پہلو سے قابلِ تعریف ہو! دقت صرف یہ ہے کہ کوئی موضوع نہیں سوجھتا۔ میں سوچتا تھا کہ شاید تم کوئی اچھی چیز تجویز کر سکو:"

سب کی نظریں صدیقی کی طرف اٹھیں۔ کیونکہ اُس کی دو ایک چھوٹی چھوٹی چیزیں "ایکاڈیمی" میں منظور ہو چکی تھیں۔ اور کم از کم اپنے دوستوں میں سب سے زیادہ ماہرِ فن تھا۔۔۔ اس نے سگریٹ سلگانے کے بعد کرسی کی پشت پر جھکتے ہوئے نہایت تحمل سے جواب دیا۔

"یعنی تم چاہتے ہو کہ کوئی ایسی تصویر بناؤ جس میں سر "گداگر" کے سر جیسا سڈول اور خوبصورت ہو۔ کچھ زیورات جنکی رنگ آمیزی سیاہی کے خود کی طرح دلکش ہو۔۔ کسی خوبصورت دوشیزہ کی، تصویر جس کا لباس "سمندری پری" کا سا ہو۔۔۔؟ تو کوشش کرو۔ کہ لباس بھی بالکل ویسے ہی رنگ کا ہو زردی مائل سبز۔۔۔" بہتی نے کہا۔ ظفر نے تجویز پیش کی۔

"اور اگر اس تصویر میں سایہ ویسی خوبی سے بنا سکو جیسا "رقص" میں ہے تو کیا کہنے۔ نہایت عمدہ چیز بن جائے۔"

"یعنی تمہاری تصاویر کے سب اچھے پہلو یکجا ہو جائیں۔۔۔ میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں۔ کہ قابلِ دید تصویر ہوگی۔"

"بیشک!" حمید نے فوراً ہرتش کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

سلیم سیدھا ہو بیٹھا۔ اس کی پتلی دبلی انگلیوں کی بےچین حرکات سے ذہنی انتشار کا پتہ چلتا تھا۔ مگر اس نے چہرے پر اطمینان اور خود اعتمادی کے آثار پیدا کرتے ہوئے کہا:

"میں تم سب کا شکرگذار ہوں۔۔۔ میرے پیارے دوستو! ہمیشہ میرے ساتھ مخلصانہ سلوک کرتے رہے ہو۔ اتنا کہ میں شاید اس کا اہل بھی نہیں۔"

"نہیں نہیں سلیم! یہ کیا کہتے ہو۔۔۔؟" اس کے دوستوں نے ہم آہنگ ہو کر کہا۔۔۔ "تمہیں کیا معلوم کہ ہمارے دلوں میں تمہاری کتنی عزت ہے۔"

اور یہ حقیقت تھی۔ کہ سلیم اپنے دوستوں میں سے ہر ایک کو بےحد عزیز تھا۔ وہ بھی سبکو یکساں چاہتا تھا۔ اور ہمیشہ اُن کی مدد کرتا رہتا تھا۔۔ وہ سب پیشہ ور مصور تھے اور ان کی شبانہ روز محنت بمشکل ان کے معمولی اخراجات کی کفیل ہو سکتی تھی۔ لیکن سلیم ایک صاحبِ استطاعت امیرزادہ تھا۔ اور محض شوقیہ تصویرکشی کرتا تھا۔

"لیکن سوال یہ ہے کہ ان سب عمدہ پہلوؤں کو کس طرح یکجا دکھایا جائے۔۔۔؟ مفہوم کیا ہو۔۔۔؟ چند دنوں سے

میرا دماغ تو کچھ معطل سا ہو رہا ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا:" اس نے اپنے تھکے ہوئے سر کو کمزور ہاتھوں کا سہارا دیتے ہوئے کہا۔

"دیکھو کچھ سوچتے ہیں . . . ." صدیقی نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"کوئی . . . . کوئی ایسی چیز جو میرے حسب حال ہو . . . . . سمجھتے ہو نا . . . . ؟"

"واضح طور پر سمجھاؤ تو سمجھیں بھی!"

"یعنی حصولِ شہرت اور بقائے دوام کے لئے انسان کی جدّ و جہد مگر فنا کے قوی ہاتھوں میں بے بسی اور مجبوری۔"

"اچھا تو "ساغرِ شہرت" کی نسبت تمہارا کیا خیال ہے؟ دکھایا جائے کہ ایک حسین دیوی تمہیں ساغرِ شہرت پیش کر رہی ہے۔ تم چاہتے ہو کہ اُسے لیکر اپنے ہونٹوں سے لگا لو . . . . مگر . . . . مگر . . . . ."

صدیقی کی آواز بھرا گئی۔

"اہو! صدیقی! میرے عزیز دوست! اتنی سی بات پر دل گرفتہ ہو جاتے ہو . . . . ؟" سلیم نے زہر خند ہو کر کہا . . "تمہارا دل اتنا مضبوط نہیں جتنا کہ میں خیال کرتا تھا . . . . یہ تو میری حالت سے ہی ظاہر ہے . . . . بھلا شمعِ سحر کب تک نسیم کے پیہم جھونکوں کا مقابلہ کرے گی؟ تم بلا تامل اپنی رائے بیان کرو۔ جو بات اٹل ہے اس کے درمیان میں آجانے کے فضول خیال سے مجھے اس قیمتی رائے سے محروم نہ رکھو جو شاید مجھے "حیات ابدی" دلا سکتی ہے . . . یقین جانو میرے دل میں مطلق ملال نہیں رہتا' جب میں سوچتا ہوں کہ انجام خوشگوار ہوگا . . . . "ساغرِ شہرت" میں سے مئے باقی کا ایک پُر کیف جرعہ اور اس کے بعد موت کی دائمی بے خودی!!"

صدیقی کرسی پر سے اٹھا اور منہ دوسری طرف پھیر کر کھڑکی میں جا کھڑا ہوا . . . . اور سامنے دیکھتے ہوئے بولا۔

"ظفر نے کہا تھا کہ تصویر میں حسین دیوی کا سایہ بھی دکھا . . . . مگر دیوی کا نہیں . . . . ایک سایہ . . . . ہیبتناک پُر اسرار سایہ عقب سے نمودار ہو کر اپنا خوفناک اور حریص پنجہ . . . رہا ہوں . . . . گویا چاہتا ہے کہ . . . . سمجھتے ہو نا . . . . ؟"

"ہاں تو یہ . . . . یہ سایہ . . . . تمہارا مطلب ہے۔

"موت ؟"

"مگر صرف تمہارے اپنے نقطۂ نگاہ کو مد نظر رکھتے ہو۔ میں نے یہ رائے پیش کر دی ہے . . . . تم بڑے پیارے دو . . . ہو سلیم! خدا تمہیں ہمیشہ ہماری محفلوں کی رونق بنائے ر . . . . . ! ہاں صرف ایک بات اور سن لو . . . ." اس نے کا . . . ہوئی آواز میں کہا . . . ." اس کی گلوگیر آواز جیسے ایک آ . . . کے نیچے سے یا کسی زمین دوز کمرے کے روزن سے سنائی د . . . رہی تھی . . . . ظفر نے غصہ سے اس کی طرف دیکھا اور پھر . . . نگاہوں سے بیمار مصور کو دیکھتے ہوئے پیار سے اپنا ہاتھ ا . . . کندھے پر رکھ دیا . . . . مگر اُسے کچھ خبر نہ تھی۔ وہ صدیقی . . . بیان کردہ خاکہ کا ایک ایک نکتہ اپنے تھکے ہوئے دماغ میں . . . کرنے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔ باقی سب دم بخود بیٹھے . . . آتشدان میں بھڑکتی ہوئی آگ کو بے معنی نظروں سے گھور رہے تھے . . . . . .

"کچھ "پس منظر" کے متعلق . . . . ! "پس منظر" دھندلا . . . پُر اسرار ہو . . . . جیسے کوئی اجنبی سی سرزمین . . . . ."

وہ اپنی جگہ پر واپس آیا اور میز پر سے ٹوپی اٹھاتے . . . بولا . . . .

"میرا خیال ہے۔ کہ یہ خاکہ بالکل موزوں اور تمہارے ۔ ۔ ۔ ۔ حسب منشا ہوگا۔ جیسا کہ تم نے کہا تھا میں کل آؤں گا۔ اور اسکے متعلق مزید تبادلۂ خیالات کرینگے۔ ۔ ۔ چلو بھئی اٹھو اب چلیں۔ ۔ ۔ ۔"

راستے میں یکایک پریم نے صدیقی کی طرف مخاطب ہو کر کہا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

"ناممکن ہے۔ کہ سلیم یہ تصویر بنا سکے۔ ۔ ۔"

"اور اسے اس حقیقت کا مطلق احساس نہیں!" حمید نے کہا۔

"کام شروع کر لینے دو۔ خوب احساس ہو جائیگا بے چارے کو!" ہرنش نے جواب دیا۔

"نہیں نہیں۔ ۔ ۔ کوئی ایسی تجویز سوچو کہ اسے اپنی ناکامی کا احساس نہ ہونے پائے۔ بیچارا غریب لڑکا۔ ۔ ۔ ۔"

ظفر کے لہجہ میں انتہائی نرمی اور ہمدردی تھی۔ ۔ ۔ ۔ وہ چند منٹ بالکل خاموشی سے چلتے گئے۔ آخر پریم نے کہا۔

"ہم سب اسے یقین دلائیں گے۔ کہ اس کی تصویر فن کا اعلےٰ نمونہ ہے۔ ۔ ۔ اور اسی خوشگوار غلط فہمی میں بے چارے کی زندگی کے باقی دن بسر ہو جائیں گے۔"

"کیا خوب!" ہرنش نے اس کی تردید میں کہا۔ "تو کیا تمہارا مطلب ہے کہ جب اسے اطلاع ملے۔ کہ اکاڈیمی نے اس کی تصویر کو فیل کر دیا تو یہ غیر متوقع ناکامی اس کی کمزور صحت کے لئے اور بھی مہلک ثابت ہو۔ ۔ ۔ ۔؟"

"مگر یہ اسے معلوم ہی کیوں ہونے دیا جائے کہ تصویر پاس نہیں ہوئی۔ ۔ ۔ ۔؟"

"کیا لغو باتیں کرتے ہو صدیقی۔ ۔ ۔! اور جو اس نے فہرست منگوا کر دیکھا اور اس میں اس کا نام نہ ہوا۔ ۔ ۔؟"

"فہرست میں بھی اسکا نام یقیناً ہوگا۔ ۔ ۔ سب کے سب میری طرف بیوقوفوں کی طرح کیا گھور رہے ہو۔ میں دیوانہ تو نہیں ہوں۔ چلو میرے ہاں چلو۔ میں ابھی تمہیں سب کچھ سمجھائے دیتا ہوں۔"

صدیقی کا مکان قریب ہی تھا۔ سب اس کے کمرے میں پہنچے اور سگرٹ سلگا کر میز کے گرد بیٹھ گئے۔ ہر ایک صدیقی کے بیان کا بیتابی سے منتظر تھا۔ ۔ ۔ ۔ اس نے کہا۔ ۔ ۔

"سلیم کا ارادہ ہے کہ ایک ایسی تصویر بنائے جو ہر پہلو سے مکمل اور عمدہ ہو۔ اور وہ اس طرح کہ اپنی مختلف تصویروں کے اچھے نکات کو یکجا کر دے۔ ۔ ۔ ۔ اس کے اس ارادے نے میرے دل میں ایک عجیب خیال پیدا کر دیا ہے۔ تم سب جانتے ہو کہ یہ سب اچھے نکات اس کے اپنے پیدا کردہ نہیں۔ بلکہ ہم سے اخذ کئے ہوئے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہم ماہر فن مصور نہ سہی، تاہم اپنی اپنی جگہ کوئی نہ کوئی خصوصیت ضرور رکھتے ہیں۔ ۔ ۔ مثلاً پریم اپنی تصویروں میں سر نہایت اعلےٰ بناتا ہے۔ حمید حسین نسوانی پیکر تو خوب بناتا ہے۔ مگر لباس اچھا پینٹ نہیں کر سکتا۔ اس کے برعکس ہرنش لباس بہت عمدہ پینٹ کرتا ہے مگر نسوانی پیکر بنانا نہیں جانتا۔ ۔ ۔ ۔ اور ظفر؟ وہ تو شاعرانہ دماغ کا آدمی ہے۔ اور مادی چیزیں سرے سے بنا ہی نہیں سکتا۔ اگر کوئی اسے دیوار بنانے کے لئے کہے تو وہ دھند کا ایک پردہ بنا دیگا اور لفظی دلائل سے ثابت کریگا کہ دیوار اس کے پیچھے ہے۔ رہا میں تو میری نسبت تم جانتے ہی ہو۔ میری تصاویر میں سر ہی میری خامی کا مظاہرہ کرتا ہے کھا، وہ میرے نقص رنگ و ... اگر یہ ناقص ... نا

زیورات، اور ظروف یعنی دھات کی قسم کی سب چیزیں تو میں خاص عمدگی سے بنا لیتا ہوں۔ . . . ہاں تو اس تصویر میں جس کا ذکر ہم سلیم کے ہاں کر رہے تھے سر پریم بنائیگا، اور . . . . "

"تو کیا تمہارا مطلب ہے۔ کہ یہ تصویر ہم سب بنائینگے . . . ؟"

پریم نے چونک کر پوچھا . . . .

صدیقی نے اثبات میں سر ہلایا۔

"مگر سلیم کبھی نہیں مانے گا۔"

"تو میں نے کب کہا۔ کہ اس سے پوچھا جائے . . . اس کے سامنے تو اس کا ذکر ہی نہ آنا چاہیئے" صدیقی نے حسب معمول متانت سے جواب دیا۔

"اچھا تم چاہتے ہو، کہ ہم تصویر بنا کر اس کے نام بھیج دیں؟"

"ہاں"

"فرض کرو اس نے وہاں جا کر دیکھا ؟"

"افسوس! بدقسمتی سے اس کے وہاں جانے کا تو امکان ہی نہیں . . ."

"پھر بھی کچھ ایسی تجویز سوچو کہ اس کے اور ہمارے خیالات میں مطابقت قائم رہے۔ تاکہ کسی وجہ سے اسے وہ تصویر دیکھنے یا اس کے کسی پہلو پر رائے زنی سننے کا اتفاق بھی ہو۔ تو اسے کچھ شبہ پیدا نہ ہو کہ وہ اس کی تصویر نہیں . . . . دونوں تصویروں میں فرق صرف اتنا ہو کہ اس کی تصویر میں جو خامیاں ہوں ان سے ہماری تصویر مبرا اور اصلی مفہوم میں سر مو فرق نہ ہو . . . ."

پریم نے باقاعدہ تقریر کرتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک کہتے ہو۔ مگر اس کے لئے ضروری ہے۔ کہ ہم میں سے کسی ایک کو ہر وقت اس کے پاس مشورے کے لئے موجود رہنا چاہیئے"

صدیقی نے جواب دیا،

"یہ کام ظفر کے سپرد کرو" ہریش بولا۔

ظفر سرنگوں بیٹھا تھا۔ نفی میں سر ہلا کر بولا۔

"نہ . . . مجھ سے یہ نہ ہو سکے گا"

"تو کیا تم ہمارا ساتھ نہ دو گے ؟"

"کیوں نہیں . . . . مگر یہ کام کسی اور کے ذمہ ڈالو۔ میرا دل بے حد دکھتا ہے جب میں اس تصویر کی نوعیت کو دیکھتا ہوں۔ ہر وقت اس کے پاس رہ کر اسے اپنی ہی موت کی تصویر بنا دیکھنا . . . اس کی یاس انگیز باتیں سننا . . . اور پھر اسے مجھی سے مشورہ دینا! کیا خوب! مجھ سے یہ نہ ہوگا . . . بڑے سنگدل ہو تم بھی صدیقی! تم نے کس دل سے اسے ایسی خوفناک تصویر کا موضوع پیش بتایا؟ کتنا ظلم ہے کہ ایک بیمار آدمی ہر وقت اپنے انجام کا ہولناک تصور قائم رکھنے کی ترغیب دو"

اس کی آنکھیں آبگوں ہو گئیں . . . .

چند منٹ تک ایک غمگین خاموشی چھائی رہی . . ظفر کرسی سے اٹھا اور دوسرے دن پھر آنے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔ اس کے بعد ایک ایک کر کے سب رخصت ہوئے . . .

اگلے ہی دن سے سلیم نے بڑے زور شور سے کام شروع کر دیا۔ اس نے مزید صلاح اور مشورے کی کچھ ضرورت نہ سمجھی۔ چند دن میں ہی خاکہ تیار کر لیا . . . ایک دن صدیقی وہاں سے واپس آ رہا تھا کہ پریم سے ملاقات ہو گئی۔ پریم نے سلیم کے متعلق استفسار کیا۔

"کچھ نہ پوچھو" اس نے مایوسی سے کہا۔

"بڑی مشکل کا سامنا ہے۔۔۔ وہ "دیوی" کے بازو برہنہ رکھیگا اور ہم میں سے کوئی بھی بازو خوبصورتی سے نہیں بنا سکتا۔۔۔۔ زیور وغیرہ سرے سے کچھ بنتے ہی نہیں کہ میرا فن کچھ کام آسکے۔۔۔ رہا "موت" کا سایہ تو اس میں کچھ خوبی ہی نہیں اسے دیکھ کر تو کسی کو ہنسی آتے تو آئے۔۔ اور تو کچھ نہیں ہوگا۔ یہ تو میں قسم کھانے کو تیار ہوں۔ کہ خوف کا احساس پیدا نہیں ہو سکتا۔۔۔!"

دونوں ایک منٹ تک چپ چاپ سوچتے رہے۔

صدیقی نے پھر کہا۔ اس سے بھی قطع نظر کر لی جائے تو پس منظر ایک دوسری مصیبت ہے۔ اور اپنے مصور کی ٹھوس دماغی کا بیّن ثبوت میں چاہتا تھا کہ "پس منظر" ایک دھندلی سی سبزی ہو۔۔ مثلاً ایک کوہستانی پگ ڈنڈی سیاہی مائل کہر میں غائب ہوتی ہوتی دکھائی جائے۔۔ مگر وہ کچھ عجیب گورکھ دھندا بنا رہا ہے۔۔۔ کہیں کوئی عمارت ہے کہیں باغیچہ کہیں مندر، اور یہ سب بے معنی ہیں۔ بالکل نچر۔۔۔ ! کچھ نہیں ہو سکتا سب تجویزیں خاک میں مل گئیں۔۔۔"

"صرف ایک تجویز ہے۔ اور وہ یہ کہ ظفر کو کسی نہ کسی طرح رضامند کرو کہ تصویر کشی کے دوران میں اس کے پاس رہ کر اسے ہماری مرضی کے مطابق ترغیب دیتا رہے سلیم ظفر کی بات کا ہمیشہ پاس رکھتا ہے، ضرور اس کے مشورے پر کاربند ہوگا۔"

"مگر ظفر نہیں مانتا اُسے کون مجبور کرے۔ دیکھو میں منت و سماجت سے کام لوں گا۔ جو اس کی سمجھ میں بات آگئی تو۔"

"خیر۔ میں تو وقت پر اپنا فرض ادا کرنے کے لئے حاضر [illegible]

حالات بہتر ہو جائینگے۔"

"کہاں جا رہے ہو تم؟"

میں دو چار دن کے لئے باہر جا رہا ہوں۔ ایک ضروری کام ہے۔" وہ صدیقی سے مصافحہ کر کے آگے چلدیا۔۔۔

پریم واپس آیا تو صبح ہی صدیقی کے ہاں پہنچا۔۔۔ وہ ابھی کمرے میں داخل ہونے بھی نہ پایا تھا کہ صدیقی اُسے دیکھ کر کرسی پر سے اچھل پڑا۔۔۔!

"پریم! پس منظر کا خاکہ تیار ہو گیا۔۔۔!" اس نے بغیر کسی تمہید کے کہا۔۔ "اِدھر آؤ۔۔۔ یہ دیکھو"

وہ اسے گھسیٹتا ہوا بغل والے کمرے میں لے گیا۔ اور جب اس نے سٹینڈ پر سے پردہ سرکایا تو پریم کا منہ فرطِ حیرت سے کھل گیا۔۔۔ بادلوں کے سے کہر آلود دھندلے سائے ایک کے اوپر ایک پھیلتے چلے گئے تھے۔ جیسے عالم رویا میں نظر آنیوالے خوابوں کا ایک لامتناہی سلسلہ ہو، یا کسی نازک خیال شاعر کی تمناؤں کا حسین تصور۔۔۔!!

"یہ کس نے بنایا۔۔۔!" اس نے بمشکل پوچھا۔

"زاہد نے"

"کیا کہتا تھا؟"

"یہی کہ میں نے تو ایسی حماقت نہ کبھی دیکھی نہ سنی۔۔۔! میں نے کہا تو مطلب یہ ہے کہ تم نہیں بناؤ گے؟" کہنے لگا بناؤنگا ضرور بناؤنگا جب کسی حماقت کا انسداد اپنے بس میں نہ ہو بلکہ ایک عزیز دوست اس میں شرکت کی دعوت دے تو پھر مجبوری ہے۔۔۔

[illegible]

کام دکھاتے مجھے تو شرم آتی ہے"

"مگر میں نے اسے تمہارا خاکہ دکھایا تھا . . . . اور اس نے اُس نے بہت سے عمدہ پہلو بتائے ہیں"

"اس کے برعکس میں زاہد کا بے حد شکر گزار ہوتا اگر وہ میری خامیوں کو نمایاں کرکے بتا جاتا"

اس کے متعلق اس سے خود گفتگو کر لینا وہ آج پھر آئیگا"

بارہ بجے دوپہر کو زاہد آیا سب خاکے اس کے سامنے پیش کئے گئے۔ اس نے ہر ایک کی نسبت کوئی نہ کوئی مفید مشورہ دیا . . مثلاً "دیوی" کا لباس ڈھیلا اور پیچھے لٹکتا ہوا ہو . . . چہرے پر زردی کی بجائے سُرخی کی خفیف سی جھلک ہو۔ چند خطوط کے تغیر و تبدل سے تبسم میں کچھ ایسا انداز پیدا ہو جائے۔ گویا "حصول بقا" کے لئے فانی انسان کی جد و جہد کا تمسخر اڑا رہی ہے۔ یہ چھوٹے چھوٹے نکات اگرچہ معمولی تھے۔ مگر درحقیقت ان سے تصویر میں حیرت انگیز تبدیلی پیدا ہو گئی جس سے اسے چار چاند لگ گئے۔

تصویر حیرت انگیز تیزی سے بن رہی تھی جنوری کے سارے مہینے میں سب نے باری باری سے کام کیا۔ مہینے کے اختتام پر زاہد کو پھر بلایا گیا۔ وہ اپنے وقت کے . . . . . . چند مشہور اور بہترین مصوروں میں سے تھا۔ اس نے تصویر کو دیکھ کر بہت پسند کیا۔ اور وثوق سے کہا کہ کام تسلی بخش ہے اور اکاڈیمی میں بھیجنے کے لئے نہایت موزوں . . . . !

فروری کے شروع میں ایک دن پریم سلیم کے ہاں گیا۔ اور اس کی تصویر کو دیکھا . . . خرابیٔ صحت کے باعث یہ تصویر اسکے [illegible]

تمام نقائص سے بے خبر اندھا دھند اسے بناتے جا رہا تھا۔ بالکل مجنونوں کی طرح . . . . جب تک اس کی کمزور ٹانگیں سٹینڈ کے سامنے کھڑے رہنے کی متحمل ہو سکتیں وہ ایک پل بھر کے لئے بھی مُوقلم ہاتھ سے نہ رکھتا . . .

"کیا خیال کرتے ہو پریم؟ تصویر اچھی ہے؟" اس نے نہایت اشتیاق سے پوچھا۔

"بلاشبہ! سب کہتے ہیں بہت اچھی ہے" پریم نے سنجیدگی سے کہا۔

ابھی ابھی صدیقی آیا تھا۔ پیمانے کی طرف بڑے غور سے دیکھ رہا تھا . . . اس کی نگاہوں سے تحسین جھلک رہی تھی . . ."

بیمار مصوّر نے خود بھی دیوی کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے "گنگا جمنی" پیمانے کی طرف کچھ محبت آمیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا . .

"ناظرین! میں ویسی خوبی سے سنہری اور روپہلی کام نہیں کر سکتا۔ تاہم . . . . . اس دفعہ میرا خیال ہے . . . . صدیقی خود بھی تو اعتراف کرتا ہے۔ اس کی جگہ تم یا ظفر ہوتا تو میں سوچتا کہ محض میری دلجوئی کے خیال سے کہتے ہو۔ مگر صدیقی بلاوجہ کسی کی داد دینے والی ہستی نہیں . . . . !"

"ہاں صدیقی تو بلاوجہ کبھی کسی کی تعریف نہیں کرتا . وہ کہہ رہا تھا کہ اس دفعہ تم نے اسے مات کر دیا . . ." ساتھ ہی اس کی آنکھوں کے سامنے اس حیرت انگیز ساغر کا نقشہ آگیا جو صدیقی نے دوسری تصویر میں بنایا تھا . . . اس کی ساخت اپنے اندر کچھ اس طرح کی گہرائی لئے ہوئے تھی "دیوی" کے نازک ہاتھ میں پکڑا ہوا وہ سچ مچ سونے اور چاندی کا وزنی جام معلوم ہو رہا تھا . .

"[illegible]

ہے" سلیم نے خوش ہو کر کہا۔ اس کی بے رونق آنکھیں فوراً مسرت سے چمک رہی تھیں۔۔۔۔ پریم کہنے لگا۔

"حمید مجھ سے کہہ رہا تھا کہ 'دیوتی' کو دیکھ کر اسے رشک آتا ہے!"

"اگر درحقیقت یہ اس کی تصاویر کے مقابلے میں کسی طرح بھی بہتر ہے۔ تو مجھے پورا یقین ہے تم سب سے زیادہ خود حمید کو اس امر کی خوشی ہوگی۔۔۔۔" اس نے ہنسکر کہا۔

"اور ظفر۔۔۔۔ میرا عزیز ظفر کہنے لگا کہ تم نے کسی ہامی قسمت کے زیر اثر۔۔۔۔ یہ سایہ۔۔۔۔ موت کا سایہ۔۔۔۔!" یکایک اُسے سخت کھانسی آئی اور وہ کھانستے کھانستے نڈھال ہو گیا۔ پریم نے سہارا دیکر بڑی آرام کرسی پر لٹا دیا۔ اور جب سلیم کی طبیعت قدرے بحال ہوئی تو محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا:—

"ہم میں سے ہر ایک تمہاری خاطر کیا کچھ کرنے کو تیار نہیں سلیم کاش کوئی ایسی تدبیر ہو کہ ہم تمہیں پھر ویسا ہی تندرست و توانا دیکھ سکیں۔"

"مجھے معلوم ہے پریم۔۔۔۔! میں جانتا ہوں میرے دوست" اس نے نقاہت سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"کیوں تم اپنی ضد نہیں چھوڑتے اور اپنی صحت کو خطرے میں ڈال رہے ہو۔ تمہیں ہماری تجویز مان لینی چاہیئے تھی۔"

"نہیں پریم! تم نہیں سمجھتے۔۔۔ اس نے سنجیدگی سے جواب دیا "دیکھو میں کہہ تو چکا ہوں۔ کہ یہ میرا آخری موقع ہے۔ اور اسے میں ہاتھ سے دینا نہیں چاہتا۔ تمہیں چاہیئے کہ مجھے نہ روکو۔ بلکہ میری ہمت افزائی کرو۔ کہ میں بھی دنیا میں اپنا نام باقی چھوڑ جاؤں"

"خیر تمہاری مرضی۔۔۔!"

"اور اگر میری تصویر کامیاب ٹھہری۔ تو اس کے لئے بھی میں تمہارا۔۔۔ تم سب کا رہین احسان ہونگا۔ یہ تمہارے ہی مخلصانہ اور مفید مشوروں کا نتیجہ ہوگا۔۔۔ میں جانتا ہوں کہ اگر تم خود اسے بناتے تو بھی اس میں اس سے بڑھکر دلچسپی نہ لیتے۔ حالانکہ اس میں کلام نہیں کہ تم میں سے ہر ایک اس سے بدرجہا بہتر اور عمدہ تصویر بناتا۔"

"نہیں سلیم۔۔۔! یہ غلط ہے۔۔۔! سب کہتے ہیں کہ تمہارا کام اس دفعہ سب دوستوں پر سبقت لے گیا ہے۔"

"تم سب مشاق اور کامیاب مصور ہو۔ مگر میں۔۔۔۔ مجھے اب تو اپنے سابقہ کام میں بھی خامیاں نظر آنے لگی ہیں۔۔۔ بس صرف یہ ایک تصویر ہے۔۔۔ ضروری ہے پریم! یہ ضروری ہے کہ میری آخری تصویر اعلیٰ ہو۔۔۔ کیونکہ میں اس پر اپنی جان قربان کر رہا ہوں۔ اور ضروری ہے کہ یہ میری روح سے زندگی حاصل کرے۔۔۔ میرا یہ جسم فنا ہو جائے۔ مگر میری روح اس تصویر میں رہ کر ہمیشہ زندہ رہے گی۔۔۔!"

پریم بڑی دیر تک اپنے بیمار دوست کی تسلی و تشفی میں مشغول رہا۔ اور آخر شام کے قریب واپس آیا۔

آئندہ ڈیڑھ دو ہفتوں کے دوران میں سلیم کی طبیعت معمول سے زیادہ خراب رہی اور ڈاکٹر نے اسے بستر پر سے اٹھنے کی سخت ممانعت کر دی۔۔۔ جب وہ دوبارہ چلنے پھرنے کے قابل ہوا تو بعید کمزور تھا۔ اور باوجود سخت کوشش کے بھی ایک گھنٹہ روزانہ سے زیادہ کسی طرح کام نہ کر سکتا تھا۔

مارچ کے شروع میں وہ پھر سخت بیمار ہو گیا۔ اور تمام مہینہ

یہی کیفیت رہی۔ اپریل کے آغاز میں طبیعت رو بصحت ہوئی تو اس نے پھر پورے زور شور سے کام شروع کر دیا۔۔۔ ایک دن اس نے پریم سے پوچھا۔

"میں اسے اپریل کے آخر تک ختم کر ڈالونگا۔۔۔ لیکن سچ کہنا پریم! کیا یہ سچ مچ ایسی ہی ہے جیسی تم کہتے ہو۔۔۔؟"

"بلاشبہ نہایت اچھی ہے۔۔ کیوں تمہیں اس میں کچھ شک ہے؟"

"ہاں چند دنوں سے میرے دل میں خیال بیٹھ گیا ہے۔ کہ یہ کچھ نہیں۔۔۔ لیکن تم لوگوں کے کہنے پر۔۔۔"

"تمہیں پورا اعتماد ہونا چاہیئے سلیم! ہم جھوٹ نہیں کہتے۔"

"ہاں اسی خیال سے مجھے پھر تسکین ہو جاتی ہے۔"

جب پریم نے صدیقی کو سلیم کی اس گفتگو سے آگاہ کیا۔ تو وہ بے حد متردد نظر آنے لگا۔۔۔

"جونہی وہ تصویر مکمل ہو اسے وہاں سے اٹھوا لانا چاہیئے۔" اس نے کہا۔ "تمام عمر میں پہلی مرتبہ اسے جانفشانی سے کام کرنے کا موقعہ ملا ہے۔ اور اس کی یہ محنت بالکل ہی رائیگاں نہیں جا سکتی۔ اس سے اسے کچھ نہ کچھ تجربہ ضرور ہوگا بس سمجھ لو کہ مکمل ہو جانے پر وہ تصویر چند دن بھی اس کے پاس رہی تو اس کے تمام نقائص رفتہ رفتہ اس پر بے نقاب ہو جائیں گے۔ اور وہ سمجھ جائیگا کہ ہم لوگ اسے محض طفل تسلیاں دے رہے تھے۔"

مہینے کے اختتام پر تصویر بھی مکمل ہو گئی۔ سب اسے دیکھنے گئے اور ان کی متفقہ پسندیدگی اور تعریف سے سلیم قدرے مطمئن تو ہوا مگر حسب معمول خوش نظر نہ آتا تھا۔ صدیقی نے کہا کہ کل صبح وہ اسے فریم کرانے کے لئے اٹھوا کر لے جائیگا۔

اسی دن شام کو سلیم کا بوڑھا ملازم صدیقی کے ہاں آیا۔۔ بےچارا ضعیف آدمی بہت ہراساں ہو رہا تھا۔ اس نے بتایا کہ سلیم کی حالت دیوانوں کی سی ہو رہی ہے۔ بیہوش بستر میں پڑا ہے۔ مگر جس وقت بھی ہوش میں آتا ہے تو تصویر کو ضائع کرنے کی کوشش میں اٹھ اٹھ کر بھاگنا چاہتا ہے۔۔۔

صدیقی نے اسی وقت کرایہ کی گاڑی لی اور پریم کو ساتھ لیتا ہوا سلیم کے ہاں پہنچا۔ دیکھا تو وہ بستر میں بیٹھا ہوا غصہ سے بھری ہوئی نحیف آواز میں خبر نہیں کیا کیا واہی تباہی بک رہا تھا۔ اور تصویر کے متعلق شکایت کر رہا تھا۔ غریب ماما اسے تسلی و تشفی دینے کی بیسود کوشش کر رہی تھی۔ صدیقی اور پریم کو دیکھ کر بےچاری بڑھیا کی قدرے ڈھارس بندھی۔

"یہ میری تصویر نہیں۔۔۔" اس نے اپنی کمزور مگر پرغضب آواز میں چلا کر کہا۔۔۔ "دھوکا! صریحاً دھوکا!" اور جب اس نے اپنے دوستوں کو دیکھا تو اور بھی جوش سے بولا:۔

"صدیقی غضب ہو گیا! کسی نے مجھ سے سخت دھوکا کیا۔۔۔ میری تصویر بدل لی۔۔۔! یہ میری نہیں ہو سکتی۔ ذرا جا کر دیکھو تو سہی۔۔ میں کہتا ہوں 'جاؤ' جا کر دیکھو تصویر کو۔"

"ہاں ہاں میں ابھی جاتا ہوں۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائیگا۔ تم صرف اپنی طبیعت کو سکون دو۔۔۔ 'ذرا تمہاری طبیعت ٹھکانے نہیں۔"

"تم نہیں سمجھ سکتے صدیقی۔۔۔!" اس نے سرگوشی میں کہا "آہستہ بولو۔ یہ بڑھیا نہ سنے۔ اسی کا کام ہے۔ اس کی سازش سے تصویر بدلی گئی۔۔۔ یہ ہو سکتا ہے کہ اسے خبر نہ ہو مگر مانتی نہیں۔۔۔ اسے کہو میرے سامنے سے ہٹ جائے۔"

"ماما بہتر ہے تم یہاں سے چلی جاؤ۔ اس وقت تمہارے آقا کے حواس ٹھکانے نہیں" صدیقی نے ماما کو ایک طرف لیجا کر نرمی سے سمجھایا "تم جانو ماما وہ واقعی اپنے آپے میں نہیں"

ماما بے چاری دوپٹے سے آنسو خشک کرتی ہوئی باہر نکل گئی.....

"سلیم دراصل بیماری کے باعث تمہاری سمجھ میں کچھ فرق ہو گیا ہے اور تصویر کے متعلق بھی غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے ہو۔ ورنہ کس کی جرأت ہو سکتی ہے۔ کہ آکر تصویر بدلتا پھرے...؟"

"غلط فہمی؟" سلیم نے چونک کر پوچھا.... "کیا کہہ رہے ہو صدیقی اندر جا کر دیکھو تو سہی اور خدا کے لئے خود ہی انصاف کرو یہ میری تصویر ہے... میری پانچ مہینے کی جان توڑ مشقت کا نتیجہ؟ کیا یہ ممکن ہے۔ کہ یہ میری تصویر ہو؟"

صدیقی، پریم کو ساتھ لے کر سلیم کے "نگارخانہ" میں گیا۔ اور چند منٹ کے بعد واپس آکر کہنے لگا۔

"میں سوچتا ہوں۔ کہ تمہارے سر کو بخار چڑھ رہا ہے۔ اور تمہیں وہم ہو گیا ہے۔ کہ تصویر بدل لی گئی۔ ورنہ وہ ہر لحاظ سے نہایت عمدہ ہے... بس بس سلیم ہوش میں آؤ اور مجھ پر اعتبار کرو تم ہمیشہ میری بات پر اعتبار کرتے ہو"

"اسے یہاں میرے پاس اٹھوا لاؤ کہ پھر اچھی طرح دیکھ سکوں ممکن ہے مجھے ہی غلطی ہوتی ہو"

پریم نے اشارہ سے صدیقی کو منع کیا تو سلیم تاڑ گیا اور غم اور غصہ سے بھری ہوئی آواز میں کہنے لگا۔

"سمجھ گیا! تم بھی اس سازش میں شریک ہو.....! تم ...؟ تم بھی حاسد ہو سکتے ہو؟ کم از کم تمہاری.... اپنے بہترین دوستوں کی نسبت میں ایسا گمان نہ کر سکتا تھا..... کہتے ہیں وہی تصویر ہے! جھوٹ... قطعاً جھوٹ! دھوکا فریب!!"

پریم بے چارہ شرمندہ ہو کر ہونٹ چبانے لگا....

سلیم پھر چلایا۔ "اور تم پر تو میں سب سے زیادہ بھروسہ اور اعتماد رکھتا تھا صدیقی!" اور اس کی آواز رقت سے بھر آگئی۔

"اگر اس وقت بھی تم اپنے آپے میں ہوتے تو مجھ پر ضرور اعتماد رکھتے۔ اور ایسا ہی پریم پر بھی" صدیقی نے کہا۔

"خیر جانے دو، در.... مجھے معاف کر دو.... شاید میں ہی غلطی پر ہوں۔ مجھے معاف کر دو... تم بھی پریم! تم جانتے ہو کہ میں بیمار ہوں...."

"ہاں ہاں۔ ہم خوب جانتے ہیں۔ اور معافی کیسی؟ کوئی بات نہیں" پریم نے اس کا کندھا سنبھالتے ہوئے کہا۔

"ہاں سچ ہے... تصویر کو ذرا یہاں لے آؤ۔ میں دیکھوں تو سہی..." اس نے نہایت نرمی سے کہا۔ اب سوائے اس کے کوئی چارہ نہ تھا کہ تصویر لائی جائے۔ پریم اور صدیقی نے سٹینڈ لا کر اس کے بستر کے سامنے رکھ دیا۔ سلیم نے اُسے بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

"ذرا قریب کر کے رکھو" انہوں نے سٹینڈ اور نزدیک کر دیا۔

"اور قریب" اب سٹینڈ پلنگ کی پٹی سے لگا دیا گیا....

سلیم اُسے دیوانوں کی طرح آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر گھور رہا تھا۔

پھر یکایک چلایا، جیسے کوئی شوریدہ سر گلا پھاڑ کر چیختا ہے....

"دیکھنا...! ذرا دیکھنا...!! شاہکار! میرا شاہکار!

ہاہاہا... ہاہاہا! اور پھر کہتے ہیں۔ یہ وہی تصویر ہے..."

قریب کی میز پر سے اس نے صدیقی کی چھڑی اٹھائی اور سٹینڈ پر لگے ہوئے مومی کپڑے پر دھڑادھڑ مارنے لگا۔ یہانتک کہ کپڑا اکھڑ کر فرش پر آرہا۔ ۔ ۔ وہ پاگلوں کی طرح خوفناک آواز میں بلند قہقہے لگا رہا تھا۔ آخر بیدم ہوکر بے ہوش ہوگیا۔ ۔ ۔ حیرت زدہ پریم بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ اور صدیقی دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر کرسی پر گر پڑا۔

پھر دونوں نے ملکر سلیم کو ہوش میں لانے کی کوشش شروع کی۔ اگرچہ دل ہی دل میں ڈر رہے تھے کہ وہ ہوش میں آکر پھر وہی جنونانہ حرکتیں کریگا۔ ۔ ۔ سلیم بڑی دیر سے ہوش میں آیا اور چند سیکنڈ تک حیرت سے گردوپیش دیکھتا رہا اور پھر آنکھیں بند کر کے فوراً بڑے آرام سے سو گیا۔

دوسرے دن صبح ہی صدیقی اور پریم سلیم کے ہاں پہنچے اُسے اُس وقت بخار تو نہ تھا۔ مگر نقاہت بے حد تھی۔ وہ بستر پر سے اُٹھ نہ سکتا تھا۔ ۔ ۔ دوستوں سے وہ بہ خندہ پیشانی ملا اور حسب معمول باتیں کرنے لگا۔ معلوم ہوتا تھا کہ گذشتہ شب کے تمام واقعات اس کے دماغ سے محو ہو چکے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ تصویر کے متعلق بھی خوش ہو ہو کر باتیں کرتا تھا۔ صدیقی نے اُسے بتایا کہ تصویر فریم کے لئے بھیجدی گئی ہے۔ اور دوکاندار اسے براہ راست ایکاڈیمی میں بھیجدے گا۔ مگر سلیم اصرار کرنے لگا کہ تصویر فریم میں لگی ہوئی دیکھنا چاہتا ہے۔ اپنے دوستوں کے چہروں پہ ناراضگی کی علامات دیکھ کر کہنے لگا۔

"چند دن سے۔ ۔ ۔ خصوصاً گذشتہ شب سے میری یادداشت میں کچھ ایسا فرق آگیا ہے کہ مجھے تو اب وہ تصویر پوری طرح یاد بھی نہیں۔ ۔ ۔ اگر تمہیں وہ تصویر میرے سامنے لانے میں کچھ اعتراض ہے تو میں سمجھونگا کہ وہ بالکل فضول ہے۔ اس لئے تم اسے میرے سامنے دوبارہ لاتے ہوئے ہچکچاتے ہو۔ اور اسی فکر میں میری صحت اور زیادہ بگڑ جائے گی۔ ۔ ۔ ۔ نہیں صدیقی! اگر وہ ایکاڈیمی میں جانے کے قابل نہیں تو کیوں بھیجکر خواہ مخواہ تضحیک کرواتے ہو۔"

"کہاں کی تضحیک؟ ایسے وہم دل میں نہ لاؤ۔ تمہاری تصویر فریم ہوکر تمہارے سامنے آجائے گی۔ ۔ ۔ بس؟"

پریم حیرت سے صدیقی کا منہ تک رہا تھا۔ کہ آخر اس کا انجام کیا ہوگا۔ ۔ ۔ ؟

اسی دن شام کو صدیقی کے کمرے میں ایک چھوٹی سی میٹنگ اس مشورہ کے لئے ہوئی کہ تصویر سلیم کو دکھائی جائے یا نہیں۔ ۔ ۔ اس میٹنگ میں سلیم کے سب دوستوں کے علاوہ زاہد بھی شریک تھا۔

پریم۔ حمید اور رہرلیش کہتے تھے کہ تصویر اُسے دکھانی مناسب نہیں کہہ دیا جائے ہمارے دوبارہ پہنچنے سے قبل ہی دوکاندار نے اسے فریم کر کے ایکاڈیمی میں بھیج دیا تھا۔ ۔ ۔ ۔ مگر صدیقی اور ظفر کی رائے تھی۔ کہ اُس کی تصویر کی بجائے اپنی فریم کروا کے اسے دکھا دی جائے۔ اسے تصویر پوری طرح یاد بھی نہیں وہ اسے اپنی ہی خیال کریگا۔

جب وہ نوچا کھسوٹا ہوا مومی کپڑا جس پر سلیم نے تصویر کشی کی تھی زاہد کے سامنے پیش کیا گیا تو اس نے اسے بغور دیکھنے کے بعد کہا۔

"اس کی کوئی فکر نہ کرو۔۔۔۔! ایسی تصویر بنانے والا شخص اپنے اندر بہت ہی کم قوتِ امتیاز رکھتا ہے۔۔۔ اور پھر دونوں تصویریں ازروئے مفہوم آپس میں کافی مشابہت رکھتی ہیں۔ تم بلاتردد اپنی تصویر اسے دکھا دو۔"

سلیم کے دوستوں نے بعض پہلو خود اس کی تصویر کے مطابق اختیار کئے تھے اور بعض پہلوؤں میں اُسے مشورہ دیکر کوشش کی تھی کہ دونوں تصویروں میں مشابہت اور مطابقت حتی الوسع قائم رہے۔۔۔ اور واقعی جب دونوں تصویریں پہلو بہ پہلو رکھی گئیں تو وہ حیرت انگیز طور پر مشابہ اور پھر غیر مشابہ تھیں۔۔۔!!

اکاڈیمی میں بھیجنے سے ایک دن پہلے شام کے وقت تصویر سلیم کے سامنے لائی گئی۔ اس کا وزنی سنہری فریم برقی روشنی میں منعکس تھا۔ نیچے جلی حروف میں لکھا تھا۔

"بقا کا ذکر کہاں اس جہانِ فانی میں

عمل ایم سلیم سیفی

صدیقی نے باصرار زاہد کو بھی ساتھ لے لیا تھا۔ کہ شاید اس کی موجودگی میں سلیم تصویر کی طرف زیادہ توجہ منعطف نہ کر سکے اس دن سلیم اور بھی نحیف ہو رہا تھا۔ لمبے اور نرم نرم سفید تکیوں اور بڑے بڑے کشنوں میں دھنسا ہوا پڑا تھا۔ اپنی تصویر کو پورے ایک جلوس کے ساتھ اور پھر اس جلوس میں اتنے مشہور و معروف مصوّر کو آتے دیکھ کر سلیم کی بے رونق آنکھیں فرطِ مسرت سے چمک اٹھیں۔ مرجھاتے ہوتے زرد چہرے پر پھر ایکبار زندگی کی سُرخی جھلملانے لگی اور وہ اپنے تکیوں اور کشنوں کے انبار کے درمیان اٹھ بیٹھا۔۔۔! چند رسمی الفاظ کے تبادلے کے بعد اس نے زاہد سے کہا۔

"اگر آپ نے کہہ دیا کہ میری تصویر اچھی ہے تو پھر یقیناً مجھے اطمینان ہو جائیگا۔ میں سوچتا ہوں کہ میرے دوست شاید صرف میری دلجوئی کے لئے کہتے ہیں۔۔۔ دراصل بات یہ ہے کہ سارا کام میں نے بخار کے دوران میں کیا ہے۔ اس لئے وہ تصویر مجھے کچھ بھول سی گئی ہے۔ اور ساتھ ہی بار بار یہ وہم ہوتا ہے کہ اچھی نہیں بنی۔۔۔ اس کی سب چیزیں فرداً فرداً تو مجھے یاد ہیں۔ مگر یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ کیسی ہیں۔۔۔ دیکھنے میں کیسی معلوم ہوتی ہیں۔ فن کے معیار پر پوری اتر سکتی ہیں یا نہیں۔"

"مسٹر سلیم! سب سے پہلے تو اس شاندار کامیابی پر میری دلی مبارکباد لیجئے۔۔۔! اور اس کے بعد میں کہونگا کہ سچ پوچھئے تو آپکی تصویر پہلے اتنی گراں پایہ نہ تھی جتنی فریم ہونے کے بعد نظر آرہی ہے اس میں چند خامیاں ضرور تھیں مگر اتنی خفیف کہ انہیں شیشے کے شفاف اور مجلا پردے نے ہی مستور کر لیا۔۔۔! اب تو آپ خود اسے دیکھ کر حیران رہ جائینگے۔ بلکہ عجب نہیں کہ بے ساختہ کہہ اٹھیں۔ کہ یہ آپ کی تصویر ہی نہیں۔۔۔! ایک دفعہ خود میرے ساتھ ایسا ہی ہوا تھا۔ میری ایک تصویر فریم ہو کر آئی تو میں شش و پنج میں پڑ گیا۔ کسی طرح یقین نہ آتا تھا کہ یہ میری ہی بنائی ہوئی ہے۔"

"ایسا ہی ایک مرتبہ میرے ساتھ بھی ہوا تھا۔" ہرلیش نے تائید کی۔ پھر سب نے ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا کہ ایسا اکثر ہوتا ہے۔ اس ضروری تمہید کے بعد تصویر کو ایک بڑی سی کرسی کا سہارا دیکر پلنگ کی پائنتی کی طرف رکھ دیا گیا۔ جب پردہ ہٹایا تو سلیم نے وحشیانہ انداز سے ایک چیخ ماری۔

یہ۔۔۔؟ یہ بناتی ہے؟ کیا یہ ممکن ہے۔ کہ میں نے ایسی

تصویر بنائی ہو۔ ۔ ۔ ؟" اس نے شدتِ جوش سے تھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"اگر میری آنکھیں مجھے دھوکہ نہیں دے رہی تو یہ اس کے بالکل برعکس ہے جس کا مجھے خدشہ تھا۔ ۔ ۔ یہ تو واقعی عجیب چیز ہے"

"بلا مبالغہ عجیب چیز ہے مسٹر سلیم" زاہد نے جواب دیا۔ ۔ ۔ ۔

"آپ کا ہی نہیں بلکہ اسے اس دفعہ ایکاڈیمی کی نمائش کا واحد شاہکار مانا جائیگا۔ دیکھ لیں گے آپ میں غلط نہیں کہتا"

"اسے اور قریب لاؤ ناظر اصدیقی! میرے پیارے دوست ہاں اور قریب! آہ میرا دل چاہتا ہے اسے چوم لوں! ۔ ۔ ۔ اب مجھے کچھ پرواہ نہیں۔ جو ہو سو ہو۔ ۔ ۔ ! میرا مقصد زندگی پورا ہو گیا۔ میں نے اپنا شاہکار پینٹ کر لیا۔ ۔ بس!!"

اس کے بعد کے چند ہفتے ناقابلِ بیان ہیں۔ ۔ ۔ یہ بیچارے سلیم کی زندگی کے آخری دن تھے۔ اور یہ آخری دن عجب متضاد کیفیات سے پُر تھے سلیم کے لئے تو یہ اُسکے دورِ حیات کا "شاندار سنہری زمانہ" تھا۔ اس کا دل کامیابی کے پُرکیف احساس سے مسرور تھا۔ مگر اس کے دوست مغموم اداس اور دل گرفتہ تھے۔ وہ دیکھ رہے تھے۔ کہ ان کا پیارا رفیق انہیں چھوڑنے والا ہے۔ مگر وہ خود بے حد خوش تھا۔ اتنا کہ اپنی زندگی میں پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔ ۔ ۔ ۔ اس کا بستر خطوط سے پُر تھا۔ ۔ ۔ ان خطوط میں کچھ تہنیت نامے تھے اور کچھ تصویر کی فروخت کے متعلق۔ میز پر کئی اخبار اور رسائل جو اس تصویر کی تعریف کے حامل تھے پڑے تھے۔ ۔ ۔ ۔ ان کی تعداد میں لمحہ بہ لمحہ اضافہ ہو رہا تھا۔ مگر وہ مر رہا تھا۔ ۔ مر رہا تھا مگر خوش اور مطمئن تھا۔ ۔ ۔ !!۔

ایک دن سب اس کے کمرے میں بستر کے گرد جمع تھے۔ وہ بیہوش لیٹا ہوا تھا۔ اور معمول سے زیادہ کمزور نظر آ رہا تھا۔ اس نے کہا۔

"میرے عزیز دوستو! میں سوچتا ہوں کہ اب وقت آگیا ہے کہ میں تمہیں الوداع کہوں۔ ۔ ۔ اپنی تصویر میں تمہارے سپرد کرتا ہوں۔ اور ہر طرح مطمئن ہوں کہ تم اسکا مناسب انتظام کرو گے"

سلیم کے دوستوں نے اس کی یادگار میں تصویر ایکاڈیمی کی نذر کر دی اور ایکاڈیمی کے ہال کے ایک کمرے میں سلیم کی ایک بڑی سی عکسی تصویر آویزاں کر کے اس کے سامنے سنگ خارا کا ایک خوبصورت ستون بنوایا۔ جسے ایک دیوی اپنے ایک بازو میں تھامے اور دوسرے میں ایک جام لئے کھڑی تھی۔ ستون پر وہی مصرعہ کندہ تھا۔

"بقا کا ذکر کہاں اس جہانِ فانی میں"

آج سلیم کی برسی تھی۔ اور اس کے عزیز دوست پریم اور صدیقی اس کی ابدی آرامگاہ کو گلاب سے نہلانے اور پھولوں سے سجانے کے بعد اس کی یادگار کو دیکھنے آئے تھے۔ اور اب اس کی متبسم تصویر کے سامنے کھڑے بار بار اُسے حسرت زدہ نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان تبسم ریز لبوں کو ابھی جنبش ہوگی اور وہ اسی مصرعہ کو دہرائینگے۔ جو اکثر مرحوم مصور کی زبان زد رہتا تھا۔ اور جو سنگ خارا کے ستون پر اُس کی یاد میں کندہ کر دیا گیا تھا۔ ۔ ۔ ۔ !

جناب صابر خلیلی

مرجانہ کے نام

تیرے بغیر

آئی ہے برسات کی پہلی گھٹا تیرے بغیر!
چھیدتی ہے روح کو ٹھنڈی ہوا تیرے بغیر
نوحہ غم ہے پرندوں کی نوا تیرے بغیر
سونی سونی ہے گلستاں کی فضا تیرے بغیر

جب سے آنکھوں میں سمایا جلوۂ آتش فروز
روح میں دل میں جگر میں جان میں بستا ہے سوز
حسرتیں مرتی ہیں ارمانوں کا خوں ہوتا ہے روز
بن رہا ہے میرا گھر دار الفنا تیرے بغیر

یاد سی رہتی ہے دل میں ہر نفس تجھانے کی
تیرے جلووں کی ہوس میں ہے ہوس تجھانے کی
کھٹکھٹایا کرتا ہوں زنجیر بس تجھانے کی
بھول بیٹھا ہوں خدائی میں خدا تیرے بغیر

آہ! کیا ہے اہتمام جلوہ ہائے بے پناہ
جاں ہے غارت روح ہے برباد اور دل ہے تباہ
انتہائے لاغری ہے اب نہ گریہ ہے نہ آہ
جی رہا ہوں ہائے اب بے آب و ہوا تیرے بغیر

تو نہیں تو بے مزہ ہیں ساغر و مینا مجھے

تو نہیں تو زہر و سم پینا ہے مے پینا مجھے
تو نہیں تو اک وبالِ جان ہے جینا مجھے
زندگی کی ہر مسرت ہے جفا تیرے بغیر

آ بھی جا روتی ہوئی آنکھوں سے خوں بہنے نہ دے
آ بھی جا فرقت میں اندوہ و الم سہنے نہ دے
آ بھی جا تنہا زمانے میں مجھے رہنے نہ دے
زندگی دشوار ہے اے مہ لقا تیرے بغیر

جناب امین الرحمٰن عامر عثمانی

ایک تمنا

شام تھی! فطرت کی گلکاری کی اک رنگیں شام
مل رہا تھا دیدۂ دل کو تڑپنے کا پیام

بربطِ گیتی کے نغموں سے فضا معمور تھی
"حسن کی دیوی" شرابِ حسن سے مخمور تھی

مسکراہٹ لٹ رہی تھی مستیوں کا تھا نکھار
ہر طرف بکھری ہوئی تھی رنگِ فطرت کی بہار

ہنس رہے تھے پھول پانی کی حسیں موجوں کے ساتھ
حسن کی تخلیق گویا کر رہے تھے ان کے ہاتھ

موجِ دریا اور شفق یوں جذب تھے اک رنگ میں
جس طرح نغموں کی رعنائی صدائے چنگ میں

سرخ پانی کے کنارے سبز پودوں کی قطار
جیسے زیبِ حسنِ رنگیں بھینی پھولوں کا ہار

سامنے نظروں کے شعلوں سے شفق کے بار بار
جھانکتا تھا کوئی "مجسمۂ تبسم" اشکبار!

جا رہا تھا گوشۂ مغرب میں مہرِ ضوفشاں
کیف کے آغوش میں کھویا ہوا تھا سب جہاں

سامنے کچھ فاصلہ پر گر رہے تھے آبشار
مٹ چکی تھی جن پہ اُن معصوم کرنوں کی بہار

مضطرب تھا آبشاروں میں محبت کا سکوں
رفتہ رفتہ ہو رہا تھا جوشِ وحشت پھر فزوں

نوکِ نشتر سے کوئی پھر چھیڑتا تھا درد کو
ڈھونڈتا پھرتا تھا میں افسوس ان کی گرد کو

کہہ رہا تھا رنج کا احساس پھر بے اختیار
کاش! وہ ہوتے جہانِ رنگ و بُو سے ہمکنار

کاش میرے ساتھ وہ بھی ہوتے آہستہ خرام
دھڑکنیں دل کی مرے بیدار ہو جاتیں تمام

جناب کوثر چاندپوری

آپریشن

ڈاکٹر کتنا ہی دوست، ہمدرد، مخلص اور بے ضرر کیوں نہ ہو۔ حقیقت میں وہ ایک زبردست خطرہ ہے زندگی، سکون، اور اطمینان کے لئے۔ ذرا جسم پر کہیں خراش، ورم یا درد پیدا ہوا، اور اس نے "آپریشن" کا خطرناک مشورہ دیا!

ہندوستان میں چونکہ اس سرے سے اُس سرے تک بہادر ہی بہادر آباد ہیں۔ اس لئے یہ مشورہ سرزمین ہند پر موت کی پیشینگوئی کے مرادف خیال کیا جاتا ہے اور کوئی مریض اسوقت تک اس رائے پر عمل کرنے کی غرض سے تیار نہیں ہوتا۔ جب تک اُسے اپنے مرنے کا پورا یقین نہ ہو جائے، زندگی کی ذراسی آس بھی باقی رہتی ہے تو بیمار بغیر آپریشن ہی کے زندہ رہنے کی کوشش کرتا ہے!

اِدھر ڈاکٹر صاحبان کو "ملک الموت" کی اتنی رعایت منظور ہے کہ وہ معمولی زکام میں بھی جوشاندے کی جگہ آپریشن ہی تجویز کرتے ہیں، اور تعمیلِ ارشاد میں تھوڑی سی تاخیر بھی واقع ہوتی ہے۔ تو اگلی ملاقات میں وہ عضو ماؤف کو دیکھ کر نہایت پُروثوق لہجہ میں کہتے ہیں۔ "دیکھو آپریشن جلد کرا لو دیر کرنے میں سخت خطرہ ہے۔ پیپ ذرا اور آگے کو بڑھ گئی تو پھر ہاتھ، پیر یا انگلی کٹوا لے کے سوا اور کوئی چارۂ کار باقی نہ رہے گا"

لیکن یہ کوئی سہل تو ہے نہیں کہ اُدھر طبیب نے تجویز کیا اور اِدھر مریض نے بغیر "ہوالشافی" کہے نوش کر لیا، یہ ہے آپریشن جس میں زندگی، خوبصورتی اور تندرستی غرض ہر چیز ہی خطرے میں رہتی ہے۔ اور سب سے بڑا خطرہ فیس کا ہے۔ جو مریض کے مرنے پر بھی رفع نہیں ہوتا، اور ڈاکٹر کا بل ادا کر دینا ضروری ہو جاتا ہے یہ بھی ظاہر ہے کہ آج کل اُن لوگوں کی پیدائش قطعاً بند ہو چکی ہے جو عملِ جراحی کی ضرورت واقع ہونے پر ایک ہاتھ میں کتاب لیکر بیٹھ جایا کرتے تھے۔ اور دوسرا ہاتھ ڈاکٹر یا جراح کے سامنے کر دیا کرتے تھے کہ لو اپنا کام کر لو تم نشتر لگاؤ، ہم کتاب پڑھتے ہیں۔ اب تو جب سے ..... "کلوروفارم" کی ایجاد ہوئی ہے۔ آدمی اتنا بزدل ہو گیا ہے کہ آپریشن کا نام سنتے ہی نصف مر جاتا ہے موجودہ زمانہ میں سو فیصدی تعداد ایسے بہادران بزدپیشہ کی ہے۔ جو آپریشن تو رہا الگ چیچک کا ٹیکہ لگواتے وقت ہی عدم آباد کی آدھی منزل طے کر لیتے ہیں۔ ان سے کیا امید رکھی جا سکتی ہے۔ کہ وہ ڈاکٹر کے کہتے ہی آپریشن کے لئے آمادہ ہو جائیں گے، لہٰذا عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ آپریشن کی ضرورت پیش آتے ہی وہ ایسے معالجوں سے رجوع کرتا ہے جو نشتر کا نام لینا بھی "جیو ہتیا" سے کم نہیں سمجھتے، کچھ دنوں انکا تختۂ مشق رہنے کے بعد پھر عطائی قسم کے لوگوں سے علاج کراتا ہے جب ان کے مجربات کا ذخیرہ بھی ختم ہو جاتا ہے۔ تو قہر درویش بجان درویش کے مصداق

آپریشن کے لئے تیار ہوتا ہے، لیکن یہ تیاری کسی طرح "قیامت" سے کم نہیں ہوتی' بیمار غریب کبھی روتا ہے' کبھی وصیت کرنے لگتا ہے' کبھی بچوں کو بلاکر پیار کرتا ہے' کبھی بیوی کو عقد ثانی کے متعلق ہدایات کرتا ہے۔ اور اپنی جوانا مرگی کے غم میں خود ہی ماتم کرنا شروع کر دیتا ہے۔

نصیب دشمناں ایک بہادر اور ذی حوصلہ انسان جن کو اب تک اپنی شجاعت کے امتحان کا کوئی موقعہ نہ ملا تھا بیمار ہو گئے۔ اور علالت کے سلسلہ میں آپریشن کی ضرورت لاحق ہو گئی ڈاکٹر نے ان کے پھوڑے کو دیکھتے ہی جلدی سے کہا۔ بابو آپریشن کراؤ آپریشن۔

آپریشن کا نام سنتے ہی بابو کے حواس خطا ہو گئے۔ اور عاجزی کے ساتھ بولے۔۔ "ڈاکٹر صاحب دوا سے کام نہیں چل سکتا کیا؟"

"دوا کا اثر آپریشن سے پہلے کسی طرح بھی جسم تک نہیں پہنچے گا"

"واللہ کیا آپریشن بالکل ناگزیر ہے؟"

"بالکل! ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بابو ہم مذاق نہیں کرتے تم سے!"

"کتنی دیر لگے گی آپریشن میں؟"

"تین چار منٹ تو ضرور صرف ہونگے!"

"تکلیف کتنی ہوگی؟"

"یہ کیا بتا سکتے ہیں ہم۔ ۔ ۔ ہم نے تو کبھی اپریشن نہیں کرایا" ڈاکٹر صاحب نے ذرا ہنسکر جوابدیا۔

"بہت اچھا پھر کر دیجئے آپریشن" مریض نے نہایت مایوسی کے ساتھ کہا!

کل کھول دیا جائے گا آپ کا زخم! تو عمرو ڈاکٹر نے نہایت اطمینان سے فرمایا' اور پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈال کر رخصت ہو گئے' ڈاکٹر کے جاتے ہی مریض کے سرہانے عورتوں کا ہجوم ہو گیا اور سب نے مسلسل سوالا شروع کر دیئے۔

واقعی اپریشن ہوگا آپ کے پھوڑے کا؟

اور کوئی ترکیب نہیں اس کو توڑنے کی؛

ڈاکٹر تو بالکل بچہ معلوم ہوتا ہے۔ ذرا سوچ سمجھ کر آپریشن کرانا چاہئے۔

لالچی تو نہیں ہے

فیس کے مارے تو نہیں کہتا؟

اس کی بات پر مت جاؤ' مجھے تو بے وقوف سا معلوم ہوتا ہے یہ ڈاکٹر!

دیکھو کوئی رگ نہ کٹ جائے!

بھیا تم تو کل کہیں چھپ جانا جب ڈاکٹر آئے'

میں تو کہتی ہوں باہر ہی سے اس کو فیس دے کر ٹال دیا جائے۔

کوئی زبردستی تو کر نہیں سکتا وہ!

کر کیوں نہیں سکتا' سرکاری نوکر ہے کوئی مذاق تو ہے نہیں ۔

بہت دیکھے ہیں میں نے ایسے سرکاری نوکر' سر پر ٹوپ بھی دکھائی نہ دے گا' اگر ذرا بھی زیادتی کی اس مرگھنے نے!

اور انہیں خبر ہو گئی تو مار ہی ڈالیں گے جان سے!

غریب عورتیں ان باتوں میں مصروف تھیں اور بیمار پڑے ہوئے رو رہے تھے۔ بالکل اس طرح جیسے آپریشن ہوتے ہی یقیناً مر جائینگے۔ اور اگر زندہ رہ گئے تو ڈاکٹر ضرور فنا کر ڈالیگا!

مریض رات بھر کروٹیں بدلتا رہا۔ ایک منٹ کو آنکھ نہ جھپکی ذرا نیند آتی اور فوراً ڈاکٹر صاحب نشتروں کا بکس لے کر آ جاتے۔ اور جگا کر کہتے اٹھو آپریشن کرا لو۔ کہنے کو تو اس نے ہمت کر کے ڈاکٹر سے کہدیا تھا۔ کل آپریشن کر دینا مگر اس کا تصور اتنا خطرناک اور روح فرسا تھا، کہ رات غریب مسہری پر رقصِ بسمل کرتا رہا' اور دن نکلنے تک نہ معلوم کتنی دفعہ ڈاکٹر نے اُسے خواب میں پریشان کیا؛ بڑی مشکل سے یہ رات بسر ہوئی صبح ہوتے ہی آپریشن کے انتظامات ہونے لگے . . . عزیزوں سے کہا گیا کہ صورت دیکھنا ہو تو آ کر اپریشن سے پہلے ہی دیکھ جاؤ۔ آخری وقت ہے۔ خدا جانے بچیں یا نہ بچیں!

جملہ احباب کو اطلاع کر دی گئی۔ کہ آج ہمارا آپریشن ہوگا۔ ٹھیک سات بجے پہنچ جاؤ تاکہ سند رہے اور ضرورت کے وقت کام آئے۔

ڈاکٹر صاحب کے آنے سے قبل ہی تمام احباب جمع ہو گئے کوئی کہتا تھا۔ میں ہاتھ پکڑ لوں گا تمہارا۔ گھبراؤ مت! کوئی پیروں کو سنبھالنے کی خدمت اپنے ذمہ لینے پر تیار تھا۔

ایک صاحب بولے میرے پاؤں میں دس بارہ مرتبہ شگاف لگ چکا ہے۔ اور میں نے اُف تک نہیں کی تم بہت ہی بزدل معلوم ہوتے ہو۔

کسی نے فرمایا ذرا سے شگاف سے پریشان ہو رہے ہو ہمیں دیکھو ہم نے اپنی بغل کے پھوڑے کو علی گڈھ کے ڈاکٹر بٹ سے کچا ہی چروا دیا تھا،

غرض احباب ہی میں کوئی شخص ایسا نہ تھا جس نے اپنے آپریشن کی کوئی نہ کوئی سچی یا جھوٹی داستان بیان نہ کی ہو یہ کوشش صرف اس لئے کی جا رہی تھی کہ بیمار دوست کے دل سے شگاف کا خوف دور ہو جائے۔ اور وہ اسی فریبِ جمیل میں مبتلا ہو کر آپریشن کے حادثہ سے زندہ بچ جائیں۔ اور چونکہ ایسے موقع پر ہر قسم کا جھوٹ "مصلحت آمیز" ہوا کرتا ہے۔ لہٰذا یہ بھی ایک قسم کا "جہاد" ہے۔ جو دوستوں پر فرض ہو جاتا ہے اب ہر شخص اپنی اپنی ہمت اور حوصلے کے مطابق اس فرض کی ادائیگی میں مصروف تھا' اتنے میں ڈاکٹر صاحب بھی آ گئے۔ اور چونکہ ڈاکٹروں کی مذہبی زبان کے متعلق طے ہو چکا تھا۔ کہ ہر حال ہی "انگریزی" ہوگی' اس لئے انہوں نے آتے ہی انگریزی میں پوچھا۔ سامان تیار ہے سب؟

بالکل تیار ہے۔

گرم پانی کہاں ہے؟

تولیہ اور صابون ہے گھر میں؟

تھوڑی ململ اور روئی کی ضرورت ہوگا ہم کو!

ڈاکٹر صاحب مسلسل اتنے سوالات کر چکے تو ایک صاحب بولے، فیس کے متعلق تو کوئی امر طے ہونا باقی نہیں ہے؟

بابو فیس تو کام کے بعد ہوتا ہے' ڈاکٹر صاحب نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا، اور اپنے "آلاتِ حکمت" کا بستہ کھول کر مریض کے سامنے ہی نشتروں کا معائنہ شروع کر دیا۔ دو تین لمبے لمبے نشتر نکالے اور اپنی پتھر کی سلی پر گھسنا شروع کیا۔ اس کام سے فارغ ہو کر ڈاکٹر صاحب نے صابون سے ہاتھ دھو کر بالکل اس طرح آستینیں چڑھائیں جیسے وہ کسی جانور کو ذبح کرنے کے لئے تیار ہو رہے ہیں۔ مریض کا بُرا حال تھا۔ وہ پلنگ پر لیٹا ہوا اپنے دوستوں کو حسرت و یاس سے دیکھ رہا تھا۔ اور

دوستوں کی کیفیت یہ تھی کہ وہ اپنے متعلقہ فرائض کو ادا کرنے کے لئے بے چین تھے' دو تین سرہانے کھڑے ہوتے زور، زور سے مٹھیاں بند کر کے دیکھ رہے تھے۔ کہ مریض کے ہاتھ ہماری گرفت سے نکل تو نہ جائیں گے۔ چار پانچ مریض کے پیروں کی قوت کا اندازہ لگانے میں مصروف تھے۔ ڈاکٹر صاحب کا اشارہ پاتے ہی سب کے سب خونخوار درندوں کی طرح انہیں لپٹ گئے کسی نے ہاتھ پکڑا کسی نے پاؤں' کوئی پیشانی پر ہاتھ پھیرنے بیٹھ گیا۔ کوئی صرف تسلی دینے کو ان کے منہ سے منہ ملا کر اس طرح بیٹھ گیا گویا ان کے سانس کی روانی کا امتحان کریگا اور جس وقت سانس کی آمد و رفت بند ہو جائے گی۔ فوراً ڈاکٹر سے کہیگا ٹھہریئے مریض کا دم نکل گیا!

ڈاکٹر صاحب اپنے شکار کو یوں بے بس اور لاچار دیکھ کر جوش میں کانپنے لگے اور اپنے ناآزمودہ کار ہاتھوں میں نشتر سنبھال کر نہایت تیزی سے مریض پر جھپٹے۔ پھر اپنی قوت سے نشتر کی نوک کھال میں داخل کی اور زور زور سے دو تین جھٹکے دیئے۔ لیکن کھال نہ کٹنا تھی نہ کٹی۔

مریض نے شدت الم سے کراہتے ہوئے کہا۔ مرگیا!

ڈاکٹر بولا ٹھہرو ابھی کسر ہے! پھر گھبراہٹ کے عالم 11
میں اپنے کمپونڈر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

یہ تو فیل کر گیا' دوسرا لاؤ' اس نے فوراً دوسرا نشتر دیا۔ اب ڈاکٹر صاحب نے دنگل ہارے ہوئے پہلوان کی طرح ہانپتے ہوئے دوسرا حملہ کیا' بس یہ معلوم ہوا کہ ایک ہوا تھی جو زخم میں داخل ہوئی اور نکل گئی لیکن شگاف نہیں ہوا' ڈاکٹر صاحب کا ہاتھ پھسل گیا۔ اور نشتر کھال پر ایک سرخ لکیر بناتا ہوا امن وسلامتی سے گذر گیا۔

مریض کو ان دو حملوں میں جس قدر تکلیف ہو چکی تھی۔ اس کے پیش نظر وہ خیال کر رہا تھا کہ ڈاکٹر صاحب نے غالباً دو تین فٹ طویل شگاف لگا دیا' ادھر حاضرین نے ڈاکٹر صاحب کی ناکامی کے دردناک منظر سے متاثر ہو کر زبان اور تالو کے تصادم سے ایک ایسی آواز پیدا کی جو چوہا چوہے سے مشابہ تھی اور نہایت خطرے کے وقت آدمی کے منہ سے نکلا کرتی ہے' مریض کو یقین ہو گیا کہ مرنے کا وقت یہی ہے اور یقیناً موت کا فرشتہ مجسم ہو کر آ گیا' اسی کو دیکھ کر سب کی یہ کیفیت ہو گئی' اس نے بدحواس ہو کر کہا۔ بس ڈاکٹر صاحب بس!

ڈاکٹر صاحب نشتر پھینک کر ایک دھار دار قینچی سنبھال چکے تھے۔ پہلی ناکامیوں کو سامنے رکھ کر انہوں نے نہایت بے دردی سے قینچی زخم میں داخل کی' ہائے .... اُف'.. . مرگیا' چھوڑ دو بس خبردار اب ہاتھ نہ لگانا۔ اور اسی نوع کی بہت سی آوازیں مریض کے منہ سے نکل کر فضا میں گونجیں۔ اندر سے عورتوں نے کواڑوں کی زنجیریں بجا بجا کر ڈاکٹر صاحب کو ہوشیار کیا حسن اتفاق سے وہ اپنا کام ختم کر چکے تھے۔ اور خون کو روکنے کی اتنی زبردست کوشش کر رہے تھے' جتنی جاپان کو روکنے کی کسی چینی جرنیل نے بھی اب تک نہیں کی تھی' انہیں یقین تھا کہ انسانی روح کا تعلق خون کے ان قطروں سے ہے جو آپریشن کے بعد اس کے جسم سے نکل جاتے ہیں۔ اسی بنا پر انہوں نے نہایت سختی سے زخم کے منہ پر انگوٹھا رکھ چھوڑا تھا۔ مریض کو اس عمل میں

ریشن سے زیادہ تکلیف ہوئی۔ اور شدت درد سے دہ چیخ اٹھا چھوڑ دو..... رہنے دو...... دیکھو دم نکلا میرا!

ڈاکٹر صاحب جانتے تھے کہ دم نکلنے کا زخم کے علاوہ کوئی نہ ہی نہیں اسی خیال سے انہوں نے زخم کو انگوٹھے سے دبا لیا تھا مریض نے۔ دم نکلنے کے خطرے سے آگاہ کیا تو انہوں نے اس فرض کو زیادہ سرگرمی کے ساتھ انجام دینا شروع کیا مغموم دل انسان سے یہ تکلیف دہ منظر نہ دیکھا گیا وہ بگڑ کر بولے اب دوا لگائیے جلدی!

انہوں نے اس سے زیادہ تلخی کے ساتھ جواب دیا تم جانو خاموش رہو!

یہ ایسا الزام تھا۔ جو کسی ہندوستانی پر نہیں لگایا جا سکتا کہ جس ملک میں قابلیت کے صرف یہی معنی ہوں کہ ایک آدمی جوہر اللہ سے ایک ہی ہو۔ ڈاکٹر بھی ہو حکیم بھی متعفن بھی ہو مقرر بھی۔ مارنویس بھی ہو اور فن باغبانی کا ماہر بھی۔ انجینیئر بھی ہو اور نجار ہ۔ وکیل بھی ہو اور موکل بھی، شاعر بھی ہو اور سخن فہم بھی۔ اسمیں سے جزو بھی کم ہو جاتے تو اس کی قابلیت اور ہمہ دانی جہالت اور انی میں تبدیل ہو جاتے۔ اس صورت میں تم کیا جانو والا جملہ صاف رہا تھا کہ وہ کم سے کم ڈاکٹری کے اس شعبہ سے واقف نہیں پریشن سے متعلق ہے۔ اور یہ کھلی ہوئی توہین۔ ذلت اور حقارت ان کے علم و فضل کی جس کو وہ برداشت نہ کر سکے۔ اور طیش میں بولے.....تم کیا جانو؟

ہم یہ جانتے ہیں جو کر رہے ہیں!

کیا کر رہے ہو خود اسے شگاف میں تمہارے ہاتھ کانپ گئے منہ پر ہوائیاں اڑنے لگیں معلوم ہو رہا تھا۔ نشتر ہاتھ سے چھوٹ کر گر جائے گا۔ اسی کو کہتے ہیں جاننا! قصائی کہیں گے!"

جھوٹ بولتے ہو تم، ہاتھ کانپ رہے تھے ہیں آدمی کا گلا کاٹ کر ڈالوں اور ہاتھ نہ رکے!

گلا کاٹنے کی مشق تو خاص طور پر کی ہے تم نے لیکن آپریشن دوسری چیز ہے اب آئندہ کسی غریب کو مت ستانا ورنہ یاد رکھو کوئی مار ہی ڈالے گا تمہیں!

بیمار نے دیکھا دو ڈاکٹروں میں مریض ہلاک ہوا جا رہا ہے۔ اور یہ قصہ ذرا اور بڑھ گیا تو ڈاکٹر صاحب نشتر کی جگہ چاقو یا تلوار نکال کر آپریشن کی جگہ قتل عام شروع کر دیں گے، انہوں نے سماجت سے کہا ڈاکٹر صاحب خدا کے لئے ان کی باتوں پر نہ جائیے جلدی سے پٹی باندھ دیجئے!

ڈاکٹر صاحب کے جانے کے بعد ہمارے اس دوست نے تمام حباب کا حلفیہ بیان لیا، کہ خدا کی قسم کھا کر ہاتھ نہیں کانپ رہا تھا ڈاکٹر صاحب کا؟ سب نے کہا سچ کہتے ہو تم ڈاکٹر صاحب واقعی گھبرا گئے تھے، اب ذرا ان کی اس جراحت میں ٹھنڈک محسوس ہوئی جو ڈاکٹر صاحب کی زبان سے ولمیں پیدا ہو گئی تھی، خدا محفوظ رکھے ایسے ہمہ دان دوستوں سے!

حضرت احسان دانش

جنت میں دوزخی

ہری نگری میں نہ پوچھو ہوں شاد یا ناشاد
یہ مختصر ہے کہ تسکین ہو گئی برباد

یہاں سکون طبیعت کو مل نہیں سکتا
کہ جانکنی میں ہے ہر وقت جذبۂ امداد

یہاں فضاؤں سے آتی ہے بوئے بے فیضی
ملے ہوئے ہیں ہواؤں میں نالہ و فریاد

شگفتگی کی رمق تک نہیں تمدن میں
معاشرت کے لبوں پر ہے ظلم کی روداد

گداگری پہ ہیں مجبور حسن و رعنائی
نگار خانۂ ہستی ہے مائل فریاد

یہاں نوائے صداقت صدا بصحرا ہے
کہ اقتدار پہ ہے شہریاری شدّاد

یہاں حکومت و ثروت ہے درپئے مزدور
ہیں اس بہشت کے خطے میں دوزخی آباد

جناب عبدالرشید طارق ایم۔اے

رُوحانیت

میں نے اپنے خیالات وعقائد کی باگ ڈور کبھی کسی دوسرے شخص کے حوالے نہیں کی' اور نہ ہی حتی الوسع کسی کو اجازت دی ہے کہ اس معاملے میں میرے دماغ پر ناجائز طور پر اثر انداز ہو۔ کرشمہ سازی اور اعجاز آفرینی کے ہزار ہا شعبدوں کے بعد بھی میرے انکار کا حصار بدستور غیر مفتوح اور مضبوط ہے لیکن کون ایسا شخص ہے جو زندگی کے مفروضہ یا حقیقی واقعات سے قطع تعلق کر کے زندگی کے متعلق ایک اٹل نظریہ قائم کرلے ہی چنانچہ میں آج تک کئی روحانی عاملین کی غیر مرئی اور فوق العادہ قوت کے بارے میں کوئی رائے نہیں قائم کرسکا۔ اس میں شک نہیں کہ ہندو یوگیوں کے بیشتر کرتب تجزیاتی اور عمیق نگاہوں کی موجودگی میں خود بخود واضح ہو جاتے ہیں۔ بشرطیکہ علت ومعلول کے سلسلہ لامتناہی کو پسِ پشت نہ ڈالدیا جائے مثلاً مردہ چڑیا میں زندگی کی روح پھونک دینا۔ سانس کو روک کر ایک لمبے عرصے تک قبر میں رہنا۔ وغیرہ۔

اس کے علاوہ علم نفسیات خصوصاً ہپناٹزم' اور مسمریزم بہت حد تک اس عقدہ کشائی میں ہمارے ممد ومعاون ثابت ہوسکتے ہیں۔ ہپناٹزم کی بدولت عامل معمول کے اقوال و افعال پر اتنی قدرت کا مالک ہو جاتا ہے کہ وہ اس کی تقریباً ہر بات اور خواہش پر بے چون وچرا عمل پیرا ہو جاتا ہے — تقریباً اس لئے کہ بعض ایسے احکام ہوسکتے ہیں جن کو معمول اس غیر شعوری حالت میں بھی بجالانے سے محترز رہے گا' چنانچہ ایک ماہرِ عمل نے اس بات کا تجربہ بھی کیا۔ وہ اکثر اپنی معمول طالبہ کے ہاتھ میں ایک خالی پستول دیکر اُسے چلانے کے لئے کہتا اور وہ گھوڑے کو دبا دیا کرتی۔ ایک مرتبہ کافی عرصے کی مشق کے بعد اس نے خالی پستول کی بجائے بھرا ہوا پستول دیکر اپنا پہلا حکم دہرایا۔ مگر اب کے طالبہ کی انگلیوں نے عمداً انکار کر دیا۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ انسانی شعور کو کچھ عرصے کیلئے معطل کیا جاسکتا ہے مگر کامل طور پر نہیں۔ غیر شعوری کرتے میں بیٹھا ہوا محتسب انسانی افکار واعمال کا زبردست محافظ ہر حالت میں موجود ہر ناجائز خواہش کو دبانے میں مصروف رہتا ہے۔ مگر مصیبت تو یہ ہے کہ انفرادی بہبود اور فطری سلامت روی کا یہ ان تھک چوکیدار بھی بعض اوقات اونگھتے لگ جاتا ہے۔ اور پھر یہی ترغیبات بدی اور متوحش خواب جنہیں فرائیڈ بجز تکمیلِ خواہشات کے اور کچھ نہیں سمجھتا' اپنی کارگذاری میں مشغول ہو جاتے ہیں

تاہم علم نفسیات بھی جو علوم حاضرہ کا بہت بڑا مددگار ہے زندگی کے رموز کے چہرے سے پردہ اٹھانے سے قاصر رہتا ہے اس راہ میں چند ایسے مقامات پڑتے ہیں جہاں اس کی رسائی محال ہے' ان مستور حقائق کی اتھاہ گہرائیوں میں اس غواص کا گذر بھی ممکن نہیں۔ وہ انسانی کدوکاوش اور احاطۂ ادراک سے بہت پرے ہیں۔

کانن ڈائل اور سر آلیور لاج ایسے معتقد روحانی

عاملین نے ان اسرار کے چہرے سے پردہ کشائی کی کوشش کی اپنے معمولین کو دوسری دنیا کی تحقیق کے لئے بھیجا، روحوں سے باتیں کیں، پیغامات دیئے اور سنے جیسا کہ کہا جاتا ہے مگر سب بے سود، معمولی سی ریاضت اور مشق سے عام انسان بھی مرے ہوئے دوستوں کی روحوں سے موانست قائم کر سکتے ہیں۔ مشرق میں کشف و مراقبہ کوئی نئی چیز نہیں ہے اور بیسیوں لوگوں نے اس قسم کے دعاوی کئے ہیں لیکن ان مشاہدات کا تعلق عشق و رقابت کی طرح شاہد کی ذات تک ہی محدود رہتا ہے۔ شاذ ہی کوئی ایسا انسان ہوگا جس نے رات کی تاریکی اور سکوتِ کامل میں کسی عزیز کی روح کو نہ دیکھا ہو، یا اس سے بات چیت نہ کی ہو اگر ان روحوں کی حیات کے بارے میں ذرا سی دلچسپی کا اظہار کیا جائے تو آپ ہمیشہ انہیں ہونٹوں پر انگلی رکھے ہی پائیں گے۔

ہمارے معلومات کے ذرائع کی بیکسی اور بے چارگی کا اندازہ یہیں سے کیا جا سکتا ہے۔ اس بوالہول کے سامنے ہمیں ہتھیار ڈالتے ہی بنتی ہے، ہمارا صبرِ اطاعت ختم ہو جاتا ہے، بایں ہمہ ہمارے پائے استقلال و استقامت میں لغزش نہیں آتی، ہماری تشنہ کامی جوئے تنک مایہ کی طرح مایوسی و نامرادی کے صحرا میں ختم نہیں ہو جاتی، بعض ایسے لمحات آتے ہیں جن میں بقول ورڈز ورتھ ہم اشیاء کی روحِ سکوت کو عریاں دیکھ لیتے ہیں۔ ہماری زندگی ایک ہمہ گیر اور زندہ قوت میں تحلیل و مدغم ہو جاتی ہے۔ اور ہم اس کائنات کی روح کے اجزا بنکر خود اس کے رازوں میں اک راز بن جاتے ہیں۔ اس مقام پر چون و چرا کا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے: ہماری آنکھ تمام چیزوں کا احاطہ کر سکتی ہے، صرف حاضر کے تھوڑے سے ٹکڑے ہی کو نہیں بلکہ ازل اور ابد دونوں کی عمیق گہرائیوں کو بے پردہ دیکھ لیتی ہے۔ الوہیت ہمارے رگ و ریشہ میں سرایت کر جاتی ہے، دھیرے دھیرے اور یقینی طور پر مگر ظاہر بین آنکھ اسے دیکھنے سے قاصر رہتی ہے۔ ہم گوئٹے اور اقبال کا انسانِ کامل بن جاتے ہیں، نیکی اور بدی دونوں ہماری ہو جاتے ہیں، فاؤسٹ کی طرح، بلکہ یزداں پر بھی قدرت رکھتے ہیں انسان میں اس اوجِ کمال تک پہنچنے کی طاقت موجود ہے لیکن اس کی تشریح محض اس کے اثرات و نتائج کی بدولت ہی ہو سکتی ہے جس طرح عشق و محبت کی، کیونکہ جیسا کہ میں اوپر کہہ چکا ہوں یہ دونوں شاہد کی اپنی ذات سے وابستہ ہیں۔ اگرچہ اوّل الذکر مشاہدہ ہمیں دوسرے سے کہیں زیادہ متحیر و سرگرداں بنا دیتا ہے، یہ ہمارے انکار و نفی کے رباب کی تاروں کو زیادہ کس کر انہیں آواز نکالنے پر مجبور کر دیتا ہے، اس لئے کہ ہمارے ادراک اور ہماری فہم کے لئے یہ ایک کھلا چیلنج ہے، ہمارے متبحر علمی خزائن کے مالک اس کے سامنے انگشت بدنداں ہو کر رہ جاتے ہیں، انگشتریوں کا رقص، رسے پر چلنا اور غیر ذی روح اشیا کے توسط سے جرائم اور مجرموں کی تحقیق و انکشاف اور اس نوع کی بیسیوں امثال وافر تاثری اور اثر آفرینی کی رہینِ منت ہیں۔ اور انہیں محض نظر بندی یا فریبِ نگاہ سمجھا جا سکتا ہے۔ سراب کی طرح، لیکن مندرجہ ذیل واقعہ (یا افسانہ ؟) جو میرے ایک بزرگ نے ایک عینی شاہد سے سنا میرے لئے آج بھی بہت زیادہ دماغی ہیجان و اضطراب کا حامل ہے، عینی شاہد کے متعلق مجھے یقین دلا دیا گیا تھا کہ وہ ایسے بزرگ نہ تھے جو تفریحی طور پر یا عادتاً مجبور ہوں کہ "خانہ زاد" واقعات کو اصلیت کا رنگ دے کر ان کی تشہیر کریں، علاوہ ازیں جب میں یہ بھی سنتا ہوں کہ اس واقعہ

کا تذکرہ اس وقت کے اخبارات میں بھی ہوا اور صاحب مشاہدہ نے بھی اپنے احوال میں اسے اہمیت دی تو فیصلہ کرنا اور بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ میں ابھی تک اس معاملے میں چنداں تحقیق و تدقیق سے کام نہیں لے سکا۔ ممکن ہے قارئین میں سے کوئی صاحب اس پر زیادہ روشنی ڈال سکیں۔ وھو ھٰذا!۔

گذشتہ صدی کے اواخر میں فیض آباد کے گاؤں میں ایک نوخیز عورت کے سفاکانہ قتل سے کھلبلی مچ گئی۔ سب سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہوئی کہ قاتل مفقود الخبر تھا۔ حکام نے محض شک کی بنا پر ایک معصوم نوجوان کو دھر لیا۔ مقدمہ چلا اور سزائے موت کا حکم دیدیا۔ دوسرے دن اسے پھانسی پر لٹکایا جانا تھا۔

نوجوان بیوہ ماں کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اُس کی پُرمحن زندگی کا واحد سہارا، اس کی امیدوں کا مرکز اور خوشیوں کا سرچشمہ۔ اسکی گریہ وزاری، بیقراری و اضطراب کا اندازہ بخوبی کیا جاسکتا ہے خصوصاً جب اُسے اپنے دلبند کی معصومیت پر سو فیصدی تیقن تھا۔ وہ ستم رسیدہ اور مصیبتوں کی ماری اپنے بیٹے کے روحانی پیر مولانا فضل الرحمٰن کے حضور اپنی دردبھری فریاد لے کر پہنچی۔ صحیح معنوں میں پہنچے ہوئے بزرگ اور اللہ والے تھے، انہیں بھی اپنے مرید کی بے گناہی کا یقین تھا، چنانچہ انہوں نے اپنے صاحبزادے میاں احمد سے ڈپٹی کمشنر (؟) کو اس نوجوان کی رہائی اور جان بخشی کے لئے خط لکھنے کے لئے فرمایا۔ علی نکتہ چینی در خارجی دخل اندازی کی نشتر زنی کا کسی صورت بھی متحمل نہیں ہو سکتا، اور نہ ہی اپنے فرائض کی ادائیگی میں بیرونی محرکات کو کسی حالت میں بنظرِ استحسان دیکھتا ہے۔ خط لکھا گیا مگر بے سود دوبارہ پھر ارسال کیا مگر اس کا بھی وہی حشر ہوا یعنی ردی کی ٹوکری

میں پھنکوا دیا گیا۔

انصاف کی اس سنگدلانہ ہٹ پر وہ اللہ کا بندہ مسکرا دیا۔ اور اپنے بیٹے سے کہا کہ اب جو میں کہتا ہوں وہ لکھتے جاؤ، حاکم کی طرف یہ آخری خط تھا جس کا مضمون کچھ اس طرح کا تھا:۔

"اگر تمہیں اپنے محبوس ملزم کی صداقت اور بے گناہی میں شک ہے تو آج رات کو اپنے بنگلے میں ٹھہریئے گا، آدھی رات کے وقت مقتولہ خود حاضر ہو کر تمہیں اپنے قاتل سے آگاہ کریگی۔"

اس کی حقیقت ایک گپ اور پیرانہ خوش فہمی سے زیادہ نہ سہی اور اسے ناممکن الوقوع جانتے ہوئے بھی صاحب بہادر کی دلچسپی حدِ اعتدال سے تجاوز کر گئی، سرِ شام ہی سے انہوں نے پولیس کے آدمی کافی تعداد میں اپنی کوٹھی کے چاروں طرف متعین کر دیئے اور انہیں تاکید کر دی کہ تمام رات پہرہ دیتے رہیں اور کسی جاندار شئے کو اندر جانے کی اجازت نہ دیں۔ یہ ہدایات جاری کر کے وہ ایک آرام کرسی میں دراز ہو کر انتظار کرنے لگے شاید وہ سوچتے ہونگے کہ یہ بوڑھا کس قدر عجیب معلوم ہوتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی کس قدر تیقن کا مالک ہے۔

ایک گھنٹہ گذر گیا جیسے کسی رینگنے والے بھاری بھرکم کیڑے کی پشت پر سفر کر رہا تھا۔ دوسرا پہلے سے بھی کہیں طویل کٹھن اور صبر آزما تھا، یوں جیسے وقت ہمیشہ کے لئے فضا میں معلق ہو گیا ہو۔ تاریکی اور مکمل خاموشی ہر شے پر چھائی ہوئی تھی۔ کوئی آواز بھی کان میں نہ پڑتی تھی۔ ہاں کبھی کبھی دور کوئی کتا بھونک اٹھتا یا گھڑی کی ٹن ٹن سنائی دیتی تھی یہ مرگ آسا خاموشی امن کے لئے سوہانِ روح بن گئی۔ اور انکے بدن میں ایک خاص قسم کے اضمحلال کا احساس ہونے لگا، نیند کے غلبہ کے

باعث آنکھیں خودبخود مندنے لگیں لیکن ہنوز کسی عورت کی آمد کے آثار واضح نہ ہوئے اور وہ آبھی کیسے سکتی تھی کتنی احمقانہ بات تھی قطعاً ناممکن۔ اگر مردے یُوں اپنی قبروں سے اُٹھ اُٹھ کر دنیا کے کاموں انصاف کی مصلحتوں میں دخل انداز ہونا شروع کر دیں تو نظام عالم چوبیس گھنٹوں میں درہم برہم ہو جائے۔ انہی خیالات میں اُنہیں اونگھ آگئی اور اسی وقفہ میں ناممکن بات عالم ممکنات میں جلوہ گر ہوگئی۔ آنکھیں کھلیں، سر اٹھایا تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک عورت دروازے کے پاس کھڑی ہے۔ اسکا لباس سُرخ تھا اور سر سے پاؤں کی طرف خون کی ندیاں بہہ رہی تھیں، انہوں نے سوچا کہ شاید میں سکرات خواب میں یہ سب کچھ دیکھ رہا ہوں مگر اس قسم کے تمام شبہات مادی اشیاء کے لمس سے زائل ہو گئے، وہ عورت آگے بڑھی اور قریباً تین فٹ کے فاصلے پر آکر رُک گئی اور یوں گویا ہوئی :۔

"ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں میں ہی وہ مقتول عورت ہوں جو آپکو اپنے قاتل کا پتہ بتانے کے لئے حاضر ہوئی ہے۔"

وہ بچے کی مانند سننے پر مجبور ہو گئے "تھوڑے سے وقفہ کے بعد وہ کہنے لگی :۔ تمہارے ضلع کے فلاں سب انسپکٹر کو مجھ سے محبت تھی میں بھی اُسے الفت ہی میں جواب دیتی رہی لیکن ایک وقت ایسا آیا کہ اُسے میرے خلوص اور میری وفاکوشی کے متعلق شبہات پیدا ہو گئے، چنانچہ ایک روز اپنے گھر سے جا کر اس نے مجھے قتل کر دیا۔ مجھ کو اور جن ہتھیاروں سے مجھے مار ڈالا تھا اپنی چارپائی کے نیچے زمین میں دبا دیئے۔ اگر اس سے پوچھا جائے تو وہ سب واقعات من وعن کہہ دے گا۔

یہ کہہ کر وہ غائب ہو گئی۔ ابھی بہت سی باتیں تھیں جو وہ اس سے پوچھنا چاہتے تھے۔ لیکن وہ جس طرح آئی تھی اسی طرح چلی بھی گئی۔ اچانک اور غیر متوقع طور پر باہر آکر پہرہ داروں سے پوچھا کہ آیا ان کا پہرہ کامیاب رہا۔ اُن کی بھرائی ہوئی آواز اور سُرخ آنکھیں پہرہ کی کامیابی کی بیّن دلیل تھیں، ایک جوان نے تو کہا انہوں نے بلّی تک کو اندر گھستے نہیں دیکھا تھا۔ اپنے افسر کی بھٹی بھٹی اور وحشتناک آنکھوں کو نہ سمجھ سکے۔ اس سے قبل انہوں نے اپنے افسر کو کبھی بھی اس حالت میں نہ دیکھا تھا، گویا اس وقت وہ کسی بھوت پریت سے دوچار ہو رہے تھے۔ مگر انہیں کیا پتہ کہ حقیقتاً انہیں ایک ایسے ہی مرحلے میں سے گذرنا پڑا ہے۔ اُن کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ جب انہوں نے مذکور سب انسپکٹر کا پتہ اُن سے پوچھا۔ اگر کوئی اس وقت ان سپاہیوں سے پوچھتا تو وہ کہتے یقیناً ان کا افسر دماغی طور پر کمزور معلوم ہوتا ہے بہرکیف وہ ان سے استفسار کی مجال نہ رکھتے تھے اور چپکے سے سب انسپکٹر کے مکان کی طرف ہو لئے۔

پچھلی رات کا وقت تھا، صاحب بہادر کی آمد نے اُن کی کسالت کو ہرن کر دیا تھا۔ نسیم سحر کی طربناک اٹکھیلیوں نے انکے اعضا میں زندگی کی نئی روح پھونک دی۔ اس وقت جبکہ دنیا کی جملہ بدیاں اور جرائم خواب کی آغوش میں رداسے بیفکری میں لپیٹے لپٹائے جزا و سزا کے تصوّرات سے بے خبر تھے یہ لوگ اپنی مشن کی نوعیت اور اسکے نتائج سے بے خبر مستعدی سے قدم اٹھاتے چلے جا رہے تھے۔ آخر انہوں نے سب انسپکٹر کے دروازے پر دستک دی۔ اس نے دیکھا اور دیکھتے ہی تمام حقیقت اس پر آشکار ہو گئی، لیکن انتہائی سکون سے۔ ڈپٹی کمشنر (د) نے اس سے پوچھا۔ آیا وہ مقتول عورت

ے قاتل پر کچھ روشنی ڈال سکتا ہے۔ اسی سکون اور متانت سے
ں نے جواب دیا کہ وہ ان کے سامنے کھڑا ہے یہ کہتے ہوئے
ا موشی کے ساتھ وہ انہیں اپنی خوابگاہ میں لے گیا اور چارپائی
ے نیچے اشارہ کیا۔ حکم ملنے پر زمین کھودی گئی اور خوف و ہراس
ے درمیان سپاہیوں نے دیکھا کہ ایک عورت سرخ کپڑوں میں
بوس منجمد خون سے لتھڑی ہوئی پڑی تھی۔ اس کے پہلو میں
ات بھی تھے۔

"قدرت نے خود کو پورا کر دکھایا۔ انصاف کا تقاضا پورا ہو گیا" یہی کہتے ہیں مگر میرے انکار کے رباب کی تاریں ڈھیلی پڑ رہی ہیں مجھے ڈر ہے کہ کہیں وہ ٹوٹ نہ جائیں۔ نہ جانے علامہ اقبال نے جب یہ شعر لکھا تو اسی قسم کا فوق العادہ واقعہ ان کے پیش نظر تھا ؎

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زور بازو کا
نگاہِ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

جناب فصاحت جنگ جلیلؔ

غزل

ساقیا جام میں جب تک مئے گلفام رہے — کام وہ کر کہ زمانے میں ترا نام رہے
صیدِ دل کے لئے جو تیرِ نظر ہے تاہم — دوش پر زلفِ پریشان بھی لئے دام رہے
سلسلہ آہ و فغاں کا جو پسند آیا تھا — چٹکیاں دل میں وہ لیتے سحر و شام رہے
فصلِ گل آ گئی اب دور میں جام آتا ہے — کہہ دو ہشیار ذرا گردشِ ایام رہے
خوفِ صیاد سے کیا لطف ہو آزادی کا — آج تک قید میں ہم بے قفس و دام رہے
گردشِ جام کا ان پر بھی اثر تھا زاہد — والے تسبیح کے پھرتے سحر و شام رہے
لطفِ صیاد کا پھندا نہ گلے سے نکلا — دام سے چھوٹ کے ہم بندۂ بے دام رہے

میں بھی گردش میں اسی کیلئے اب تک ہوں جلیلؔ
مہر و ماہ جس کی طلب میں سحر و شام رہے

جناب احمد ندیم قاسمی بی۔ اے

جہیز

کارخانے کے پروپرائٹر صاحب کا یہ رویہ اس درجہ ناقابل برداشت ہوگیا تھا۔ کہ وہ مجھے دیکھتے ہی اپنا ہنٹر گھمانے لگتا۔ اس کے نتھنے پھیل جاتے۔ اس کی گول گول چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں خون اتر آتا۔ اس کے کانوں پر اُگے ہوئے بال سوئیوں کی طرح اکڑ جاتے اور جب میں نہایت ادب سے سلام کرکے اُس کے پاس سے گزرتا۔ تو اس کا ہنٹر ہوا کو چیرتا ہوا میرے سر یا پیٹھ پر پڑتا۔ میری آنکھوں کے سامنے سُرخ۔ نیلے۔ پیلے اور سبز دائرے اس تیزی سے گھومنے لگتے کہ میرا دماغ مختل ہو جاتا۔ میں آنکھیں مل کر سر جھٹک کر اِدھر اُدھر دیکھتا۔ پروپرائٹر سامنے موٹر میں سوار ہوتا دکھائی دیتا۔ اور کارخانے کی چاروں منزلوں سے کالے کالے مغموم چہرے مجھے گھورتے۔

آخر میں کیا کرتا۔ کدھر جاتا؟ باپ کوچوان تھا۔ ایک دن ایک سیٹھ جی کی موٹر اس کے یکے سے ٹکرائی۔ اس کا دماغ پھٹ گیا۔ اور وہیں سڑک پر ٹھنڈا ہوگیا۔ ماں تھی۔ ٹوکریاں بنایا کرتی تھی۔ ایک دن کمرے میں سوئی۔ ٹوکریوں میں بھگوان جانے کیسے آگ لگ گئی۔ جاگی۔ تو شعلوں میں گھری ہوئی تھی۔ اِدھر دوڑی۔ اُدھر کودی۔ اور آخر جل کر راکھ ہوگئی۔ میں اُس دن شہر سے باہر سڑک پر روڑی کوٹنے میں مصروف تھا۔ ہم لوگ آدھی رات گئے تک کام کرتے رہتے تھے۔ صبح کو گھر گیا۔ تو صفایا دیکھا۔ قسمت کا مارا اِدھر آنکلا۔ خدا نے ہڈی پسلی مضبوط بنائی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی پروپرائٹر کہنے لگا۔

"کام کروگے کمپنی میں۔؟"

میں اسی مقصد کے لئے تو آیا تھا۔ جھٹ جواب دیا۔

"جی ہاں"

"اچھا۔ تو پندرہ روپے ماہوار پر تمہیں ملازم رکھا جاتا ہے۔ میرے گھر کا سودا سودا لے آیا کرو۔"

یہی سہی!... میرے دل نے کہا... یہی سہی۔ ہم نے مجسٹریٹ تو تھوڑا ہی بننا ہے۔ یہ دوزخ تو بھر لیں گے۔ بس!... یہی سہی۔ انسان جو پیدا ہوا تو..... تو کس لئے؟... میرا تجربہ شاہد ہے کہ صرف پیٹ بھرنے کے لئے!... آخر کبھی آپ نے بھی سوچا ہے کہ یہ سب ہما ہمی۔ یہ ہنگامہ۔ یہ زور شور۔ یہ رفتار۔ یہ پرواز۔ یہ کیا ہے؟... پیٹ بھرنے کے دھندے۔ حکومتیں؟...... پیٹ کے لئے۔ شاعری؟... مصوری؟... بت تراشی؟... پیٹ کے لئے..... صرف پیٹ کے لئے اور اگر پیٹ نہ ہوتا تو دنیا ایک مزار ہوتی... ایک ٹھنڈی ہوئی قبر جس میں صرف اُلّو اور جھینگر ہی بولتے ہیں۔

ایک کالا کلوٹا شخص میرے ہمراہ کر دیا گیا۔ میں سیٹھ جی کی کوٹھی پر پہنچا۔ پھول جیسے بچے کلیوں کے نرم نرم فرش پر کشتی کھیل رہے تھے۔

"یہ ہے تمہارا نوکر" کالے آدمی نے دور سے چھیکتے ہوئے کہا۔

لڑکے میری طرف متوجہ ہوئے بغیر ایک دوسرے کو گرانے میں مصروف رہے۔ اس شخص نے مجھے کوٹھی کے تمام امور اور دیگر تمام لوازمات سے آگاہ کیا۔ صبح بازار سے سودا لانا۔ بچوں کو کھلانا سیٹھ جی کی لڑکی کو اسکول لے جانا اور لے آنا۔ رات کو کوٹھی کے اردگرد دلمہ وہلمہ کے بعد چکر کاٹنا اور صاحب کے کتے کو شام کے وقت نہلانا۔ یہ میرے فرائض تھے۔ آخری فرض ذرا سخت تھا۔ کتوں سے مجھے بہت نفرت ہے۔ گیلی گیلی ناک والے خوشامدی جانور مجھے نہیں بھاتے لیکن پیٹ! .... انتڑیوں نے ایک بل کھایا اور مجھے سب کچھ منظور تھا۔

میں سمٹا سمٹا ایک بنچ پر جا بیٹھا۔ کالا آدمی اُن لڑکوں کو اٹھا کر لایا۔ اُن کی عمریں تدریجاً ۴-۱۰-۸- اور ۶ برس کی ہوں گی۔ سب سے چھوٹا کہنے لگا۔

"منورما کو تمہیں اسکول لے جاؤ گے؟"

"جی ہاں میں ہی لے جاؤں گا" میں نے بچے کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ بچے نے میرے ہاتھ پر زور سے چٹکی لی اور سر کے بالوں پر ہاتھ پھیرتا اور منہ بسورتا ہوا بولا: "میرے بال خراب کر دیئے بدمعاش"!.... دوسرے تمام بچے ہنسنے لگے۔

"کون نیا امیدوار ہے؟" ایک باریک سی آواز نے مجھے چونکا کر دیا۔

"یہ حضور" کالے آدمی نے دو قدم پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔

میں کھڑا ہو گیا۔ پیچھے مڑ کر دیکھا۔ تو سولہ سترہ برس کی ایک بہت ہی خوبصورت لڑکی شوخ شوخ نظروں سے مجھے گھور رہی تھی۔

"نمستے" اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"نمستے" میں نے اپنے آپ کو برف کے بے تہ سمندر میں غرق ہوتے ہوئے محسوس کیا۔

"تم ہمیں اسکول چھوڑ آیا کرو گے۔ سمجھے؟"

"سمجھا حضور" میں نے اپنی آنکھیں فرش پر گاڑتے ہوئے کہا۔

"کیا سمجھے؟"

"کہ آپ کو روزانہ اسکول چھوڑ آیا کروں گا"

"ہا ہا ہا" ایک باریک گردآلود پر قہقہے کے بعد وہ قدرے آگے بڑھی اور کہنے لگی: "آدمی تو ذہین معلوم ہوتا ہے۔ مگر...." اور پھر اُس نے میری مونچھیں پکڑ لیں "انہیں کٹا ڈالو اور یہ داڑھی! واہ!.... جوان آدمی ہو۔ ابھی سے بوڑھوں کا بھیس؟... سر کے بال ترشواؤ۔ منہ دھوؤ۔ سمجھے بغلیظ آدمی ہمیں نہیں پسند آتے"

اس طرح رہنا پڑے گا؟... داڑھی مونچھ منڈوا کر روزانہ منہ دھونا پڑے گا؟ یہ تو قیامت ہے! سردیوں کا موسم اگر نمونیہ ہو گیا پھر؟ منہ کی صفائی دھری رہ جائے گی مگر سیٹھ جی کی لڑکی تھی۔ نہ مانتا تو بارہ پتر ل جاتے!

میں رات کو سویا تو خیالات کا دریا امڈ پڑا بجلی کی سی تیزی سے تصورات کے قافلے میری قوت احساس کو مس کرتے بھگوان جانے کدھر گم ہوتے جا رہے تھے میں ایک چیز سوچتا تھا۔ اور پھر کچھ اور۔ ... اور پھر کچھ اور!..... مجھے اپنی پریشانی کی وجہ نہ معلوم ہو سکی میں اپنے مذبذب تصورات کو ایک نقطے پر نہ لا سکا۔ بچوں سے تو خیر جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ مگر اس لڑکی سے نہ نبھ سکے گی۔ یہ شوخیوں کی پتلی شرارتوں کی کان!... نہ جان نہ پہچان اور آتے ہی میری مونچھوں سے لٹک گئی۔ انہیں ترشوا دو۔ انہیں کٹوا دو! آخر کیوں؟....

تمہیں کیا ہو... چاہے میری داڑھی ناف تک لٹک آئے اور مونچھیں گردن تک پھیل جائیں! مردوں کے کام الگ۔ عورتوں کے الگ۔ وہ اگر میں اُسے کہہ دیتا۔ کہ تم اپنے سر کے بال کٹوا دو۔ تو پھر .... پھر مجھے یہاں کون رہنے دیتا۔

صبح ہوئی۔ بچے باہر نکلے۔ نہاتے ہوتے سر میں تیل پڑا ہوا ہاتھوں میں پھول بیں انہیں سبزے پر لے گیا۔ ایک سے کشتی کی — دوسرے کو گدگدی۔ تیسرے کو پیٹھ پر سوار کیا۔ چوتھے کے آگے ریچھ بنکر ناچا... اتنا اچھا نوکر! . . . . بچوں کی آنکھیں کہہ رہی تھیں: وہ سب مجھ سے چمٹ گئے۔ میری بلائیں لیں۔ سب سے چھوٹا بڑھ کر جونہی میرے رخسار کا بوسہ لینے لگا تو اس کی چیخ نکل گئی۔ روتا ہوا بھاگا۔ اور ایک ڈھیلا اٹھا کر میرے سر پر دے مارا۔

"کیوں کیوں؟ کیا بات ہے ننھے شیام"

"میرے ہونٹوں میں کانٹے کیوں چبھو دیئے تم نے؟" اس نے ماتھے پر شکن لانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"اوہو۔ یہ داڑھی کمبخت!... داڑھی کے بال چبھے تمہیں؟" اور جب تک میں نے نائی سے داڑھی منڈا نہ لی اور مونچھیں کٹوا نہ لیں ننھے شیام کی تسلی نہ ہوئی۔

آٹھ بجے سودا لانا تھا۔ منورما ہاتھ میں ٹوکری لٹکائے برآمدے میں نمودار ہوئی۔

"کدھر گیا رامو؟"

"ادھر ہوں حضور" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"یہ لے ٹوکری۔ چار آنے کی سبزی لے آؤ۔ اور باقی بارہ آنے کے سیب۔"

میں نے ٹوکری ہاتھ میں لی۔ روپیہ جیب میں ڈالا اور چل پڑا۔ رستے میں سوچتا گیا۔ یہ لڑکی مجھے گھور گھور کر کیوں دیکھ رہی تھی لڑکے بھی تو اندر ہی تھے۔ ان میں سے کوئی ایک ٹوکری دینے باہر چلا آتا۔ سولہ سال کی نوخیز کنواری لڑکی کو باہر بھیجنے میں کیا راز ہے اس ضعف کو تو حتی الوسع مردوں سے دور رہنا چاہئے .... اور مجھے بات بات پر سوچنے کی عادت کیوں پڑ رہی ہے! ہر چیز کی تہ تک پہنچنے کے لئے جی کیوں بےتاب رہتا ہے.. ایسے خیالات پہلے کبھی میرے دماغ میں نہ آتے تھے میں سڑکوں پر روڑی کوٹنے والا جاہل مزدور۔ میں یہ باتیں کہاں سے سیکھ گیا..... مجھے تعجب ہو رہا تھا۔

سودا لے کر میں کوٹھی پر آیا۔ تو منورما منتظر کھڑی تھی۔ میں نے کہا۔ بھگوان۔ یہ لڑکی ہر وقت میرے سامنے کیوں آتی ہے!... اور پھر جوان لڑکی... میں نے ٹوکری دی تو ہنستے ہوئے کہنے لگی "بڑے خوبصورت معلوم ہوتے ہو۔ دیکھو نا۔ مونچھیں انسان کا چہرہ بگاڑ دیتی ہیں!"

نو بجے منورما باہر آئی۔ اور بولی۔

"یہ لو تھیلا۔ اور چلو۔"

"رستہ جانتی ہوں گی آپ؟"

"ہاں میں تمہیں بتاتی چلوں گی۔"

میں نے تھیلا لے لیا۔ وہ آگے آگے چل پڑی۔ فیروزی رنگ کا گرم دوپٹہ اس کے سر سے کھسک اُس کی گردن پر آگیا تھا۔ اور اُس کے کالے کالے بال سورج کی زرد زرد کرنوں میں دمک رہے تھے اُس کے پتلے پتلے گلابی کانوں میں سونے کا ایک ایک بندا لٹک رہا تھا۔ اُس کی گردن بلور کی طرح سفید تھی۔ اس کے ہاتھوں کے پوٹے شفق کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ اُس کی اونچی ایڑی

ولی سیاہ مگر گالوں میں اُس کا پتلا مرمریں پاؤں بہت بھلا معلوم ہوتا تھا۔ چلتے چلتے کہنے لگی۔

"تمہارا گھر کدھر ہے؟"

"میں بے گھر سا آدمی ہوں حضور!"

"خانہ بدوش؟"

"جو کہہ لیجیے حضور"

اس نے مڑ کر میری طرف دیکھا۔ نازک نازک ہونٹوں پر میٹھی میٹھی مسکراہٹ جھلملا رہی تھی۔ لبوں کے کنارے پر ایک تل بھی مسکرا رہا تھا!

"ماں باپ کدھر ہیں؟" اُس نے پھر پوچھا۔

"سب مر گئے حضور"

"سب مر گئے؟ ... اور تم اکیلے ہو؟"

"جی ہاں حضور"

"حضور کی کیا رٹ لگا رکھی ہے۔ مجھے حضور نہ کہا کرو" منورما نے قدرے غصے سے کہا۔

"پھر کیا کہا کروں گا حض ...." میں رُک گیا۔ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اور پھر دوپٹہ سنبھالتی ایک گلی میں مڑ گئی۔

"راستہ تو دیکھتے جاتے ہو نا؟"

مجھے اب ہوش آیا کہ ہم تو بہت سی گلیاں اور موڑ عبور کر کے یہاں پہنچے ہیں۔ میں منورما میں اس قدر گم ہو گیا تھا کہ اپنے آپ کی بھی خبر نہ رہی تھی۔ رستہ کون دیکھتا۔ میرے یہ کرتوت تو اچھے نہیں۔ میں ایک ملازم۔ غلام .... وہ ایک سیٹھ کی لڑکی! اور پھر اپنے آقا کی لڑکی سے اُنس! .... میں کانپ اُٹھا۔

"جی ہاں۔ مگر .... شاید .... "

"اچھا تو تاجی کی کوٹھی کا پتہ پوچھتے چلے جانا۔ سمجھے؟ اور پورے چار بجے یہاں پہنچ جانا۔ سمجھے؟ پورے چار بجے۔ چار بجے کے بعد آئے۔ تو سزا ملے گی۔"

میں نے منورما کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرائی اور تھیلا میرے ہاتھ سے چھین لیا۔ "یہ ہے ہمارا اسکول" اس نے ایک لمبے چوڑے گیٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ میں نے اُسے سلام کیا۔ اور سیٹھ جی کی کوٹھی کا پتہ پوچھتا اپنی کوٹھری میں آ پہنچا۔

لڑکوں کا اسکول تو کوٹھی کے سامنے ہی تھا۔ میں آیا تو دو تین لڑکوں کے ہمراہ اسکول کے دالان میں کھیل رہے تھے۔ کھانا خوب جی بھر کر کھایا۔ اور تمام دن ایک بنچ پر سویا رہا۔ آنکھ کھلی تو ساڑھے تین بجے کا وقت تھا۔ بھاگا بھاگا اسکول پہنچا۔ چھٹی ہونے میں پانچ منٹ باقی تھے۔ اطمینان کی سانس لی۔ آخر گھنٹی بجی۔ منورما دوسری ہم عمر لڑکیوں کے ساتھ چہلیں کرتی ہوئی باہر آئی۔

"وہ ہے ہمارا نیا ملازم" اس نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"پہلوان ہے" ایک چنچل سی لڑکی نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ سب لڑکیاں کھلکھلا کر ہنسنے لگیں۔ منورما کے قہقہے ان سب سے اونچے تھے۔ میں نے شرم سے آنکھیں فرش پر گاڑ لیں۔ دل پکارا یہ تو پہلا دن ہے۔ اور اگر روز یہی حالت ہوئی۔ تو مجھے مجبوراً ملازمت سے علیحدہ ہونا پڑے گا۔ میں نے منورما سے تھیلا لے لیا۔

"کیا کرتے رہے ہو تمام دن؟" منورما نے رومال سے منہ صاف کرتے ہوئے کہا۔

وہ مجھے کڑی کڑی نگاہوں سے دیکھنے لگی۔

"حضور کیوں کہتے ہو مجھے؟"

"میں بھول گیا تھا"... اور واقعی میں بھول گیا تھا۔

"تمہیں اُن سیبوں کا حصہ ملا ہے جو آج لائے تھے تم؟"

"نہیں جی"۔

"میں تمہیں اپنا حصہ دے دوں گی۔ وہ سمجھتے ہیں ملازم آدمی نہیں ہوتے"۔

کتنی رحمدل لڑکی ہے؟... میرے دماغ میں ایک عجیب سی گونج پیدا ہو گئی... کتنی خدا ترس کتنی بھلی مانس لڑکی!

"تمہیں کونسا کمرہ ملا ہے؟" اُس نے پوچھا۔

"اصطبل کے ساتھ جی"۔

"اصطبل کے ساتھ؟ بو آئے گی تمہیں! میں تمہیں باغیچے والا کمرہ دے دوں گی، مالی اُدھر چلا جائے گا"۔

مالی کو بو نہ آئے گی کیا!... مگر... مگر میرے جی میں آئی۔ کہ منورما کے پاؤں چوم لوں۔ میں تو بہشت میں پہنچ گیا تھا۔ از حد آرام و آسائش! ایسا لذیذ کھانا! اتنے میٹھے سیب!... ایسا اچھا کمرہ! اور پھر اتنی اچھی منورما!... میں تو یہیں رہوں گا!... میں تو یہاں سے کبھی نہ جاؤں گا!

کوٹھی میں پہنچ کر میں ابھی بنچ پر بیٹھا ہی تھا۔ کہ چار سیب میری گود میں آگرے۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو منورما ایک سیب کھا رہی تھی۔

"یہ سیب تمہارا حصہ ہے میرے لئے یہی کافی ہے"۔

"آپ... آپ یہ کیا کرتی ہیں!" میں نے مسرت و حیرت

"تمہیں کیا؟... میں جو کہوں وہ تمہیں ماننا پڑے گا"۔ اور یہ کہہ کر وہ مسکراتی ہوئی ڈرائنگ روم میں چلی گئی۔

"سیب کھا رہے ہو؟" لیڈی صاحبہ نے پوچھا۔

"جی ہاں حضور"

"کھانے والے اور بہت ہیں یہاں۔ کام کرنا ہوگا۔ سمجھے؟ پیٹ کے پجاری یہاں ایک منٹ نہیں ٹھہر سکتے"۔ یہ کہتے ہوئے وہ اندر چلے گئے۔ شوفر میری طرف دیکھ کر مسکرایا۔ اور موٹر گیرج میں لے جانے لگا۔ تین سیب میرے ہاتھ میں تھے۔ کہ منورما کے ہاتھ نے میرے کاندھے کو مس کیا۔

"پتا جی ناراض ہو رہے تھے؟"

"جی ہاں" میں نے سیبوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"کہیں رکھ دو رات کو کھا لینا"۔

"بہت اچھا"

"مگر دیکھنا۔ پتا جی ہمیشہ ہی ایسا کرتے ہیں۔ جی برا نہ کیا کرو"

"نہیں جی"

منورما کے اِن الفاظ نے میرے دل کو ایک آہنی گرفت سے چھٹکارا دلایا۔ میں نے اپنی کوٹھڑی میں جا کر سیب بستر میں چھپا دیئے۔ واپس آیا۔ بچوں کو باغ میں لے گیا۔ پھر کتے کو نہلایا...

کتنا غلیظ کام تھا! شام کا کھانا کھا کر سب بچے یا ہر وقت مرے آئے اور میرے اِرد گرد اکٹھے ہو گئے۔ میں انہیں رات کے دس بجے تک دیوؤں اور پریوں کی کہانیاں سناتا رہا۔ اور جب آخری کہانی ختم ہوئی۔ تو میں نے برآمدے کے ستون کے ساتھ ایک پتلا سا سایہ حرکت کرتے ہوئے دیکھا!

لئے ہوئے آتی۔ اور سودا لے آنے کے بعد پھر اسی طرح تھیلا اٹھائے میں منورما کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔

"پہلے بھی ہم نے کئی نوکر رکھے تھے۔ مگر تم سب سے اچھے ہو" اس نے کہا۔

"آپ کی کرپا ہے جی"

"تمہیں کوئی تکلیف ہو تو مجھے بتایا کرو"

"سب طرح کا آرام ہے جی۔ ایک کتا نہلانے کی ڈیوٹی کسی اور کو دے دی جائے تو..."

"تو یہ کام میں کروں گی۔!"

میرا سر چکرانے لگا۔ منورما میرے لئے کتا نہلائے گی! یہ بھی ہو سکتا ہے کیا؟ اتنے اچھے لوگ بھی دنیا میں بستے ہیں!

"نہیں جی" میں نے جھجکتے ہوئے کہا "آپ یہ کیا کہہ رہی ہیں۔ میں اتنا کمینہ نہیں کہ....."

"مگر میں جو کہوں گی وہ تمہیں ماننا پڑے گا"

.... اور اس دن شام کو منورما نے ہی کتا نہلایا۔ مجھے اس رات تن بدن کا ہوش نہ تھا۔ میری روح ایک نشے میں محو تھی۔ میری رگ رگ پر ایک لطیف سا جھپو دطاری تھا۔ میرے سامنے منورما کا مسکراتا ہوا چہرہ آتا اور وہیں ٹھہرا رہتا۔ پھر کتے کے لبوں کے گھوڑے کے ہنہنانے یا بوڑھے مالی کے کھانسنے سے یہ طلسم ٹوٹ جاتا تھا۔ مجھے منورما ایک دیوی معلوم ہوتی تھی جس کے بس میں یہ ساری کائنات ہے۔ جو تاروں پر چھائی ہوئی ہے۔ آسمان میں تیر رہی ہے۔ زمین پر منڈلا رہی ہے۔ جس کی مسکراہٹوں سے پھول جھڑتے ہیں۔ جس کی شوخ شوخ آنکھوں سے ٹھنڈی ٹھنڈی

کسبِ نور کرتے ہیں۔ جو آسمان کے سیاہ سینے پر تھرک رہی ہے۔ منورما!.... منورما!... منورما!... میرا وجود جل رہا تھا۔ میرے دل کی جگہ میری روح دھڑک رہی تھی!

صبح ہوئی اور وہی روزمرہ کا کام شروع ہو گیا۔

منورما میرے لئے روزانہ پھل لے آتی۔ مٹھائی کی جھولیاں بھر لاتی۔ اپنا جیب خرچ مجھے دے دیتی۔ میں ہزار انکار کرتا۔ لاکھ پہلو تہی کرتا۔ لیکن وہ میرا پیچھا نہ چھوڑتی۔ کئی دفعہ میں نے چاہا کہ اسے اتنا یاد نہ کیا کروں۔ سو ایک اتوار کو میں تمام دن اس کے سامنے نہ آیا۔ رات کو سو ہی رہا تھا کہ دروازے پر ٹک ٹک کی آئی۔

"کون؟" میں نے لحاف سے نکلتے ہوئے کہا۔

ٹک ٹک ٹک!... بھگوان۔ یہ کیا اسرار ہے! میں نے دیا جلایا۔ دروازہ کھولا تو منورما!... روتی ہوئی منورما... اپنی ہزاروں شوخیوں کو آنسوؤں کے بار تلے دبائے ہوئے سسکتی ہوئی میرے کمرے میں داخل ہوئی۔

"آپ...." میں نے جھجکتے ہوئے کہا "آپ جیسی لڑکی ایک ملازم کے کمرے میں... رات کو؟"

"میرے جیسی لڑکی؟" اس نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔ اس کے آنسو بہتے بہتے رک گئے۔ اس کے ہونٹ کھل گئے۔

"تمہارا مطلب کیا ہے اس سے" اس نے کانپتے ہوئے کہا۔

"آپ جیسی جوان لڑکی.... رات کو..."

منورما پارے کی طرح تڑپی اور بجلی کی طرح مجھ پر گری۔ میرے دونوں کندھے پکڑ لئے۔ اور مجھے غیر معمولی قوت سے جھنجھوڑ کر

میں تھرا اٹھا۔ وہ بھی تو میرے ساتھ محبت کرتی تھی۔ میں نے کیا گناہ کیا کہ کھلی بات کر دی۔

"تم مجھے صرف ایک جوان لڑکی سمجھتے ہو رامو؟"

میں خاموش تھا۔

"اور میں تمہیں اپنا بڑا بھائی خیال کرتی ہوں!"

بھائی!... میں نے چاہا اپنا سر دیوار سے پھوڑ لوں۔ اپنا سینہ پھاڑ کر رکھ دوں۔ اپنے آپ کو قیمہ کر دوں۔ اپنے آپ کو چبا لوں! میرا پسینہ ایک ننھی سی ندی کی صورت میں فرش پہ بہنے لگا۔

"رامو!" منورما نے مجھے چارپائی پر بٹھاتے ہوئے کہا۔

"جی" میں نے ضبط کرتے ہوئے کہا میں چیخنا چاہتا تھا۔

میں اپنا کلیجہ چیر کر اپنا دل کھول کر منورما کے سامنے پھینک دینا چاہتا تھا۔ اس معصوم لڑکی کو میں نے دھوکے میں رکھا۔ وہ مجھے بھائی سمجھ کر محبت کرتی رہی۔ بھولی لڑکی... اور میں اسے صرف جوان لڑکی جان کر پیار کرتا رہا۔

"تم مجھے کیا سمجھتے تھے؟" منورما نے پوچھا۔

میں خاموش رہا۔ میں کیا جواب دیتا میں ڈرتا تھا کہ اگر کچھ کہوں تو میرا دل میری سانسوں میں آگ نہ لگا دے۔

"اب کیا سمجھتے ہو؟"

میں اس سوال کا منتظر تھا۔ کانپ کر بولا۔

"بہن"

"بھائی رامو"

"بہن منورما"

ہم نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑ دیں۔ ہم

تعلقات کس قدر پاکیزہ ہو گئے تھے۔ کتنے مقدس اور خوشگوار!

میں نے کہا "منورما بہن آسمان ہے تو بھائی فرش پر۔ ہم رتبہ ہوتے تو بات بھی تھی!" "منورما بولی" رامو بھائی۔ اونچ نیچ کا خیال تک میرے دل میں نہیں آتا۔ بھائی بہن کبھی ایسی باتیں بھی سوچتے ہیں؟ میں تمہاری چھوٹی بہن ہوں۔ میں تمہیں کبھی اپنی آنکھوں سے دور نہ ہونے دوں گی"

"اور میں بھی تمہارے ہی چرنوں میں دم توڑ دوں گا میری بہن"

ہم کافی دیر خاموش رہے۔ آخر میں نے کہا۔

"منورما... بہن تم اب جاؤ۔ دیکھو نا۔ تمہارے پتاجی جاگ اٹھے تو تمہیں برا بھلا کہیں گے"

"کتنے دور رامو بھائی۔ میں کوئی ایسی راہ سوچ رہی ہوں۔ کہ تم ہمارے گھر میں ملازم نہ رہو۔ گھر کے ایک فرد گنے جاؤ"

"ایسا بھی کبھی ہو سکتا ہے؟"

"ہو سکتا ہے۔ میں پتاجی سے کہوں گی" یہ کہہ کر وہ چلی گئی

وہ رات میری زندگی کی مقدس ترین رات تھی۔ کبھی کبھی خیال کرتا ہوں کہ ایشور نے مجھ پر دیا کی۔ تو صرف اس رات کو دیکھنے پر کیونکہ اس رات میں نے اپنے دل کو ایک عظیم الشان کروٹ بدلنے پر لمحہ بھر میں آمادہ کر لیا تھا؟

صبح اٹھا تو سیٹھ صاحب باہر نکلے۔

"تم نے منورما کو کیا سکھایا تھا؟" انہوں نے ڈپٹ کر پوچھا۔

"میں نے کیا سکھانا تھا حضور! میں نے سماجت سے

"تم کیا راجہ بن کر رہنا چاہتے ہو یہاں۔ ملازم نہیں رہ سکتے تو جاؤ۔ راہ کھلی ہے۔ مجھے بد دماغ اور مغرور آدمی پسند نہیں۔ سمجھے!"

اب مجھے معلوم ہوا۔ کہ منورما نے حسب وعدہ میری سفارش کی تھی۔ اور اس کا اُلٹا اثر پڑا تھا۔ اس کے بعد سیٹھ صاحب جب باہر نکلتے تو مجھے ڈپٹتے۔ جھڑکتے۔ میرے ہر کام پر نکتہ چینی کرتے۔ میری اچھی بات سے نقص نکالتے۔ "رات کو گھوڑے بیچ کر سوئے تھے کیا؟" "کتے کے بال کدھر جا رہے ہیں؟" "بچوں کو سست بنا دیا ہے" "سودا لانے کا ڈھب نہیں!".....

مگر منورما بہن نے میرے دُکھے دل پر مرہم رکھا۔ اور کچھ دنوں کے بعد مجھے سیٹھ صاحب کی گالیوں میں لذت محسوس ہونے لگی۔ جب میں نے منورما کے قدموں ہی میں مرنا ہے تو جی بُرا کرنے سے کیا فائدہ؟

....اور چھ ماہ بعد مجھے معلوم ہوا۔ کہ لڑکیاں پرایا مال ہوتی ہیں۔ منورما کی شادی کی افواہ اڑی۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ میں نے ایک رات منورما کو کہا۔

"بہن سنا ہے تم چلی جاؤ گی۔"

"کدھر؟" اُس نے حیران ہو کر پوچھا۔

"اپنے دولہا کے گھر" میں نے بے دھڑک جواب دیا۔

وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ وہ خواب سے اچانک بیدار کر دی گئی ہے۔ وہ روتی روتی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ منورما مجھے بدستور ملتی رہی۔ مگر خاموش رہنے یا رونے کے سوا اُس کا کوئی کام

رامو بھائی۔"

"او کیا یہاں رہو نگا بہن؟"

وہ بہت خوش ہوئی۔ اور میرا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگی: "او کیا تم نے سمجھا تھا۔ کہ میں تمہیں چھوڑ کر چلی جاؤں گی۔ بھولے بھیا!"

"نہیں مجھے معلوم تھا کہ تم مجھے بھولو گی نہیں۔"

اچانک ایک ہنٹر میرے سر پر اس تیزی سے گرا۔ کہ میرا دماغ جھنا گیا۔ مڑ کر دیکھا تو سیٹھ صاحب کھڑے ہیں۔ پھر تو ہنٹر تڑا تڑ میرے سر پر پڑنے لگے میں خاموش کھڑا رہا۔ مگر سیٹھ صاحب بھی تب تک نہ تھکے جب تک کہ میں لڑکھڑا کر گر نہ پڑا۔ منورما ان سے لپٹ گئی۔

"پتا جی۔ اس بیچارے نے کیا قصور کیا ہے؟"

"قطامۂ" انہوں نے منورما کے ماتھے پر ہنٹر مارتے ہوئے کہا۔

"دور ہو!"

وہ چیختی ہوئی گر پڑی۔ تمام گھر والے باہر دوڑے آئے منورما کی ماں نے سیٹھ صاحب سے ہنٹر چھین لیا۔ انہوں نے مجھے تین چار ٹھوکریں لگائیں اور چلے گئے۔ منورما کی چیخوں کی آواز دیر تک میرے کانوں میں آتی رہی۔ ننھا شیام دوڑا آیا۔ اور مجھے کہنے لگا۔

"دیکھو رامو! تمہیں پتا جی نے مارا ہے؟" اس نے ایک ننھا سا چاقو نکالتے ہوئے کہا۔ "آج میں ان کی موٹر کو پنکچر کر دوں گا دیکھنا!" اور وہ دوڑا دوڑا موٹر کے پاس گیا۔ اور ٹائر میں چاقو گھسیڑنے کی کوشش کرنے لگا۔ شوفر دیکھتا رہا۔ سیٹھ صاحب کو بلایا گیا وہ بھاگے بھاگے آئے اور شیام کو بازو سے پکڑ کر کہا۔

"کیا کر رہے ہو شیام۔ پاگل تو نہیں ہو گئے ہو؟"

"تم نے رامو کو کیوں مارا ہے پتا جی؟" شیام نے غصے سے چاقو

"اچھا!" سیٹھ صاحب نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا: "بچے کو بھی سکھاتے پھرتے ہو؟ بڑے کمینے ہو۔ بڑے بدمعاش ہو۔ ادھر آؤ آج سے تم نوکری سے برخاست کئے جاتے ہو۔ اور اگر پھر کبھی اس طرف قصد کیا۔ تو جان سے مار ڈالے جاؤ گے؟"

میں تو خیر یہ سن کر اپنی کوٹھڑی کی طرف مڑا۔ مگر شیام یہ سن کر چیخنے لگا۔ "نہیں پتاجی۔ نہیں۔ رامو یہیں رہے گا۔ پتاجی رامو کو نہ جانے دو۔ میں تمہاری موٹر کا شیشہ توڑ دوں گا۔ میں تمہارا چپی مار دوں گا۔ پتاجی یہیں رہنے دو اسے۔"

مگر سیٹھ صاحب شیام کو بازو سے کھینچتے اندر چلے گئے میں بستر باندھ رہا تھا۔ کہ سیٹھ جی نظر آئے اور کہنے لگے: "بچوں کی سفارش سے تمہیں بالکل بے روزگار نہیں کرتا۔ لیکن تم گھر میں بھی نہیں رہ سکتے۔ کارخانے میں کام کرنا ہوگا۔ کل میرے ساتھ چلنا۔"

میرے جوڑ جوڑ میں درد ہو رہا تھا۔ تمام رات نیند نہ آئی۔ اُدھر رات منورما بھی نہ ملی۔ پھر کارخانے کی ملازمت اور منورما سے ہمیشہ کے لئے جدائی۔۔ میں نے چاہا کہ باہر نکل کر موٹر سے پٹرول نکال کر اپنے سر پر انڈیل دوں اور آگ لگا دوں۔ مگر دل میں امید کی کرن تھرتھرائی۔ اور میں نے کروٹیں بدلتے صبح کی۔

دوسرے دن مجھے کارخانہ میں لوہا پگھلانے کے کام پر مقرر کیا گیا۔ صبح سات بجے سے رات کے نو بجے تک میں وہیں کھڑا رہتا تھا جب سب مزدور کام ختم کر کے اپنی اپنی کوٹھڑیوں میں چلے جاتے تھے تو میرا کام بدستور جاری رہتا تھا۔ میرے لئے تو یہ ملازمت قید با مشقت سے کچھ زیادہ ہی تھی۔ سیٹھ ہمیشہ ہنٹر سے میری تواضع کرتا تھا۔ مغرور انسان۔۔ میرا قصور ہی کیا تھا۔ کہ میرے زخم روز ادھیڑے کئے جاتے

رخصت کر دی جائے گی۔ میں اُس رات کام ختم کر کے چھپتا ہوا سیٹھ صاحب کی کوٹھی کے پاس پہنچا۔ گیٹ سے گزر کر پودوں کی آڑ میں برآمدے تک پہنچا۔ کتا ایک گملے کی اوٹ میں بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی بھونکنا چاہا۔ میں نے آہستہ سے کہا: "ٹیپی!" اور وہ دُم ہلاتا کئی بل کھاتا میرے قدموں میں آ کر لیٹ گیا۔ آہستہ آہستہ کھسکتا دیواروں سے چمٹتا میں ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔ ایک چھوٹا سا کمرہ عبور کر کے میں نے ایک دروازے کے سبز شیشوں میں جھانکا۔ منورما میز پر بیٹھی ایک کاغذ دیکھ رہی تھی۔ میں نے آہستہ آہستہ دروازے پر ناخن مارا۔ وہ چونک اٹھی۔ پھر قلم میز پر رکھ کر بھاگی۔ اور نہایت خاموشی سے دروازہ کھولا۔ مجھے دیکھتے ہوئے اُس کی آنکھوں میں مسرت کے آنسو تیر گئے۔

"رامو بھائی" اس نے دبی آواز میں کہا۔ اور میرا ہاتھ چوم لیا۔

"میری بہن" میں نے سرگوشی کے انداز میں جواب دیا۔

وہ مجھے اندر لے گئی۔ دروازہ بند کر دیا۔ کھڑکیوں پر قرمزی پردے ڈال دیئے۔ پھر آکر میرے پاس بیٹھ گئی۔ اور رونے لگی۔ میں نے کہا۔

"کل چلی جاؤ گی بہن؟"

"ہاں" اس نے نہایت آہستہ سے کہا۔

"میں بھی چلا آؤں تمہارے ساتھ؟"

وہ اور رونے لگی۔ اور بولی "پتاجی نے ادھر بھی کہلا دیا ہے کہ رامو نامی کوئی شخص آئے تو اُسے مار کر بھگا دینا۔"

اُس دن مجھے محسوس ہوا کہ ایشور غریبوں کو بھول جاتا ہے ہم کس طرح جدا ہوتے! بہت ہی محبت کرنے والے بھائی بہن

کل کر اپنی کارخانے والی کوٹھڑی میں آگیا۔ منورما چلی گئی۔ اور میں نے
ہیہ کر لیا کہ ملازمت چھوڑ کر کسی جنگل میں جا بسوں گا۔ جہاں تصوّر
ی تصوّر میں بہن منورما کے مسکراتے ہوئے پیکر کو پوجوں گا۔ اور بھگوان
لے آگے پرارتھنا کروں گا۔ کہ مجھے اس پوجن کا صلا ایک ایسی نیند
لے جو جاودانی ہو!

دوسرے دن صبح چھ بجے میں شہر کی ایک گلی سے گزر رہا
تھا۔ کہ منورما کی ایک ہم جماعت لڑکی مجھے ملی۔

"رامو تمہارا نام ہے؟" اُس نے پوچھا۔

"جی ہاں۔"

"منورما کو جانتے ہو؟"

"آپ اُن کی سہیلی ہیں کیا؟"

"ہاں۔ یہ خط آیا ہے۔ تمہارے نام۔ میری معرفت۔ پڑھ لو"

"مگر میں تو نہیں پڑھ سکتا" میں نے نیلے رنگ کے لفافے کو
اُلیوں میں غیر ارادی طور پر دباتے ہوئے کہا۔

"لو میں پڑھ دوں" لڑکی نے لفافہ کھولا اور پڑھنے لگی "رامو
بھائی"... وہ رک گئی۔ بھائی کا لفظ تعجب سے اُس نے زیر لب
ہرایا۔ میری طرف دیکھا اور پھر پڑھنے لگی "رامو بھائی۔ مایوس
ہو۔ ایشور ہماری آشاؤں کا پالن کرے گا۔ تمہاری بہن منورما۔"

میں نے سمجھا۔ کہ درد و الم کا گھٹا ٹوپ اندھیرا اچانک ایک
بروکن روشنی میں تبدیل ہوگیا ہے۔ میرے دل کا بار ہلکا ہوگیا۔
ں نے اُس لڑکی کا شکریہ ادا کیا۔ اور کارخانے میں آیا۔ اُس دن
ب جی لگا کر کام کیا۔ سیٹھ صاحب میری تندہی دیکھ کر خوش
ہے۔ مگر ایک ہنٹر ضرور رسید کیا۔ اور کہا "اتنی تیزی بھی ضروری

مارتا۔ تو مجھے محسوس نہ ہوتا جب میری واحد مسرت کا ڈگمگاتا ہوا ستون
پھر سے قائم ہوگیا تھا۔ تو ان ذرا ذرا سی باتوں کے خوف سے حاصل؟

دوسرے دن میں کارخانے میں گیا۔ تو سیٹھ صاحب ملے کہنے
لگے۔ "رامو۔ اِدھر آؤ۔ یہ لو پندرہ روپے تمہاری تنخواہ۔ اور پانچ روپے
یہ تمہارا کرایہ ہے۔ سیدھے منورما کے پاس چلے جاؤ۔ اس نے تمہیں
بلایا ہے۔ سمجھے؟"

مجھے سیٹھ صاحب کی باتوں کا یقین ہی نہیں آتا تھا۔ میں نے
کچھ کہنا چاہا۔ مگر وہ موٹر پر سوار ہو چکے تھے۔ ایشور تو غریبوں کا پالنہارا ہے
میں نے کہا۔ اپنی کوٹھڑی میں آکر بستر سنبھالا اور گاڑی پر سوار
ہوگیا۔ میں چاہتا تھا یہ گاڑی اڑتی جائے اور پلک جھپکنے میں منورما
کے پاس پہنچا دے۔ سٹیشنوں پر ٹھہرتی تھی۔ تو جی چاہتا تھا۔ اسے
دھکیل کر آگے کر دوں۔ ڈرائیور کو اپنے پندرہ روپے دے کر جلد از
جلد منزل مقصود تک پہنچوں۔ آخر منورما کا شہر آیا۔ دیوانوں کی طرح
سڑکوں پر بھاگتا پتہ پوچھتا منورما کی کوٹھی پر پہنچا۔ برآمدے میں ایک
خوبصورت نوجوان بیٹھا تھا۔ میں نے ہانپتے ہوئے سلام کیا۔

"تم کون ہو؟"

"رامو" میں نے کہا۔

"منورما" نوجوان نے کرسی پر سے اُٹھتے ہوئے کہا۔ "اِدھر
آؤ منورما۔ اِدھر آؤ۔ تمہارا جہیز آیا ہے!!!" منورما ایک کمرے سے
نکلی اور بھاگ کر مجھ سے لپٹ گئی "میرے بھائی۔ میرے رامو۔
میرے اچھے بھیا"... نوجوان ہنستا رہا۔ شاید اُسے سب حقیقت
حال معلوم تھی۔ اُس نے مجھے کوچ پر بٹھاتے ہوئے کہا "رامو بھائی
تمہیں معلوم ہے کہ تمہاری بہن نے تمہیں کس طریقے سے بلایا۔"

"اس نے اپنے پتاجی کو اس مضمون کا خط لکھا "پتاجی آپ مجھے دیا ہوا جہیز واپس لے لیں۔ اور میرا بھائی راموُ مجھے دے دیں۔ میں اُسے ہی اپنا جہیز سمجھ لوں گی۔..." میں نے مسرت سے منورما کی طرف دیکھا۔ اور پوچھا "میرا کام کیا ہوگا یہاں؟"

"تمہارا کام ہوگا ہمارے سامنے موجود رہنا بس" منورما نے میری پیٹھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "یہاں سگّے وُگّے نہیں ہوتے راموبھائی۔ اور جہیز تو دلہنوں کو بہت پیارا ہوتا ہے!" نوجوان نے ہنستے ہوئے کہا میں نے سمجھا میں آسمانوں کی طرف پرواز کر رہا ہوں!

مخمس بر غزل حضرت خواجہ میر درد

مولانا امجد حیدرآبادی

میرے لئے للّٰہ ملا کیجئے اُس سے — جو کچھ وہ کہے مجھ کو سنا کیجئے اُس سے
اچھا کہ بُرا، ذکر مرا کیجئے اُس سے — یارو، مرا شکوہ ہی کیا کیجئے اُس سے
مذکور کسی طرح سے جا کیجئے اُس سے

خاموشی سے، جان اور بھی گھبراتی ہے جی میں — تسکین کسی طرح نہیں پاتی ہے جی میں
چُپ اُس کی تو اور آگ لگا جاتی ہے جی میں — جوں جوں وہ رُکے ہے تو یہی آتی ہے جی میں
پھر چھیڑئیے اور باتیں سنا کیجئے اُس سے

روٹھے ہوئے ظاہر میں ہم اُس بزم سے آئے — پھر دیکھ رہے ہیں، کہ کوئی آکے بلائے
کیا کیجئے افسوس، کہ مجبور ہیں جی سے — سو مرتبہ یوں ٹھیر چکی اب سے نہ ملیے
یوں بھی تو نہیں بنتی ہے کیا کیجئے اس سے

تم چارہ گرِ عاشقِ بیمار ہو صاحب! — تم مرہمِ زخمِ دلِ افگار ہو صاحب!
صورت سے مری کس لئے بیزار ہو صاحب! — بیزار اگر مجھ سے ہو، مختار ہو صاحب!
دل جس سے ملے اپنا ملا کیجئے اس سے

اے حضرتِ امجدؔ نہ چلیں آپ کی گھاتیں — اس بازیِ الفت میں ہوئیں سینکڑوں ماتیں
اب آپ ہیں اور آپ کی تنہائی کی راتیں — ہم کہتے نہ تھے دردؔ میاں چھوڑ دیہ باتیں!
پائی نہ سزا؟ اور وفا کیجئے اس سے

جناب راز چاندپوری

نوائے راز

اے جانِ سخن کوئی ترانہ
باطرزِ لطیف و شاعرانہ

ہے مشرقِ مہرِ حسن و الفت
اپنے ساقی کا آستانہ

اللہ اللہ، وہ چشمِ میگوں
ہر بات ہے اس کی عارفانہ

دنیا ہے وفا نواز بیشک
کتنا دلکش ہے یہ فسانہ

پیمانِ وفا قبول لیکن
میں نے دیکھا ہے اک زمانہ

کیا بات ہے شیخِ حق نگر کی
اپنے فن میں ہے وہ یگانہ

پیتا ہے دو آتشہ شب و روز
کھاتا ہے مگر غمِ زمانہ

اے مستِ مئے خودی خبردار
یہ ہے میرا شراب خانہ

ہوتی ہے یہاں خدا پرستی
باحسنِ خلوص و عاشقانہ

اب کون بتائے بے خبر کو
تفصیلِ رموزِ شاعرانہ

بے کیف ہے شعرِ راز توبہ
کتنا خوش فہم ہے زمانہ

سالنامہ ادب لطیف

رایوں کے اقتباسات

جناب ایم اسلم صاحب لکھتے ہیں:۔ سالنامے شائع کرنے کی ایک رسم سی ہوگئی ہے۔ اس سال بھی پنجاب کے اکثر ماہوں نے اپنے سالنامے شائع کئے ہیں۔ اگر مضامین کی بھرمار اور رنگا رنگ کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تصویریں ہی سالنامے کی کامیابی کا معیار تصور ہوں۔ تو پھر سبھی اچھے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ کسی کو خوش قسمتی سے اچھے مضمون نگار مل گئے اور کوئی بارہ مہینے اپنی ہی ڈگر پر چلتا رہا۔

مگر میرے نقطۂ نظر سے وہ سالنامہ سب سے کامیاب ہے جو اردو اور ہندی کی موجودہ آویزش کے دوران میں اردو کی بہترین طریق پر خدمت کرے۔ اور اردو کی بہترین خدمت یہی ہے .... کہ بہترین مضامین شائع کئے جائیں اس لحاظ سے امسال ادب لطیف کا سالنامہ نہایت ممتاز درجہ رکھتا ہے۔ سرورق کی زیبائش کارپردازان ادب لطیف کے حسن مذاق کی آئینہ دار ہے۔ قریباً تمام مضامین نظم و نثر بہت اچھے ہیں۔ "دو آتشہ" ایک پرلطف نظم ہے۔ "دنیا کی اہم سیاسی تحریکات" بہت مفید مضمون ہے۔ اس زمانے میں جب سرمایہ دار اور مزدور کی چپقلش ایک اہم صورت اختیار کر رہی ہے عوام الناس کو ایسے مضامین سے ضرور بہرہ اندوز ہونا چاہیئے۔ "یاد رفتہ" ایک کیف زا نظم ہے اور اس کا وہ بند جس کا پہلا مصرع "جب کھجوروں کے تلے خاموش نخلستان کے پاس" ہے کسی کے جذبات کی ایک خوشنما تصویر ہے۔ "ایک خاوند کی ضرورت" بہت پرلطف ہے۔ اور "تنقید ادب" ایک بہت عالمانہ مضمون ہے۔ رشید صاحب نے واقعی "لطافتِ ذوق" سے اس پر بحث کی ہے۔ تاج صاحب کی "انار سبھا" نے لفظوں ہی لفظوں میں ہی ناٹک کا مزا دے دیا ہے۔ اور "صحرا نورد کا پانچواں افسانہ" تو جیسا کچھ دلکش اور تحیر انگیز ہے۔ سو ہے لیکن میرزا ادیب کا "خط" جنہیں ادب لطیف کی بزم میں شامل ہونے والوں کا میر کارواں سمجھنا چاہیئے اصل افسانے سے کچھ کم رومان خیز نہیں۔ بہرحال ادب لطیف کا یہ سالنامہ ہر لحاظ سے قابل تعریف ہے۔

جناب احمد ندیم قاسمی بی۔ اے تحریر فرماتے ہیں:۔ اردو رسائل کے ضخیم سالنامے دیکھ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے لیکن یہ سالنامے — طوفان کی طرح آتے ہیں۔ اور اپنا کوئی دوامی نقش چھوڑے بغیر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ دنیا انہیں بہت جلد بھول جاتی ہے۔ سالنامہ ادب لطیف اس طوفان سے الگ کھڑا ہے ظاہری صورت انگ دیدہ زیب اور اندرونی حالت الگ کیف افروز۔ "تمثیل دیکھ کر" انسان بے اختیار ہو کر اسے اٹھاتا ہے اور دیر تک مصور کے موقلم کی سحر آفرینیوں کو دیکھ دیکھ کر حیران ہوتا رہتا ہے۔ مصور کا قلم کن قدر سیانہ جدتوں اور باریکیوں کو لے کر چلا اور چند خطوط کے امتزاج سے کیسا عجیب و غریب مرقع پیش کر دیا۔ اسمٰعیل صاحب اس کامیابی پر مستحق مبارکباد ہیں۔

نقاد یہ کا انتخاب نہایت اعلےٰ ہے۔ چودھری برکت علی اور میرزا ادیب صاحبان نے نہایت دور اندیشی سے یہ روش اختیار کی

ہے کہ تصویروں کی تعداد کے بجائے اُن کی خوبیوں کو سامنے رکھنا چاہیئے۔ اور سو کے بجائے دس ایسی تصاویر پیش کرنی چاہئیں جن کے خطوط کا ایک حقیر سا بل بھی رنگوں کے بے ہنگم اجتماع پر بھاری ہو، کاش دوسرے ایڈیٹر صاحبان بھی یہی روش اختیار کریں۔ کیونکہ دُنیا اب بہت سیانی ہوگئی ہے اور "تعداد" کے دھوکے میں نہیں آسکتی،

ترتیب ایک ایسا مشکل کام ہے کہ اچھے اچھے ماہرین نفسیات اس مرحلے میں اپنے قدم آسانی سے آگے نہیں بڑھا سکتے۔ انسان کے دل کی گہرائیوں کا واقف ہونا بڑی چیز ہے۔ اور ترتیب کے لئے یہ صفت بدرجہ اتم ضروری ہے، ادب لطیف کے کارپردازوں نے سالنامہ اس طرح ترتیب دیا ہے کہ قہقہے کے بعد آنسو، آنسوؤں کے بعد ہلکی سی مسکراہٹ، مسکراہٹ کے بعد جوش، جوش کے بعد سکون اور سکون کے بعد پھر قہقہہ . . . . . یہ سلسلہ آخری صفحہ تک قائم رہتا ہے۔ اور ایڈیٹر صاحبان کی یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ رسالے کے مالک کا نقطۂ نظر مالی نہیں بلکہ وہ خالص ادبی خدمت کرنا چاہتے ہیں۔ بھرتی کا کوئی مضمون نہیں۔ ایک غزل میں ایک شعر تقطیع سے گرتا ہے لیکن ایک ہزار میں ایک غلطی معاف کی جاسکتی ہے

آج کل علمی مضامین کی ادب اردو کو از حد ضرورت ہے، صرف افسانوں اور غزلوں کے انبار سے رسالہ معیاری نہیں کہا جاسکتا۔ حکیم عیش امروہی، حضرت طارق، حضرت شبلی، بیخود صاحب موہانی، عطاء اللہ صاحب پالوی، رشید صاحب، تاج صاحب کے مضامین بہت بلند اور بہت کامیاب ہیں۔ اگر ان چند مضامین ہی کا مجموعہ شائع کر دیا جاتا تو سالنامہ کی کامیابی پر کوئی شک نہ ہوسکتا تھا۔

میرزا ادیب صاحب کا پانچواں خط ان کے سب خطوط میں ایک شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے، دیگر تمام صفات کے ہوتے ہوئے اس افسانہ کا پلاٹ اس درجہ عجیب ہے کہ بے اختیار اُن کی جدت نظر اور دور رس تصور کی داد دینی پڑتی ہے۔

میں کارپردازان رسالہ کو اس عظیم الشان کامیابی پر مبارک باد پیش کرتا ہوں؛

حضرت ساغر جعفری لکھتے ہیں ۔ مجھے سالنامہ ادب لطیف پر تنقیدی نظر ڈالنے کے لئے اس کے صوری و معنوی دونوں پہلوؤں پر غور کرنا ہے۔ صوری یا ظاہری پہلو کے تحت میں کتابت و طباعت تصاویر، سائز اور ضخامت وغیرہ کا ذکر آتا ہے، ادب لطیف کی کتابت و طباعت ابتداہی سے پاکیزہ اور دلآویز رہی ہے مگر چہ پچھلے سال چند پرچوں میں کتابت و طباعت کچھ پست ہوگئی تھی مگر سالنامہ سے پھر پاکیزہ ہوگئی ہے۔ آج کل ادبی رسائل میں تصاویر کی اشاعت کچھ فرض سا ہوگیا ہے۔ ادب لطیف کے سالنامہ میں صرف تین رنگین تصاویر دی گئی ہیں۔ مگر دلآویز اور فنی نقطۂ نظر سے کامیاب ہیں۔ حیا سوز اور مطبوعہ تصاویر کی اشاعت سے ان کا شائع نہ کرنا ہی بہتر ہے۔ سالنامہ ادب لطیف کا ٹائیٹل پیج اس مرتبہ نہایت شاندار اور خوبصورت بنایا گیا ہے۔ اس سال کے کسی اردو رسالہ کے سالنامہ کا ٹائیٹل پیج اس قدر جاذب نظر اور دلآویز نہیں ہے۔ سالنامہ کے سائز پر مجھے کچھ اعتراض ہے۔ سائز کے بڑھ جانے سے سالنامہ سال کے دوسرے پرچوں کے ساتھ یکجا مجلد نہیں ہوسکتا۔ اگر سائز عام پرچوں جتنا رکھا جائے تو ضخامت بھی زیادہ ہوسکتی ہے۔ اور رسالہ کا مکمل فائل ایک جلد میں آسکتا ہے۔ فہرست میں بھی کچھ اغلاط واقع ہوئی ہیں۔ ایک نظم صفحہ ۱۹۱ سالنامہ میں شامل نہیں مگر فہرست میں درج ہے۔

اور آخر کے تین منظومات سالنامہ میں درج ہیں مگر فہرست سے خارج۔

اب مجھے رسالہ کے معنوی یا باطنی پہلو یعنی اس کے مضامین پر کچھ روشنی ڈالنا مقصود ہے۔ سالنامہ کے مضامین میں حتی الوسع جامعیت پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ وقت انتخاب افسانوں۔ ڈراموں۔ علمی و ادبی مضامین۔ نظموں اور غزلوں غرضیکہ ادب کے تمام شعبوں کا خیال رکھا گیا ہے۔ افسانوں میں حاجی لق لق کا مختصر سا مزاحیہ افسانہ "لیڈر تکبس کا اغوا" نہایت دلچسپ ہے۔ حاجی صاحب مزاحیہ مضامین لکھنے میں کافی دسترس رکھتے ہیں۔ نظامی صاحب کا افسانہ "پریم کا جادو" ان کے حسن انتخاب اور مترجمانہ قابلیت کا بدرجہ اتم اظہار کر رہا ہے۔ ترجمہ میں اصل کی تمام خوبیاں نظر آتی ہیں اور افسانہ طویل ہونے کے باوجود بھی کافی دلچسپ ہے۔ محترمہ مسز عبدالقادر کے "رومان" پر اسرار اور حیرت خیز واقعات سے پر ہوتے ہیں۔ آپ کا افسانہ "قاتل روح" بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ اگرچہ عبارت اتنی رنگین و دلکش نہیں جتنی کہ ہونی چاہئے۔ حضرت ایم اسلم کو معاشرتی افسانے لکھنے میں ید طولیٰ حاصل ہے۔ آپ کے افسانوں کے کردار حیات انسانی کی جیتی جاگتی تصویریں نظر آتی ہیں۔ سالنامہ میں آپ کا مشہور افسانہ "قسمت" کافی دلچسپ ہے۔ سالنامہ کا سب سے طویل افسانہ خود ایڈیٹر ادب لطیف کی دماغی کاوش کا نتیجہ ہے۔ صحرا نورد کا پانچواں خط یا "چاہ بابل" میں رومانوی عنصر بہت حد تک غالب ہے۔ حیرت انگیز اور دردناک واقعات کے ساتھ ساتھ محبت کے نرم و نازک جذبات کو نہایت دلکش پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے۔ میرزا صاحب کے ان خطوط کا سلسلہ بہت کامیاب ثابت ہوا ہے۔ آپ کی تحریر نہایت شگفتہ۔ رومان خیز اور تشبیہات سے بھری ہوتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر ان خطوط کو کتابی صورت میں شائع کیا جائے تو اسے بہت عزت و وقعت کی نگاہوں سے دیکھا جائیگا۔

"نالہ سول" "سماج زادی" اور "اخبار والا گھر" مشاہدے کی کامیاب دلیلیں ہیں۔ اور ان میں حیات انسانی کے گھناؤنے پہلو کو اچھی طرح واضح کیا گیا ہے۔ "مشورہ" "بھوک" اور "مریض" اوسط درجہ کے افسانے ہیں۔ "زہرہ" اور "افکار زنداں" دو عنقریب شائع ہونے والی کتابوں کے چند اوراق ہیں امید ہے کہ دقیقی لحاظ سے دونوں تصانیف کام کی چیزیں ثابت ہوں گی۔

سالنامہ میں صرف دو ڈرامے شائع ہوتے ہیں خلیل صاحب کا ڈراما "جرح" جو ترجمہ ہے اپنے مزاحیہ عنصر کے لحاظ سے نہایت دلچسپ ہے۔ اور پڑھنے کے قابل۔ دوسرا ڈراما "مرحوم" مجھے صاحبزادہ محمد عمر کی اپنی تصنیف معلوم نہیں ہوتا۔ کیونکہ یہی ڈراما "صاحبزادیاں" کے عنوان سے رسالہ ساقی دہلی بابت جون ۱۹۳۵ء میں سید احسن ایم۔ اے کی طرف سے شائع ہو چکا ہے۔ اگرچہ دونوں احباب نے افراد کے نام اپنی مرضی کے مطابق ہندوستانی رکھے ہیں۔ تاہم ڈرامے کا پلاٹ بالکل ایک ہے میرے خیال میں ہر دو حضرات نے اسے ترجمہ کیا ہے۔ اور معمولی رد و بدل کے بعد اپنی تصنیف ظاہر کیا ہے۔

افسانوں اور ڈراموں کے بعد علمی۔ ادبی اور تنقیدی مضامین کا حصہ ہے۔ سالنامہ میں اس قسم کے سات مضامین درج ہیں "اسرار خودی" اور "نظم تحقیق" "قوت تنقید" کے نہایت اعلےٰ نمونے ہیں۔ اول الذکر مضمون میں حکیم عیش امروہی نے علامہ اقبال کے فلسفہ خودی پر مختصر الفاظ میں نہایت عالمانہ تبصرہ کیا ہے۔ عبدالرشید صاحب کے تنقیدی مضامین ادب لطیف میں اکثر شائع ہوتے رہتے ہیں "تنقید ادب" بھی ضرور پڑھنے کے لائق مضمون ہے۔ اس میں ایک صحیح نقاد کے فرائض کو اچھی طرح واضح کیا گیا ہے "فلسفہ خندہ" ایک ٹھوس علمی مضمون ہے۔ دنیا کی اہم سیاسی تحریکات ایک

نظر ڈالتے ہیں۔ سب سے پہلے ہندوستان کے محبوب راہنما پنڈت جواہر لال نہرو کا پیغام تنویر کے نام ہے۔ گذارش کے تحت میں محترمہ سحر صاحبہ نے رسالے کے مقاصد کو سپرد قلم کیا ہے۔ اور ملک کی تحریکات جدیدہ پر بھی نظر ڈالی ہے "بندے ماترم" کے قومی ترانہ ہونے میں جو دلائل آپ نے دیئے ہیں۔ وہ ہماری نظر میں بہت حد تک کمزور ہیں۔ ماحول کے تغیر کے ساتھ "چیز" کو بدل جانا چاہیئے۔ بندے ماترم صرف ایک فرقے کے لئے لکھا گیا تھا۔ اس لئے متعصبانہ جذبات کا آئینہ دار ہے۔ اُسے قومی ترانہ بنانا بہت بڑی غلطی ہے۔ اور پھر یہ اردو میں بھی نہیں۔ . . قومی گیت کو قومی زبان میں ہونا چاہیئے۔ دنیا سے آرزو غزل ہے۔ . . حیرت ہے نسوانی رسالے میں اور پھر اس رسالے میں جس کا مقصد اتنا بلند ہے۔ ایک غزل کی اشاعت کیا معنی رکھتی ہے؟ جشن بہار جوش کی مطبوعہ نظم ہے . . . ! ہماری حالت محترمہ بلقیس کا مفید مقالہ ہے قربانی محترمہ مدیرہ کا نہایت عبرت آموز افسانہ ہے۔ سحر صاحبہ اس دبستان کی اتباع کرتی ہیں جو "افادیت" کو ہر وقت پیش نظر رکھتا ہے پابندی وقت ایک ایسا مضمون ہے' جسے بچوں کے رسالے میں شائع ہونا چاہیئے تھا۔ دیسی صنعتیں اچھا مضمون ہے۔ دیوی ساغر سیمابی کی بہت اچھی نظم ہے۔ راہب صحرا نشین' انگریزی کے مشہور شاعر گولڈ سمتھ کے ویکار اف ویکفیلڈ کے ایک باب کا ترجمہ ہے۔ ترجمہ نہایت کامیاب اور دلآ ویز ہے۔ مقام مسرت ہے کہ اب عورتیں بھی ترجمانہ فرائض اتنی خوش اسلوبی سے ادا کر سکتی ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ مادر وطن مسلسل مضمون ہے اور بے حد کامیاب۔

بہرحال "تنویر" نسوانی صحافت میں ایک خوشگوار انقلاب' ایک مفید تغیر ہے۔ خواتین کو اس خوشگوار انقلاب' اس مفید تغیر کا بخندہ پیشانی [illegible] کا ثبوت دیں، قابل قدر اضافہ ثابت ہوگا۔ میں ادارہ ادب لطیف کو اس کی کامیابی پر مبارکباد دیتا ہوں۔

سالنامہ ادب لطیف لاہور حسب معمول امسال بھی کارپردازان ادب لطیف نے علم و ادب اور شعر و سخن کا ایک نادر مجموعہ سالنامہ کے نام سے ارباب ذوق کے سامنے پیش کیا ہے جس میں علوم و فنون کے بعض ایسے جواہر یکجا کر دیئے ہیں جو درجنوں کتب خانوں کی خاک چھاننے کے بعد کہیں دستیاب ہو سکتے ہیں۔ سالنامہ ادب لطیف کے اکثر و بیشتر مندرجات نثر و نظم معیاری اور زندہ جاوید ہیں۔ خاصکر مولانا روش صدیقی کی نظم "جناب" ایک لاثانی شاہکار ہے۔ تصاویر کی تعداد نہایت محدود ہے۔ مگر ان کے انتخاب میں مذاق سلیم کے بلند ترین مدارج کامیابی سے ملحوظ رکھے گئے ہیں۔ خاصکر جناب قادری کی مو قلم کا نقش دلربا میر کارون۔ واقعیت کا جواب آئینہ ہے' جاپانی دوشیزہ' دیہاتی دوشیزہ' اور بہار کی دیوی بھی اپنے اپنے رنگ میں خوب ہیں۔ سالنامے کا سرورق مشہور آرٹسٹ محمد اسمٰعیل کے کمال فن کا نمونہ ہے۔ جو بجائے خود ایک بے مثل مرقع ہے۔ مجموعی حیثیت سے ادب لطیف کا سالنامہ ۳۷ء کا ایک بہترین علمی کارنامہ ہے۔ (ہفتہ وار ہمدرد "سرینگر")

بہی خواہان ادب لطیف توجہ فرمائیں۔ کارپردازان ادب لطیف "سود و زیاں" سے یکسر بے نیاز ہو کر اپنا فرض انجام دے رہے ہیں اگر آپ چاہتے ہیں کہ ادب لطیف کی صوری و معنوی خوبیوں میں ہمیشہ اضافہ ہوتا رہے تو آپ اسکی توسیع اشاعت میں حصہ لیں۔ ادب لطیف کی اعانت کا یہ بہترین ذریعہ ہے مزید برآں ہر قسم کی کتب مکتبہ اردو سے طلب فرمائیں۔

تنویر (زیرادارت محترمہ سحر صاحبہ کتابت وطباعت معمولی، صفحات ۸۰۔ شروع میں انڈین سوشل کانفرنس صدر محترم کی تصویر بھی ہے۔
سالانہ چندہ تین روپے آٹھ آنے فی پرچہ چار آنے۔ مقام اشاعت تھرڈ سانکلی سٹریٹ بمبئی ۸)

ہندوستان میں نسوانی صحافت نے کافی ترقی کی ہے۔ اور کر رہی ہے۔ اردو میں متعدد ایسے بلند پایہ نسوانی رسالے ہیں جن کا مطالعہ یقیناً مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ مگر ایسا کوئی بھی رسالہ نہیں تھا جس کے مطالعہ کی ہم خاص سفارش کر سکیں۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ کہ "تنویر" بہت بلند اور پاکیزہ مقاصد لے کر شائع ہوا ہے۔ اس کا سب سے بڑا مقصد کیا ہے؟ سنئے:۔

"عورتوں نے یہ محسوس کر لیا ہے کہ قوم، وطن، مذہب، انسانیت، اخلاق ان تمام پر تباہی آ گئی ہے۔ اور نسل انسانی جو ترقی کی بجائے تنزل کی طرف جا رہی ہے یہ ہماری ہی غفلت، کمزوری اور بے توجہی کا نتیجہ ہے۔ موجودہ غلام نسلیں ہماری ہی نیم مردہ گود کی پلی ہوئی، موجودہ ظالم اقوام بھی ہماری ہی جہالت اور نالائقی کا مظاہرہ کر رہی ہیں۔ غرضکہ دنیا میں جو طوفان بدتمیزی برپا ہے اس کی واحد ذمہ دار عورت ہی ہے۔ ان کی اصلاح بھی ہمارے ہی ہاتھوں سے ہونا چاہیئے۔ کم از کم ہم اتنا تو کریں کہ اس وقت جو نسلیں ہماری آغوش میں ہیں انہیں صحیح تربیت و تعلیم سے مزین کر کے انسانیت کی توقیر، اخلاق کی تزئین یا مذہب کی تحقیق اور ملت کی تعمیر کے قابل بنا دیں۔"

اگر تنویر کا فی الواقع یہی بلند مقصد ہے۔ تو ہمیں اس کی ہمت افزائی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرنا چاہیئے۔ اب ہم مندرجات تنویر پر سرسری

نظر فرماتے ہیں۔ سب سے پہلے ہندوستان کے محبوب رہنما پنڈت جواہر لال نہرو کا پیغام تنویر کے نام ہے۔ گذارش کے تحت میں محترمہ سحر صاحبہ نے رسالے کے مقاصد کو سپرد قلم کیا ہے۔ اور ملک کی تحریکات جدیدہ پر بھی نظر ڈالی ہے "بندے ماترم" کے قومی ترانہ ہونے میں جو دلائل آپ نے دیئے ہیں۔ وہ ہماری نظر میں بہت حد تک کمزور ہیں۔ ماحول کے تغیر کے ساتھ "چیز" کو بدل جانا چاہیئے "بندے ماترم" صرف ایک فرقے کے لیے لکھا گیا تھا۔ اس لیے متعصبانہ جذبات کا آئینہ دار ہے۔ اُسے قومی ترانا بنانا بہت بڑی غلطی ہے۔ اور پھر یہ اردو میں بھی نہیں۔۔۔ قومی گیت کو قومی زبان میں ہونا چاہیئے "دنیائے آرزو" غزل ہے۔۔۔ حیرت ہے نسوانی رسالے میں اور پھر اس رسالے میں جس کا مقصد اتنا بلند ہے۔ ایک غزل کی اشاعت کیا معنی رکھتی ہے؟ "حسن بیمار" جوش کی مطبوعہ نظم ہے۔۔۔! "ہماری حالت" محترمہ بلقیس کا مفید مقالہ ہے "قربانی" محترمہ مدیرہ کا نہایت عبرت آموز افسانہ ہے۔ سحر صاحبہ اس دبستان کی اتباع کرتی ہیں جو "افادیت" کو ہر وقت پیش نظر رکھتا ہے "پابندی وقت" ایک ایسا مضمون ہے، جسے بچوں کے رسالے میں شائع ہونا چاہیئے تھا۔ "دیسی نغمے" بھی اچھا مضمون ہے۔ "دیوی" ساغر سیمابی کی بہت اچھی نظم ہے۔ "مآب صحرا نشین" انگریزی کے مشہور شاعر گولڈ سمتھ کے "ویکار آف ویکفیلڈ" کے ایک باب کا ترجمہ ہے۔ ترجمہ نہایت کامیاب اور دلآویز ہے۔ مقام مسرت ہے کہ اب عورتیں بھی مترجمانہ فرائض اتنی خوش اسلوبی سے ادا کر سکتی ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ "دردِ وطن" مسلسل مضمون ہے اور بے حد کامیاب۔

بہرحال "تنویر" نسوانی صحافت میں ایک خوشگوار انقلاب ایک مفید تغیر ہے۔ خواتین کو اس خوشگوار انقلاب اس مفید تغیر کا بخندہ پیشانی استقبال کرنا چاہیئے۔ اس کے ساتھ ہی ہم سحر صاحبہ کی خدمت میں التماس کرینگے کہ، مدیرانہ مقالات میں "انداز تخاطب" میں زیادہ سنجیدگی کا ثبوت دیں اور رسالے کو رطب و یابس سے پاک کرنیکی ہر ممکن کوشش کریں۔ کتابت و طباعت کی طرف تو خاص توجہ دینی چاہیے۔ اگر ان نقائص کو دُور کر دیا جائے، تو "تنویر" نسوانی صحافت میں فی الواقع ایک عدیم النظیر رسالہ ہے۔

بہرحال تنویر بحیثیت مجموعی کافی کامیاب ہے۔ امید ہے سحر صاحبہ اُسے بہتر سے بہتر کامیاب سے کامیاب بنانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کریں گی۔

(م - ل)

سہیلی، سالگرہ و دستکاری نمبر زیرادارت زہرا بتول و رقیہ بیگم رقیہ، کتابت و طباعت اعلیٰ۔ صفحات دوسو، سالانہ چندہ چار روپے سالگرہ کی قیمت ایک روپیہ مقام اشاعت اسدی پارک لاہور)

سہیلی پرتع و مقتدر نسوانی مجلہ ہے جو کئی سال سے نہایت کامیابی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔ اس سال بھی حسب معمول اس کا سالگرہ نمبر شائع ہوا ہے۔ جو گذشتہ خاص نمبروں کی مانند کامیاب ہے مضامین و تصاویر کے انتخاب میں خاص محنت سے کام لیا گیا ہے۔ قریباً تمام مضامین اپنے موضوعات کے لحاظ سے مفید ہیں۔ ہمارے محترم دوست جناب سراج الدین ظفر بی اے کی نظم "ماں" نہایت دلآویز و وجد آفرین ہے "مسلم خواتین کی جنگی خدمات" مفید مقالہ ہے۔ "شعرائے جاہلیت کے کلام، امثال اور علوم مشرقیہ میں عورت کا حصہ" خاص طور پر بہت مفید ہیں۔ ان کے علاوہ ترانہ وحدت، بدنصیب ملکہ، نوید حیات، ساس بہو، تاریخ اسلام میں عورت کی حیثیت، نادرہ، آنکھ آئینہ فروا وہ مضامین نظم و نثر ہیں جن کا مطالعہ از بس ضروری ہے۔

بیگم خیال مراد آبادی کا افسانہ گو مختصر مگر نہایت دلچسپ و دلآویز ہے ہم یہ تو جانتے تھے کہ خیال صاحب اردو کے بلند پایہ ادیب ہیں۔ مگر یہ پہلی دفعہ معلوم ہوا کہ ان کی زوجہ محترمہ بھی اعلیٰ درجے کی ادیبہ ہیں۔

رسالے میں متعدد رنگین و سادہ تصاویر بھی ہیں . . . . . . رسالوں میں عام طور پر مضمون نگاروں کے فوٹو دیئے جاتے ہیں۔ مگر سہیلی میں یہ جدت کی گئی ہے کہ پرچے میں مضمون نگاروں کے بچوں اور بچیوں کے فوٹو دیئے گئے ہیں۔!

الغرض سہیلی کا سالگرہ نمبر ہماری توقع کے مطابق کامیاب ہے م-ا

ستارہ فلم نمبر مرتبہ بشیر ہندی، صفحات ۷۶، کتابت و طباعت اعلےٰ۔ قیمت چار آنے۔
ملنے کا پتہ۔ دفتر ستارہ گیلانی پریس لاہور)

ستارہ کے فلم نمبر کے مدیرانہ فرائض فلمیات کے مشہور و معروف نقاد جناب بشیر ہندی نے انجام دیئے ہیں۔ بشیر ہندی فلمیات کے ماہر اور ایک کہنہ مشق نقاد ہیں۔ فلم نمبر میں آپ نے انتہائی کوشش کی ہے۔ کہ فلم کے ہر پہلو سے متعلق کامیاب و مفید مضامین درج ہوں۔ اور آپ کی یہ کوشش بے حد کامیاب رہی ہے۔ یقین واثق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اس نمبر کا مطالعہ کرنے کے بعد انسان فلموں کی تعمیر و تدوین اور معیار کامیابی سے بہت حد تک واقف ہو سکتا ہے۔ سب سے کامیاب مضامین دو ہیں۔ ایک تو پسِ پردہ اور دوسرا فلمی اصطلاحات ان مضامین کے مصنف مسٹر بالم فردوسی ہیں۔ اور اس پردے میں کون بالم ہے، یہ دنیا اچھی طرح جانتی ہے . . . م-ا

غنچہ رنگین از غ۔م۔ کتابت و طباعت اعلےٰ۔ سائز ۲۰×۲۲/۱۶ صفحات ۴۸، قیمت آٹھ آنے
ملنے کا پتہ، غلام محمد رنگین، سمند رپوسٹ آفس بھوانہ، ضلع جھنگ۔

رنگین صاحب ضلع جھنگ کے نوجوان شعراء میں امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔ طبع غزلت پسند ہیں غنچہ رنگین آپ کے متواتر اصرار پر شائع کی گئی ہے شروع میں دو دیباچے ہیں ایک تو عروج جھنگ کے ایڈیٹر صاحب جناب عبدالمجید احمد بی۔ اے کے قلم سے اور دوسرا مشہور ادیب حضرت خیال مراد آبادی کے قلم سے۔ رنگین صاحب تخلص کی مناسبت سے رنگین طبع آدمی ہیں انکا ذوق سخن حضرت اختر شیرانی کے کلام سے خاص طور پر متاثر ہے۔ چنانچہ آپکی نظم "وہ راتیں" اختر صاحب کی مشہور و معروف نظم "گذارش" کا صحیح معنوں میں چربہ ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر رنگین صاحب نے مشق جاری رکھی تو امید واثق ہے بہت ترقی کرینگے کیونکہ آپکی طبیعت میں ترقی کی استعداد موجود ہے۔ کتاب کو تین حصوں میں منقسم کیا گیا ہے۔ پہلا حصہ "تبسم تخیل" ہے جسمیں نظمیں ہیں اور ان میں روضۂ تاج محل، محبت کی سرزمین، نغمہ بیخودی بہت اچھی نظمیں ہیں۔ دوسرا حصہ "شمیم تغزل" ہے جسمیں غزلیں ہیں تیسرا حصہ متفرقات پر مشتمل ہے۔ م-ا

اختر عید نمبر زیر ادارت جناب برق صاحب کتابت و طباعت خوشگوار صفحات ۵۵ قیمت ۴ر چندہ دو روپے پندرہ آنے علاوہ محصولڈاک مقام اشاعت چاہ میراں روڈ لاہور) ماہنامہ اختر ایک سال سے علم و ادب کی شاندار خدمات انجام دے رہا ہے۔ زیر نظر اسکا عید نمبر ہے جو مضامین کے تنوع اور تصاویر کی جاذبیت کے لحاظ سے قابل قدر ہے۔ مضمون نگاروں میں اردو کے مشہور و معروف ادیبوں کے اسمائے گرامی نظر آتے ہیں

محمود رضوی، حضرت سیماب، پروفیسر سالک، حفیظ ہوشیارپوری، راجہ مہدی علی خاں، الطاف مشہدی، محترمہ فاطمہ بیگم کے مضامین نظم و نثر خاص طور پر قابل مطالعہ ہیں۔ برق صاحب خود ایک اچھے ادیب ہیں۔ اس لئے مضامین کے انتخاب میں انہوں نے دقت نظر سے کام لیا ہے۔ امید ہے پرچہ بہت ترقی کرے گا۔ م-ا


ہر پڑھے لکھے گھر میں رکھنے والی کتب
سکول کمپوزیشن
ایڈیومیٹک ٹرانسلیشن
کا
پاکٹ ایڈیشن قیمت چار آنے
نوٹ
جہاں ہر پڑھے لکھے گھر میں معمولی
لائبریری لازمی ہے وہاں
مندرجہ بالا کتب کا
ہونا بھی ضروری ہے
اندو وادچندر داوے
سنسکرت ٹرانسلیشن کے لئے
اپنی قسم کی نرالی کتاب ہے
قیمت
۱۲/
پرشین ٹیچر
فارسی ترجمہ
بہترین کتاب ہے
قیمت دس آنہ
ماڈرن انگلش گرامر
اینڈ کمپوزیشن
انگریزی کی بہترین
گرامر ہے
قیمت دو روپے
رفیق مضمون نگاری
اردو جواب مضمون
قیمت
بارہ آنے
مکمل فہرست کے لئے مندرجہ ذیل پتہ کو لکھئے
پنجاب کتاب گھر رجسٹرڈ موہن لال روڈ۔ لاہور

موجودہ انشورنش ایکٹ

مسلم انڈیا انشورنس کمپنی لمیٹڈ

اف مسلم انڈیا انشورنس کمپنی لاہور

چند ایک خود غرض ایجنٹ اور کچھ حاسد اور بدباطن لوگ مختلف قسم کی بے بنیاد خبریں پھیلا رہے ہیں اسلئے پبلک کو بالعموم اور اپنے حصہ داران اور بیمہ کنندگان کو بالخصوص مطلع کرنے کی غرض سے تحریر کیا جاتا ہے کہ مسلم انڈیا انشورنس کمپنی لمیٹڈ موجودہ انشورنش ایکٹ کے نفاذ کے بعد نہایت خوش اسلوبی سے اور کامیابی کیساتھ اپنے بیمہ زندگی کے کام کو جاری رکھے گی۔ اور اس کو

کسی دوسری بیمہ کمپنی کے ساتھ الحاق کرنے کی

ہرگز ضرورت نہ ہوگی۔ اور دوسرے گورنمنٹ ہندنے ہر نئی کمپنی کو دو لاکھ روپیہ زر ضمانت (سیکورٹی) داخل کرنے کے لئے جو ۹ سال کی میعادی ہے اس سے بہت کم عرصہ میں ہماری کمپنی اس سیکورٹی کو داخل کردے گی۔

مزید برآں یہ بتا دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مسلم انڈیا انشورنش کمپنی کے موجودہ سال کے کام کی رفتار اسقدر عمدہ اور حوصلہ افزا ہے کہ وہ شمالی ہندوستان کی بہت سی نئی اور پرانی بیمہ کمپنیوں کو پیچھے چھوڑ دے گی مزید حالات معلوم کرنے کے لئے براہ راست کمپنی کے ساتھ خط و کتابت کریں۔

ڈاکٹر سید محمد شریف متقی مینجنگ ڈائرکٹر

دی مسلم انڈیا انشورنش کمپنی لمیٹڈ۔ ۲۲۔ مزنگ روڈ۔ لاہور

قسمت کی آزمائش کا سنہری موقعہ



موٹر کار کا انعام حاصل کریں

ارسطوئے زماں حضرت مولانا حکیم محمد عبدالخالق قبلہ شاہی حکیم راولپنڈی اپنے دست خاص سے انعام نکالینگے

ہم نے سال گذشتہ میں اپنے مجربات کی قیمت نصف کر دی تھی جس سے اہل ملک نے کافی فائدہ اٹھایا ہے اب اعلان کیا جاتا ہے کہ ۱۹۴۳ء میں ایک نہایت عمدہ موٹر کار شورلٹ چھ سلنڈر جس کا فوٹو اشتہار ہذا میں دیا گیا ہے اور جو تمام پنجاب میں چکر لگا رہی ہے انعام میں دی جائیگی ذیل تحفہ جات کے ہمراہ انعامی ٹکٹ دیئے جاتے ہیں مئی ۱۹۴۳ء میں بمقام راولپنڈی کارخانہ صوفی اینڈ کو رجسٹرڈ میں نتیجہ نکالا جائیگا۔ آموں کے آم اور گٹھلیوں کے دام والا معاملہ ہے مفت میں قسمت آزمائیے۔ یہ قیمتی موقعہ پھر ہاتھ نہ آئیگا آج ہی ذیل کے نایاب تحفہ جات کا آرڈر دیکر انعامی ٹکٹ مفت حاصل کریں۔

سفید بال خوشبودار تیل سے قدرتی سیاہ ہو جاتے ہیں۔ ہندوستان کی ایجادات میں قابل قدر اضافہ

ہم نے جو ہر وسمہ مہندی کو تیل کی شکل میں تبدیل کرنے کا وعدہ کیا ہوا تھا۔ جو بارہ سال کے طویل عرصہ میں پورا ہوا ہے آج ہم نہایت مسرت کے ساتھ ڈنکے کی چوٹ سے اعلان کرتے ہیں۔ کہ وہ شوقین جو بال سیاہ کرنے والے تیل کا انتظار کرتے کرتے تھک گئے تھے آج خوشبودار تیل استعمال کر اپنے سفید بالوں کو سیاہ کر سکتے ہیں اگر ہمارے اس تیل سے ایک ہفتہ میں بال سیاہ نہ ہوں تو دوگنی قیمت واپس دی جائیگی ہم دغاباز اشتہار بازوں کو لعنت بھیجتے ہیں۔ قیمت فی شیشی ایک روپیہ علاوہ محصولڈاک۔ یہ شیشی کافی عرصہ تک کام دیتی ہے۔

ایجنٹوں کی ہر جگہ ضرورت ہے۔ کمیشن معقول دی جاتی ہے۔

طلا اعظم رجسٹرڈ۔ مردہ اور بے حس رگوں میں جوش جوانی پیدا کر کے بجلی کی طرح تیزی پیدا کرتا ہے مجلوق اور کثرت جماع کے مایوس کیلئے پیلا اکسیر ثابت ہو چکا ہے۔ کجی سستی اور لاغری کا واحد علاج ہے۔ بوڑھے اور جوان یکساں فائدہ اٹھاتے ہیں چالیس دن کے استعمال کیلئے شیشی کی قیمت ایک روپیہ

ممسک گولیاں رجسٹرڈ۔ نوجوانوں کو جریان احتلام سرعت انزال چاہے کسی وجہ سے ہو اور جو ہر حیات پانی کیطرح گرنے سے صحت خراب ہو چکی ہو ان گولیوں کے استعمال سے تمام شکایتیں رفع ہو جاتی ہیں۔ سرعت انزال کے مریض کو ان گولیوں کے استعمال کو شرمندہ ہونا نہیں پڑھتا۔ زیادہ تعریف خلاف تہذیب ہے۔ بارہ عدد گولیوں کی قیمت ایک روپیہ۔ محصولڈاک بذمہ خریدار تینوں اشیاء کے خریدار کو محصولڈاک معاف۔

صوفی اینڈ کو رجسٹرڈ آزاد منزل نیا کیٹرہ اجہ بازار راولپنڈی

برانچ آفس صوفی اینڈ کو رجسٹرڈ کرنال شاپ بلڈنگ انارکلی لاہور

سول ایجنٹ برائے ضلع لاہور میاں محمد امین ڈبی بازار لاہور

پنجاب کے مایہ ناز ادیب ایم اسلم کے جدید شاہکار

تفسیرِ حیات | جن اہل ادب نے ایم اسلم کے افسانے پڑھے ہیں انکو معلوم ہے کہ زندگی کے وہ معمولی واقعات جو انسان کی نگاہ میں کچھ وقعت نہیں رکھتے۔ ایم اسلم صاحب انمیں ایسا رنگ بھر دیتے ہیں کہ پڑھنے والا اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا لہذا قابل مصنف کے ایسے ہی جدید چالیس افسانوں کا یہ نادر مجموعہ ہے۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ اردو زبان میں اس شان کی ایسی دلچسپ نتیجہ خیز کوئی کتاب آج تک طبع نہیں ہوئی ضخامت تقریباً سات سو صفحات اور جلد نہایت خوبصورت کاغذ گلیز کتابت و طباعت نہایت صاف ہے قیمت صرف عہ/

کارزارِ حیات | یہ تفسیر کا دوسرا حصہ ہے۔ اسمیں بھی ۴۴ جدید افسانے ہیں۔ اور ہر افسانہ نتیجہ خیز و لچسپ اور بار بار پڑھنے کے قابل ہے۔ ضخامت تقریباً ۰۰ ، صفحات۔ خوبصورت جلد۔ گلیز کاغذ۔ طباعت کتابت پاکیزہ۔ قیمت صرف دو روپے آٹھ آنے عہ/

آشوبِ زمانہ | اس کتاب میں قابلِ مصنف نے اپنی وسعت مشاہدہ اور رنگین عبارت سے جذبات و محبت کا فلسفہ بیان کیا ہے جو اگرچہ مرد اور عورت کے چند خطوط کا مجموعہ ہے لیکن نہایت دلچسپ نتیجہ خیز ہے۔ قیمت صرف ایکروپیہ ملہ/

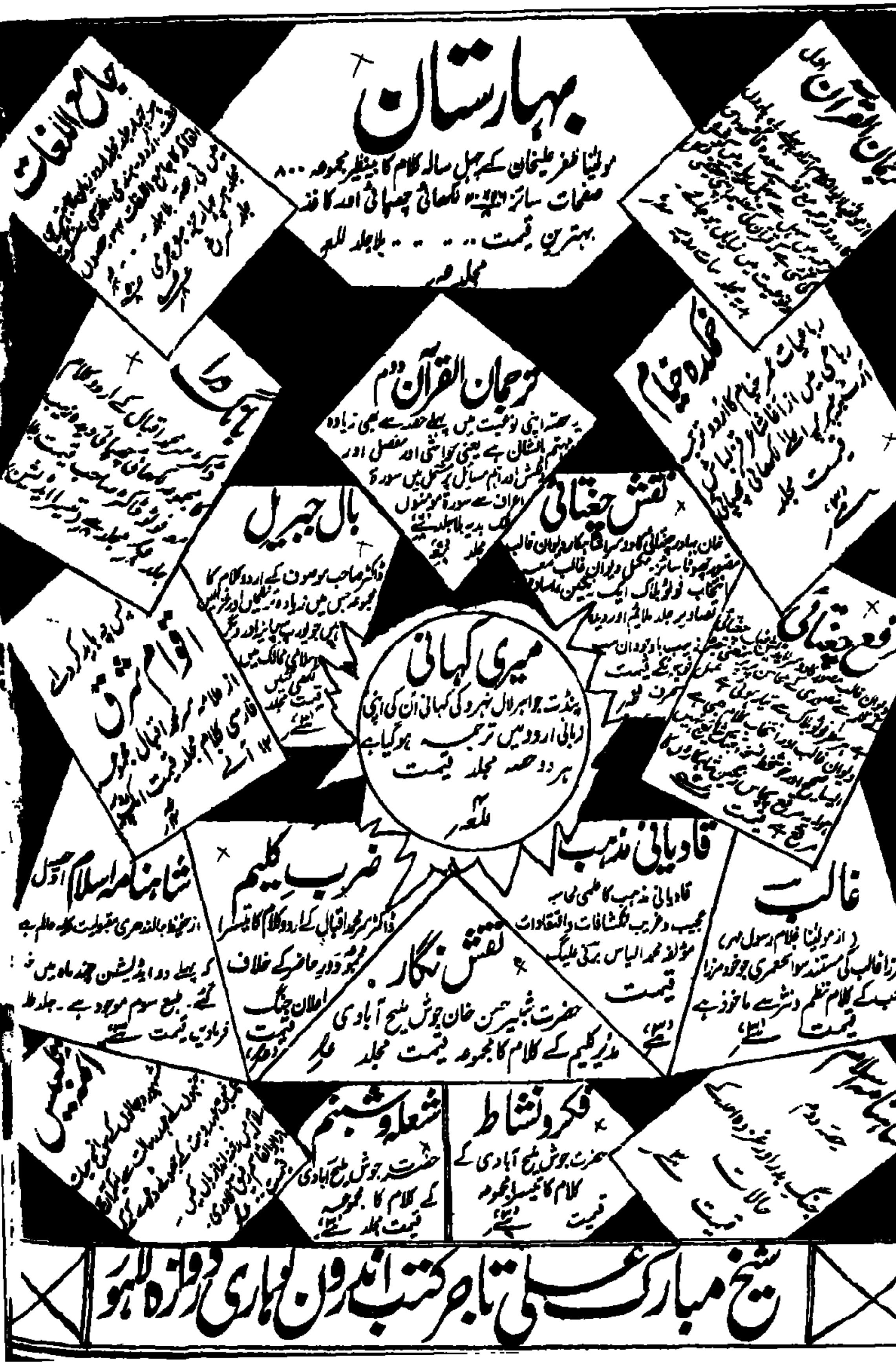
گناہ کی راتیں | یہ کتاب اپنے اچھوتے مضامین کے باعث اس قدر مقبول ہو چکی ہے کہ اس کا چوتھا ایڈیشن ہم نے طبع کیا ہے۔ جس میں انسان کی سیہ کاریوں کے وہ افسانے درج ہیں جو نہایت دلچسپ اور سبق آموز ہیں قیمت ایکروپیہ ملہ/

تمام مزاحیہ افسانوں کا ماسٹر پیس مرزا جی حصہ اول و دوم

مرزا جی حصہ اول کا دوسرا ایڈیشن طبع ہو گیا ہے۔

موجودہ مزاحیہ لٹریچر میں مرزا جی کو جس قدر مقبولیت حاصل ہوئی ہے تمام اہلِ ادب اس سے واقف ہیں۔ لہذا اگر آپ مزاحیہ افسانے اور مذاقیہ مضامین پڑھنے کے شائق ہیں۔ تو مرزا جی منگا کر پڑھیے۔ تمام ادبی رسائل و اخبارات کا متفقہ فیصلہ ہے کہ اردو زبان میں مرزا جی مقابل اس سے زیادہ سنجیدہ اور اچھوتے مذاق کی کوئی کتاب آج تک شائع نہیں ہوئی مرزا جی کا حصہ اول ختم ہو جانے کے باعث اس کے دوسرے ایڈیشن کا ملک میں بے حد انتظار تھا چنانچہ اب حصہ اول اور حصہ دوم دونوں موجود ہیں جن کی مجموعی قیمت مجلد کی صرف پانچ روپے ہے یعنی حصہ اول عہ/ حصہ دوم عہ/

ملنے کا پتہ: طلب فرمائیں } ملک دین محمد اینڈ سنز پبلشرز و تاجران کتب بل روڈ کشمیری بازار۔ لاہور


بہارستان
مولینا ظفر علیخان کے چہل سالہ کلام کا بینظیر مجموعہ ۸۰۰
صفحات
بہترین قیمت
مجلد
جامع اللغات
ترجمان القرآن اول
ترجمان القرآن دوم
خمکدۂ خیام
بال جبریل
نقش چغتائی
مرقع چغتائی
اقوام مشرق
میری کہانی
پنڈت جواہر لال نہرو کی کہانی ان کی اپنی
زبانی اردو میں ترجمہ ہو گیا ہے
ہر دو حصہ مجلد قیمت
شاہنامہ اسلام اوّل
ضرب کلیم
قادیانی مذہب
غالب
نقش نگار
حضرت شبیر حسن خان جوش ملیح آبادی
شعلہ و شبنم
حضرت جوش ملیح آبادی کے کلام کا مجموعہ
فکر و نشاط
حضرت جوش ملیح آبادی کے کلام کا تیسرا مجموعہ
شیخ مبارک علی تاجر کتب اندرون لوہاری دروازہ لاہور